خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ

جشن آزادی مبارک

ماہنامہ

سسپنس ڈائجسٹ

اگست 2022

قیمت 150 روپے

بانی

معراج رسول

مدیر اعلیٰ
عذرا رسول

مدیرہ
یمنیٰ احمد

نائب مدیر
اطہر حسین

مینجر اشتہارات
محمد شہزاد خان
0333-2256789

سرکولیشن مینجر
سید منیر حسین
0333-3285269

جلد 51 • شمارہ 08 اگست 2022 • زرِ سالانہ 2000 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 150 روپے • پبلشر و پرو پرائٹر: ذیشان رسول مقامِ اشاعت: گراؤنڈ فلور C-63 فیز II ایکسٹینشن، ڈیفنس مین کورنگی روڈ کراچی 75500
خط کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 215 کراچی 74200 • فون: 35895313 (021) mail:jdpgroup@hotmail.com پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

انشائیہ

جون ایلیا

سلامتی کی راہ

صدیوں پہلے کتاب میں لکھا گیا۔

"بدن کا چراغ آنکھ ہے۔ پس اگر تیری آنکھ درست ہو تو سارا بدن روشن ہوگا اور اگر تیری آنکھ خراب ہو تو تیرا سارا بدن تاریک ہوگا۔ پس اگر وہ روشنی جو تجھ میں ہے، تاریکی ہو تو کیسی بڑی ہوگی۔"

چنانچہ اے شخص! اپنے بدن کے چراغ کو کام میں لا اور اپنے گرد و پیش پر نظر کر۔ دیکھ کہ زمانہ نئی بساط بچھاتا ہے اور نئے رنگ دکھاتا ہے اور اب جبکہ دشنام کی آندھیاں گزر چکیں اور چڑھی ہوئی کمانیں اتر چکیں، اپنی زبان کو اپنے دہن میں سُلا دے اور کدورتوں کو دل سے بھلا دے۔

اور اے شخص! کیا تجھے یاد نہیں کہ لکھنے والے نے کتاب میں صدیوں پہلے لکھا تھا۔

"عیب جوئی نہ کر کہ تیری بھی عیب جوئی نہ کی جائے۔"

کیونکہ جس طرح تو عیب جوئی کرتا ہے، اسی طرح تیری بھی عیب جوئی کی جائے گی اور جس پیمانے سے تُو ناپتا ہے، اسی سے تیرے واسطے ناپا جائے گا۔

تو کیوں اپنے بھائی کی آنکھ کے تنکے کو دیکھتا ہے اور اپنی آنکھ کے شہتیر پر بھی غور نہیں کرتا؟

اور جب تیری ہی آنکھ میں شہتیر ہے تو تُو اپنے بھائی سے کیونکر کہہ سکتا ہے کہ لا، میں تیری آنکھ سے تنکا نکال دوں؟

اے شخص! آ...... کہ تُو اور میں ایک دوسرے سے ہم ہوں کہ جب ہم، ہم ہوں تو "ہم" کے نام سے پکارے جاتے ہیں۔ ہاں وہی "ہم" اپنی کمر کھولیں، اپنی دشمنیوں کو تہ کریں۔ اپنے جھگڑوں کو اندھے کنوئیں میں دھکیلیں اور اپنے قضیوں کو گڑھے میں دفن کریں۔

اے شخص! آ...... کہ اب ہم اپنے نخلستانوں کی خبر لیں اور اپنی چراگاہوں کو دیکھیں۔ ہم وہ جنگل ڈھونڈیں اور وہ راہ نکالیں کہ ہمارے کھیت فصلوں سے چھلک رہے ہوں اور ہمارے دسترخوان ہر نوع کے تر اور خشک میووں سے مہک رہے ہوں۔ ہماری پوشاک سونے کے تاروں سے کاڑھی جائے اور ہماری عورتیں لعل و گہر کی دمک سے شب چراغ ہوں۔ ہماری گلیوں میں خوشبوؤں کے کنوا نڈیلے جائیں اور ہمارے محلوں میں خوشیاں بار پائیں۔

حکمت ہمارے ذہنوں میں جگہ بنائے اور خرد ہمارے فیصلوں کو راہ دکھائے، تاریکیاں ہماری بستیوں سے رخصت ہوں اور روشنیاں ہمارے قریوں کو جگمگائیں۔ ویرانیوں کو موت آئے اور آبادیاں زندگی کو لبھائیں۔ لوٹنے والوں کے ڈیرے برباد ہوں اور انصاف کرنے والوں کے گھروں میں شادیانے بجیں۔

امن ہمارے سروں پر آسمان بنے اور سلامتی ہمارے پیروں کے نیچے زمین ٹھہرے۔ ہمارے بچے بڑھاپے کی دلیز کو لانگھیں اور ہمارے جوان زندگی کو گھونٹ گھونٹ پئیں۔ ہماری کنواریاں اپنے گھروں کی ہوں اور ہماری بیاہیوں کے سہاگ سلامت رہیں۔

اے شخص، اب جبکہ تہمتوں کی چڑھی ہوئی ندیاں اتر چکیں اور طنز کے سارے تیر کند ہو چکے۔ آ...... کہ تُو اور میں ایک دوسرے سے ہم ہوں کہ جب تو اور میں ہم ہوں تو "ہم" کے نام سے پکارے جاتے ہیں۔

اے شخص! آ...... کہ ہم ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر سلامتی کی راہ پر چلیں اور ہمارے بعد کی نسلیں اور ان کے بعد ان کی نسلیں......!

معزز قارئین!
السلام علیکم!
اگست 2022ء کا شمارہ بے شمار ذہنی اذیتوں اور گھٹن زدہ ماحول میں شاید ہوا کا ہلکا سا جھونکا ثابت ہو..... پرچے کی اشاعت کے دوران عیدالاضحیٰ کی تیاریاں تو تھیں مگر ..... عروج اور جوش و خروش کا فقدان نظر آرہا تھا۔ اگرچہ یہ ایک دینی فریضہ ہے مگر صد افسوس کہ سیاسی گٹھ جوڑ اور قوم کی بدقسمتی کہ..... بے حسی اور مہنگائی کے ہاتھوں ہونے والی تباہی کی وجہ سے حیثیت اور ہمت سے بڑھ کر اس فریضے کو ادا کرنے کی کوشش کی گئی۔ سنتِ ابراہیمی پر عمل کرنے کے لیے آج کے انسانوں کو کتنے پاپڑ بیلنے پڑ رہے ہیں شاید طبقۂ اشرافیہ کو اس کا ذرہ برابر بھی احساس نہ ہو۔ ہر مسلمان کی خواہش ہوتی ہے کہ اس فریضے کو دلی تقدس کے ساتھ ادا کیا جائے ..... بہرحال حج کی ادائیگی اور عیدالاضحیٰ کی تمام قارئین اور مسلمانانِ عالم کو مبارک باد۔ اللہ تعالیٰ یہ سعادتیں ہمیں ہر سال سکونِ قلب اور بہ آسانی رسائی کے ساتھ نصیب فرمائے (آمین ثم آمین)۔ اگست کا مہینا ہو اور جشنِ آزادی کی بات نہ ہو، ایسا کیسے ممکن ہوسکتا ہے۔ تمام اہالیانِ وطن کو جشنِ آزادی بہت بہت مبارک ہو..... مگر بات اسی جوش و خروش کی آجاتی ہے کہ خوشی کوئی بھی ہو، ماحول اور وسائل کا بہت بڑا دخل ہوتا ہے۔ حبس زدہ ماحول میں وسائل کی کمی ذہنی اذیت کا سبب بن جاتی ہے..... ملکی حالات اور سہولیات کو ایمانداری سے قوم کے لیے استعمال کرنا حکومت کی بہت بڑی ذمے داری ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ سے ان رحمتوں والی ساعتوں میں دعا ہے کہ ہمارے ملکی حالات پر اللہ اپنا کرم فرمائے اور حکمرانوں کے دلوں میں قوم کے لیے رحم اور انصاف ڈال دے..... اتنے زرخیز ملک میں رہنے والے جب اتنی تنگدستی اور بھرپور وسائل ہونے کے باوجود مسائل کا شکار ہوکر زندگی گزارنے پر مجبور ہوں تو بس فقط دعائیں اور اچھے دنوں کی امید ہی اس قوم کی ہمت بن جاتی ہیں۔ فی الحال تو اندھیر نگری اور..... بس کیا کہہ سکتے ہیں آگے..... مایوس کن کیفیت ہر سمت چھائی نظر آتی ہے۔ آمدنی اور استطاعت سے زیادہ ٹیکس ادا کرنے والی اس قوم کی مشکلات کو اللہ آسانیوں میں بدل دے (آمین)۔ بہت ساری دعاؤں کے بارے کر اب ذرا اپنی محفل کا بھی رخ کر لیتے ہیں۔

❁ ناہید یوسف، اسلام آباد سے خط لکھ رہی ہیں۔ "موسم انتہائی سہانا ہو رہا ہے۔ رم جھم برسات نے ہر چیز دھو ڈالی ہے۔ درختوں، پودوں کا رنگ اور بھی صاف شفاف ہوگیا ہے۔ بس اللہ پاک اسے رحمت بنائے رکھے کیونکہ بلوچستان وغیرہ میں طوفانی بارشوں نے بہت نقصان کیا ہے جس میں انسانی جانوں کا زیاں بھی شامل ہے۔ ہماری طرف سے تمام عالم اسلام کو حج اور ...... عیدالاضحیٰ کی مبارکباد۔ اس دفعہ کا ٹائٹل بھی کافی نکھرا نکھرا سا ہے۔ سب سے پہلے "عقابِ آب" سے شروع کیا۔ زویا جی نے تاریخی صفحات کا حق ادا کردیا۔ کہانی نہایت عمدگی سے آگے چل رہی ہے اور دلچسپی مزید بڑھتی جارہی ہے۔ عروج پاشا کا ایک بازو جسم سے جدا ہوگیا۔ اب دیکھنا ہے کہ وہ مسلمانوں کے حق میں کس طرح آگے کا لائحہ عمل طے کرتا ہے۔ منذر کی مریم کے لیے بے تابی بھی خوب ہے۔ اتنے مسائل میں اسے صرف اپنی ذات کا ہی مسئلہ نظر آرہا ہے جس کی وجہ سے ہر کوئی اس سے دور بھاگتا ہے۔ فاطمہ حسام کی "جرم زاد" میں کرٹ نے ٹومی کو خوب پھنسایا اور لائیو پروگرام میں اس سے اقبالِ جرم بھی کرا لیا۔ اسما قادری کی "شہ زور" سرپٹ بھاگ رہی ہے لیکن معاذ کا ہر دن مصیبتوں سے بھرا ہے۔ نجل کے بیٹے اعظم کا ناک میں پتھر پھنسا لینا اور پھر معاذ اور جارود کا نجل سمیت اسپتال کے لیے نکلنا مصیبت میں مبتلا کر گیا۔ پولیس نے گھیرا تنگ کردیا اور وہ لوگ بال بال بچے اور قریبی بستی میں پناہ لے لی۔ ادھر دیگر ساتھیوں نے بھی اپنا ٹھکانا چھوڑ دیا اور اپنے حلیے میں تبدیلی کر کے الگ الگ نکل گئے۔ سونیا، معاذ کی تلاش میں حلیہ بدل کر ایک بستی میں پہنچ گئی اور سرسوتی نامی عورت کے گھر پہنچ گئی۔ وہیں اس کی باتوں سے اسے شک ہوا کہ معاذ کا سراغ مل جائے گا۔ کہانی دلچسپ ہوگئی ہے۔ عیوق بخاری کی "چکرباز" نہایت عمدہ کہانی تھی۔ ریتا کے گملوں میں چھپائے گئے ہیرے اس نے غائب کردیے اور روجر اور آرتھر کو بھی پھنسوا دیا۔ ملک صفدر حیات کی "مارگزیدہ" بس ٹھیک تھی۔ ناہید سلطانہ کی "کوتاہ اندیش" بھی اچھی کہانی تھی۔ تقی شاہ کی کنجوسی اور آخر میں اس کا انجام نہایت سبق آموز تھا۔ نشاط آرا کی ثابت قدمی بھی زبردست تھی۔ ہر حال میں گزارہ کیا اور بچوں کو لائق بنایا۔ ویلڈن ناہید جی۔ جاوید بسام کی "انگارہ صفت" بھی بہتر کہانی تھی۔ ڈینئیل نے شیطان سے معاہدہ کیا اور خوب فائدے اٹھائے مگر شیطان کو اپنی عقل مندی سے خوب نقصان پہنچایا اور ایک ہزار روحوں کو جہنم سے آزاد کروا دیا۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی "جنگ باز" کی پانچویں قسط پڑھی۔ کہانی میں ہمیں کوئی ایسی دلچسپی محسوس نہیں ہوئی۔ ہوسکتا ہے آگے جا کر کہانی بہتر ہوجائے۔ عائشہ نصیر کی "آخری مشن" اچھی کہانی تھی۔ چالسن نے بوڑھا ہوکر بھی کارل اور اس کے بدمعاش ساتھیوں کو سبق سکھا دیا۔ ضیا تسنیم بلگرامی کی "اصحاب الرس" میں ایمان افروز واقعات پڑھنے کو ملے۔ محمد عباس ثاقب کی "چنگاری" اس ماہ کی زبردست کہانی تھی۔ ایڈی نے ایلیزا کی جان بچالی اور خود دشمنوں سے نمٹنے کے لیے تیار ہوگیا۔ آخری کہانی فرح بخاری کی "ریگزار" زبردست رہی۔ میٹھی نے مقداد کے لیے بہت قربانیاں دیں اور بالآخر اپنی جان سے گئی۔ اس ماہ کا سسپنس نہایت شاندار رہا۔"

● روبینہ اشعر کی کراچی سے مبارکباد۔ "سب سے پہلے احباب کو حج، عیدالاضحیٰ اور جشنِ آزادی کی مبارک باد۔ اس گھٹن زدہ سیاسی ماحول، مہنگائی کے عفریت، پیٹرول ڈیزل کی قیمتوں میں ہوشربا اضافے کے درمیان اگست کا مہینا ان خوشیوں کے ساتھ آیا ہے۔ اللہ پاک ہم سب کے لیے آسانیاں پیدا فرمائے اور اس ملک و قوم پر اپنا خاص لطف و کرم فرمائے (آمین)۔ ماہ جولائی 2022ء کا شمارہ وقت سے پہلے ہی مل گیا تھا۔ ٹائٹل پسند آیا۔ ٹائٹل کو سراہتے اور فہرست پر سرسری سی نظر ڈالتے ہوئے جون ایلیا کے انشائیے سے مستفید ہوئے۔ خطوط کی محفل میں کچھ نئے لوگ نظر آئے لیکن پرانے ساتھی منظرِ عام سے غائب تھے مگر اپنی بھرپور حاضری دیکھ کر کچھ اطمینان محسوس ہوا۔ سلسلے وار کہانیوں میں سب سے پہلے صحرائی پس منظر میں تحریر کی گئی فرح بخاری کی "ریگزار" پڑھی۔ کہانی کے اختتام نے دل اداس کردیا۔ میٹھی کی دردناک موت نے بے اختیار آنکھیں نم کردیں۔ فرح بخاری نے کہانی کو بہت جلدی اختتام تک پہنچا دیا۔ اس عمدہ مکالموں پر مبنی زبردست تحریر کو کچھ اقساط تک مزید چلایا جاتا تو قارئین کو اچھی کہانی پڑھنے کو ملتی۔ ویلڈن فرح بخاری۔ زویا صفوان کی تاریخی کہانی "عقابِ آب" بہت زبردست جارہی ہے۔ عروج پاشا مسلمانوں کو ان کا حق دلوانے کے لیے کوشاں ہے لیکن کہانی میں مسلمانوں کی نااتفاقی پڑھنے کو ملی اور اس باہمی نااتفاقی سے ہمیشہ دوسروں نے فائدہ اٹھایا۔ عبدالرب بھٹی کی "جنگ باز" ابھی جاری ہے۔ کہانی میں سسپنس پیدا ہو رہا ہے اور نئے

قارئین کرام! آپ پرچے کی ضخامت دیکھ کر چونک گئے ہوں گے مگر یہ ہوشربا مہنگائی کا نتیجہ ہے۔ کچھ حد تک یہ بات سچ بھی ہے کہ اب دو روپے کی چیز دس روپے میں ملنے لگی ہے لیکن جو چیز بازار سے بالکل ہی غائب ہو تو تاجران اس کی قیمت منہ مانگی مانگتے ہیں۔ اس وقت بازار میں نیوز پرنٹ بھی کمیاب ہوچکا ہے۔ پھر بھی ہم کسی نہ کسی طرح حاصل کر رہے تھے، یہ بھی غور نہیں کر رہے تھے کہ ادارہ کس قدر دباؤ میں آرہا ہے لیکن اب نقصان برداشت سے باہر ہے۔ ہم بے بس ہو رہے ہیں اس لیے اب معزز قارئین کرام سے التماس کر مجبور ہوگئے ہیں کہ آپ مشورہ دیں، اب کیا کیا جائے۔ فی الحال تو اس مہینے کچھ صفحات کم کردیے ہیں لیکن یہ مسئلے کا حل نہیں ہے۔ کئی اداروں نے قیمت بڑھا کر دو سو کردی ہے۔ اس ذہنی خلجان کے وقت آپ کا مشورہ اہم ہے کہ صفحات اتنے کردیے جائیں یا قیمت بڑھا دی جائے۔ ہم شدت سے جواب کے منتظر ہیں۔

نئے موڑ آرہے ہیں۔ دیکھیے آگے کیا ہوتا ہے۔ ناہید سلطانہ اختر کی تحریر ''کوتاہ اندیش'' حقوق و فرائض کی ادائیگی کے پس منظر میں لکھی گئی عمدہ کہانی تھی۔ ناہید سلطانہ اختر ہمیشہ معاشرتی موضوع پر لکھنے کا حق ادا کرتی ہیں۔ ویلڈن ناہید جی۔ فاطمہ حسام کی کہانی ''جرم زاد'' جرائم پر مبنی اچھی تحریر تھی۔ جاوید بسام کی ''انگارہ صفت'' نیکی اور بدی کے درمیان جنگ کی ایک عجیب مگر دلچسپ تحریر تھی۔ پسند آئی۔ محمد عباس ثاقب کی تحریر ''چنگاری'' بھی زبردست رہی۔ عیوق بخاری کی تحریر ''چکر باز'' زبردست رہی۔ اکثر چوروں کو مور پڑ جاتے ہیں۔ ہیرے کو مٹی بنانے والی ایک سادہ فطرت دوشیزہ کی چالاکی پڑھنے کو ملی۔ ملک صفدر حیات کی ''مارگزیدہ'' بہترین کہانی تھی۔ مجرموں سے کڑی تفتیش اور ان کو کیفر کردار تک پہنچانا ملک صفدر حیات کا طرۂ امتیاز رہا ہے۔ ضیا تسنیم بلگرامی کی ایمان افروز واقعات پر مشتمل ''اصحاب الرس'' پڑھی۔ اچھی تحریر تھی۔ عائشہ نصیر کی ''آخری مشن'' کچھ خاص نہیں لگی۔ محفل شعر و سخن میں اشعار کا انتخاب خوب رہا۔''

٭ ملک وحید کا تبصرہ کراچی سے۔ ''جولائی 2022ء کا شمارہ ہمیشہ کی طرح اس بار بھی جلد ہی مل گیا۔ ٹائٹل بہت زبردست رہا۔ جون ایلیا کا پُرمغز انشائیہ پڑھ کر سر دُھنتے ہوئے سب سے پہلے زویا صفوان کی تاریخی کہانی ''عقاب آب'' پڑھی۔ کہانی بہت زبردست جاری ہے۔ ویلڈن۔ اسما قادری کی ''شہ زور'' نئے واقعات اور نئے موڑ کے ساتھ سسپنس پیدا کرتے ہوئے دن بہ دن اچھی ہوتی جارہی ہے۔ فرح بخاری کی ''ریگزار'' اپنے بہترین مکالموں کے ساتھ اختتام پذیر ہوئی۔ کہانی کے اختتام نے اداس کر دیا۔ بہترین کہانی تھی۔ عبدالرب بھٹی کی ''جنگ باز'' سسپنس سے بھرپور بہترین تحریر ہے۔ اگلی قسط کا انتظار ہے۔ محمد عباس ثاقب کی کہانی ''چنگاری'' کچھ خاص نہیں لگی۔ ناہید سلطانہ اختر کی معاشرتی موضوع پر لکھی گئی کہانی ''کوتاہ اندیش'' زبردست رہی۔ عیوق بخاری کی ''چکر باز'' بھی اچھی تحریر تھی۔ ملک صفدر حیات کی ''مارگزیدہ'' اچھی رہی۔ ضیا تسنیم بلگرامی کی تحریر ''اصحاب الرس'' ایمان افروز واقعات پر مبنی تحریر تھی۔ فاطمہ حسام کے قلم سے لکھی گئی تحریر ''جرم زاد'' متاثر کن تحریر تھی۔ عائشہ نصیر کی کہانی ''آخری مشن'' کچھ خاص تاثر قائم نہ کرسکی۔ جاوید بسام کی کہانی ''انگارہ صفت'' بس ٹھیک ہی تھی۔ محفل شعر و سخن میں اشعار پسند آئے۔ آخر میں تمام قارئین کو حج، عیدالاضحی اور جشنِ آزادی کی ڈھیروں مبارک باد۔''

٭ انجم فاروق ساحلی، لاہور سے چلے آرہے ہیں۔ ''امید ہے آپ اور ادارے کے دیگر احباب بخیر و عافیت ہوں گے۔ شمارہ جولائی کا ٹائٹل کچھ غیر مانوس سا معلوم ہوا۔ ''کہیں کا نہیں'' انشائیہ معنویت سے بھرپور ہے۔ ادارتی گفتگو میں ملکی حالات و سیاست کا بھرپور جائزہ قلمبند کیا گیا۔ یکدم بڑھتی ہوئی مہنگائی نے عوام کو بہت سے مسائل میں مبتلا کر دیا ہے۔ پبلشرز، رائٹرز بھی مشکلات کا شکار ہیں۔ مہنگائی ذہنی انتشار پیدا کرتی ہے جس سے انسان کی صلاحیتیں متاثر ہو کر رہ جاتی ہیں۔ خطوط کی محفل کچھ مختصر معلوم ہوئی۔ ریاض بٹ صاحب کی بھی کمی تھی۔ کہانیوں میں چکر باز، انگارہ صفت، چنگاری، عقاب آب خوب تھیں۔ ''شہ زور'' کا ہنگامہ اچھا رہا۔ ''اصحاب الرس'' بھی معیاری کاوش تھی۔ اشعار کی نازک خیالیاں خوب تھیں۔ باقی پرچہ زیر مطالعہ ہے۔''

٭ مہتاب احمد کی خوشی حیدر آباد سے ''ٹائٹل پر جوں ہی نگاہ گئی، تھوڑی دیر کے لیے گم صم ہو گئے۔ کیا خوب صورت چہرہ تھا مگر پاس ہی ایک اداس شخص سوکھے درخت پر ہاتھ لگائے کھڑا تھا۔ بہرحال ٹائٹل شاندار تھا۔ خطوط کی محفل میں اپنا خط پہلے نمبر پر دیکھ کر نہایت خوشی ہوئی۔ ہم ادارے کے مشکور ہیں کہ انہوں نے ہمیں اول نمبر پر جگہ دی۔ سب سے پہلے جنگ باز سے شروع ہوئے۔ عبدالرب بھٹی نے کمال کر دیا۔ کیا زبردست تحریر ہے۔ ایکشن سے بھرپور۔ نادو کا کردار نہایت جاندار ہے۔ جس طرح وہ ایک عورت ہو کر ہمت دکھا رہی ہے، وہ قابلِ داد ہے۔ کہانی زبردست جا رہی ہے اور امید ہے کہ آگے جا کر مزید زوردار ہونے والی ہے۔ ویلڈن بھٹی صاحب۔ دوسری کہانی شہ زور پڑھی۔ شہ زور کے تو کیا ہی کہنے۔ کہانی بہت تیز تر ہے۔ معاذ بے چارہ اپنے دوست اور گل کے لیے جدوجہد کر رہا ہے مگر مصیبتیں ہیں کہ جان ہی نہیں چھوڑ رہیں۔ اعظم کو اسپتال لے کر گئے تو

وہاں نواب صاحب کے رشتے دار نے پہچان کر مصیبت کھڑی کر دی اور پولیس پیچھے پڑ گئی۔ زبردست مقابلے کے بعد جا کر جان چھوٹی۔ جارو کا ملنا بھی نعمت سے کم نہیں۔ وہ واقعی معاذ کے احسان کا صحیح بدلہ چکا رہا ہے۔ ادھر معاذ کے ساتھی بھی الگ الگ سمتوں میں نکل پڑے ہیں مگر سونیا معاذ کی تلاش میں حلیہ بدل کر ایک بستی میں پہنچ گئی ہے اور امید ہے کہ وہ معاذ کو تلاش کر لے گی۔ اگلی قسط اور زبردست ہونے والی ہے۔ عقاب آب پر پہنچے۔ زویا جی نے تاریخ سے آگاہ کیا۔ کہانی نہایت عمدہ ہے۔ عروج پاشا کی سلطانوں کے لیے جدوجہد جاری ہے۔ اس کا ایک بازو جسم سے جدا ہو گیا ہے۔ آگے دیکھیے وہ اپنی جدوجہد کو کس طرح آگے بڑھاتا ہے۔ دلچسپی مزید بڑھتی جا رہی ہے اور یقیناً آگے کہانی مزید دلچسپ ہو جائے گی۔ منذر کی مریم کے لیے طلب بھی مضحکہ خیز ہے۔ اتنے ہنگاموں میں بھی اسے صرف مریم کا خیال ہے اور وہ کسی نہ کسی طرح اسے حاصل کرنا چاہتا ہے۔ ویلڈن زویا جی۔ فاطمہ حسام کی جرم زاد بہترین کہانی تھی۔ کرٹ نے سالوں پہلے کے قتل کے مجرم کو اپنی عقل مندی سے پھانس ہی لیا۔ ٹومی کو پتا بھی نہیں چلا اور اس نے ریڈیو پروگرام میں اپنے جرم کا اقرار کر لیا۔ بہت اچھی کہانی تھی۔ ناہید سلطانہ اختر کی کوتاہ اندیش معاشرتی پہلو کو اجاگر کرتی ایک اور اثر انگیز اور نصیحت آمیز کہانی تھی۔ تقی شاہ کی کنجوسی کے برخلاف نشاط آرا کی ثابت قدمی خوب تھی۔ نشاط نے جانے کیسے پیسے جوڑ جوڑ کر اپنی اولاد کی ضرورتوں کو پورا کیا۔ تقی شاہ کا بس چلتا تو وہ اپنے اہلِ خانہ کو ایک وقت کا ہی کھانا کھلاتا۔ زبردست تحریر تھی۔ ملک صفدر حیات کی مارگزیدہ میں پولیس افسر کی موت کی تفتیش کرنا تھی اور قاتل کو بھی پکڑنا تھا مگر مسئلہ یہ تھا کہ ظاہر یہی کرنا تھا کہ ان کی موت طبعی تھی اور در پردہ حقائق جاننا تھے۔ ملک صاحب نے نہایت چالاکی سے کام لیتے ہوئے اپنوں میں ہی موجود کالی بھیڑ کو پکڑ لیا۔ کہانی اچھی تھی۔ جاوید بسام کی انگارہ صفت نیکی اور بدی کے درمیان مقابلہ آرائی پر مبنی تھی۔ ڈینیل نے عقل مندی سے کام لیتے ہوئے شیطان کو زیر کر دیا اور شیطان جیسا مکار بھی بے بس نظر آیا۔ کہانی اچھی تھی۔ عائشہ نصیر کی آخری مشن میں جانسن نے بوڑھا ہو کر بھی بدمعاشوں کو سبق سکھایا اور کسی کو شک بھی نہ ہوا کہ اس نے انہیں پھنسایا ہے۔ ضیا تسنیم بلگرامی کی اصحاب الرس سے معلومات میں مزید اضافہ ہوا۔ جزاک اللہ۔ آخری کہانی ریگزار تو نہایت ہی عمدہ رہی۔ فرح بخاری نے آخری صفحات کا حق ادا کر دیا۔ کافی عرصے بعد سسپنس کے آخری صفحات پر نہایت ہی شاندار کہانی پڑھنے کو ملی۔ میثی اور مقداد کی ذہنی ہم آہنگی زبردست تھی۔ میثی نے مقداد کے لیے اپنی ذات کو قربان کر دیا۔ قدم قدم پر اسے آسانی فراہم کی۔ واقعی سچی محبت ہو تو انسان اپنا آپ بُھلا کر اپنے محبوب کے لیے قربانیاں دیتا چلا جاتا ہے اور بدلے میں کچھ بھی نہیں مانگتا۔ اتنی اچھی کہانی لکھنے پر فرح جی کو مبارکباد۔ عباس ثاقب کی چنگاری بھی اچھی تھی۔ ایڈ نے ایلیزا کو دشمنوں سے بچایا اور خود ان سے مقابلے کے لیے تیار ہو گیا۔ عیوق بخاری کی چکر باز میں ریتا نے چوروں کے مال کا خوب فائدہ اٹھایا اور ہیرے غائب کر دیے۔ پولیس بھی کچھ سراغ نہ لگا سکی اور ریتا کے دن پھر گئے۔ کترنیں بہترین تھیں۔ محفل شعر و سخن میں رباب خان، نجمی رحمان، امبرین ناصر اور عظیم احمد کے اشعار پسند آئے۔ مجموعی طور پر سسپنس شاندار تھا۔ ہماری طرف سے تمام عالم اسلام کو حج اور عیدالاضحیٰ کی مبارکباد۔''

اب ان قارئین کے نام جن کے خطوط محفل میں شائع نہیں ہو سکے۔

ریاض انصاری، ملکوال۔ عبدالباری، کراچی۔ صابر فیاض، حیدرآباد۔ محمد اکرم، جہلم۔ عطاء اللہ، ملتان۔ غلام رسول چانڈیو، لاڑکانہ۔ اسلم ملک، فیصل آباد۔ اعجاز احمد، لاہور۔

سانحۂ ارتحال

اناللہ وانا الیہ راجعون جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز کے سینئر کارکن محمد اختر بیگ کی ہمشیرہ کا قضائے الٰہی سے انتقال ہو گیا ہے۔ ادارہ اہلِ خانہ کے غم میں برابر کا شریک ہے۔ قارئین سے سورۂ فاتحہ کی درخواست ہے۔

چوتھا حصہ
عقابِ آب
زویا صفوان
عہد کوئی بھی ہو... جب جب
طاقت اور گھمنڈ کی بساط بچھی...
تو ظلم سے نجات کے لیے نچلی سطح
سے بغاوت نے جنم لیا اور پھر بڑی بڑی
سازشوں کے پردے چاک ہوتے چلے گئے...
کہ یہی دستور ہے دنیا کا اور موسم کے بدلاؤ
میں بھی یہی سبق پوشیدہ ہے۔ یہ اور بات کہ
انسان سمجھ کر بھی نظر انداز کرے مگر... اس
دور کے انسانوں نے نظر انداز کرنے کی غلطی کے
بجائے نظروں میں قید کرلینے کی عقل مندی
کرڈالی... لہٰذا پھر کیسے ظلم کی رسّی نہ کٹتی اور
بغاوت کے پیروں تلے ظالم کیسے نہ روندے جاتے... یہی تو
کمال ہے درست وقت کے درست فیصلے کرنے کا... اور انھوں
نے جو فیصلہ کیا شاید اس وقت کا یہی تقاضا بھی تھا۔
ماضی کا آئینہ۔ بااختیار اور بے اختیار انسانوں کے عبرت اثر واقعات

کرنے آیا ہے تو میں اس معاملے میں کچھ نہیں کرسکتا۔'' خیر الدین نے رکھائی سے کہا۔ اسے حالتِ جنگ، کسمپرسی اور بے سائبانی میں ایک عورت کے لیے بلکتے اس شخص پر شدید طیش آتا تھا۔

''میں آپ کے پاس کسی اور مقصد کے لیے آیا ہوں۔ صرف کچھ دیر کے لیے میری بات سن لیجیے۔'' اس نے التجا کی۔

''تمہارا ہر مقصد اور بات مریم سے شروع ہوکر اسی پر ختم ہوجاتی ہے۔ میرے پاس ان لغویات کے لیے بالکل وقت نہیں ہے۔'' خیر الدین رکھائی سے بولا۔

''آپ کی یہ نفرت اور گریز بجا ہے امیر! لیکن بس ایک بار میری بات سن لیجیے۔'' وہ مصر ہوا۔

خیر الدین نے اثباتی انداز میں سر کو جنبش دی اور بیزاری سے اس کا مدعا سننے لگا۔ منذر کی گفتگو نے آغاز میں ہی اس کی سب حسیات چوکنا کردیں۔ وہ دھیمی آواز میں کہنے لگا۔

''نصر اور فہر سلطان سلیم کے قاتل کو سزا نہ دینے پر تیخ پا تھے۔ انہوں نے عروج پاشا سے مایوس ہونے کے بعد خفیہ مذاکرات کیے۔ انہیں ایک ہی بات کا خدشہ لاحق تھا کہ بار بروسہ برادران کی طاقت بے حد بڑھنے لگی ہے۔ اس طاقت کو لگام ڈالنے کی ضرورت ہے۔ وہ لوگ آپ کے مقابلے میں کسی طاقتور حلیف کی تلاش کا ذکر بھی کرنے لگے۔ ان کے انداز سے محسوس ہوتا تھا کہ ایسا کوئی حلیف ان کی نظروں میں پہلے سے ہی موجود ہے۔ میں ان کی سرگرمیوں پر بہت حیران تھا۔ فہر اور نصر اکثر غائب رہنے لگے پھر اچانک ہی کہیں سے نمودار بھی ہوجاتے۔ کچھ روز قبل ان

کرگھوں کے کاریگر فراہم کرنے کا مطالبہ کیا اور جوابی طور پر مریم سے شادی کروانے کی ہامی بھری۔''

''اس نکتے پر تو نے فوراً اسے کاریگر فراہم کرنے کا وعدہ کرلیا ہوگا؟'' خیر الدین نے تلخی سے لقمہ دیا۔

''جی ہاں۔'' منذر نے افسردگی سے آہ بھری۔ ''میں نے اسے یہ یقین بھی دلایا کہ بار بروسہ برادران سے انتقام کے لیے میں کسی بھی حد تک جاسکتا ہوں۔ فہر میری نفرت اور غصے سے مطمئن دکھائی دینے لگا۔ اس نے مجھے بتایا کہ انہوں نے سخت دوڑ دھوپ کے بعد ایک ایسا طاقتور حلیف تلاش کرلیا ہے جو بار بروسہ برادران کا تختہ الٹ دے گا۔ فہر پُرامید تھا کہ وہ اتوار تک الجزائر پر قابض ہوجائیں گے۔''

''ایسا کون سا حلیف مل گیا انہیں؟'' خیر الدین چونکا۔ ''ان احمقوں کو یہ بھی علم نہیں کہ ایسے مددگار وقت آنے پر خود ہی اس حکومت پر قابض ہوجایا کرتے ہیں۔''

''فہر نے جو کچھ بتایا اس کے مطابق انہوں نے پی نن کے قلعے والوں سے معاملات طے کیے ہیں۔ بحری جہازوں پر موجود اندلسی عملہ عیسائی چپو برداروں کی زنجیریں غیر مقفل کردے گا۔ یہ عیسائی آپ لوگوں کے جہاز قلعے تک پہنچادیں گے۔ انتشار پھیلتے ہی بربری قبائلی سرداروں کا خاتمہ اور آپ دونوں کو قیدی بنالیا جانا ہے۔ پی نن کے قلعہ دار نے وعدہ کیا ہے کہ عروج پاشا اور خیر الدین ان کے حوالے کرتے ہی الجزائر کی حکومت نصر، فہر کے حوالے کردی جائے گی۔ میں نے کچھ سوچ کر انہیں پچاس کاریگر فراہم کردیے۔'' وہ اتنا کہہ کر خاموش ہوگیا۔

''تو یہ سب مجھے کیوں بتانے آئے ہو؟ ہمارے لیے نفرت یکدم کیسے ختم ہوگئی؟'' خیر الدین نے تحمل سے

اندلسی عیسائی بھی انہی کے ہم مذہب ہیں۔ نصر اور قہر میں اتنی سکت نہیں کہ ان عیسائیوں سے معاہدے پر عمل کروا سکیں۔ وہ ایک بار پھر ابو عبداللہ کی طرح ہماری سوداگری کر رہے ہیں۔ خسارہ ایک بار پھر ہمارا مقدر بننے والا ہے۔ مجھے اوری ولہ کے وہ ہزاروں بے گناہ افراد یاد آئے جو ان عیسائیوں کی بربریت کا نشانہ بنے ہیں۔ بس وہ ایک انقلابی لمحہ تھا۔ میرے دل سے صدا آئی کہ اپنا فرض نبھاؤ۔ ایک بار پھر وہی داستان رقم ہونے مت دو۔ سو میں آپ کے پاس چلا آیا۔"
اس کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔

"تم نے مجھے ایک بار پھر حیران کر دیا ہے منذر! پروردگار تجھ سے راضی ہو۔" خیر الدین نے گہری سانس لی۔ اس کی مردم شناس نگاہوں نے بھانپ لیا تھا کہ منذر کے انکشافات میں کسی جھوٹ یا دھوکے کی آمیزش نہیں ہے۔

"اب میرے لیے کیا حکم ہے؟" منذر نے اپنے آنسو صاف کیے۔

"اپنے معمولات یونہی برقرار رکھو۔ انہیں بالکل شک نہ ہونے دینا کہ تم نے مجھ سے کوئی ملاقات کی ہے۔ اتوار میں ابھی دو روز باقی ہیں۔ ہم ان کا کوئی نہ کوئی حل نکال لیں گے۔" اس نے دلاسا دیا۔

منذر اس سے رخصت ہو کر واپس آیا تو قہر نے اسے گھیر لیا۔ اسے اپنے متعین کردہ اہلکار سے اطلاع مل چکی تھی کہ منذر خیر الدین سے ملاقات کے لیے گیا ہے۔

"بار بروسہ برادران کے پاس کیا کرنے گیا تھا تو اور تیری آنکھوں میں آنسوؤں کا یہ ورم کیسا ہے؟" اس نے جارحانہ انداز میں پوچھا۔

"اپنے دل کی بھڑاس نکالنے گیا تھا۔ انہیں خوب بددعائیں دے کر آیا ہوں۔ مجھ سے دھوکا دہی کے بعد وہ بھی سکون سے نہیں رہیں گے۔ انہیں دردناک موت ملے گی۔" منذر نے نفرت سے کہا۔

قہر مطمئن ہو گیا۔

"بس اب ایک دو روز کی بات ہے۔ ان دونوں بھائیوں کو کسی جہاز کے عرشے میں باندھ کر تجھے ٹھوکریں مارنے کا موقع بھی دیں گے۔ اپنے سارے انتقام اور حساب کتاب چکتا کر لینا۔ اس کے بعد تیری شادی مریم سے کروا دی جائے گی۔"

"میں اس وقت کا انتظار کروں گا جب ظلم اور ناانصافی اپنے انجام کو پہنچے گی اور مریم میرے آنگن میں چاند بن کر اترے گی۔" منذر نے معنی خیزی سے کہا اور آگے بڑھ گیا۔

☆☆☆

الجزائر کی جامع مسجد میں نمازِ جمعہ کی تیاریوں کا آغاز تھا۔ اس روز مسجد میں نمازیوں کی تعداد معمول سے زیادہ تھی۔ عروج پاشا اور خیر الدین بھی اپنے معمول سے پہلے نماز کی ادائیگی کے لیے چلے آئے تھے۔ اندلسیوں کی آمد ان کے بعد ہوئی۔ ان کے آتے ہی چند نمازیوں نے غیر محسوس انداز میں نصر، قہر اور دیگر اندلسیوں کے درمیان نشست سنبھال لی۔

اب صورتِ حال کچھ اس طرح تھی کہ ہر اندلسی کے پہلو یا عقب میں کوئی نہ کوئی بربری ضرور موجود تھا۔ اس کے بعد عروج نے آنکھ سے خفیف اشارہ کیا۔ دروازوں کے پاس موجود بربری جوانوں نے فوری طور پر تینوں دروازے مقفل کر دیے۔ نماز کی ادائیگی ہوتے ہی عروج نے امام کے کان میں سرگوشیانہ کچھ کہا اور اسے ایک جانب کر کے منبر پر خود کھڑا ہو گیا۔ اسے اپنے سامنے ہر شخص کے تاثرات واضح دکھائی دینے لگے۔ نصر کی آنکھوں میں شکوک کی پرچھائیاں تھیں۔ عروج نے بلا تمہید بات کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔

"پانی جب سر سے بلند ہو جائے تو ڈوبنے والا ہاتھ پاؤں ضرور مارتا ہے۔ روزِ اول سے کتنا سمجھایا تم سب کو۔ پیار سے، بھی سختی سے۔ شفقت سے، بھی بیزاری سے۔ بارہا کہا کہ اپنی یہ روش ترک کر دو لیکن تم لوگوں کو ماضی پرستی اور تعصب نے اندھا کر دیا ہے۔ تم ہنوز انہی سازشوں اور ہمیں نقصان پہنچانے کے درپے ہو۔ لہٰذا سزا تو یقینی ہے۔ اب مزید ڈھیل دینا خود کو ہلاکت میں ڈالنے کے مترادف ہے۔ میں تمہارا فیصلہ اپنے ان مسلمان بھائیوں پر چھوڑتا ہوں۔"

عروج کی بات مکمل ہوتے ہی درجن بھر بربری اٹھے اور ان اندلسیوں کے سروں سے عمامے کھینچ کر اتار دیے۔ نصر اور قہر کی زبانوں سے مغلظات کی بوچھاڑ برآمد ہوئی۔

"ملعونو! مسجد کا احترام ہی ملحوظِ خاطر رکھ لو۔" ایک بربری نے دانت پیسے۔ دیگر افراد نے بھی فوری طور پر ان سب کو عماموں سے ہی پھانسی دے دی۔

"ان کی لاشیں پی نن کے قلعے کے سامنے جہازوں پر لٹکا کر آلۂ نشرِ صوت سے اعلان کرو کہ بار بروسہ برادران کی تحریک کچلنے اور انہیں قیدی بنا کر اندلس بھیجنے کے خواب مکمل کرنے میں تمہارے سہولت کاروں کے بعد خود تمہارا بھی یہی انجام ہوگا۔" عروج نے سفاکی سے اپنے معتقدین

سے کہا۔

حکم کی تعمیل کر دی گئی۔ قلعہ دار جہازوں پر جھولتی لاشیں دیکھ کر ساکت ہو گیا۔ اس کے خواب حقیقتاً بہت بری طرح چکنا چور ہوئے تھے۔ اس نے ایک کشتی اندلس روانہ کر کے قاصد کے ذریعے موجودہ صورتِ حال سے آگاہ کرتے ہوئے کمک طلب کی۔ اس کی قسمت زوروں پر تھی کہ کشتی بار بروسہ برادران کی نظروں سے اوجھل رہ کر منزل تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئی۔ حکومت نے امیر البحر "ڈان ڈی گوڈی ویرا" کی سربراہی میں سات ہزار اندلسی عیسائی سپاہی روانہ کر دیے۔ بار بروسہ برادران کی ان سرگرمیوں نے حکومتی سطح پر کھلبلی پیدا کر دی تھی۔ انہیں اپنی سلامتی بھی خطرے میں دکھائی دینے لگی۔

ڈان ڈی گوڈی ویرا برق رفتاری سے اپنا بحری بیڑا لیے روانہ ہوا اور قلعہ پی نن کے سامنے اس طرح لنگر انداز ہو گیا کہ عروج پاشا کے جہاز قلعے اور ان جہازوں کے درمیان محصور ہو گئے۔ عروج نے صورتِ حال کی سنگینی کے پیشِ نظر فوری جنگی حکمتِ عملی تیار کی۔ اہلِ قلعہ کو برائے نام جنگ میں الجھا کر اصل ہدف بحری بیڑے کو بنایا گیا۔ اس کی مستعدی حسبِ سابق ہر خطرے سے بے نیاز ہو چکی تھی۔ وہ ایک چھوٹی سی کشتی پر سوار ہر جانب چکراتے ہوئے اپنے لشکر کو ہدایات دیتا رہا۔

یہ جنگ تقریباً تین گھنٹے جاری رہی۔ اس کے بعد عروج کی عقابی نظروں نے موسم میں در آنے والی تبدیلی فوری بھانپ لی۔ اندلسی جہازوں کی لنگر اندازی کے مقام پر ایک طوفان کی آمد متوقع تھی۔ وہ لمحہ فوری فیصلے کا متقاضی تھا۔ عروج نے اپنے بحری بیڑے کو مخصوص اشارہ دے کر روپوشی کا عندیہ دے دیا۔ گوڈی ویرا عروج کے اچانک غیاب پر حیران تھا۔ اس کی یہ حیرانی اگلے نصف گھنٹے میں ہی شدید پریشانی اور بوکھلاہٹ میں تبدیل ہو گئی۔ سمندر اچانک ہی سرکشی پر آمادہ دکھائی دینے لگا۔ موجیں اس قدر بلند تھیں کہ سطحِ آب پر جہاز تنکوں کے مانند اچھلتے دکھائی دینے لگے۔ اندلسی سپاہی بوکھلاہٹ کا شکار ہو گئے۔ وہ افرادی قوت سے لڑنے کے..... تو اہل تھے تاہم ایسے طوفان سے نبرد آزما ہونے کی قوت ان میں سے کسی کے پاس بھی نہیں تھی۔

گوڈی ویرا نے اپنی سپاہ کو ایک مخصوص سمت میں بڑھنے کا حکم دیا جہاں طوفان کا دباؤ نہ ہونے کے برابر تھا۔ سپاہیوں نے حکم کی تعمیل کی۔ زندگی اور سلامتی کی آس لیے پیش قدمی کرتی اس سپاہ کو اندازہ ہی نہیں تھا کہ عروج پاشا کسی عفریت کی طرح اسی سمت ان کا منتظر ہے۔ اس نے اندلسی بیڑے کو سنبھلنے کا موقع دیے بغیر سپاہیوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹ کر رکھ دیا۔ اگلے چار گھنٹے میں گوڈی ویرا کے سات ہزار سپاہی اپنی جانیں گنوا کر سمندر برد ہو چکے تھے جبکہ عروج کی سپاہ اور جہاز کسی بھی قسم کے نقصان سے محفوظ رہے۔

اس جنگ میں ہونے والے نقصانات نے پی نن کے قلعے میں صفِ ماتم بچھا دی تاہم وہ اندلس سے مزید کمک کی امید میں ہنوز بار بروسہ برادران کی تباہی کے خواب دیکھ رہے تھے۔ قلعہ خالی نہ کرنے کی ہٹ دھرمی بھی جوں کی توں برقرار تھی۔ ان کی امید بارآور ثابت ہوئی۔ افریقی ریاست "طلیس" کے عیسائی شہزادے نے براستہ خشکی الجزائر پر حملہ کر دیا۔ اس کا گمان تھا کہ گوڈی ویرا سے جنگ کے نتیجے میں عروج پاشا کے بحری بیڑے کو خاصا نقصان پہنچا ہوگا جس کے باعث وہ انہیں زیر کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔ شہزادے کی آرزوؤں کا محل بہت جلد زمین بوس ہو گیا۔ وہ عروج اور خیر الدین کی جنگی مہارت کا مقابلہ نہ کر سکا اور ہزیمت اٹھاتے ہوئے پہاڑوں میں روپوش ہو گیا۔ طلیس الجزائر کی حکومت کا حصہ بنا دیا گیا۔

ان پے در پے جنگوں کے بعد بار بروسہ برادران کی چوکسی میں کئی گنا اضافہ ہو گیا۔ انہوں نے بحری بیڑے میں مزید جہازوں کا اضافہ کیا۔ اندلس کے ساحلی شہروں میں گشت بڑھاتے ہوئے مسلمانوں کے انخلا میں اضافہ کیا۔ جبرالٹر کے سامنے سے گزرنے والے امریکا کے جہازوں پر غارت گری کی۔ ان جہازوں پر لدا قیمتی سامان نہایت مہارت سے اپنے گوداموں میں محفوظ کر لیا گیا۔

عیسائی دنیا میں ان متواتر نقصانات نے صفِ ماتم بچھا دی تھی۔ عیسائی حکمران کسی بھی قیمت پر ان دونوں بھائیوں کا خاتمہ کرنے کے درپے تھے۔ بارسلونا میں ایک نئی حکمتِ عملی تیار ہوئی اور الجزائر کے بجائے تلمسان کے درمیانی راستوں سے پیش قدمی کا فیصلہ کیا گیا۔ عروج پاشا سے یہ خبر پوشیدہ نہ رہ سکی۔ اندلس کے ساحلی علاقوں میں خفیہ طور پر گشت کرنے والے جہازوں سے اسے یہ اطلاع بروقت مل گئی۔ عروج نے اندلس سے نقل مکانی کر کے آنے والے نئے مسلمان خاندانوں کو بھی بحری اور بری جنگوں کی تربیت دینے کا آغاز کر دیا۔ اس کے لیے خوش آئند بات یہ بھی تھی کہ نصر، قہر اور ان کے ساتھیوں کو دی جانے والی سزا کے بعد اندلسیوں اور بربریوں میں اتحاد قائم ہو گیا تھا۔ اس

وقت مختلف کامیابیاں سمیٹتے عروج کے دل میں ایک ہی خلش پنہاں تھی کہ عیسائی دنیا ان کے مقابلے میں بے حد متحد تھی۔ ان کا روحانی پیشوا "پاپائے اعظم" بھی اس اتحاد کی بقا میں اہم کردار ادا کیا کرتا تھا۔ اس کے برعکس مسلمانوں میں ایسے اتحاد اور پیشوا کی کمی انہیں منتشر کیے ہوئے تھی۔ الجزائر اور اس کے گرد و نواح میں خیر الدین اور عروج کی بحری کارروائیاں اندلسیوں اور بربریوں کو بے حد حوصلہ و تقویت دے رہی تھیں لیکن اس کے باوجود عروج کی دلی خلش ہر گزرتے دن کے ساتھ بڑھتی ہی چلی گئی۔ مسلمانوں میں داخلی اتحاد ہنوز ناپید تھا۔ اس کے علاوہ پنیون کا قلعہ بھی تاحال دردِ سر تھا۔ یہاں مقیم اندلسی عیسائی عروج کی نقل و حرکت کی خبریں اپنی حکومت تک پہنچانے میں بالکل تاخیر نہ کرتے۔ قلعہ دار نے اپنی مرکزی حکومت پر بے حد دباؤ ڈالا کہ عروج اور خیر الدین کی سرکوبی نہ کی گئی تو وہ اس خطے سے عیسائیوں کا نام و نشان بالکل ہی مٹا دے گا۔ چارلس اس خط و کتابت اور اطلاعات سے مسلسل ذہنی دباؤ میں تھا۔ اسے مغربی مسیحی اقوام کے لیے باربروسہ برادران کی صورت میں ایک عفریت پروان چڑھتا محسوس ہو رہا تھا۔ اس کا وجدان مسلسل ایک ہی بات کا اشارہ دے رہا تھا کہ اگر اس عفریت کو اپنے قابو میں نہ کیا گیا تو مستقبل میں شدید نقصانات اٹھانے پڑیں گے۔ موجودہ جانی و مالی نقصانات سے بھی کہیں زیادہ اور کہیں بھیانک۔

قلعہ دار کی بھی دہائیاں بار آور ثابت ہوگئیں۔ چارلس پنجم نے "مارکوئیس کیمراس" کی قیادت میں پندرہ ہزار تربیت یافتہ اور تجربہ کار سپاہیوں پر مشتمل لشکر الجزائر روانہ کردیا۔

عروج پاشا کو اس لشکر کی آمد کی اطلاع تلمسان میں ملی۔ اس وقت عروج کے ہمراہ صرف ڈیڑھ ہزار سپاہ تھی۔ پندرہ ہزار لشکر کا مقابلہ کرنے کے لیے اس کا الجزائر پہنچنا ناگزیر تھا لیکن مسئلہ یہ بھی تھا کہ اس راستے میں دریا آتا تھا۔ عروج کے حوصلے بلند تھے۔ اسے یقین تھا کہ ایک بار دریا عبور کرتے ہی وہ مارکوئیس کیمراس پر قابو پانے میں کامیاب ہوجائے گا۔ عروج پاشا کو علم ہی کہاں تھا کہ اس وقت تقدیر اس کی معیت ترک کیے حوصلوں کی آزمائش کے لیے خندہ زن ہوچکی ہے۔

مسیحی سپاہ کے تعاقب کے باوجود عروج نے دریا عبور کرلیا۔ بدقسمتی ہم رکاب تھی۔ اس کی ڈیڑھ ہزار سپاہ دریا کے کنارے ہی پھنس گئی۔ مسیحیوں کے گھیرے میں آئی اس سپاہ کے لیے اب مقابلے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ دونوں افواج میں گھمسان کی جنگ شروع ہوگئی۔ دوسری سمت مارکوئیس کیمراس عروج کو ہاتھ سے نکلتے دیکھ کر سخت پریشان تھا۔ وہ کسی بھی لمحے اس آبی عقاب کے شکار کا موقع ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتا تھا۔ اس کے شیطانی دماغ میں ایک خیال برق کی طرح کوندا۔ اس نے اپنی سپاہ سے دریافت کیا۔

"تم میں سے کتنے افراد عربی اور بربری زبان مقامی لب و لہجے میں بول سکتے ہیں؟"

درجنوں سپاہی اثبات میں سر ہلاتے اس کے سامنے چلے آئے۔

"بہت خوب۔ خداوند یسوع مسیح نے تمہیں ایک سعادت فراہم کی ہے۔ اس موقع سے فائدہ اٹھالیا تو مسیحی دنیا سدا تمہاری مقروض رہے گی۔" وہ جوش سے کہنے لگا۔

"آپ حکم کیجیے۔ ہم اپنے خون کا آخری قطرہ بھی بہانے کے لیے تیار ہیں۔" سپاہیوں نے عزم سے جواب دیا۔

"تمہیں بہ آوازِ بلند مقامی لب و لہجے میں "العطش" (پیاس) اور "الغیاث" (کوئی ہے۔ ہماری مدد کرو) پکارنا ہے۔" مارکوئیس نے انہیں تحریک دی۔

مسیحی سپاہیوں نے اس کے حکم کی تعمیل کی اور نہایت دلدوز انداز میں العطش، الغیاث پکارنے لگے۔ دریا کے دوسرے کنارے موجود عروج پاشا کو ایسا محسوس ہوا کہ اس کے قدم زمین نے جکڑ لیے ہیں۔ وہ آگے بڑھنے سے قاصر تھا۔ ساتھیوں کی پکار دل چیرنے لگی۔ اس نے بلا سوچے سمجھے ایک فیصلہ کیا اور دوبارہ اسی کنارے پہنچ گیا۔ اس کے سپاہی کٹی پھٹی صورت میں ہر سو بکھرے تھے۔ بچے زخمی حالت میں ہنوز مزاحمت کا حق نبھا رہے تھے۔ عروج کو دیکھتے ہی مارکوئیس کیمراس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ اور آنکھوں میں چمک در آئی۔

"خوش آمدید عارت گر۔ خوش آمدید۔"

عروج آتشیں نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔ سپاہیوں کی لاشوں کی دید اس کے لیے صدمہ ثابت ہوئی تاہم اصل اعصابی جھٹکا تو ابھی باقی تھا۔ مارکوئیس کے اشارے پر چند سپاہی آگے بڑھے اور سابقہ انداز میں چلاتے ہوئے کہنے لگے۔

"العطش...... العطش...... الغیاث...... الغیاث......"

عروج کی رنگت متغیر ہوگئی۔ اسے اپنی عجلت اور عاقبت نااندیشی پر شدید تاؤ آیا۔ اس لمحے چھوٹے بھائی خیر الدین کی بھی شدت سے یاد آئی تھی جو اسے ایسے فوری

فیصلوں سے گریز کی التجا کیا کرتا تھا۔ اپنی بے بسی اور حماقت نے عروج پاشا پر دیوانگی طاری کردی۔ وہ ہتھیار سونت کر آگے بڑھا اور پوری قوت سے مارکوئیس پر حملہ آور ہوگیا۔ مارکوئیس نے بھی مکمل مہارت سے اس کا مقابلہ کیا۔ یہ دوبدو جنگ کافی دیر جاری رہی۔ انجام کار مارکوئیس عروج کی معذوری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس پر غالب آگیا۔ عروج اپنے بدن پر لگنے والے زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے زمین بوس ہوگیا۔ اس کے اکلوتے ہاتھ نے تلوار کا دستہ مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔ بے نور آنکھوں میں اپنے بھائی کی یاد اور مسلم قوم کے لیے سوچے گئے ادھورے منصوبوں کی خلش کرب بن کر نقش تھی۔

"مسیحی دنیا میرا یہ احسان کبھی نہیں بھولے گی۔ میں نے انہیں اس بحری عفریت سے نجات دلادی ہے۔ اب ہماری راہ میں کبھی کوئی دشمن نہیں آئے گا۔ میں نے مسلمانوں کی کمر توڑ دی ہے۔ اب وہ کبھی ہمارے سامنے کھڑے نہیں ہوسکیں گے۔" مارکوئیس دیوانہ وار قہقہے لگانے لگا۔

"محترم! کیا ہمیں الجزائر کی طرف پیش قدمی کرنی ہے؟" اس کے نائب نے دریافت کیا۔

"نہیں۔ وہاں اب کیا رکھا ہے؟ عروج پاشا مرچکا۔ اب یہ تحریک بھی اپنی موت خود ہی مرجائے گی۔ یہ جشن منانے کا وقت ہے۔ مسیحیوں کو دنیا پر غالب آنے میں اب کوئی طاقت نہیں روک سکتی۔ یہ دنیا ہمارے قدموں تلے ہوگی۔" وہ سرور میں تھا۔

"ان لاشوں کا کیا کرنا ہے؟" نائب نے بھی مسرور ہوکر دریافت کیا۔

"اس کے ساتھیوں کو اطلاع کردو کہ لاشیں اٹھا لیں۔ ویسے تو میری خواہش تھی کہ یہ چیل کوؤں کی خوراک بن جاتے لیکن ان کے ساتھیوں کے لیے یہ نظارہ زیادہ دردناک ہوگا۔" مارکوئیس نے سفاکی سے کہا۔

اس کے حکم کی بلاتوقف تعمیل کردی گئی۔

☆☆☆

خیر الدین دریا کے کنارے عروج پاشا کی لاش کے گرد موجود تھا۔ اس کے ہمراہ ایدالدین، رئیس الدین، ابرار بربری اور داؤد بھی موجود تھے۔ ان کی آنکھوں میں آتشیں آنسو تھے۔ عروج کی رحلت نے ان پر غم کا پہاڑ ڈھا دیا تھا۔

"کاش! امیر نے ہماری بات مان لی ہوتی۔ ایک بار ہمیں اس جنگ کی اطلاع بھجوا دیتے۔ ہم اپنی پوری سپاہ لیے ان کی مدد کو چلے آتے۔" ایدالدین نے تاسف سے کہا۔

"مجھے ہمیشہ سے ایسی ہی کسی بات کا خدشہ تھا۔ جنگ کا ذکر ہوتے ہی وہ ہر احتیاط فراموش کردیا کرتے تھے۔" خیر الدین گھٹنوں کے بل عروج کے پاس بیٹھ گیا۔

"یہ نقصان ناقابلِ تلافی ہے۔ ہم امیر کے بغیر کیا کریں گے؟" ابرار بھی شکستہ تھا۔

"ہم اس نقصان کے بدلے عیسائیوں کو صدیوں تک یاد رہنے والے زخم لگائیں گے۔ عروج پاشا کے تشنہ خوابوں کی تکمیل کریں گے۔" خیر الدین پُرعزم تھا۔ "میں اپنے بھائی کی شہادت کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ عیسائی حکمرانوں کا جینا دوبھر کردوں گا۔ انہیں ایک لمحے کے لیے بھی سکون کا سانس میسر نہیں ہوگا۔"

عروج کا جسدِ خاکی نہایت عزت سے سپردِ خاک کردیا گیا۔ خیر الدین کا صدمہ بے بہا تھا۔ اس جنگ میں وہ اپنے تینوں بھائیوں سے محروم ہوگیا تھا اور ستم ظریفی یہ تھی کہ جن کے لیے عروج پاشا ہمہ وقت اپنی جان ہتھیلی پر لیے پھرتا رہا وہی مسلم ریاستیں اب ان سے بے نیاز دکھائی دے رہی تھیں۔ کسی چھوٹی سے چھوٹی مسلم ریاست نے بھی افسوس کا اظہار نہیں کیا تھا۔ خیر الدین کو ان ریاستی سربراہان سے ایسی ہی کم ظرفی کی امید تھی۔

ان حالات و واقعات کو دیکھتے ہوئے خیر الدین نے سلطنتِ عثمانیہ کے حکمران سلیم سے دوبارہ رابطے کا فیصلہ کیا اور دو قاصد استنبول روانہ کردیے۔ سلطان سلیم کے وزیر خاص پیری پاشا نے گرم جوشی سے ان کا استقبال کیا اور سلطان کو باربروسہ برادران کے سبھی کارناموں، جد و جہد سے آگاہ کرکے ان سے ملاقات کے لیے قائل کرلیا۔ سلطان نے قاصدین کو اپنے پاس طلب کیا۔ انہوں نے خیر الدین کی ہدایات پر تعظیم بجالاتے ہوئے سلطان سے کہا۔

"سلطانِ معظم! آپ نے مرحوم عروج پاشا کو مراعات نوازیں۔ اس کمک سے ہم نے افریقا کے سبھی مفتوح علاقے سلطنتِ عثمانیہ میں شامل کردیے۔ اس وقت بھی ہم خیر الدین باربروسہ کی جانب سے حلفِ اطاعت اور عہدِ وفاداری پیش کرنے آئے ہیں۔ مستقبل میں فتوحات سے ملنے والی خراج کی رقم بھی آپ کو ادا کی جائے گی۔"

سلطان سلیم اس پیشکش پر بہت خوش ہوا۔ اس نے خیر الدین کے لیے پروانہ صوبیداری، گھوڑے کی دموں والا پرچم، صوبیداری کی مہر کے علاوہ ایک خصوصی خط بھی روانہ کیا۔ اس خط میں باربروسہ برادران کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے سیکڑوں ترکوں کے الجزائر میں رہائش

اختیار کرنے کا عندیہ دیا۔ اس نے قسطنطنیہ میں بھی یہ اعلان کروا دیا کہ الجزائر میں رہائش کے خواہش مند افراد کو وہاں بسنے کے لیے تمام تر سہولیات فراہم کی جائیں گی۔ خیر الدین کو ینی چری کا ایک دستہ اور توپ خانہ بھی نواز کر بارود بنانے کی ترکیب سے بھی آگاہ کیا گیا تاکہ وہ بارود سازی میں خود کفیل ہو سکے۔ ان مراعات کے علاوہ اپنے لیے "امیر البحر" اور "پاشا" کا خطاب بھی خیر الدین کا حوصلہ مہمیز کرنے کے لیے بہت اہم ثابت ہوئے۔

خیر الدین اور سلطنتِ عثمانیہ کے الحاق کی یہ خبر مسیحی حکمرانوں پر ہی نہیں بلکہ جاہ طلب اور منافق مسلم سرداروں پر بھی برق بن کر گری۔ عروج کی شہادت کے بعد خیر الدین کے وجود کو بے مصرف سمجھنے والے افراد کے لیے یہ شدید لمحۂ فکریہ تھا۔

الجزائر کے اندلسی تسلط شدہ علاقوں کے حکمران "مون کیڈ" نے ان سبھی ہم نواؤں کو اپنے پاس طلب کرلیا۔ قلعہ پی نن سے ڈان مارٹن، تیونس سے حسان، تلمسان سے ابو حمو اور چند دوغلے قبائل کے سردار اس ملاقات میں خاصے پریشان نظر آئے۔ وہ الجزائر کے مفتوحہ علاقے دوبارہ اپنے تسلط میں کرنے کے لیے بے تاب تھے۔ انہوں نے باہمی صلاح مشورے سے چارلس کے دربار میں قاصد بھیجنے کا فیصلہ کیا تاکہ اندلس سے آنے والی کمک اور دیگر جنگی اسباب جزیرہ پی نن کے کماندار ڈان مارٹن کی زیرِ نگرانی رکھا جائے۔ بوقتِ ضرورت یہ سامان افریقی ساحلوں پر منتقل کر دیا جاتا۔ وہ پُرامید تھے کہ خیر الدین بار بروسہ بھی اپنے بھائیوں کی طرح بہت جلد انجام تک پہنچ جائے گا۔

☆☆☆

سلطان سلیم یاوز کی جانب سے ملنے والی امداد اور بارود بنانے کی ترکیب سے آگاہی خیر الدین کے لیے نعمتِ غیر مترقبہ سے کم نہ تھی۔ اب تک بحیرۂ روم کی سطح پر ہونے والی جنگوں میں ایران، ہنگری اور آسٹریا ایسی مہلک ہتھیار استعمال کر رہے تھے۔ عروج اور خیر الدین کے پاس اب تک اسی مواد کی کمی تھی۔ عروج کا خیال آتے ہی خیر الدین کی آنکھیں جلنے لگتیں۔ اپنے سبھی بھائیوں سے محرومی نے اس کا دل بے حد گداز کر دیا تھا۔ کچھ ہی روز گزرے تھے کہ ابد الدین، صالح الدین، داؤد اور ابرار بربری اس سے ملاقات کے لیے چلے آئے۔ انہوں نے خیر الدین سے ایک بار پھر عروج کی تعزیت کی، اپنائیت کا احساس دلایا اور اسے گزشتہ کچھ عرصے میں ہونے والی کارروائیوں کے علاوہ موصول شدہ اطلاعات سے آگاہ کرنے لگے۔

"اندلس اور بربر کے امن پسند مسلمان جنگ و جدل سے دور رہنا چاہتے ہیں امیر!" ابرار نے بتایا۔

"انہیں ساحلی علاقوں سے اندرونی حصوں میں منتقل کر دو۔ ان کے معاملات کی براہِ راست خود نگرانی کرو۔ ان کے ساتھ وہیں قیام کرو تاکہ ان کے مسائل جلد از جلد حل کیے جاسکیں۔" خیر الدین نے اسے حکم دیا۔

"میرے چچا منذر بھی بے حد مسائل کا شکار ہیں امیر! ان کی طرف بھی خصوصی توجہ کیجیے۔" داؤد نے التجا کی۔

"اس نے اندلسی امراء کی بابت اطلاع دے کر مجھے بہت متاثر کیا تھا۔ اس کا یہ احسان مجھ پر بہرحال برقرار رہے گا۔" وہ ممنونیت سے کہنے لگا۔

"ان کی یہی ہمت آج گناہ بنا دی گئی ہے۔" داؤد افسردگی سے کہنے لگا۔ "پہلے پہل تو یہاں یہ خبریں گردش کرتی رہیں کہ عروج پاشا کی وفات دراصل اندلسی امراء کی بے گناہ موت کا قدرت کی جانب سے انتقام ہے۔"

"اس کا مطلب ہے کہ نصر اور طہر کی باقیات اب بھی کہیں نہ کہیں موجود ہیں۔" خیر الدین نے گہری سانس لی۔

"جی ہاں۔ ان لوگوں کو کہیں سے یہ بھنک مل گئی ہے کہ اس سازش کا انکشاف منذر چچا نے ہی کیا تھا۔ وہ ان سے حقارت و نفرت کا برتاؤ کرتے ہیں۔ چچا کی کمزور قوتِ ارادی کا بھی آپ کو علم ہی ہے۔"

"ہاں۔ اچھی طرح علم ہے۔" خیر الدین نے تاسف سے سر جھکایا۔ "وہ یقینی طور پر یہ سوچ رہا ہوگا کہ اندلسی امراء کی سازشوں کا انکشاف کر کے اس نے زیادتی کر دی ہے اور اب اسی زیادتی کے تناظر میں وہ اپنے انجام سے خوف زدہ ہو رہا ہوگا۔"

"جی ہاں۔ ایسا ہی کچھ سمجھ لیجیے۔" ابد الدین کہنے لگا۔ "مجھے تو یہ بھی علم ہوا ہے کہ عیسیٰ اور منذر اکثر دل کے پھپھولے پھوڑتے نظر آتے ہیں۔ تیونس سے شاہی ملازمت ترک کر کے یہاں آنے کا فیصلہ بھی اپنی حماقت قرار دیتے ہیں۔ عیسیٰ نے عروج پاشا کی شہادت کے متعلق تھیوڈومیر اور ٹیٹو کو بھی آگاہ کر دیا ہے۔ ان کا ردِعمل دیکھ کر میرا دل چاہ رہا تھا کہ زندہ ہی زمین میں گاڑ دوں۔"

"منذر کی ذہنی کیفیت واقعی بہت مخدوش ہے۔ اس شخص نے ہم پر بروقت احسان کیا۔ اس سے قطع نظر وہ ایک پیشہ ور ماہر بھی ہے۔ اسے کرگھوں سے ہٹانا اپنی صنعت کے لیے شدید نقصان کا باعث ہوگا۔ میرا فیصلہ بہرحال یہی ہے

کہ اس کی شادی خاموشی سے مریم ہی سے کروا دی جائے۔ عیسیٰ کو بھی اس کی بھنک نہ ملے تو بہتر ہے۔"

"ہمارے لیے مزید کیا حکم ہے امیر؟" داؤد نے اپنے دل میں اٹھتی ٹیس پر قابو پاتے ہوئے پوچھا۔

"تم خضر اور عیسیٰ کے ساتھ جہازوں پر نگرانی کا کام جاری رکھو۔"

"جیسا آپ کا حکم امیر! میں ہر معاملے میں آپ کا ساتھ دینے کے لیے تیار ہوں۔" اس نے آنکھوں کی نمی چھپانے کے لیے سرِ تسلیم خم کیا۔

"میری ایک تجویز ہے امیر!" ابد الدین نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

"جو بھی کہنا ہے کھل کر کہو۔ میں سنجیدگی سے سن رہا ہوں۔" خیر الدین نے کہا۔

"ہم اندلس سے مسلمانوں کے انخلا میں باقاعدہ تنظیم کیوں نہیں پیدا کر لیتے؟ آپ مناسب سمجھیں تو ہم میں سے چند مخصوص افراد کی نگرانی میں یہ کام مستقل طور پر سونپ دیجیے تاکہ آپ کا بار بھی ہلکا ہو سکے۔"

"یہ تجویز میں نے بھی کئی بار دی تھی۔ اب واقعی اس پر عمل درآمد کرنے کا وقت ہے۔" اس نے عروج کو یاد کرتے ہوئے افسردگی سے کہا۔ اپنے بھائی سے محرومی کے بعد وہ ناقابلِ برداشت حد تک درشت اور چڑچڑا ہو گیا تھا۔ اپنے معاملات میں کسی کی دخل اندازی تو درکنار کسی کو بھی ان معاملات سے آگاہ بھی نہ ہونے دیتا۔

"امیر! آپ خود کو کبھی کسی مقام پر تنہا نہ پائیے گا۔ ہم عروج پاشا، الیاس اور اسحاق کا خلا تو ختم نہیں کر سکتے لیکن اپنے خلوص و اتحاد سے آپ کو برادرانہ رفاقت کی کہیں کسی موڑ پر کمی محسوس نہیں ہونے دیں گے۔"

صالح الدین کے اس خلوص پر خیر الدین کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ اس لمحے اسے احساس ہوا کہ یہ سبھی افراد عروج کی زندگی میں اس کے مزاج کے باعث خاصے دب کر رہتے تھے۔ اب ان کی صلاحیتیں کھل کر سامنے آرہی تھیں۔ اس انکشاف کے باوجود اسے بڑے بھائی کی کمی شدید کھلتی۔ تن تنہا فیصلے ابتدائی طور پر بے حد مشکل ثابت ہو رہے تھے۔ خیر الدین کو اندازہ ہو رہا تھا کہ اپنے مزاج کی آمریت، بے نیازی اور درشتی کے باوجود عروج کی ذات کس قدر باعثِ تقویت تھی۔

"میں آپ کی شہادت اور ہمارے نقصانِ عظیم کے ذمے داران سے بھرپور انتقام لوں گا۔ انہیں نشانِ عبرت بنا دوں گا۔ عیسائی حکمرانوں اور ان کے مسلم سہولت کاروں کو روئے ارض پر کہیں بھی پناہ نہیں ملے گی۔ جو لوگ یہ سمجھ رہے ہیں کہ آپ کی شہادت کے بعد یہ تحریک اپنی موت آپ مر جائے گی انہیں بھرپور انداز میں بتاؤں گا کہ آپ کا تربیت یافتہ "خیر الدین" ابھی زندہ ہے۔ وہ آپ کے خواب کبھی مردہ نہیں ہونے دے گا۔ آپ کی ہر خلش ختم کر دے گا۔" وہ پُرعزم تھا۔

☆☆☆

خیر الدین نے عروج کے سبھی معاملات دھیرے دھیرے اپنے ہاتھ میں لے لیے۔ کچھ ہی روز گزرے تھے کہ اوری ولہ سے ایک وفد اس کے پاس چلا آیا۔ یہ وفد اوری ولہ کے تاجروں اور پادری کے ایما پر وہاں آیا تھا۔ طویل عرصے تک تھیوڈومیر اور ٹیٹو کو مردہ سمجھنے والے پادری کو کسی عیسائی نے آگاہ کیا تھا کہ ان دونوں بھائیوں کو بار بروسہ برادران کے جہاز پر چپو برداری کرتے دیکھا گیا ہے۔ تاجروں نے پادری کے ایما پر رقم اکٹھی کر کے انہیں دونوں کی رہائی کے لیے وہاں بھیجا تھا۔

"وہ میرے قیدی ہیں۔ میں انہیں آزاد کرنے یا قید رکھنے میں خود مختار ہوں۔" خیر الدین نے رکھائی سے کہا۔

"یہ جنگی اصولوں کی خلاف ورزی ہے۔" وفد کے سربراہ نے احتجاج کیا۔

"کیا تم کسی اصول یا ضابطے سے واقف بھی ہو؟" وہ تلخی سے بولا۔

سربراہ کھسیا کر رہ گیا۔ اس سے کوئی جواب بن نہ پڑا تھا۔

"تم لوگوں نے اب تک اندلس میں جو مظالم روا رکھے ہیں یہ اسی کا ردِعمل ہے اور ان مظالم کا تو عشرِ عشیر بھی نہیں۔"

"اگر آپ چاہیں تو ہم تاوان کی رقم میں اضافہ بھی کر سکتے ہیں۔ آپ منہ مانگے تاوان کا مطالبہ کر لیجیے۔" سربراہ نے ترغیب دی۔

"میں نے جو کہہ دیا وہ فیصلہ اٹل ہے۔ میرے قیدی آزاد نہیں کیے جائیں گے۔" وہ دو ٹوک انداز میں کہنے لگا۔ "ہاں۔ صرف اتنی رعایت کر سکتا ہوں کہ تمہیں اپنے ساتھ ہم وطنوں سے ایک ملاقات کی اجازت دے دوں۔"

وفد کے اراکین دل مسوس کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ خیر الدین کے حکم پر انہیں ٹیٹو اور تھیوڈومیر کے پاس پہنچا دیا گیا۔ ٹیٹو کی زخمی کمر دیکھ کر سبھی اراکین بوکھلا کر رہ گئے۔ زنجیر کی بندش سے کمر کے زخم اس قدر بگڑ چکے تھے کہ ہر وقت خون اور پانی رِسا کرتا۔

"کیا سے کیا ہو گئی ہماری زندگی بھی۔" میلڈ نے اوری ولد کے شب و روز یاد کر کے آہ بھری۔
"فکر نہ کرو۔ ہم تمہیں ہر قیمت پر آزاد کروا لیں گے۔" سربراہ نے یقین دلایا۔
"میں ان لوگوں کے ساتھ کئی ماہ سے رہ رہا ہوں۔ یہ بہت منظم انداز میں سفر کرتے ہیں۔ ان کا عملہ مخلص اور وفادار ہے۔ تم انہیں آسانی سے رہائی نہیں دلوا سکو گے۔" حمیدو دمیر کہنے لگا۔
"لیکن ہم تمہیں اس طرح چھوڑ بھی تو نہیں سکتے۔ کسی نہ کسی طرح تو آزاد کروانا ہے نا۔" وہ جھنجلایا۔
"اس کا صرف ایک ہی طریقہ ہے۔ ہمارے جہاز پر کئی حملہ آور ہوں اور مسلمانوں کو شکست دے کر قابض ہو جائیں۔ اس وقت ہم آزاد ہو کر مسلمانوں سے یہ خلاصی کروا لیں گے۔ پھر کوڑا ہمارے ہاتھ میں ہوگا۔ ہر ایک ضرب کا گن گن کر بدلہ لوں گا۔" میلڈ نے دانت پیسے۔
"تمہاری یہ تجویز دل کو لگتی ہے۔ ہسپانوی قوم کی خوش قسمتی ہے کہ ہمیں چارلس پنجم جیسا حکمران نصیب ہوا ہے۔ وہ دلیر ہی نہیں، جانباز بھی ہے۔ ہم بادشاہ تک یہ اطلاع پہنچا دیں گے۔ تم دیکھنا جلد ہی الجزائر کے جہازوں کا محاصرہ کر لیا جائے گا۔ پھر تمہاری راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں رہے گی۔" سربراہ نے سرگوشی میں بتایا۔
اسی اثنا میں خیر الدین بھی وہاں چلا آیا۔
"امید ہے اب تک کوئی نہ کوئی بھرپور سازش تیار کر لی ہوگی۔"
اس کے طنز پر میلڈ اور حمیدو دمیر دونوں ہی گڑبڑا گئے۔
"خیر، تم دونوں کو میں رہائی دے سکتا ہوں بشرطیکہ تمہارے عوض پچاس مسلمان خاندان ہمارے حوالے کر دیے جائیں۔" اس نے سنجیدگی سے کہا۔
"یہ کیسی شرط ہے؟ پچاس خاندانوں میں افراد کی تعداد بے شمار ہوگی۔ ہم ان دونوں کے عوض ایک سو اندلسی مسلمان آپ کے حوالے کرنے کے لیے تیار ہیں۔" سربراہ ہڑبڑایا۔
"نہیں۔ پچاس اندلسی خاندان۔ منظور ہے تو بتاؤ۔ ورنہ رخصت ہو جاؤ۔"
خیر الدین کی صاف گوئی اور دوٹوک انداز سے وفد کا ہر رکن مضطرب ہونے لگا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ ان کی بے بسی سے محظوظ ہو رہا ہے۔ قیدیوں کو رہا کرنے کا فیصلہ تو وہ پہلے ہی کر چکا تھا۔
"آپ کے ہاں قیدیوں کے ساتھ ایسا برتاؤ کیا جاتا ہے کیا؟ ان دونوں کی کمر لہولہان ہے۔ انسانیت کا کچھ تو خیال کر لیجیے۔" سربراہ نے اپنی حیثیت جتانے کے لیے اسے جتایا اور خود ہی اپنے دام میں پھنس گیا۔
"انسانیت و اخلاقیات کے درس ایسے لوگوں کی زبان سے اچھے نہیں لگتے جو اپنے ہم مذہبوں کے ساتھ مسلمانوں کو زندہ ہی نذر آتش کر چکے ہوں۔" وہ متانت سے کہنے لگا۔
وفد کے معاملات سے نمٹتے ہی وہ دیگر امور پر بھی بھرپور توجہ دینے لگا۔ لشکر جنگ کے لیے ہر وقت چوکس رہنے لگا۔ اس کے علاوہ جہازوں کی تیاری پر بھی خصوصی نظر رکھی جانے لگی۔ لکڑی کا استعمال خیر الدین کے معائنے اور اجازت سے ہی ہوتا تاکہ کسی بھی مقام پر خام یا دیمک زدہ مواد استعمال نہ ہو سکے۔ اس کے ذہن میں ایک تفصیلی منصوبہ پروان چڑھ رہا تھا۔ اس نے اندلسی وفد کے روانہ ہوتے ہی اپنے دو جہاز ان کے عقب میں روانہ کر دیے تاکہ انکاسیہ سے گفتگو کے دوران وہ بلنسیہ کے ساحل سے مسلمان خاندانوں کو بچا کر لا سکیں۔ ایک جہاز پر ایدالدین، خضر اور داؤد جبکہ دوسرے پر رئیس الدین اور عیسیٰ سوار تھے۔ اندلسیوں کو ان بربری جہازوں کا تعاقب محسوس ہوا تو وہ لوٹ مار کے خطرے سے خوفزدہ ہو گئے تاہم یہ دونوں جہاز مشرق کی جانب مڑ گئے۔ ایدالدین اور رئیس الدین کی یہ حکمت عملی کامیاب رہی۔ اندلسی پرسکون ہو کر یہ سوچنے لگے کہ مسلمانوں کے جہاز جبرالٹر کی جانب کسی مال بردار جہاز کے شکار کے لیے روانہ ہوئے ہیں۔
ان دونوں نے برق رفتاری سے اپنے اقدامات جاری رکھے۔ انہوں نے بلنسیہ سے تین میل کی مسافت پر جہاز روک دیے۔ ارادہ یہی تھا کہ تاریکی میں ساحل پر اتر کر مقامی مسلمانوں سے ملاقات کی جائے گی۔ عیسائی خاندانوں کو البتہ قیدی بنا کر الجزائر منتقل کر کے بیگار لی جاتی یا ان کے عوض تاوان وصول کر کے رہا بھی کیا جا سکتا تھا۔
بلنسیہ کے انتخاب کی وجہ یہ تھی کہ یہاں مسلمانوں کی آبادی کا تناسب دیگر علاقوں کی نسبت بہت زیادہ تھا۔ حیران کن امر تو یہ تھا کہ عیسائی بھی اسلامی رنگ میں ہی ڈھلے تھے۔ عربی اس قدر روانی سے بولی جاتی کہ اندلس کی عیسائی حکومت کو غلبے کے بعد یہاں مسیحی تعلیمات عام کرنے کے لیے انجیل کا عربی زبان میں ترجمہ کرنا پڑا۔ خیر الدین نے یہاں بھیجے گئے افراد کا انتخاب بھی سوچ سمجھ کر کیا تھا۔ داؤد، خضر، عیسیٰ، ایدالدین اور رئیس الدین کے لیے عربی زبان کی بول چال اور مقامی ماحول میں ڈھلنا بالکل مشکل نہیں تھا۔ داؤد اور عیسیٰ تو

عیسائیوں کے رسم و رواج سے بھی اچھی طرح واقف تھے۔
رئیس الدین نے عیسیٰ جبکہ ایدالدین نے داؤد اور خضر کی ہمراہی اختیار کی۔ ان کی منزل بلنسیہ کا شمالی حصہ تھی۔
عیسیٰ اس سفر کے لیے کافی پرجوش تھا۔ وہ رئیس الدین کی تجربہ کاری اور متانت سے بھی کافی متاثر ہو رہا تھا۔
"تم نے یہی علاقہ کیوں منتخب کیا ہے؟" عیسیٰ نے دریافت کیا۔
"یہاں البغیرہ نامی ایک جھیل ہے۔ قرب و جوار کی آبادی میں مسلمان اکثریت میں ہیں۔" اس نے بتایا۔
"لیکن میری معلومات کے مطابق مسلمان اور عیسائی اس قدر گھل مل کر رہتے ہیں کہ ان کی انفرادی شناخت ہی ممکن نہیں۔ پھر ہمیں کیسے علم ہوگا کہ مسلم گھرانے کون سے ہیں؟"
"ایک نشانی سے پہچانا جا سکتا ہے۔ مسلمان اپنے مکانوں میں سنہری اور سفید روغنی اینٹوں کا استعمال کرتے ہیں۔ برج اور نصف مدور دروازے یا کھڑکیاں بھی ہوتی ہیں۔ حوض اور نالیاں تعمیر کر کے چھوٹے باغات میں پانی نالیوں کے ذریعے پہنچایا جاتا ہے۔"
یہی باتیں کرتے ہوئے وہ دونوں ایک گھر کے دروازے تک چلے آئے۔ رئیس الدین کی دستک پر ادھیڑ عمر شخص نے دروازہ کھول دیا۔ رئیس الدین علیک سلیک کے بعد شائستگی سے کہنے لگا۔
"میں طلیطلہ سے آیا ہوں۔ محترم! سامانِ تجارت فروخت کرنا چاہتا تھا لیکن موسم کی خرابی سے مزید سفر جاری رکھنا ممکن ہی نہیں۔ امکان یہی ہے کہ ایک ہفتے تک موسم میں بہتری کے کوئی آثار نہیں۔ ہمارے ملاح، خلاصی اور خدمت گار ساحل پر لنگر انداز جہاز اور مال کی نگرانی کر رہے ہیں۔ ہم دونوں علاقے کا جائزہ لینے آئے ہیں۔ اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو یہاں قیام کی اجازت دے دیجیے۔"
"آپ ایک صاحبِ ثروت تاجر دکھائی دیتے ہیں۔ میں غریب اور کم حیثیت شخص ہوں۔ خاطر خواہ مہمان نوازی نہیں کر سکوں گا۔" ادھیڑ عمر شخص نے بظاہر سادگی سے کہا تاہم اس کی نظروں میں احتیاط اور شک کی پرچھائیاں لرزاں تھیں۔
"اچھا... تو پھر آپ ہمارے مہمان بن جائیے۔" رئیس الدین نے مسکرا کر کہا۔ "ہمیں صرف رہائش کے لیے جگہ درکار ہے۔ جتنا عرصہ رہیں گے طعام کے اخراجات خود اٹھائیں گے۔"
"مجھے منظور ہے۔"
ادھیڑ عمر شخص انہیں مکان کے اندر ایک کمرے میں لے آیا۔ اس کے انداز و اطوار میں احتیاط بڑھنے لگی تھی۔
"اب سکون سے بتاؤ کہ کہاں سے آئے ہو اور کیا ارادے ہیں؟ طلیطلہ سے نہیں آئے تم۔ تمہاری اور ان کی زبان و لہجے میں بہت فرق ہے۔" اس نے رئیس الدین کی آنکھوں میں جھانکا۔
"یہ فرق شاید آپ کو اس لیے محسوس ہوا ہے کہ میں نسلاً تیونس سے تعلق رکھتا ہوں۔ تجارت کے سلسلے میں سالہا سال سے طلیطلہ میں مقیم ہوں۔" اس نے گڑبڑانے کے باوجود خود کو سنبھال لیا۔
"میں نے تمہارا معاملہ خدا کے سپرد کر کے اپنا مہمان بنایا ہے۔ مجھ غریب کے گھر میں لوٹ مار کے لیے تمہیں کچھ بھی نہیں ملے گا۔ میری بیٹیاں عیسائیوں نے یرغمال بنا رکھی ہیں۔ جرم صرف اتنا ہے کہ ان کا دادا عیسائی تھا۔ بیٹوں کو بھی ترکِ اسلام کے لیے مجبور کیا جا رہا ہے۔ مجھے بے بسی کے عالم میں یہاں اس لیے تنہا چھوڑ دیا گیا ہے کہ بوڑھی نسل سے نسل بھی آگے نہیں بڑھ سکتی۔ خیر، تم لوگ بیٹھو۔ میں کھانے پینے کا بندوبست کرتا ہوں کچھ۔" وہ گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کے اٹھ کھڑا ہوا۔
اس کے کمرے سے نکلتے ہی عیسیٰ نے گہری سانس بھری اور آنکھوں سے نمی صاف کرتے ہوئے بولا۔
"ایسا محسوس ہو رہا ہے وقت ایک بار پھر خود کو دہرا رہا ہے۔ اس بوڑھے کی جگہ اپنے ایمان کی حفاظت میں ہلکان سالومن کی جھلک دکھائی دے رہی ہے۔ وقت ایک بار پھر وہی کہانی دہرا رہا ہے۔ وہی کردار، وہی اذیت اور اسی طرح مسیحائی کے لیے آئے ہم لوگ۔"
"اندلس کے ہر گھر میں تمہیں ایسی ہی کہانی ملے گی۔ اب علم نہیں ایدالدین، داؤد اور خضر کو کن کرداروں سے واسطہ پڑا ہوگا۔" وہ متفکر تھا۔

☆☆☆

ایدالدین اپنے دونوں ساتھیوں کے ہمراہ ایک ایسی بستی میں موجود تھا جہاں مسلمان اکثریت میں تھے۔ اس بستی میں انجیر کے ایک باغ میں کچھ لوگوں کو مصروف دیکھ کر وہ اسی جانب بڑھ گئے۔
باغ میں رونق عروج پر تھی۔ مختلف عمر کے مرد و زن لیمو... مہندی کے درختوں اور جھاڑیوں کی صفائی کر رہے تھے۔ انہیں دیکھتے ہی دو عمر رسیدہ افراد نے روک لیا۔ نقوش میں شباہت سے عیاں تھا کہ وہ دونوں بھائی ہیں۔

"یہاں اجنبی معلوم ہوتے ہو؟" استفسار ہوا۔
"جی ہاں۔ ہم تینوں ہی اس علاقے سے تعلق نہیں رکھتے۔ میرے ساتھی اوریِ ولہ اور قرطبہ سے آئے ہیں۔ میں الجزائر کا باشندہ ہوں۔" ایدالدین نے بتایا۔
"مسلمان ہو یا عیسائی؟" ایک شخص نے سراسیمگی سے دریافت کیا۔
الجزائر کا حوالہ انہیں بوکھلانے کے لیے کافی تھا۔ اندلس میں مقیم عیسائی اس علاقے کو اپنا دشمن سمجھتے تھے۔
"الحمدللہ! مسلمان ہیں۔ باربروسہ برادران کے قریبی ساتھی ہیں۔" ایدالدین نے صاف گوئی سے کہا۔
اس کی یہ بات ان دونوں کے لیے دھماکا ثابت ہوئی۔ ان کے چہرے متغیر ہوگئے۔
"آہستہ بولو جوان! ایسے نام لینا سراسر خطرہ ہے۔ یہاں کی فضائیں بھی باربروسہ برادران سے خائف ہیں۔" ایک شخص نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔
"میں یہاں مزید نہیں ٹھہر سکتا۔ بھائی ابوالحسن ہی تم سے بات کریں گے۔" دوسرے شخص نے عجلت میں کہا اور ایک جانب بڑھ گیا۔
"آپ مسلمان ہوکر بھی باربروسہ برادران سے خوفزدہ ہیں۔ وہ تو آپ لوگوں کے لیے نجات دہندہ ہیں۔ عروج پاشا نے اندلسی مسلمانوں کی خاطر ہی اپنی جان دے دی۔ خیرالدین اپنے بھائی کی مہم آگے بڑھا رہا ہے۔" ایدالدین نے افسردگی سے کہا۔
"ٹھیک کہہ رہے ہو تم۔ میں پہلے اپنا تعارف کروا دوں۔ میرا نام ابوالحسن ہے اور وہ میرا بھائی یوسف ہے۔ ہم نسلاً عرب اور طویل عرصے سے بلنسیہ میں مقیم ہیں۔ باغ میں موجود یہ سبھی نوجوان میرے بیٹے، پوتے اور نواسے ہیں۔ یوسف البتہ لاولد ہے۔ اس نے شادی ہی نہیں کی۔ تمہاری یہاں آمد سے مجھے اندازہ ہوگیا ہے کہ ہمیں اس علاقے سے لے جانے کے لیے آئے ہو۔"
"اگر تم لوگ یہاں خود کو خوش، محفوظ اور مطمئن سمجھتے ہو تو ہمیں کیا ضرورت ہے تمہیں یہاں سے لے جانے کی۔" داؤد نے کہا۔
"خوش...... محفوظ...... مطمئن...... ان الفاظ و کیفیات سے تو ایک مدت سے ناآشنا ہیں۔" وہ افسردہ ہوا۔
"ہجرت کے بارے میں کیا خیال ہے؟ اگر پُرسکون زندگی درکار ہے تو تھوڑی سی ہمت دکھاؤ اور یہاں سے نکل چلو۔ اگر نہیں تو ہمیں اپنے مسلمانوں کا پتا بتادو جو یہ علاقہ چھوڑنے کے لیے راضی ہوں۔" ایدالدین نے نرمی سے کہا۔
"ہجرت آسان کہاں ہوتی ہے؟" ابوالحسن مزید افسردہ ہوا۔ "بلنسیہ کے رہائشی متفرق جذبات میں گھرے ہوئے ہیں۔ ایک طرف یہ آرزو کرتے رہے ہیں کہ مرسیہ اور اوریِ ولہ کی طرح باربروسہ برادران یہاں سے بھی مسلمانوں کا انخلا کروائیں۔ دوسری جانب اپنا مال و متاع یہاں چھوڑ جانے اور الجزائر میں بے سروسامانی کے خوف سے متذبذب ہونے لگتے ہیں۔ ان سب سے قطع نظر نئی نسل کے مسائل و نظریات بالکل ہی ناقابلِ برداشت ہیں۔ یہ لوگ سالہا سال سے عیسائی آبادی کے ساتھ رہتے گرجا میں جانے کے عادی بھی ہوگئے ہیں۔ نوجوان لڑکیاں تو کافی مضبوط قوتِ ارادی کی مالک ہیں۔ ان کے عقائد اب بھی پختہ ہیں لیکن لڑکے اپنے مدار سے بھٹکنے لگے ہیں۔ ان کے نظریات ہی تبدیل ہورہے ہیں۔ کہتے ہیں بین المذاہب شادیوں میں کوئی حرج نہیں۔ ان کی حمیت کا تو یہ عالم ہے کہ یہاں تک کہنے لگے ہیں صدیوں تک مسلمانوں نے عیسائیوں پر حکومت کی ہے۔ اب اگر عیسائی ان پر غالب آگئے ہیں تو احتجاج یا بغاوت کے بجائے اس حقیقت کو تسلیم کرلیا جائے۔ زندگی کو کیوں مشکل بنایا جارہا ہے؟"
"الجزائر اور باربروسہ برادران کی جدوجہد کے متعلق کیا گمان ہے ان کا؟" جعفر نے استفسار کیا۔
"وقت اور توانائی کا زیاں کہتے ہیں وہ اسے۔ کہتے ہیں چارلس پنجم اس قدر طاقتور ہے کہ بارسلونا میں رہ کر دور دور تک عیسائی ملکوں پر حکومت کررہا ہے۔ اسے شکست دینا الجزائر جیسے چھوٹے ملک کے لیے کیسے ممکن ہوسکتا ہے؟"
ابوالحسن کے انکشافات نے انہیں گنگ ہی کردیا۔ عیسائیت ذہنوں کو اس حد تک مفلوج کرچکی تھی کہ انہیں حق و باطل میں تمیز ہی بھول گئی تھی۔ ابوالحسن ان کی مہمان نوازی کے لیے کچھ بندوبست کرنے اٹھا تو ایک نوجوان ان کے پاس چلا آیا۔ اس کی پیشانی شکن آلود اور چہرے کے عضلات تنے ہوئے تھے۔
"میں نے تمہاری گفتگو سن لی ہے۔ تمہارے بارے میں یہی سن رکھا ہے کہ جہاں بھی جاتے ہو وہاں کسی نہ کسی طرح تباہی برپا ہوجاتی ہے۔ اب ہمارے ان نادان بزرگوں کو بہکانے چلے آئے ہو۔ یہ علاقہ ہماری جنت ہے۔ ہم یہاں بے حد خوش ہیں۔ اس پُرسکون زندگی کو برباد کرنے کی کوشش کی تو میں تمہیں عبرت کا نشان بنادوں گا۔" اس نے دھمکایا۔

"ارے واہ! تم تو بہت بہادر نوجوان ہو۔ نام کیا ہے تمہارا؟" ایدالدین تمسخر سے کہنے لگا۔
"مومن۔" وہ سینہ تان کر بولا۔
ایدالدین اس ستم ظریفی پر مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ نام کے برعکس اس کا کردار کیسے روپ میں سامنے آرہا تھا۔ اس کی کیفیات سے بے خبر مومن تکبر سے دریافت کرنے لگا۔
"مسلمانوں کو الجزائر یا افریقا لے جاکر تمہیں یا تمہارے گروہ کو کیا حاصل ہوتا ہے آخر؟"
"مادی منافع کی بات کررہے ہو تو بے شک رتی بھر بھی نہیں ہوتا۔ ہم یہ کام صرف اپنے مسلمان بھائیوں کی مدد اور فلاح کے لیے کرتے ہیں۔" ایدالدین نے نرمی سے جواب دیا۔
"ہم بلنسیہ میں بہت خوش ہیں۔ یہ خطہ جنت نظیر ہے۔" مومن نے مزید تیور دکھائے۔
"یہاں مسلمانوں کا ایمان سخت خطرے میں ہے۔ بہتر یہی ہے کہ نقل مکانی کرلو۔" ایدالدین نے سمجھانا چاہا۔
"ایمان ہر ایک کا ذاتی مسئلہ ہے۔ تم لوگ خدائی فوجدار کیوں بن رہے ہو؟" وہ بھڑک گیا۔ "اگر تم نے ہمارے معاملات میں دخل اندازی کی مزید کوشش کی تو میں تمہیں بھی گرفتار بھی کروا سکتا ہوں۔"
"ٹھیک ہے۔ جیسے تمہاری مرضی۔" ایدالدین کو بھی غصہ آنے لگا۔ "لیکن تم ان مسلمانوں کے معاملات میں دخل اندازی نہیں کروگے جو یہاں سے جانے کے خواہش مند ہیں۔"
مومن اس مطالبے پر لمحاتی طور پر متذبذب ہوا پھر اسی کروفر سے بولا۔
"اگر کسی کو خود ہی کنوئیں میں گرنے کا شوق ہے تو ہم کیا کرسکتے ہیں۔ تمہیں جو کرنا ہے کرو لیکن اس باغ میں نہیں رہوگے۔ اپنا ٹھکانا کہیں اور کرلو۔"
مومن کی اس بات اور تیوروں سے ایدالدین کو شدید اہانت محسوس ہوئی تاہم اس نے ضبط کرتے ہوئے تحمل سے کہا۔
"مجھے کچھ مہلت درکار ہے تاکہ ہم اپنا کوئی بندوبست کرسکیں۔"
"ایک دن کی مہلت مل سکتی ہے۔ بس اس کے بعد تمہاری رہائی کی بالکل کوئی ضمانت نہیں رہے گی۔" مومن اسے دھمکاتا ہوا لوٹ گیا۔
داؤد اور جعفر نے تشویش سے ایدالدین کو دیکھا۔
"یہ صورتِ حال اچھی نہیں ہے۔" داؤد کہنے لگا۔
"مجھے لگتا ہے کہ ہم نے ابوالحسن پر بہت جلد اعتماد کرلیا ہے۔ کیا علم وہ ہمیں دھوکا دے جائے۔ مومن کی نیت بھی خوفزدہ دکھائی دے رہی ہے۔"
"فکر نہ کرو۔ میں نے سوچ سمجھ کر ہی یہ داؤ کھیلا ہے۔ اگر کسی نے بھی کوئی خطرہ بننے کی کوشش کی تو میں اسے قتل کردوں گا۔" وہ سفاکی سے بولا اور پھر خاموشی سے باغ میں موجود افراد کا جائزہ لینے لگا۔
کچھ ہی دیر گزری تھی کہ ابوالحسن دوبارہ ان کے پاس چلا آیا۔ ایدالدین نے اسے مومن کی آمد اور گفتگو سے آگاہ کردیا۔ ابوالحسن کے چہرے پر تاسف در آیا۔
"آہ...... ہماری نوجوان نسل کس سمت چل پڑی ہے۔ اس راہ کی مسافت آخر کیا ہوگی؟ ہر جانب ترغیب اور حرص کا جال بچھا ہے۔ دشمن اس قدر کم ظرف ہے کہ اپنی لڑکیوں کو بھی چارے کے طور پر استعمال کررہا ہے۔"
"ہمارے لیے کسی ٹھکانے کا بندوبست کردو تو ممنون رہیں گے۔"
"ممنون تو میں رہوں گا محترم!" ابوالحسن نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ "آپ کسی طرح میری اولاد کو الجزائر پہنچا دیں۔ مومن انہیں گمراہی کے دہانے پر دھکیل رہا ہے بلکہ مومن کو بھی یہاں سے لے جائیے۔ آپ کے لیے رہائش کا بندوبست بھی کردیتا ہوں۔ یہاں بے شمار گھرانے ایسے ہیں جو الجزائر جانے کے لیے بے تاب ہیں۔ وہ بسر و چشم آپ کو اپنے ہاں ٹھہرالیں گے۔"
"جیسے تم مناسب سمجھو۔ بس ہماری روپوشی کا خیال رکھنا۔" ابوالحسن نے انہیں دلاسا دیا اور ایک کشتی ساز خاندان کے حوالے کردیا۔
افرادِ خانہ کشتیوں کے ذریعے سامان کی باربرداری کرتے تھے۔ اپنے پیشے کے حوالے سے انہیں بہت سے عیسائی جوانوں سے بھی شناسائی تھی جو ذاتی کشتیوں کے مالک ہونے کے ساتھ کشتی ساز بھی تھے۔
اگلے تین روز بے حد مصروف گزرے۔ ایدالدین نے سیکڑوں مسلمانوں کو الجزائر منتقلی کے لیے آمادہ کرلیا۔ اس نے اپنی شیریں بیانی سے عیسائی ملاحوں کو غیر معمولی اجرت کا لالچ دے کر اس بات کے لیے آمادہ کرلیا کہ بلنسیہ کے کچھ خاندان جزائر میورقہ تک پہنچا دیں۔ بلنسیہ کے شمال مشرق میں واقع یہ جزیرہ چارلس پنجم کے زیرِ تسلط تھا۔ ایدالدین نے پانچ بڑی کشتیاں کرائے پر لے کر نقل مکانی کرنے والے افراد کو ان پر بٹھادیا۔

پانچویں روز تک معاملات میں مزید تیزی پیدا ہوگئی۔ رئیس الدین اور عیسیٰ تلاشِ بسیار کے بعد ابدالدین سے ملاقات کے لیے چلے آئے۔ دونوں نے ایک دوسرے کو اپنی مصروفیات اور کامیابیوں سے آگاہ کیا اور مزید صلاح مشورے سے فیصلہ ہوا کہ بلنسیہ کے صاحبِ ثروت افراد بطور یرغمالی ابدالدین کے جہاز پر لے جائیں گے۔ ان کی رہائی کے عوض ملنے والی رقم سے جہاز سازی کو مزید فروغ دیا جاتا۔

اگلے روز ابدالدین نے کئی خاندان مخصوص گاڑیوں پر سوار کیے تاکہ انہیں ساحل پر پہنچایا جاسکے۔ یہ کام ابتدائی مراحل میں ہی تھا کہ طیش زدہ مومن اس کے پاس چلا آیا۔

"میرے بہن بھائی کہاں ہیں؟" اس نے آتے ہی جارحانہ انداز میں دریافت کیا۔

"مجھے کیا علم ہو؟" ابدالدین نے بے نیازی سے کندھے اچکائے۔

"مجھے علم تھا کہ تم لوگوں کی یہاں موجودگی کوئی نہ کوئی گل ضرور کھلائے گی۔ میرا وہ بے وقوف باپ اور احمق چچا بھی اس سازش میں شریک ہیں۔" وہ بھڑک گیا۔

"یہ گاڑیاں تمہارے سامنے موجود ہیں۔ جاؤ اور تلاشی لے لو۔ اگر تمہارے بہن بھائی برآمد ہوتے ہیں تو جو چاہو سزا دے لینا۔" وہ سکون سے بولا۔ "اپنے اطمینان کے لیے چاہو تو ہمارے جہاز کی تلاشی بھی لے لو۔"

مومن اسے غصے سے گھورتا ہوا آگے بڑھا اور ہر ایک سواری کی تلاشی لینے لگا۔ اسے اپنے خاندان کا کوئی بھی فرد دکھائی نہ دیا۔ وہ جھنجلایا ہوا ابدالدین کے پاس آیا اور کہنے لگا۔

"میں تم سے آخری بار پوچھ رہا ہوں، مجھے میرے بہن بھائیوں کا پتا بتادو ورنہ انجام اچھا نہیں ہوگا۔ میں بلنسیہ کے حاکم کو تمہاری یہاں موجودگی کے بارے میں بتادوں گا۔ تم لوگ جانے اندلس میں ناسور بن کر کیوں چلے آئے ہو؟ پھانسی دلواؤں گا میں تمہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ یہ شوق بھی پورا کرلے لیکن ان سب کو یہاں سے جانے دے۔" اس کی بے نیازی برقرار تھی۔

مومن اسے گھورتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

"یہ آپ نے کیا کیا؟" داؤد پریشان ہوا۔

"یہی بہتر تھا۔ مومن جیسے ہی مجھے اپنے ساتھ لے جائے تم لوگ جہاز اور کشتیاں لے کر مجورقہ کی طرف چلے جانا۔ میں کسی نہ کسی طرح وہاں پہنچ جاؤں گا۔" ابدالدین کے حتمی انداز پر داؤد اور خضر مزید بحث نہ کر سکے۔

شام سے قبل مومن اسے اپنے گھر لے گیا۔ ابوالحسن اور یوسف بھی وہیں موجود تھے۔

"اس بھلے آدمی کو کیوں یہاں لے آئے ہو؟" یوسف نے کہا۔

"یہ آدمی سب کچھ ہوسکتا ہے لیکن بھلا ہرگز نہیں۔ اس نے میرے ہی بہن بھائی غائب کیے ہیں۔ آپ کو اندازہ بھی ہے کہ ہم کس قدر تباہی سے دوچار ہونے والے ہیں۔ بلنسیہ کے حاکم نے اپنے بھانجوں کے لیے ہماری بچیوں کا رشتہ طلب کیا ہوا تھا اور مجھ سے اپنی بھانجی کا عقد کرنا چاہتا تھا۔ سب کچھ تباہ ہوگیا۔ میں اسے کیا جواب دوں گا؟" مومن اپنے بال نوچنے لگا۔

"اپنی اولاد کو میں نے خود ایک محفوظ مقام پر منتقل کیا ہے۔ ان کا پتا تمہیں کہیں سے نہ ملے گا۔" ابوالحسن نے جواب دیا۔

"اوہ، مجھے تو پہلے ہی یقین تھا کہ سب آپ کی ملی بھگت سے ہوا ہے۔" مومن نے بے قابو ہوکر ابدالدین کا گریبان پکڑ لیا اور گھسیٹتے ہوئے ایک کمرے میں مقفل کردیا۔

"اگر کسی نے اسے یہاں سے باہر نکالا تو بہت برا ہوگا۔" وہ دھمکاتے ہوئے خود دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

ابوالحسن نے کچھ دیر انتظار کیا اور اس کی گہری نیند ہوتے ہی ابدالدین کا کمرا غیر مقفل کردیا۔

"چلے جاؤ یہاں سے۔ ورنہ میرا سرکش بیٹا تمہیں حاکم کے حوالے کردے گا۔"

"بہتر ہوتا کہ آپ بھی چلتے میرے ساتھ۔" اس نے خلوص سے کہا۔

"نہیں بیٹا! ساری زندگی اس سرزمین میں بسر کی ہے۔ اب آخری عمر میں یہاں سے جانے کا حوصلہ نہیں ہے۔" یوسف نے افسردگی سے کہا۔

"اگر ممکن ہو تو مومن کو بھی یہاں سے لے جاؤ۔" ابوالحسن کی آنکھوں میں آنسو چمکے۔ "یہاں رہا تو بے دین ہوکر کسی عیسائی لڑکی سے شادی کرلے گا۔ ہماری نسل میں کفر کی ملاوٹ کردے گا۔"

اسی گفتگو میں وقت بیتتا رہا۔ صبح سے کچھ ہی دیر پہلے رئیس الدین اور عیسیٰ وہاں سے چلے آئے۔ "داؤد اور خضر تمہارے بارے میں بہت تشویش مند ہیں۔ جہاز روانگی کے لیے تیار ہیں۔ صرف تمہارا انتظار کیا جارہا ہے۔" رئیس الدین کہنے لگا۔

"ایک چھوٹا سا کام درپیش ہے۔ اس کے بعد ہم روانہ ہوجائیں گے۔" وہ مستعدی تیزی سے بولا۔

اسی اثنا میں مومن بھی بیدار ہوکر باہر چلا آیا۔ ابدالدین کو وہاں کھڑے دیکھ کر وہ سیخ پا ہوگیا۔ رئیس الدین اور عیسیٰ پر نظر پڑتے ہی وہ چونک گیا۔

"اب یہ دونوں کون ہیں؟ یہاں کیا کررہے ہیں؟" اس نے ابوالحسن سے دریافت کیا۔

اس کے کچھ بھی کہنے سے قبل ابدالدین نے کہا۔

"نئے عیسائی اور بلحاظ پیشہ مچھیرے ہیں۔ جھیل البغیرہ کے قریب کسی مکان میں چند نوجوان لڑکے اور لڑکیاں مقید دیکھے گئے ہیں۔ ان میں سے ہی کسی قیدی نے اسے یہاں کا پتا دے کر یہ اطلاع بھجوائی ہے کہ انہیں الجزائر روانگی سے بچایا جائے۔"

"کیسے حلیے تھے ان قیدیوں کے؟" مومن چونکا۔

"یہ تو مجھے علم نہیں۔ مکان مکمل تاریک اور مقفل تھا۔" رئیس الدین کے اس جواب پر مومن ایک بار پھر چونک گیا۔

"تمہارا لب و لہجہ مقامی نہیں ہے۔ کون ہو تم؟"

اس صورتِ حال میں عیسیٰ کے لیے خاموش رہنا ممکن ہی نہ تھا۔ وہ اندلس کے مقامی لب و لہجے سے بخوبی واقف تھا۔ اس نے متانت سے مومن کو جواب دیا۔

"میرے بابا دراصل طنجہ کے رہائشی ہیں۔ اسی لیے وہیں کا انداز گفتگو اپنا لیا ہے۔"

اس جواب اور عیسیٰ کے پُراعتماد انداز سے وہ خاموش ہوگیا۔

"جھیل البغیرہ یہاں سے کافی مسافت پر ہے۔ میں اپنے دوستوں کو ہمراہ لے لیتا ہوں۔"

مومن عجلت میں باہر روانہ ہوا اور کچھ ہی دیر میں اپنے دو عیسائی دوستوں کو وہاں لے آیا۔

"چلو اب۔ دیکھ لیتے ہیں کہ وہاں قیدی افراد کون ہیں؟" وہ مزید عجلت زدہ دکھائی دینے لگا۔

ابوالحسن نے نم آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے اسے بے اختیار گلے لگالیا۔

"پروردگار تجھے دنیا اور آخرت میں ہر کامیابی سے سرفراز فرمائے۔"

"میرا خیال ہے کہ صورتِ حال خطرناک بھی ہوسکتی ہے۔ فوجی دستہ ساتھ لیے چلتے ہیں۔" مومن کے ایک عیسائی دوست نے کہا۔

لاعلمی

ایک صاحب اپنی بیوی کے بارے میں اپنے دوست کو بتا رہے تھے۔

"شادی سے پہلے یہ تو مجھے معلوم تھا کہ اس کے باپ نے اسے اسکول کا منہ نہیں دیکھنے دیا۔ مجھے یہ شادی کے بعد ہی پتا چلا کہ اس کی ماں نے کبھی اسے باورچی خانے کا منہ بھی دیکھنے نہیں دیا۔"

قابلِ غور

☆ غم کا علاج مصروفیت ہے۔

☆ سب سے بڑی غلطی، اپنی غلطیوں سے بے خبر رہنا ہے۔

☆ رشتے جب اذیت کے سوا کچھ نہ دیں تو ان سے کنارہ کشی ہی بہتر ہے۔ خواہ وقتی ہی سہی۔

☆ جھوٹی انا ہمیں ان لوگوں سے بھی دور کردیتی ہے جو بہت عزیز ہوتے ہیں۔

☆ انسان سے ہمدردی انسانی زندگی کی علامت ہے۔

☆ آرزو نصف زندگی ہے اور بے حسی نصف موت۔

☆☆☆

ہری مرچیں

☆ عورتیں مردوں کی طرح ترقی نہیں کرسکتیں کیونکہ وہ مشورہ دینے والی اس نعمت سے محروم ہوتی ہیں جسے بیوی کہا جاتا ہے۔

☆ ماہر نفسیات اور بیوی دونوں ایک ہی قسم کے سوالات پوچھتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ماہر نفسیات رقم وصول کرتا ہے اور بیوی کو کوئی معاوضہ نہیں دینا پڑتا۔

☆ بہت سی لڑکیاں بہترین بیوی ثابت ہوسکتی ہیں بشرطیکہ وہ شوہروں کو بہترین بنانے کی کوشش نہ کریں۔

(مرسلہ: محمد انور ندیم۔ حویلی لکھا، اوکاڑہ)

"میں نے اپنے چند رشتے دار وہاں تعینات کر رکھے ہیں۔ معاملے کو طول دینے کے بجائے اسے جلد از جلد کسی انجام تک پہنچاؤ۔" رئیس الدین نے کوفت کا مظاہرہ کیا۔

مومن نے روانگی کے لیے آمادگی ظاہر کردی۔ شب کی تاریکی ابھی غالب تھی۔ کچھ دور جاتے ہی مومن کا دوست ٹھٹک گیا۔

"یہ راستہ جبل البسقیرہ کی طرف نہیں جاتا۔ مجھے کچھ گڑبڑ محسوس ہو رہی ہے۔"

"گڑبڑ خود تمہاری سوچ میں ہے۔" رئیس الدین نے غصے سے کہا۔ "میں اسی راستے سے گزر کر یہاں آیا ہوں۔"

مومن نے بحث سے گریز کرتے ہوئے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور سفر جاری رکھا۔ کچھ دور جاتے ہی رئیس الدین نے عیسیٰ کو مخصوص اشارہ کیا۔ اس نے گھوڑے کی رفتار ہلکی کی اور ان کے عقب سے راستہ تبدیل کرلیا۔

"تمہیں سمندر کا شور سنائی نہیں دے رہا مومن؟" دوسرے دوست نے چونک کر کہا۔ "مجھے شدید گڑبڑ محسوس ہو رہی ہے۔ ہمارے ساتھ دھوکا ہوا ہے۔"

"ہاں، وہ دیکھو۔ جہاز کی روشنیاں بھی ہیں۔" پہلے دوست نے ایک جانب اشارہ کیا۔

رئیس الدین نے گھوڑے کی رفتار تیز کردی۔ وہ ان کے سوالات کے جواب نہیں دینا چاہتا تھا۔ اسی اثنا میں عیسیٰ دوبارہ سے نمودار ہوگیا۔ اس کے ہمراہ درجن بھر الجزائری نوجوان تھے۔

"یہ سب کیا ہے آخر؟ ہمارے ساتھ دھوکا کیا گیا ہے۔" مومن چلایا۔

رئیس الدین نے اس کی چیخ پکار پر بالکل کان نہ دھرے۔ الجزائری نوجوانوں نے ان تینوں سے ہتھیاروں کے زور پر تلواریں واپس لیں اور گھسیٹتے ہوئے ایک جہاز پر لے گئے۔ گھوڑے بھی ایک خالی کشتی میں سوار کردیے گئے۔ کرائے پر حاصل کی گئی کشتیاں جہازوں سے آگے رکھی گئیں۔

سفر کا آغاز ہوا۔ مومن اور دونوں عیسائی اس صورت حال پر سخت بوکھلائے ہوئے تھے۔ انہیں اپنے اردگرد الجزائری جوان دکھائی دے رہے تھے۔ ان کے علاوہ اندلسی وضع قطع کے افراد بھی تھے۔ ان کے چہروں پر بیک وقت اطمینان اور حزن کی جھلک تھی۔ ہر طرف ایک پراسرار سی خاموشی تھی۔ کچھ مسافت طے ہوتے ہی کشتیوں کے عیسائی ملاحوں کو آگاہ کردیا گیا کہ ان کی منزل مجورقہ کے بجائے الجزائر ہے۔ ہر جانب ایک چیخ پکار برپا ہوگئی۔

"مومن! تم نے ہمارے ساتھ دھوکا کیا ہے۔" پیٹر نے غصے سے کہا۔

"نہیں، خدا کی قسم مجھے خود بھی کسی بات کا علم نہیں تھا۔" وہ بلبلایا۔

"میری والدہ تو بہت صدمہ لے گی۔ والد کے بعد میں ہی تو ان کا سہارا ہوں۔" ولیم نے بین کیا۔

اسی دوران اید الدین بھی اس جہاز پر چلا آیا۔ وہ مومن اور دونوں عیسائیوں کی آہ و بکا سے بہت محظوظ ہوا۔

"مجھے پہلے ہی سمجھ جانا چاہیے تھا کہ یہ سب تیری ہی سازش ہے۔" مومن نے نفرت سے اسے دیکھا۔ "لیکن میرے ان دوستوں کا کیا قصور تھا؟ انہیں یہاں کیوں لایا گیا ہے؟"

"چپو چلانے کا کام کریں گے یہ دونوں۔ فکر نہ کرو۔" اید الدین نے اسے پچکارا۔

"یہ ظلم ہے۔ ہمارا قصور کیا تھا؟" پیٹر چلایا۔

"یہ صرف ایک ردعمل ہے۔ اس ظلم کا ردعمل جو تمہارے ہم مذہبوں نے اندلسی مسلمانوں پر روا رکھے ہوئے ہیں۔ ہم نے تو پھر بھی بہت شریفانہ اطوار روا رکھے ہیں عیسائیوں کے ساتھ۔" اس نے نہایت سکون سے جواب دیا۔ "اب چیخو، چلاؤ یا جو مرضی کرو۔ یہی تمہارا مستقبل ہے اور یہیں تمہیں رہنا ہے۔"

سفر کا اختتام بلی نن کی بندرگاہ سے ایک میل دور مغربی سمت الجزائر کی بندرگاہ پر ہوا۔ اس بندرگاہ پر جشن کا سا سماں تھا۔ خیر الدین بھی ان کے استقبال کے لیے وہاں موجود تھا۔

"خوش آمدید میرے بھائیو! خوش آمدید۔" اس نے بازو پھیلاتے ہوئے کہا۔ "امید ہے سفر بخیر رہا ہوگا۔"

"ہم آپ کے بہت ممنون ہیں۔ آپ ہمارے لیے نجات دہندہ ثابت ہوئے ہیں۔ ہم نے وہاں بہت دردناک زندگی بسر کی ہے۔" ایک شخص نے اسے دیکھتے ہی رونا شروع کردیا۔

"پریشان نہ ہو میرے بھائی! دردناک وقت بیت چکا ہے۔ اب بدلے کا وقت ہے۔ ہم ان کے ظلم کا بھرپور حساب لیں گے۔" خیر الدین نے جذباتی انداز میں کہا۔

اس کے اعتماد و عزم نے ہر نو وارد کو بے پناہ حوصلہ عطا کیا۔ خیر الدین کی ہدایات پر انہیں شہر کے باہر آباد کردیا گیا۔ عیسائیوں کے ذمے جہاز سازی کے کارخانے میں امور تفویض ہوئے۔ کرائے پر لائی کشتیاں بحری بیڑے میں شامل کرلی گئیں۔ ٹیٹو اور تھیوڈومیر پر یہ خبر برق بن کر

گری۔ ان کے ارمان ایک بار پھر بری طرح چکنا چور ہوگئے تھے۔

☆☆☆

بلنسیہ کی کامیاب مہم کے بعد خیر الدین نے اید الدین، رئیس الدین اور مہم میں شامل سبھی ساتھیوں کی دل کھول کر پذیرائی کی۔ وہ لاشعوری طور پر عروج کے سبھی معمولات سے گریز کر رہا تھا۔ کچھ روز بعد اس نے اید الدین کو دوبارہ اپنے پاس طلب کرلیا۔ اید الدین وقتی طور پر بوکھلاہٹ کا شکار ہوگیا۔ ابتدا میں ذہن میں یہی خدشہ بیدار ہوا کہ اس سے کہیں کوئی خطا سرزد نہ ہوگئی ہو۔ وہ متذبذب سی کیفیت میں خیر الدین کے پاس چلا آیا۔

"خوش آمدید میرے عزیز! میں تمہارا ہی منتظر تھا۔" وہ خوش دلی سے کہنے لگا۔

"میرے لیے سعادت ہے امیر!" وہ سینے پر ہاتھ رکھ کے جھکا۔

"بلیرک نامی جزائر کے بارے میں کیا جانتے ہو؟" اس نے گفتگو کا آغاز کیا۔

"بحیرۂ روم میں یہ جزیرے مسلمانوں کے مسکن ہیں۔ اندلسی مسلمان یہاں منتقل ہوگئے ہیں۔ بلیرک کا قدیم نام "بلیار" تھا۔ آبادی ہتھیار سازی کی صنعت کے لیے مشہور ہے۔" وہ اتنا کہہ کر خاموش ہوگیا۔

"بالکل درست...... اور تمہارے خیال میں بلیار اس قدر پُرامن علاقہ کیوں رہا ہے؟" خیر الدین نے معنی خیزی سے دریافت کیا۔

"امیر! جہاں تک میری رائے ہے یہ ہتھیار سازی ہی انہیں اب تک محفوظ رکھے ہوئے ہے۔ اندلس کے عیسائی اور افریقا کے بربری چھاپا مار اسی لیے ان سے گریز کرتے آئے ہیں کیونکہ دونوں ہی فریقین کو اپنا دبدبہ برقرار رکھنے کے لیے ان سے ہتھیاروں کی خریداری کرنی ہوتی ہے۔"

"اور گزشتہ چوبیس، پچیس برس میں مسلمانوں کا اندلس سے نام و نشان ختم کرنے والے عیسائی اب انہی مسلمانوں کو نقل مکانی سے کیوں روک رہے ہیں؟" اس نے ایک اور ذومعنی سوال کیا۔

"کیونکہ انہیں اندازہ ہوگیا ہے کہ مسلمانوں کے انخلا سے وہ صنعتی اور معاشرتی طور پر نقصان اٹھا رہے ہیں۔ ہنرمندی کے اعتبار سے مقامی عیسائی مسلمانوں کی گرد بھی نہیں پا سکے۔" اید الدین نے اپنا تجزیہ بتایا۔

"اور اگر ہم ان ہنرمندوں کو افریقا میں منتقل کرنا شروع کردیں تو؟" خیر الدین نے اصل مدعا بیان کیا۔

اید الدین جوش سے اچھل ہی پڑا۔

"بہت زبردست خیال ہے امیر! اس سے ہم دہرا فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ یہ اندلسی مسلمان اپنے علاقے کے دولت مندوں اور مختلف صنعتوں کے متعلق بھی معلومات فراہم کرسکتے ہیں۔"

"مجھے حاصل ہونے والی معلومات کے مطابق اندلسی حکومت نے ایک ایسا قانون نافذ کیا ہے جس کے مطابق مسلمان کسی دوسرے علاقے میں منتقل نہیں ہوسکتے۔ باشعور مسلمانوں نے البتہ درمیانی راہ نکال لی ہے۔ وہ مشرقی ساحلوں کے مقابل جزائر کا رخ کر رہے ہیں۔ یہی وہ علاقے ہیں جہاں یہ قانون نافذ نہیں ہوتا۔"

"آپ کی معلومات درست ہیں امیر! لیکن یہ کام اتنا آسان بھی بہرحال نہیں ہے۔" اس نے صاف گوئی سے کہا۔

"ہماری زندگی میں آسان تو کچھ بھی نہیں ملے گا اید الدین! ہمیں اپنے راستے ہر صورت میں خود تلاشنے ہوں گے۔" خیر الدین نے ہر ایک لفظ پر زور دیا۔

"میں ہر ایک لمحہ آپ کے ساتھ ہوں امیر! ہر موڑ پر آپ کا ساتھ نبھاؤں گا۔" وہ بھی پُرعزم تھا۔

خیر الدین کے ہونٹوں پر جاندار مسکراہٹ رینگ گئی۔ وہ اید الدین کو مہم سے متعلق جزئیات اور اپنی حکمت عملی سے آگاہ کرنے لگا۔ شمالی سمت درپیش اس مہم کے لیے اید الدین پہلے جنوبی سمت روانہ ہوتا اور وہاں اندلسی مسلمانوں کی نو آبادیوں سے معلومات حاصل کرتا کہ مجورقہ بلیار میں کون سے افراد منتقل ہوچکے ہیں۔ دوسرے مرحلے میں وہ انہی خاندانوں کے کچھ لوگ اپنے ہمراہ لے جاتا تاکہ وہاں مددگار ثابت ہوسکیں۔ اید الدین نے اگلے چند ہی روز میں مطلوبہ لوگ تلاش کرلیے۔ خیر الدین اس کی کارکردگی اور رفتار سے بہت خوش تھا۔ اس نے مہم کے لیے جلد از جلد تیاری مکمل کرنے کا حکم دے دیا۔

"امیر! اگر آپ اجازت دیں تو میں داؤد اور جعفر کے علاوہ بلنسیہ کے مومن کو بھی ساتھ لے جانا چاہوں گا۔" اس نے اپنا مطالبہ پیش کیا۔

"مومن کی سرکشی تمہارے لیے مسائل بڑھا سکتی ہے۔" خیر الدین نے تنبیہ کی۔

"اس سرکشی کا علاج کرنے تو لے جانا ہے اسے۔ وہ ذاتی طور پر اندلسی عیسائیوں کا مطیع بن چکا ہے۔ انہیں مسلمانوں سے برتر سمجھتا ہے۔ میں اسے دکھاؤں گا کہ

مسلمان اپنے ایمان اور جذبے کی قوت سے ان عیسائیوں کو خاک میں ملانے کی صلاحیت رکھتے تھے۔"

"مناسب خیال ہے۔" خیرالدین کسی بھی اچھی تجویز کو سراہنے میں بخل سے کام نہیں لیتا تھا۔ "تیمو اور تھیلا دیر کو بھی ہمراہ لے لو تا کہ ان کے کس بل بھی اچھی طرح نکل جائیں۔"

اید الدین نے سرِ تسلیم خم کر دیا۔

اس مہم کی تیاریاں برق رفتاری سے مکمل کی گئیں۔ اید الدین نے عیسائی جنگ برداروں پر مستعد، بے رحم اور سفاک کوڑا بردار تعینات کیے۔ کسی بھی ممکنہ ناکامی کی صورت میں جنگ چھڑنے کا خدشہ بھی اپنی جگہ برقرار تھا لہٰذا دس زائد جہاز بھی سفر میں شامل کیے گئے۔ ان جہازوں پر تین کس ملاح' ایک مسلمان سپاہی' جنگ بردار اور جنگجو سوار تھے۔ ان جہازوں کی الجزائر کی بندرگاہ میں تیاریاں پنون کے قلعہ دار کی نیند حرام کرنے لگی۔ اسے یہ خدشہ لاحق ہو گیا تھا کہ خیر الدین ایک بار پھر اس قلعے کا محاصرہ کروا رہا ہے۔ اس نے اپنی فوج کو مستعد رہنے کا حکم جاری کر دیا۔ قلعے میں شدید اضطراب در آیا تھا۔ ان کے خوف و خدشات سے بے نیاز اید الدین تیاریوں کو اختتامی روپ دیتا رہا۔ ایک روز داؤد اس سے ملاقات کے لیے چلا آیا۔

"کیا بات ہے نوجوان؟ کوئی خاص کام ہے کیا؟"

"ایک عرض کرنی ہے آپ سے۔ مجھے جب سے علم ہوا ہے ہماری نئی مہم جزائر بلیرک سے تعلق رکھتی ہے، میرے ذہن میں ایک ہی سوچ دستک دے رہی ہے۔ ان جزائر میں مجورقہ اور یابسہ نامی جزائر بھی تو ہیں۔ وہاں اوری ولرے کچھ خاندان منتقل ہوئے تھے۔ وہ ہمارے لیے کافی کارآمد ثابت ہو سکتے ہیں۔"

"کیا تو انہیں پہچان لے گا جوان؟" اس نے حیرانی سے پوچھا۔

"ہم اس پیشے کے دائرۂ عمل میں انہیں تلاش کر لیں گے۔ اگر میرے چچا منتظر ہمراہ رہیں تو پھر یہ تلاش جلد ممکن ہو جائے گی۔"

"منتظر تو اپنی شادی کے بعد گھر کا ہی ہو کر رہ گیا ہے۔ وہ نئی نویلی دلہن کو چھوڑ کر ہمارے ساتھ چلنے میں ان کی کمزوریوں سے اچھی طرح واقف ہے۔"

"انہیں زیادہ سے زیادہ دولت درکار ہے۔ نسائی کے پیشے سے اوبنے لگے ہیں۔ اس پیشے میں لوگ خمیدہ کمر تو ہوتے ہی ہیں اس کے علاوہ بینائی' انگوٹھوں اور انگلیوں کو الگ نقصان پہنچتا ہے۔ میں نے کل ہی باتوں باتوں میں انہیں بتایا تھا کہ شیخ منتظر صرف پانچ ماہ ہی ہم پر مہربان ہوئی ہے۔ اس دوران "کام" سے خاصی دولت بھی کمائی جا سکتی ہے۔ خود میں نے الجزائر میں ایک مکان خریدنے کے بعد جہازوں کی صنعت میں کچھ رقم سے سرمایہ کاری کر دی ہے۔ خاصا نفع مل جاتا ہے۔ چچا کو طمع نے گھیر لیا۔ تاہم بیوی کی تنہائی کا بھی احساس ہے انہیں۔"

"میں امیر خیر الدین سے اجازت لے کر اس کی شمولیت کا حتمی فیصلہ سناتا ہوں۔ اجازت کی صورت میں مریم کی رہائش کا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔ میں نے موسیٰ کی بہنوں کو ایک معزز بزرگ کے خاندان میں ٹھہرایا ہے۔ موسیٰ کے ساتھ اس کے سبھی بھائی ہمارے ہم سفر ہوں گے۔" اید الدین نے نیم رضامندی ظاہر کی۔

"موسیٰ آج کل بہت خاموش دکھائی دینے لگا ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ یہ تبدیلی کیسے آئی اس میں؟" داؤد کو یکدم خیال آیا۔

"اس نے الجزائر کے بازار سے گزرتے ہوئے ایک بنی چڑی گھڑسوار دستے کو مکمل تنظیم سے امیر خیر الدین کے قلعے کی جانب جاتے دیکھا تھا۔ یہ وہی دستہ تھا جو سلطان سلیم نے اپنی وفات سے قبل الجزائر بھیجا تھا۔ اس دستے کی دید نے موسیٰ ہی نہیں، کئی جلاوطن اندلسیوں کا حوصلہ بڑھا دیا ہے۔ اب انہیں اس بات سے تقویت مل رہی ہے کہ الجزائر سلطنت عثمانیہ کا ایک صوبہ ہے۔ اندلس میں ایسا لباس اور تربیت یافتہ فوج کبھی دیکھنے میں نہیں آئی۔"

"آپ کی بات بجا ہے امیر!" داؤد نے الجھ کر کہا۔ "لیکن مجھے موسیٰ پر بالکل اعتبار نہیں ہے۔ وہ اب بھی کہیں نہ کہیں چارلس کی طاقت اور اختیارات کے زیر اثر ہے۔ بربریوں کو وحشی اور ناخواندہ کہتا ہے۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ بھی نصرا اور عمر کی طرح ہمیں زک پہنچائے گا۔"

"اگر ایسا ہوا تو ان سے بھی بھیانک تر سزا پائے گا۔"

اید الدین نے سفاکی سے جواب دیا۔

سفر کی تیاریاں اختتام تک پہنچتے ہی روانگی عمل میں آ گئی۔ اید الدین کے چار جہاز دو مستولوں پر جبکہ بقیہ مائدہ ایک مستول پر مشتمل تھے۔ جہازوں کے حرکت میں آتے ہی پنون کے قلعے میں اضطراب برپا ہو گیا۔ انہوں نے بلا دریغ آتشیں ہتھیار چلانے شروع کر دیے۔ جوابی خاموشی اور جہازوں کے شمال میں سفر کے باوجود انہیں یہی خدشہ تھا کہ وہ جنوب کی جانب سے پلٹ کر قلعے پر حملہ کر دیں گے۔

ان کی پریشانی اور اضطراب سے بے خبر اید الدین

نے مشرقی ساحل کی جانب سوا سو میل دور جزائر کی جانب اپنا سفر جاری رکھا۔ اسے صرف ایک ہی فکر لاحق تھی کہ حکومت اندلس کو ان کی روانگی یا آمد کا شک نہ ہو جائے۔ اس صورت میں وہ جزائر کو حفاظت میں لے لیتے۔ اس اضطراب میں کہیں نہ کہیں ایک اطمینان بہرحال یہ بھی تھا کہ اندلسی سلطنت نے فی الوقت خیر الدین باربروسہ کی جانب سے بحیرۂ روم کے جزائر میں کسی کارروائی کا تصور بھی نہیں کیا ہو گا۔ وہ اپنے تئیں عروج پاشا کی وفات کے بعد بالکل مطمئن ہو گئے تھے کہ اب ان کے سامنے کوئی بھی مزاحمت نہیں کر پائے گا۔

اید الدین کا یہ سفر نہایت منظم تھا۔ اس نے اپنے جہازوں کو ایک ساتھ سفر کرنے کی پہلے ہی ممانعت کر رکھی تھی۔ جہاز برداروں نے تاجروں کا بھیس اختیار کر رکھا تھا۔ سفر کے دوران کوئی جہاز سامنے آ جانے سے وہ ایک دوسرے کے ساتھ بھی اجنبیوں کی طرح برتاؤ کرتے۔ رسمی طور پر جذبۂ خیر سگالی کا اظہار کرتے اور بے نیازی سے آگے بڑھ جاتے۔ اس کے باوجود ان سب میں ایک ہی بات مشترک تھی۔ ہر جہاز اور کشتی پر موجود مبلغ جہاد کے فضائل بیان کر کے لشکریوں کا خون گرما رہا تھا۔

موسیٰ اس صورتِ حال سے سخت ناخوش تھا۔ اسے مبلغ کی گفتگو سے بیزاری محسوس ہونے لگی۔ بلنسیہ کا "آزاد ماحول" "صنفِ نازک کی کھلی زندگی اور ناز و انداز یاد آتے تو مزید گھٹن محسوس ہونے لگتی۔ داؤد اس عاقبت نااندیش پر ہر طرح سے نظر رکھے ہوئے تھا۔ وہ اس کی ہر سرگرمی کے متعلق اید الدین کو آگاہ کرتا۔ اید الدین اپنی مصروفیات کے باوجود ہر معاملے پر گہری نظر رکھے ہوئے تھا۔ وہ جزائر بلیرک کے تینوں جزائر منورقہ' مجورقہ اور یابسہ کے متعلق زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کر رہا تھا۔

یہ جزائر مختلف قسم کے اناج کی پیداوار اور پھلوں کے لیے بھی مشہور تھے۔ افریقا بھر میں نمک کی ترسیل یہیں سے ہوا کرتی۔

"ایک بات سمجھ نہیں آئی امیر! اس قدر اہم خطے پر بیرونی طاقتوں نے قبضہ کیوں نہیں کیا؟" منتظر نے حیرت سے پوچھا۔

"مختلف ادوار میں مختلف اقوام قابض ہوتی بھی رہی ہیں۔ زیادہ تر کشمکش عیسائی اور مسلمانوں کے درمیان رہی۔ پہلے مسلمانوں نے عیسائیوں کو بے دخل کیا پھر عیسائیوں نے مسلمانوں سے اقتدار چھین لیا۔ اب صورتِ حال یہ ہے کہ ہر جگہ کر بے تعمیر دکھائی دیتے ہیں۔ مساجد اجاڑ دی گئیں اور مسلمان عبرت ناک زندگی گزارنے پر مجبور ہو گئے۔" اید الدین نے تاسف سے بتایا۔

"لیکن سوا سو یا ڈیڑھ سو میل بحری راستہ اتنا طویل تو نہیں ہے کہ یہ لوگ اسے عبور کر کے افریقا تک نہ پہنچ سکیں۔" داؤد کی حیرت بھی بجا تھی۔

"کبھی کسی افریقی مسلم حکمران کو ان کی مدد کا خیال ہی نہیں آیا۔ یہ قدم تو پہلی بار امیر خیر الدین نے اٹھایا ہے۔ اس کے علاوہ یہ گرد جہاز جزائر کے متعلق معلومات فراہم کرتے رہے ہیں۔"

"مجھے یقین ہے کامیابی ہمارا ہی مقدر بنے گی۔" منتظر پُرعزم تھا۔

"ہاں، یہ ایک یادگار مہم ثابت ہو گی۔ ہم اپنے دشمن کو ناقابلِ فراموش ضرب لگائیں گے۔" داؤد کا چہرہ تمتمانے لگا۔

اید الدین نے شفقت بھری نظر سے اپنے ان پُرخلوص سپاہیوں کو دیکھا اور مسکراتے ہوئے بحیرۂ روم کی نیلی آبی سطح پر نظریں جما دیں۔ ایک بھرپور معرکے کا تصور اس کی رگوں میں بھی لہو سنسنا رہا تھا۔

☆☆☆

چارلس نے اپنے جہاز کے مخصوص مقام پر میز کے ایک سرے پر نشست سنبھال رکھی تھی۔ میز کے چاروں اطراف کرسیوں پر دیگر افراد براجمان تھے۔ چارلس، جودا کو گہری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اسے جودا کے کچھ کارناموں سے آگاہی ہوئی تھی۔ اس کے جذبے اور توانائی نے چارلس کو کافی متاثر بھی کیا تھا۔ چارلس نے جودا کے لیے اپنی بائیں جانب ایک مخصوص نشست رکھنے کا حکم دے دیا۔

جودا بھی اسی طرح گہری نظروں سے چارلس کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس کی انگلیاں گٹھیا کے مرض کی بدولت ٹیڑھی تھیں۔ ایک عظیم سلطنت کے فرماں روا کی اپنی ذات اور صحت سے ایسی بے پروائی جودا کو تاسف میں مبتلا کرنے لگی۔ اس کی سوچوں اور تاسف سے بے نیاز چارلس اپنی دیگر مجلسِ مشاورت کا بغور جائزہ لے رہا تھا۔ اس کی نظریں فی الوقت ایک دوسرے کے مقابل بیٹھے "البا" کے جاگیردار اور "برنانڈو کورٹا" پر گڑی تھیں۔ جاگیردار مزاجاً نہایت سخت تھا۔ اس کے زیرِ کمان تیس ہزار اسپینی' جرمن اور اطالوی فوجی تھے۔ ہالینڈ میں حالیہ خون ریزی کے بعد اس نے چارلس اور دیگر ہم نواؤں کی نظروں میں کافی وقعت حاصل کر لی تھی۔ اس شہرت و اہمیت نے اسے مزید متکبر

اس کے مقابل اسی کی طرح متکبرانہ شان سے ہرنانڈو کورٹز بیٹھا تھا۔ اس کا تعلق کسی معزز یا نامور خاندان سے تو نہیں تھا البتہ اپنی کمان میں اسپین کے لیے امریکا میں میکسیکو کی فتح کے باعث ہی چارلس نے اسے یہاں مدعو کیا تھا۔

ان کے علاوہ دیگر حاضرین بھی بحری امور میں کافی مہارت رکھتے تھے۔ ان سے قطع نظر پاپائے اعظم کے بھیجے گئے ایک خصوصی پادری کے ہمراہ مزید پادری بھی شامل تھے۔ چارلس نے ایک گہری نظر سے سب کا جائزہ لیتے ہوئے گفتگو کا آغاز کیا۔

''ہماری یہ مہم اصولی طور پر تو بہت پہلے ہی شروع ہو جانی چاہیے تھی لیکن جرمنی کے مارٹن لوتھر سے نمٹنے میں یہ وقت چلا آیا۔ اس نے پہلے پاپائے اعظم کے خلاف آواز بلند کی پھر کسانوں کو بھی اپنا ہم نوا بنالیا۔ اس شخص نے مسیحیت میں ایک نیا فتنہ کھڑا کر دیا۔''

اس کے انداز میں بیزاری اور تعصب نمایاں تھا۔

مارٹن لوتھر کی حقیقت دراصل یہ تھی کہ اس نے کیتھولک گرجوں میں انسانی گناہوں کے معافی ناموں کی فروخت پر سخت احتجاج کیا۔ وہ ہانگ دہل ایک ہی بات کہتا تھا کہ گرجا نے خود کو اصل روح سے الگ کر کے ایک حاکمانہ سانچہ تیار کرلیا ہے۔ تاہم مارٹن نے اپنی کوششیں بالکل ترک نہ کیں۔ وہ اپنی اصلاحات کے نفاذ پر سختی سے کاربند تھا۔

چارلس یہ دباؤ اور ذاتی تناؤ برداشت نہ کر سکا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی اعصابی مضبوطی ہوا ہونے لگی۔ کشمکش کے عالم میں چارلس نے مارٹن کو اپنے مقالات کتابی شکل میں شائع کرنے کی اجازت دے دی۔

اس کشمکش میں چھ ماہ کا عرصہ بیت گیا اور اب ماہ اکتوبر کا آغاز ہو چکا تھا۔ چارلس نے بوجھل سانس خارج کرتے ہوئے اپنے حاضرین کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''اب سفر کے آغاز میں مزید تاخیر کی بالکل گنجائش نہیں ہے۔''

ڈوریا خود کو سر پیٹنے سے بمشکل روک سکا۔ اس نے نرمی سے کہا۔

''شہنشاہ معظم! اس ناچیز کی رائے میں یہ موسم سمندری سفر میں مناسب نہیں ہے۔ یہ موسم بحری سفر کے لیے بدترین اور ہولناک شمار ہوتا ہے۔ آندھیاں اور طوفان بھرپور زور دکھاتے ہیں۔ میں نے اس موسم میں مستول ٹوٹتے اور بادبان تار تار ہوتے بھی دیکھے ہیں۔ ہمارا عظیم ... بڑے نقصان سے دوچار ہو سکتا ہے۔ خوامخواہ خطرہ مول لینے کی آخر کیا ضرورت ہے؟ ہم یہ مہم چھ ماہ بعد بھی تو شروع کر سکتے ہیں۔''

''یہ کیا احمقانہ تجویز دی ہے تو نے؟'' چارلس بھڑک اٹھا۔ ''یہاں الجزائر کو فتح کرنے کے لیے جمع ہونے والے پانچ سو جہاز واپس بھیج دیے جائیں کیا؟ کیا تجھے علم نہیں کہ صلیبی سالہا سال سے الجزائر فتح کرنے کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ وہ بڑی عقیدت اور جوش سے یہاں جمع ہوئے ہیں۔ اب میں انہیں واپس چلے جانے اور اس مبارک مہم کو چھ ماہ ملتوی کرنے کا عندیہ دے کر مقدس جذبوں سے لبریز دل توڑ دوں؟''

جووانیکیو اس موقع پر خاموش نہ رہ سکا۔ اس نے ہر ممکن ادب سے چارلس کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''شہنشاہ معظم! یہ موسم سمندری سفر میں کسی بھی جہاز کو بے نام و نشان کر دینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ آپ سے التماس ہے کہ ہماری التجا پر تھوڑا غور کیا جائے۔''

یہ سن کر چارلس کا چہرہ بگڑنے لگا۔ اس کا ردعمل دیکھ کر پاپائے اعظم کا نمائندہ پادری فوری طور پر کھڑا ہوا اور چارلس کی شان و شوکت کے گن گاتے ہوئے کہنے لگا۔

''چارلس ایک عظیم فرماں روا اور بہادری میں اپنی مثال آپ ہے۔ اس کی حکمرانی ہمارے لیے کسی سعادت سے کم نہیں ہے۔ آپ سب کو علم ہی نہیں کہ پاپائے اعظم کو خواب میں حضرت مسیح کی بشارت ہوئی تھی۔ انہوں نے واضح طور پر کہا ہے، چارلس جس مہم میں شریک ہوگا کامیابی اس کا مقدر رہے گی۔ عظیم چارلس پر یسوع مسیح کا بھرپور سایہ ہے۔ وہ طوفانوں سے لڑ کر ان کا رخ موڑ دینے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے۔ ہوا بھی اس کے تابع اور موسم اس کے سامنے اپنا سر بھی نگوں کر دے گا۔''

''موسم ایک حقیر شے ہے!'' ہرنانڈو کورٹز رعونت سے کہنے لگا۔ ''ہم بھی کبھار معتدل سمجھے جانے والے مہینوں میں بھی موسم کی تبدیلی کا سامنا کر لیتے ہیں۔ لہٰذا صرف اسی کا بہانہ بنا کر مہم ملتوی کرنا کہاں کی دانش مندی ہے؟''

چارلس یہ سن کر مزید شیر ہو گیا۔

''الجزائر نے مجھے پیشکش کی ہے کہ اگر میں فوج لے کر وہاں پہنچوں تو وہ ہتھیار ڈال دیں گے۔ انہیں اس بات کا مکمل معاوضہ بھی ادا کر دیا گیا ہے۔ اگر انہوں نے کوئی بدعہدی کی تو اس صورت میں بھی ہم ایسی عظیم الشان بحری قوت لے کر وہاں پہنچیں گے کہ مسلمان اس قوت سے

خوفزدہ ہوکر ہی ہتھیار ڈال دیں گے۔"

ہر جانب سے مختلف آرا سن کر ڈوریا کے پاس جبری خاموشی کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ وہ جز بز ہونے کے ساتھ کن انکھیوں سے کاسترو نامی اس نوجوان کو دیکھنے لگا جو ساحل پر خواتین کے ساتھ بذلطیفوں میں مصروف تھا۔ کاسترو "اریون" کے جاگیردار کا بیٹا تھا۔ کاسترو نے بھی گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔

"امیر البحر ڈوریا کے مزاج میں جانے کیوں تلخی آتی جارہی ہے۔ انہوں نے ساحل پر ان خواتین کی موجودگی پر بھی اعتراض کیا تھا جو الجزائر کے جشن فتح میں حصہ لینا چاہتی ہیں۔ کیا انہیں اس مہم میں فتح کی کوئی امید یا خوشی نہیں ہے؟"

چارلس نے طنزیہ نظروں سے ڈوریا کی جانب دیکھا اور اسی انداز میں کہنے لگا۔

"ڈوریا کی حکمت عملیاں میری سمجھ سے بھی بالاتر ہیں۔ اس کی پریویزا میں شکست مجھے ابھی فراموش نہیں ہوسکی ہے۔"

ڈوریا اضطراب سے پہلو بدلتے ہوئے شکستگی سے بولا۔

"میں جانتا ہوں ناکامی نے میری بات کی وقعت کم کردی ہے لیکن وقت خود ہی بتادے گا کہ چھ ماہ کے انتظار کا عذر بالکل درست تھا۔"

"میں اب اس مہم سے پیچھے نہیں ہٹوں گا۔ ہم کل بہر صورت روانہ ہوجائیں گے۔"

چارلس کے اس حتمی فیصلے پر مجلس مشاورت مزید جاری رہنے کا کوئی جواز ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ پادری نے کھڑے ہوکر خوشی و جوش سے کامیابی کی دعا مانگی جس کے بعد حاضرین کی بھنے گوشت اور شراب سے تواضع بھی کی گئی۔

ڈوریا اور جووانیکیو اب نہایت بددلی سے محفل میں شریک تھے۔ ان دونوں کے ہی دلوں میں موسم کی متوقع ہولناکی کا احساس خلش پیدا کررہا تھا۔ کاسترو اور کورٹز طنزیہ نظروں سے اس کی جانب دیکھتے ہوئے پھبتیاں کسنے لگے۔ ڈوریا انہیں حتی الامکان حد تک نظر انداز ہی کررہا تھا۔ یہ بددلی کم نہ تھی کہ خواتین کو بھی اس ضیافت میں شامل کرلیا گیا۔ خواتین کی آمد نے کاسترو اور کورٹز سمیت اکثریت کو انسانیت کے جامے سے باہر کردیا۔ ڈوریا زچ ہوکر جووا کے ساتھ اپنے جہاز پر واپس چلا آیا۔ اس کے دل میں رہ رہ کر ایک ہی خواہش پیدا ہورہی تھی کہ چارلس کا متبادل مل جائے تو وہ لمحہ بھر میں ہی اس سے قطع تعلق کرلے گا۔

چارلس کے جہاز پر رقص و سرود، داستان گوئی، شراب و شباب اور عیش و نشاط کا رات بھر دور دورہ رہا۔ جووانیکیو بھی اس صورت حال پر سخت کبیدہ خاطر تھا۔ اس کے دماغ میں بھی موسم کی متوقع تباہ کن صورت حال اور چارلس کی بے نیازانہ روش پر کئی خدشات کلبلا رہے تھے۔

رات بھر اسی کشمکش اور دوسری جانب عیش و عشرت میں بیت گئی۔

☆☆☆

اگلی صبح تمام جہازوں پر سفر کے آغاز کا اعلان کروادیا گیا۔ اسی لیے جہازوں سے عرب غلاموں کے گیت گونجتے سنائی دینے لگے۔

"زندگی ایک وسیع بحر ہے۔
ہم سب اس میں رواں مخلوق۔
ہاں! آزادی سے بغلگیر ہونے کا وقت قریب ہے۔
ہاں! کائنات کی حسین ترین سچائی
موت کی آمد کا وقت قریب ہے۔"

سفر کا آغاز چارلس کے جہاز کی حرکت سے ہوا۔ اس کے عقب میں دیگر جہاز بھی رواں ہوگئے۔ کچھ دیر بعد چارلس نے ڈوریا کو اپنے جہاز پر طلب کرلیا۔ ڈوریا نے جہاز کی کمان جووانیکیو کے سپرد کی اور بادل ناخواستہ وہاں پہنچ گیا۔ کاسترو اور کورٹز کو بھی وہاں موجود دیکھ کر اس کا حلق تک کڑوا ہوگیا۔

اگلے چند لمحے بے حد ناخوشگوار ثابت ہوئے۔ کورٹز نے اسے اپنے طویل بحری سفروں کے بارے میں بتاتے ہوئے تجربہ کاری اور مہم جوئی کی خوب ڈینگیں ماریں۔ کاسترو بھی دبے لفظوں میں بزدلی اور کم ہمتی کے طنز کرتا رہا۔ ڈوریا نے خاموشی پر ہی اکتفا کیا۔ وہ خواہش کے باوجود انہیں سمجھانے سے قاصر تھا کہ مسلمانوں کے خلاف جنگ تو بالکل مشکل نہیں ہے۔ اصل خطرہ اور حریف سمندر کا خطرناک موسم ہوتا ہے جو اپنے خلاف اٹھنے والوں کو نابود کرنے میں ایک لمحہ بھی نہیں لگاتا۔

چارلس بھی ہر دوسری بات پر اپنے اسی عزم کا اظہار کرتا رہا کہ اس کے لیے واپسی کا سفر اب ناممکن ہے۔ ڈوریا خون کے گھونٹ بھر کر رہ گیا۔

کچھ ہی گھنٹے گزرے تھے کہ تیز ہوائیں چلنے لگیں۔ ابتدا میں... تو ان پر کوئی توجہ نہ دی گئی تاہم ان کی بڑھتی شدت اب نظر انداز کیے جانے کے قابل نہیں تھی۔ ڈوریا کے ہونٹوں پر مسکراہٹ رینگ گئی۔

"اب آئے گا مزہ! اب ہر ایک اپنے غرور اور کم ہمتی

کی سزا بھگت لے گا۔ بہت مذاق اڑالیا میرا۔" اس نے خود کلامی کی۔

اب اس کی نظریں بقیہ حاضرین پر مرکوز تھیں۔ وہ ان کے تاثرات کا باریکی سے جائزہ لینے لگا۔ کورٹز اسے سخت کینہ توز نظروں سے دیکھنے لگا۔ صاف ظاہر ہورہا تھا کہ وہ موسم کے اس تغیر کو ڈوریا کی "نحوست" سمجھ رہا تھا۔ کاسترو البتہ ہنوز بے پروا تھا۔ عرب غلاموں کا گیت مزید لے اختیار کرگیا۔

"آزادی سے بغلگیر ہونے کا وقت قریب ہے۔
کائنات کی حسین ترین سچائی
موت کی آمد کا وقت قریب ہے۔"

ڈوریا ان صداؤں کو نظر انداز کرتے ہوئے دیدبان پر چڑھا اور چاروں اطراف کا جائزہ لینے لگا۔ ہواؤں کا رخ شمال سے جنوب کی سمت تھا۔ اس کے علاوہ بلندی سے چھوٹے جہاز بھی کشمکش میں دکھائی دے رہے تھے۔ ہواؤں کی شدت انہیں صحیح سمت برقرار رکھنے میں خاصی دشواری پیدا کررہی تھی۔ وہ فوری طور پر دیدبان سے نیچے اتر آیا۔

"ہوائیں بہت خطرناک ہیں۔ یہ جہازوں کو ان کی سمت سے محروم کردیں گی۔" اس نے فوراً اعلان کیا۔

"تیرا تو دماغ چل گیا ہے۔" کاسترو نے منہ بنایا۔

"ہاں! مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے۔ مسلمانوں سے جنگ کا خوف اسے ایسی حرکات پر مجبور کررہا ہے۔ بزدل کہیں کا!" کورٹز نے بھی حقارت سے کہا۔

ڈوریا نے منتظر نگاہوں سے چارلس کی جانب دیکھا۔ اسے موہوم سی امید تھی کہ وہ ہوشمندی کا ثبوت دے گا۔

"سفر بالکل نہیں روکا جائے گا۔" چارلس نے اعلان کیا۔ "اگر جہاز اپنی سمت سے بھٹک بھی گئے تو کسی نہ کسی مسلمان علاقے کی طرف ہی نکلیں گے۔ ہم انہیں بھی فتح کرلیں گے۔"

ڈوریا بے بسی سے تلملا کر رہ گیا۔ تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ ہواؤں نے مزید شدت اختیار کرلی۔ چارلس کے چہرے پر پہلی بار تشویش جھلکتی نظر آئی۔ اس نے چند موسمیاتی ماہرین دیدبانوں پر چڑھا دیے تاکہ وہ موسم کی مکمل صورت حال کا اندازہ لگا سکیں۔ وہ ان ماہرین سے بھی اپنا مطلوبہ جواب ہی سننا چاہتا تھا لیکن ایسا کچھ بھی نہ ہوا۔

"ہواؤں کی صورت حال بہت ہولناک ہے شہنشاہ معظم!" ایک شخص نے بتایا۔ "بہت سے چھوٹے جہاز اپنے بیڑے سے کٹ گئے ہیں۔ یہ طوفان اگر اسی طرح جاری رہا تو ہم ایک دوسرے کا سراغ بالکل ہی کھودیں گے۔"

"تو اب ہمیں کیا کرنا چاہیے؟" چارلس جز بز ہوا۔

"واپسی کے سوا اب کوئی اور چارہ نہیں ہے شہنشاہ معظم! یہ مہم اگلے برس مئی تک ملتوی کردینا ہی بہتر ہے۔" دوسرے ماہر نے کہا۔

"اب میں سمجھا۔ تم سب ڈوریا کے ہمنوا بن گئے ہو۔ مجھے گمراہ کرنے کی کوشش کررہے ہو لیکن میں ایسا ہرگز نہیں کروں گا۔ میں ہر قیمت پر الجزائر پہنچوں گا۔"

ڈوریا اس شخص کی عقل پر ماتم بھی نہ کرسکا۔ اسی اثنا میں جہاز کے اگلے حصے کے بادبان سے ایک ملاح اترا اور بھاگتا ہوا چارلس کے پاس چلا آیا۔

"شہنشاہ معظم! ہمارے بہت سے جہاز اپنی سمت کھو بیٹھے ہیں۔ جہازوں کی تعداد تیزی سے کم ہورہی ہے۔ اگر یہی حال رہا تو ہم دشمن کا مقابلہ کیسے کریں گے؟"

"یہ سب بے مطلب باتیں ہیں۔ سفر کسی صورت نہیں رکے گا۔" چارلس بضد رہا۔

"کارسیکا یہاں سے بہت قریب ہے اور وہی اس وقت ان خطرناک ہواؤں سے محفوظ بھی ہے۔" ڈوریا ایک بار پھر خود کو مشورہ دینے سے نہ روک سکا۔

"ہرگز نہیں۔ یہ صرف الجزائر ہی جائیں گے۔" چارلس پر عجیب بچگانہ ضد سوار ہوچکی تھی۔

"مجھے اجازت دیجیے شہنشاہ معظم!" ڈوریا نے عاجز آکر کہا۔ "میں اب اپنے جہاز کی کمان سنبھالنا چاہتا ہوں۔"

"نہیں، ابھی تو یہیں رہ کر دیکھو گے کہ میں اس خطرناک موسم کو کس طرح شکست دیتا ہوں۔"

"انسان نے جب بھی قدرت یا فطرت سے جنگ کی کوشش کی ہے، ہمیشہ تباہی کا سامنا کیا ہے۔" ڈوریا نے دبے لفظوں میں اسے سمجھانا چاہا لیکن چارلس قوت سماعت سے مکمل طور پر محروم محسوس ہونے لگا تھا۔

تیز ہوائیں بہت جلد طوفان کا روپ اختیار کرگئیں۔ بادبان لپیٹ دیے گئے تاکہ طوفانی ہواؤں کے جھونکے جہازوں کو آپس میں ٹکرانے یا سمندری سمت کھودینے کا سبب نہ بن جائیں۔ ان کوششوں کے باوجود عالم یہ تھا کہ تیز ہوائیں جہازوں کو کسی کٹی پھٹی پتنگ کے مانند دائیں بائیں آگے پیچھے اڑائے دے رہی تھیں۔

ان مناظر نے چارلس کے ہوش ٹھکانے لگادیے۔ اس نے مضطرب ہوکر ڈوریا سے کہا۔

"جہازوں پر فوری اعلان کروادو کہ بحری بیڑا

کارسیکا کا رخ کرے گا۔"

ڈوریا نے ایسا ہی کیا۔ اس نے کارسیکا کی جنوبی بندرگاہ کا انتخاب کیا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ طوفانی ہواؤں نے سمندر کے بالکل کھلے ہوئے علاقے میں تباہی برپا کی ہوئی تھی۔ کارسیکا جنوبی سمت میں ہونے کے باعث بالکل محفوظ تھا۔

چارلس کا بحری بیڑا کارسیکا میں لنگر انداز ہونے میں کامیاب ہوگیا۔ اگلے کئی روز وہ وہیں مقیم موسم کی تبدیلی کا انتظار کرنے لگے۔ اس دوران ڈوریا کا یہی گمان تھا کہ چارلس کی عقل جیتی طور پر ٹھکانے آگئی ہوگی لیکن اس کی ہٹ دھرمی ختم ہونے کا نام ہی نہ لے رہی تھی۔ موسم معتدل ہوتے ہی چارلس نے الجزائر کا رخ کرلیا۔

سفر کا دوبارہ آغاز ہوتے ہی بادبان کھول دیے گئے۔ عملے نے حسب سابق اپنی مخصوص جگہیں سنبھال لیں۔ ڈوریا تاحال چارلس کے جہاز پر ہی قیام کیے ہوئے تھا۔ اس نے یہ سفر دو مرحلوں میں طے کرنے کی تجویز دی۔ اس طرح وہ پہلے بلیرک میں کچھ روز مقیم رہتے، اس کے بعد الجزائر کا رخ کیا جاتا۔

بدقسمتی ہنوز ان کے ہم رکاب تھی۔ کارسیکا سے کچھ مسافت طے ہوتے ہی جہاز ایک بار پھر طوفان میں گھر گئے۔ ڈوریا نے جزیرہ موہن تک پہنچنے کی ہدایات دے دیں۔ طوفان کی شدت ایسی تھی کہ تین خلاصی ایک چپو سنبھالے جہازوں کو موہن تک پہنچانے کی جان توڑ کوشش کرنے لگے۔ یہ سات میل مسافت طے کروانے میں کوڑا برداروں نے خلاصیوں کی پیٹھ کوڑے برسا کر لہولہان کردیں۔

موسم کی صورتِ حال ہر گزرتے لمحے تغیرات کی زد میں تھی۔ سمندر میں گرداب بنتے دکھائی دینے لگے تو آوہ بکا کا نیا سلسلہ شروع ہوگیا۔ تھوڑی ہی دیر میں اس حزلزل کیفیت سے جہازوں کے مستول ٹوٹ کر بادبان تار تار ہوگئے۔ ڈوریا اپنی پیشہ ورانہ مہارت بروئے کار لاتے ہوئے خلاصیوں کو مختلف ہدایات دیتا رہا۔ اس کی مہارت اور خلاصیوں کی محنت نے سات میل کی وہ مسافت بارہ گھنٹے میں طے کروادی۔ جزیرہ موہن تک پہنچنے کے بعد چارلس نے وہاں مختصر ترین قیام اور فوری روانگی کے لیے تیار رہنے کا حکم جاری کردیا۔ ڈوریا کی بے بسی دیدنی تھی۔

ایک بات تو اب واضح تھی کہ موسم کی یہ صورتِ حال مزید سنگینی بھی اختیار کرسکتی تھی۔ سفر جاری رکھنے کا خیال کسی بھی ذی ہوش شخص کے لیے ناممکن تھا لیکن چارلس کی فہم وفراست جانے کہاں خوابیدہ ہوگئی تھی۔ اس بار بھی چارلس نے ڈوریا کی ایک نہ سنی اور جنگی بیڑا الجزائر کی جانب گامزن کروادیا۔ مرمت طلب بادبانوں کی حالت بالکل درست کردی گئی۔ ہواؤں میں خنکی کے باوجود خلاصی پسینے سے شرابور تھے۔ اس کے علاوہ الجزائر کی جاسوس کشتیوں نے اس بحری بیڑے کی آمد کی خبر دو روز پہلے ہی پہنچادی۔

حسن آغا نے فوری حکمتِ عملی تیار کی اور خود کو قلعے میں محصور کرلیا۔ اسے فصیل کی جانب سے بھی کوئی تشویش نہ تھی کیونکہ وہ چاروں اطراف سے محفوظ اور پہرے میں تھی۔ اس نے بالائی حصوں میں توپیں نصب کروائیں۔ فصیل میں صرف دو بڑے دروازے تھے۔ شمالی سمت کے دروازے کو "باب البیت" جبکہ جنوبی دروازے کو "باب الاذن" کہا جاتا۔ حسن آغا کے موجودہ اقدامات کے پیش نظر چارلس کے سامنے اب الجزائر کے ساحل پر یہ صورتِ حال تھی کہ مشرقی ساحل بے حد ناہموار اور بلند وبالا ٹیلوں پر مشتمل تھا۔ بلندی سے شہر کا نظارہ کرنے پر تاحدِ نگاہ پختہ مکانات اور عمارتیں ہی نظر آتیں۔

"شہنشاہ معظم! الجزائر پر باب البیت سے حملہ کرنا مناسب نہیں ہے۔" ڈوریا نے پھر تجویز دی۔ "اس کام کے لیے باب الاذن ہی بہتر رہے گا۔"

"اب اس مشورے کی کیا منطق ہے؟" چارلس نے منہ بنایا۔

"ساحل سے وہاں..... تک رسائی کے لیے بہت سے ناہموار راستوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ یہاں ہر جگہ بربری قبائل کی کثرت ہے۔ یہ لوگ چھاپے مار کر فوج کا بڑا حصہ تباہ کردینے تک کی صلاحیت رکھتے ہیں۔"

"یہ ضروری نہیں کہ تمہارا تجربہ ہر بار ہی درست ثابت ہو۔ بہرحال فوج کو مغربی ساحل "کشینہ" پہنچنے کا حکم دے دو۔" چارلس نے اپنا حتمی فیصلہ سنایا۔

ڈوریا نے ایسا ہی کیا۔ فوجی الجزائر کے ساحل پر اترتے ہی فرطِ خوشی سے بے حال ہوگئے۔ ان کی کیفیت دیکھ کر ایسا محسوس ہورہا تھا گویا انہوں نے الجزائر فتح کرلیا ہے۔ اس خوشی میں انہوں نے سامانِ رسد کے جہازوں کے متعلق توجہ ہی نہ دی جو ابھی کافی مسافت پر تھے۔ کچھ ہی دیر گزری تھی کہ ہلکی بارش کا آغاز ہوگیا۔ اس دوران چارلس ساحل پر مقیم ہوچکا تھا۔ اس کی سپاہ البتہ جنوبی دروازے تک پہنچنے کے لیے بے چین تھی۔ چارلس نے حکم دیا کہ باب الاذن کی جانب پیش قدمی کرنے والے سپاہی راستے میں

خندقیں کھودتے جائیں۔ یہ کھدائی پہاڑی گھاٹیوں میں پوشیدہ بربری قبائل کے اچانک حملے کی صورت میں سودمند ثابت ہوسکتی تھی۔ کسی سپاہ پناہ کے لیے ان خندقوں میں روپوش ہوسکتے تھے۔ سپاہ کی اس نئی مصروفیت کے دوران ڈوریا کسی کو بھی مطلع کیے بغیر کہیں غائب ہوچکا تھا۔ چارلس کو تفتیش پر علم ہوا کہ وہ اپنی کشتیاں "خلیج ٹیمنڈ فاسٹ" پہنچا رہا ہے۔ ڈوریا کی اس خودسری پر چارلس کو شدید تاؤ آیا۔ اسے یہ منطق بھی سمجھ نہیں آرہی تھی کہ ان کشتیوں اور جہازوں کی الجزائر میں ضرورت کے باوجود ڈوریا انہیں روپوش کیوں کررہا ہے۔ چارلس نے غصے میں ایک اہلکار کو حکم دیا کہ ڈوریا کو کسی بھی صورت جلد از جلد اس کے پاس پہنچایا جائے۔

"امیر البحر! شہنشاہ معظم نے فوری طور پر آپ کو اپنے پاس طلب کیا ہے۔" اہلکار نے ڈوریا سے ملاقات پر کہا۔

"شہنشاہ کو پیغام دینا کہ مزید کچھ ضروری کام نمٹاتے ہی آجاؤں گا۔" اس نے بے نیازی سے جواب دیا۔

اہلکار یک ٹک سے اس موجودہ صورتِ حال کا جائزہ لینے لگا۔ ڈوریا اپنی دو تہائی کشتیاں خلیج ٹیمنڈ فاسٹ پہنچا چکا تھا۔ اس کی تیز رفتاری دیکھ کر یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ تمام تر کشتیوں کو راستے سے ہی خلیج چلے جانے کا حکم دیا جاچکا ہوگا۔

"ویسے ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ ہمیں کشینہ کے ساحل پر ان کشتیوں اور آدمیوں کی زیادہ ضرورت ہے۔ اپنی چھتیس ہزار فوج کو کئی حصوں میں تقسیم کرنے کی آخر کیا حکمتِ عملی ہے؟ یہ تقسیم ہمیں نقصان بھی پہنچا سکتی ہے۔" اہلکار نے پُرسوچ انداز میں استفسار کیا۔

"اپنی حد میں رہو!" ڈوریا نے درشتی سے کہا۔ "امیر البحر میں ہوں یا تم؟ جنگی حکمتِ عملی طے کرنا یا ان کے بارے میں سوال کھڑے کرنے کا اختیار آخر تمہیں کس نے دیا؟"

"معذرت چاہتا ہوں۔" اہلکار نے فوراً سنبھل کر کہا۔ "آپ سے گزارش ہے کہ میرے ساتھ فوراً شہنشاہ کے پاس چلے چلیے۔"

"کیا تمہیں سنائی نہیں دیا کہ میں نے ابھی بہت سے کام نمٹانے ہیں۔ شہنشاہ سے کہو کہ یہاں سے کشینہ تک پہنچنے کا بری راستہ دیکھنا زیادہ ضروری ہے۔ اس کے بعد میں کشتیوں میں موجود بہترین نسل کے کسی گھوڑے پر سواری کرکے شہنشاہ کے پاس چلا آؤں گا۔" وہ مزید درشتی سے بولا۔

اہلکار الٹے قدموں لوٹ گیا اور ڈوریا کا یہ پیغام من وعن چارلس تک پہنچادیا۔ اس جواب پر چارلس مزید برافروختہ ہوگیا۔ اس نے بلا سوچے سمجھے جرمن سپاہیوں کو خندق کھودنے پر مامور کردیا۔ ارادہ یہی تھا کہ شہر کے جنوبی دروازے سے باب الاذن کی طرف پیش قدمی کرے گا۔ یہ صورتِ حال ان کے لیے ایک نئی بوکھلاہٹ کا سبب ثابت ہوئی۔ افریقی بربری قبائل نے اپنے تجربات بروئے کار لاتے ہوئے ان پر مختلف اطراف سے حملہ کردیا۔ انہیں بھی اس بات کا بخوبی اندازہ تھا کہ جرمن سپاہی ہوں یا ہسپانیہ کے عیسائی، اٹلی کے سپاہی ہوں یا مالٹا کے صلیبی، ان سبھی میں ایک بات مشترک تھی۔ وہ مسلمانوں سے شدید نفرت کرتے تھے اور ان کی جانب سے معمولی رعایت پر بھی مسلمانوں کو بہیمانہ انداز میں کچلنے سے بالکل نہ چوکتے۔

اس صورتِ حال میں موسلا دھار بارش کے آغاز سے مزید ابتری پیدا ہوگئی۔ خندقوں میں پانی بھر جانے کے باعث باب الاذن کی جانب پیش قدمی کرتے عیسائیوں کو اپنی پیش قدمی روکنا پڑی۔ چارلس ان کا کوئی بھی فطری عذر قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس نے جبری طور پر سپاہ باب الاذن کے سامنے پہنچا کر انہیں فصیل کی طرف مغرب سے مشرق کی سمت پھیلا دیا۔ اب صورتِ حال کچھ اس طرح تھی کہ ان کے سامنے فصیل اور عقب میں اونچے نیچے ناہموار زمینی و پہاڑی سلسلے تھے۔ ان پہاڑی سلسلوں میں ٹیلے اور درے بھی شامل تھے۔

یہاں تک رسائی چارلس کی ایک اور حماقت ثابت ہوئی کیونکہ اس طرح بربری قبائل کے پاس انہیں زچ کرنے کا ایک اور موقع ہاتھ آگیا۔ وہ دروں سے نکل کر ان پر اچانک حملہ کرتے اور عیسائیوں کے تعاقب میں آتے ہی فوری طور پر فرار ہوجاتے۔ عیسائی ان کے تعاقب میں جب مزید پیش قدمی کرتے تو پہاڑی کے اوپر سے پتھر لڑھکا دیے جاتے۔ عیسائی اس آفت پر بلبلا کر رہ جاتے لیکن چارلس ہنوز بلا سوچے سمجھے فیصلے صادر کررہا تھا۔ اسے اس بات کی بھی مطلق پروا نہ تھی کہ بارش کی وجہ سے زمین زیرِ آب آگئی ہے جس کے باعث زمینی نشیب وفراز بھی نظروں سے اوجھل ہی رہتے۔ گھوڑوں کا یہ عالم تھا کہ وہ کسی دلدل میں اتر تو جاتے تاہم چند قدم آگے بڑھتے ہی پانی میں پوشیدہ کسی نہ کسی تودے کی ٹکر سے پھسل کر اپنا توازن کھو بیٹھتے۔ نتیجہ یہ برآمد ہوتا کہ گھڑسوار بھی پانی میں گر جاتا۔

پیادہ فوج کی دشواریاں اس سے بھی سوا تھیں۔ وہ

جزروں میں پانی بھر جانے کے باعث اپنی رفتار سست کرنے پر مجبور ہو جاتے یا یوں بھی ہوتا کہ بھاگتے ہوئے یکدم کسی گڑھے میں جا گرتے۔ توپ خانے کی ساحل سے باب الاذون کے سامنے تک نقل و حمل بھی بے حد دشوار مرحلہ تھی۔ اس پر مستزاد عقب سے ہونے والے اچانک حملے بھی مسائل میں اضافہ کر دیتے۔ ان مشکلات کے نتیجے میں ہزار ہا فوجی نقصانات اٹھا رہے تھے۔ راستوں کی ناہمواری کے باعث سامان رسد بھی جہازوں سے یہاں تک لانا ممکن نہ رہا تھا۔ حسن آغا ان کی بوکھلاہٹ اور بدنظمی کا نہایت باریک بینی سے جائزہ لے رہا تھا۔

اسی اثنا میں اس نے چارلس کا ایک کمزور پہلو تلاش کر لیا۔ چارلس نے مشرقی بندرگاہ کو یکسر نظر انداز کیا ہوا تھا۔ حسن آغا نے اس موقع سے بلا تاخیر فائدہ اٹھایا اور قبائلیوں سے سامان رسد کے جہازوں پر حملہ کروا دیا۔ اس موقع پر عرب خلاصیوں نے ان قبائلیوں کی بہت مدد کی۔ چارلس کی سپاہ نے ان کے جہاز اپنے تصرف میں کیے ہوئے تھے تاکہ وہ کسی بھی موقع پر جہاز لے کر فرار نہ ہو سکیں۔ خلاصیوں نے سامان کی لوٹ مار میں قبائلیوں کا بھرپور ساتھ دیا اور اس سامان کے محافظ دستے کو قتل کر دیا۔

دوسری جانب چارلس کی باب الاذون تک جانے والی فوج بارش سے اس قدر بے بس تھی کہ تجنیق نصب کرنے میں بھی کامیاب نہ ہو سکی۔ یہ مشکلات نظر انداز کرتے ہوئے چارلس نے سطح آب پر قدرے بلند ٹیلوں پر توپیں نصب کرنے کا حکم دے دیا۔ حسن آغا ایسی کسی بھی صورت حال کے لیے تیار تھا۔ وہ باب الاذون کے عقب میں نو سو پیدل چرچی اور پانچ ہزار سپاہ کے ہمراہ ان کے بھرپور استقبال کے لیے تیار تھا۔ فصیل کے اوپر تعینات فوجی بھی مکمل چوکس تھے۔ حملہ آوروں کے لیے توپیں بھی بالکل تیار حالت میں تھیں۔ حسن آغا ایک مخصوص موقع کی تاک میں تھا اور یہ موقع اسے بہت جلد میسر آ گیا۔

چارلس کے سپاہی مسلسل بارش کے باعث اپنے توپ خانے اور بارود کو پانی سے بچانے کی کوشش کر رہے تھے۔ حسن آغا فوری طور پر باب الاذون سے نکلا اور عیسائیوں پر دھاوا بول دیا۔ عیسائی ابھی اس حملے سے سنبھل ہی نہیں پائے تھے کہ عقب سے بربری قبائلی حملہ آور ہو گئے۔ تبھی حملے کا کسی نہ کسی طرح دفاع کرتے چارلس نے جرمنی، اٹلی اور مالٹا کے صلیبیوں کی مدد سے حسن آغا پر تین اطراف سے دباؤ بڑھا دیا۔ اس کی ہر ممکن کوشش یہی تھی کہ کسی نہ کسی طرح پھاٹک پر قبضہ کر کے شہر میں داخلہ ممکن بنا لے۔ اپنی حماقتوں میں اسے بالکل اندازہ ہی نہ ہو سکا کہ حسن آغا ایک باقاعدہ چال کے تحت پسپائی اختیار کرتے ہوئے تیز رفتاری سے باب الاذون واپس روانہ ہو گیا ہے۔ علاقے کی جغرافیائی حالت سے آگاہی کی بدولت مقامی افراد گڑھوں کی نوعیت و موجودگی سے واقف تھے اس لیے تیز رفتاری زیادہ مسئلہ ثابت نہ ہوئی۔

حسن آغا کے باب الاذون واپس جاتے ہی پھاٹک فوری طور پر بند کر دیا گیا اور اسی لمحے فصیلوں کے اوپر سے تعاقب کرنے والے عیسائیوں پر گولہ باری شروع کر دی گئی۔ سپاہی پکے ہوئے پھلوں کی طرح گھوڑوں سے گر گر مرنے لگے۔ اس قدر جانی نقصانات کے بعد چارلس کو علم ہوا کہ حسن آغا اپنی فوج کے ہمراہ باہر کیوں آیا تھا۔

کچھ ہی روز میں چارلس کو اپنے فیصلوں کا ایک تاوان ادا کرنا پڑا۔ اسے خیمے کی پناہ گاہیں حاصل نہ تھیں۔ اس لیے سردی میں اچانک اضافے نے سپاہ کی رگوں میں خون منجمد کرنا شروع کر دیا۔ فصیل کی توپوں سے گولہ باری، پسپائی اختیار کرنے والوں پر بربریوں کے حملوں اور اب ٹھٹھرا دینے والی سردی سپاہ پر قیامت بن کر ٹوٹ رہی تھی۔ موسلا دھار بارشوں کا زور ٹوٹا تو شمال سے آنے والی طوفانی ہوائیں ایک اور آزمائش ثابت ہوئیں۔ یہ نیا طوفان سطح سمندر پر کھڑے جہازوں کے لیے تباہ کن تھا۔ طوفان کی شدت سے جہازوں کی زنجیریں ٹوٹ گئیں اور وہ ایک دوسرے سے ٹکرا کر پاش پاش ہونے لگے۔ گہرے سمندر میں کھڑے جہازوں کی حالت زیادہ تباہ کن تھی۔ ٹوٹ پھوٹ کے باعث سوار عملے اور خلاصیوں نے کشتیوں کے ذریعے فرار کی کوشش کی تو ہوا کے زور سے کشتیاں ہی الٹ گئیں۔ ان کے سوار سمندر میں غوطے کھاتے غرق آب ہو گئے۔ کشتیوں میں پانی بھر جانے کے باعث وہ آبی قبر کا مدفن بن گئیں۔

اگلے چھ گھنٹے میں اس طوفان نے اتنی تباہی مچائی کہ ''ایک سو چالیس'' جہاز غرق اور دیگر ناکارہ ہو گئے۔ گولہ بارود بھی بھیگ کر ناقابل استعمال ہو چکا تھا۔ ساحل پر موجود اناج کے ذخائر بھی باب الاذون تک لے جانے ممکن نہ رہے۔ اسی اثنا میں شمالی دروازے سے حسن آغا کے سپاہی بگولے کی طرح نمودار ہوئے اور عیسائیوں کا سامان رسد لے کر شہر واپس چلے گئے۔ دیگر قبائلیوں نے بھی اپنے حصے کی رسد اٹھا کر لوٹ مار کا آغاز کر دیا۔

چارلس کے سپاہی مزاحمت تو کیا کرتے، ان کا عالم یہ تھا کہ مسلسل جدوجہد سے بھوک نے وجود میں اپنے پنجے گاڑ لیے۔ ان کے پاس کھانے کے لیے اناج کا ایک بھی دانہ نہ تھا۔ خوراک کی صرف اسی قدر مقدار موجود تھی جو بادشاہ اور اس کے اہل خانہ کے لیے ضروری ہوتی اور اس کی بھی نہایت کڑی حفاظت کی جا رہی تھی۔

سپاہی اب بری طرح انتشار کا شکار ہو چکے تھے۔ بارش کے پانی نے بالوں اور بدن کا برا حال کر دیا تھا۔ لباس بھی بدن سے چپک گیا تھا۔ کسمپرسی کا عالم یہ تھا کہ ان کے پاس کپڑے تبدیل کرنے کے بھی کوئی وسائل موجود نہ تھے۔ طوفانی ہواؤں کے جھونکے انہیں چلنے پھرنے تک سے معذور کیے ہوئے تھے۔ ان ہواؤں نے ہر جانب ایک ہولناک شور برپا کر کے اعصاب کو الگ امتحان میں ڈال رکھا تھا۔ چارلس اور اس کے قریبی ساتھی اب ایک پہاڑی کے سائے تلے اکٹھے ہو کر قدرے بلند پتھروں پر کھڑے ہو گئے تھے۔ ان کی سپاٹ نظریں اپنے پیچھے ندی نالے کی طرح بہتے پانی پر مرکوز تھیں۔

چارلس کی کیفیت ان سب سے مختلف تھی۔ اس کا چہرہ بے تاثر تھا۔ مختلف اطراف میں بھاگتے اور پہاڑیوں کی آڑ بنانے کی کوشش میں سرگرداں فوجیوں کی بے بسی بھی اسے ٹس سے مس نہ کر رہی تھی۔ آدمیسر نہ آنے والے سپاہیوں کو کھلے میدانوں میں بھیگتے اور ہواؤں کے تھپیڑوں کی زد میں آتے دیکھنا بھی اسے اپنے غلط فیصلوں اور حماقت کا احساس نہ دلا سکا۔ جرمن، اطالوی اور مالٹا کے صلیبیوں کی ہنوز یہی کوشش تھی کہ کسی بھی طرح شہر میں داخل ہونے میں کامیاب ہو جائیں۔ فصیلوں سے گولہ باری کا سلسلہ بھی بند ہو چکا تھا کیونکہ وہاں بھی طوفانوں نے الگ ہی نوعیت کی تباہی برپا کی تھی۔

کچھ لمحے اس انتشار اور ہڑبونگ کو دیکھتے رہنے کے بعد چارلس کے وجود میں پہلی جنبش پیدا ہوئی اور اس نے حسن آغا کو پیغام بھجواتے ہوئے کہا۔

''شہر کا پھاٹک کھول دیا جائے تاکہ اتحادی شہری پناہ لے سکیں۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ تم دیگر مسلمانوں کی طرح اسی شہر میں رہو گے۔ ہماری طرف سے کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا جائے گا۔''

یہ پیغام بھیجنے کے بعد چارلس کو مثبت ردعمل کی توقع تھی لیکن حسن آغا نے ہر امید پر ہی پانی پھیر دیا۔

''بادشاہ چارلس کے وسیع تر علم میں یہ بات تو لازمی ہو گی کہ اس کی چھتیس ہزار فوج کے مقابلے میں ہمارے پاس محض پانچ ہزار نو سو سپاہی ہیں۔ اس بات کا فیصلہ اب ہم دونوں کی تلواروں پر چھوڑ دیں تاکہ شہر کے اصل حاکم کا اندازہ ہو سکے۔''

چارلس اس پیغام سے جز بز ہونے لگا لیکن اس کے سوا اب اور کوئی راہ دکھائی نہ دیتی تھی۔ وہ ایک بار پھر طوفانی موسم کے خاتمے کا انتظار کرنے لگا لیکن طوفان تھمنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ اس کی شدت مزید رفتار پکڑنے لگی۔ سپاہیوں کے لیے بھوک بھی اب ناقابل برداشت ہو رہی تھی۔ وہ ساحل سے ہی نہیں الجزائر کے بھی کسی نہ کسی حصے سے خوراک لانے سے قاصر تھے۔ عیسائی سپاہ دھیرے دھیرے اپنی قوت برداشت و مزاحمت کھونے لگی۔ ڈوریا بھی اس دوران دوبارہ کہیں غائب ہو چکا تھا۔ اس کے بارے میں آخری اطلاع یہی موصول ہوئی تھی کہ میٹفو فاسٹ تک پہنچائے گئے اس کے دو تباہی جہاز اور کشتیاں سلامت رہ گئی تھیں۔

ڈوریا اس موقع پر درحقیقت خود ہی منظر عام سے غائب ہوا تھا۔ اس کی برداشت کا پیمانہ بھی اب لبریز ہو چکا تھا۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ مقابلہ جاری رکھنا اب ممکن نہیں رہا ہے۔

سپاہیوں کی بھوک کا بندوبست کرنے کے لیے چارلس نے موسم کی خطرناکی کی پروا کیے بغیر جرمن سپاہیوں کا ایک فوجی دستہ ساحل پر روانہ کر دیا تاکہ سامان رسد یہاں لایا جا سکے۔ سپاہیوں کے پاس حکم کی تعمیل کے سوا اور کوئی چارہ بھی نہ تھا۔ وہ پژمردگی اور آس کی ملی جلی کیفیات لیے آگے بڑھے اور چارلس کے ایک اور غلط فیصلے کی بھینٹ چڑھ گئے۔ دستے کے ساحل پر پہنچتے ہی پہلی دید سامان رسد کی انتہائی معمولی مقدار اور اس کے گرد بکھری بے شمار لاشوں کی ہوئی۔ جرمن سپاہی اس بچے کھچے سامان رسد کو سمیٹنے ہی لگے تھے کہ بربری مسلمانوں نے ان پر حملہ کیا اور موت کے گھاٹ اتار کر وہ سامان بھی اپنے قبضے میں لے لیا۔

قبائلیوں اور حسن آغا کو ہنوز ڈوریا کی تلاش تھی لیکن وہ انہیں کہیں بھی دکھائی نہ دے رہا تھا۔ ان میں سے کسی کو بھی اندازہ نہیں تھا کہ وہ میٹفو فاسٹ سے براستہ خشکی الجزائر کی طرف روانہ ہو چکا تھا تاہم موسم کی خطرناکی اس کا مزاج بھی اچھی طرح دریافت کر رہی تھی۔ اس ہولناکی کا سامنا کرتے ہوئے ڈوریا کے دل کو ایک اطمینان بہرحال

ضرور نصیب ہوا تھا کہ سپاہیوں کے ہمراہ جشنِ فتح منانے کے لیے آنے والوں کی اکثریت بربریوں کے تسلط میں جاچکی تھی۔ اسے بھی اپنی سپاہ کی کسمپرسی کے تصور نے پژمردہ کر رکھا تھا اور حقیقت یہی تھی کہ عیسائی سپاہ کے اعصاب نہایت شکستہ ہو چکے تھے۔ وہ بھوک اور نقاہت کے باوجود باب الاذن پر قابض ہونے کے لیے جان لڑا رہے تھے کیونکہ انہیں اچھی طرح علم تھا کہ باہر رہنا براہِ راست موت سے جنگ کے مترادف ہے۔ بھوک، بارش، سردی اور طوفانی ہوائیں انہیں لحہ بہ لحہ اسی جنگ کی جانب دھکیل رہی تھیں۔ انہوں نے باہمی حکمتِ عملی کے تحت کئی محاذوں پر لڑنے کے بجائے صرف ایک محاذ پر دباؤ بڑھانے کا فیصلہ کیا تھا تاکہ یہاں کامیابی کی صورت میں دیگر محاذوں کو بھی بہ آسانی سر کیا جا سکتا تھا۔ ان کی آخری امید ٹیلوں پر نصب توپیں تھیں۔ یہ توپیں بالکل تیار حالت میں تھیں۔ انہیں فلیتہ دکھا کر جلا دینے کی ہی تاخیر تھی۔ قباحت یہ تھی کہ ان تیز ہواؤں میں فلیتے جلانا بھی بے حد دشوار ہو رہا تھا۔ نہایت دقتوں سے فلیتے آگ کی زد میں آئے تو امید کی آخری شمع بھی گل ہو گئی۔ فلیتہ اور بارود پانی میں بھیگ جانے سے ناکارہ ہو چکے تھے۔ سپاہی مزید بددل ہو گئے۔

ان سپاہیوں میں واحد تا حال پُرجوش شخص چارلس کا داماد تھا۔ وہ اسی جوش و جذبے سے مغلوب ہو کر فصیل کی جانب پیش قدمی کرنے لگا۔ اسے گھنگھور گھٹاؤں کی سیاہی اور شب کی تاریکی کا ہولناک ملاپ بھی بددل نہیں کر پارہا تھا۔ اس نے بہ وقتِ آمد چارلس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اگلی صبح تک باب الاذن کو توڑ کر شاہی لشکر شہر میں داخل ہونے کے قابل بنا دے گا۔ اپنی بھرپور توانائی صرف کرتے ہوئے انہیں گمان بھی نہیں تھا کہ چارلس کے ذہن میں واپسی کا خیال کلبلانے لگا ہے۔ اس کے خیالات سے بے خبر چارلس پُرامید تھا کہ الجزائر رسائی ان کے سارے مصائب کا خاتمہ کر دے گی۔ اس کی یہ امیدیں اس لمحے مزید توانا ہو گئیں جب ڈوریا بھی ان کے دستے تک آپہنچا۔ ان توانائیوں کی عمر بہت مختصر ثابت ہوئی۔ ڈوریا کی حالت بھی کم دگرگوں نہ تھی۔ خوش کن بات صرف یہ تھی کہ ڈوریا کے پاس کچھ سامانِ رسد موجود تھا۔

چارلس نے ایک بار پھر کم ظرفی اور تنگ دلی کا ثبوت دیتے ہوئے یہ سامان اپنے تصرف میں کروایا اور بھوکوں میں تقسیم کر دیا۔ اس کے بعد چارلس نے ڈوریا کو اپنے پاس طلب کر لیا۔

''کہاں سے آرہا ہے تُو؟'' اس نے سرد مہری سے دریافت کیا۔

''شہنشاہِ معظم! مجھے موسم کی ان کرتوتوں کا اچھی طرح اندازہ ہو گیا تھا اسی لیے کچھ جہاز ٹیمنڈ فاسٹ پہنچا دیے تھے۔''

ڈوریا کے انداز و جواب نے چارلس کو قدرے نرم کر دیا۔

''تُو نے عقل مندی کا مظاہرہ کیا ورنہ آج ہم ایک سو پینتالیس جہازوں سے زائد نقصانات کا ماتم کر رہے ہوتے۔''

''شہنشاہِ معظم! مجھے یہاں کئی سپاہی پانی میں شرابور ٹھٹھرے نظر آئے ہیں تو کئی بھوک سے بھی بلبلا رہے ہیں۔ ہمارا سامان آخر کہاں گیا؟'' وہ حیرت سے بولا۔

''سپاہی اپنے ساتھ سامانِ رسد لائے ہی بہت کم تھے۔ انہیں یقین تھا کہ اس جنگ میں جیت ہماری ہو گی جس کے بعد الجزائر کے شہروں سے سامانِ رسد مل ہی جائے گا۔'' اس نے غصے سے جواب دیا۔

''ہر طرف لاشیں بکھری ہیں۔ بارش نے یقیناً اسلحہ بھی ناکارہ کر دیا ہو گا۔ ایسی صورت میں ہم جنگ لڑنے کے اہل ہی کہاں ہیں؟'' ڈوریا نے تاسف سے کہا۔

''جو بھی ہو...... سپاہیوں کے حوصلے اب بھی بلند ہیں۔ وہ کسی نہ کسی طرح شہر میں داخل ہو کر رہیں گے۔ وہاں انہیں سبھی مطلوبہ اشیا مل جائیں گی۔'' چارلس نے اپنی تشویش پوشیدہ رکھتے ہوئے بھرم جتایا۔

حالات سے مکمل باخبر نہ ہونے پر ڈوریا کو بھی اندازہ نہ ہو سکا کہ وہ روم کے ان تین سو سورماؤں کے بارے میں بھی تشویش زدہ تھا جو اس مقدس جنگ میں حصہ لینے آئے تھے۔ وہ بھوک اور نقاہت سے بے حال تھے۔ انہیں شاہی رسد سے صرف ایک وقت کی غذا فراہم کی جانی ممکن ہو پارہی تھی۔ یہ تین سو افراد چارلس ہی کی طرح خندقوں میں پناہ لینے پر مجبور تھے۔ یہ پناہ گاہ بھی انہیں مکمل تحفظ فراہم کرنے سے قاصر تھی۔ یہاں طوفانی ہواؤں سے تو سکون میسر آجاتا لیکن تیز رفتار بارش کا پانی نکالنا بے حد دشوار تھا۔

(جاری ہے)

ماخذات:

سلیمان عالی شان۔۔ تاریخِ افریقا۔۔
تاریخ الجزائر۔۔ خلافتِ اندلس

ناموس

ناہید سلطانہ اختر

زندگی کا کوئی بھی باب ہو ابتدا میں ہر ایک کا تجربہ مختلف ہوتا ہے... کسی کی یادوں میں تلخیاں اور کسی کے حصے میں محبتوں اور آسائشوں کی برسات لاتا ہے... ایک ہی مقصد کے تحت گھر سے نکلنے والی وہ دو بہنیں بھی دو مختلف سمتوں کی مسافر تھیں... کسی نے عزت و ناموس کو مقدم سمجھا اور کسی نے دولت و عیش پر ہاتھ صاف کیا... پھر یہی ہونا تھا جو ہوا... کیونکہ ببول بو کر کبھی گلاب حصے میں نہیں آسکتے۔

بے وفائی سے جنم لینے والے حزن و ملال اور حسرتوں کا عبرت اثر احوال

وہ دو بہنیں تقسیم ہند کے بعد ہمسایہ ملک ایران سے نو آزاد مملکت پاکستان کے دارالخلافہ کراچی آئی تھیں۔ بڑی بہن کا نام نیلوفر تھا، چھوٹی کا یاسمین۔ دونوں خوبرو، تعلیم یافتہ اور بے باک تھیں۔ مادری زبان فارسی تھی۔ انگریزی میں بھی رواں تھیں۔ باپ پٹھان تھا، ماں ایرانی، سو پشتو بھی تھوڑی بہت سمجھ لیتی تھیں۔ نو آزاد مملکت

پاکستان میں ان کے باپ کی جڑیں گڑی تھیں جو ایرانی خاتون سے شادی کے بعد ایران ہی کا ہو رہا تھا۔ ان کی ماں ایک پڑھی لکھی اور روشن خیال عورت تھی۔ شوہر کی مرضی کے برعکس اس نے دونوں بیٹیوں کو بھی اس زمانے کے اعتبار سے جدید تعلیم سے آراستہ کیا تھا۔ دونوں کو اس نے ٹائپنگ بھی سکھائی تھی کہ اس زمانے میں ٹائپنگ دفاتر میں کام کرنے والی خواتین کے لیے اضافی مہارت سمجھی جاتی تھی۔ دونوں بہنیں ماں کی ترغیب پر ہی پاکستان آئی تھیں جہاں ان کی زیرک ماں کے خیال میں خواتین آبادی کی اکثریت ناخواندہ یا معمولی پڑھی لکھی تھی اور مشرقی رسوم و قیود کی پابند ہونے کے باعث ان دونوں بہنوں کے لیے دفاتر میں ملازمت، ترقی اور تابناک مستقبل کے مواقع زیادہ ہو سکتے تھے۔ اگرچہ باپ دو جوان بیٹیوں کو محض نوکری کے لیے دوسرے ملک میں بھیجنے کے حق میں نہ تھا مگر بیوی کے سامنے اس کی ایک نہ چلی۔

دونوں بہنوں کو شروع میں خاصی مشکل ہوئی مگر اپنی تعلیم، انگریزی زبان میں روانی، ذہانت اور ٹائپنگ میں مہارت کے باعث نیلوفر کو جلد ہی ایک وزارت میں پرائیویٹ سیکریٹری کی ملازمت مل گئی اور یاسمین شہر کے ایک بڑے ہوٹل میں استقبالیہ کی زینت بن گئی۔ اس ہوٹل کی شہر بھر میں شہرت تھی۔ کھاتے پیتے اور امیر لوگ اس ہوٹل میں آ کر کھانا پینا اپنی شان سمجھتے تھے۔ روزانہ ضیافتیں ہوتیں، شادی اور دوسرے کی دعوتیں ہوتیں، مخصوص مواقع پر محفلیں سجتیں، نوع بہ نوع لذیذ اور اشتہا انگیز کھانے پکانے والے باورچی شفٹوں میں صبح سے رات گئے تک مصروف رہتے اور سفید وردی والے بیرے گاہکوں کو فوری اور بہترین خدمات فراہم کرنے کے لیے اڑے اڑے پھرتے۔ تنخواہ کے علاوہ فیاض گاہکوں سے ملنے والی بخشش اور بچا ہوا کھانا اپنے گھر لے جانے کی مسرت انہیں ہر لمحہ چاق و چوبند رکھتی۔

ہوٹل کا مالک داؤد احمد خاندانی امیر آدمی تھا۔ ہوٹل اس کا کاروبار تو تھا ہی، شہر کے طبقۂ امراء میں اپنی مخصوص شناخت رکھنے کا ذریعہ بھی تھا۔ بااثر اور مالدار افراد کا اپنے اہلِ خانہ اور احباب و اقارب کے ساتھ اس ہوٹل میں نشست جمانا اور کھانا پینا داؤد احمد کے لیے فخر و تسکین کا سبب تھا۔ دور دراز کے علاقوں سے آنے والوں کے قیام کے لیے بالائی منزل پر آراستہ و پیراستہ رہائشی کمروں کی سہولت بھی میسر تھی۔ ہوٹل کے علاوہ داؤد احمد کے دیگر ذرائع آمدن بھی تھے مگر داؤد احمد کی اصل وجہ شہرت یہ ہوٹل ہی تھا۔

داؤد احمد شادی شدہ تھا۔ اس کی بیوی زرینہ سادہ سی گھریلو عورت تھی جسے ناز و انداز سے کوئی سروکار نہ تھا۔ داؤد سے اس کی شادی اس کے اور داؤد کے گھرانوں کے قریبی مراسم کے باعث ہوئی تھی۔ وہ اپنے گھر سے شوہر کی اطاعت اور خوشنودی کو مقدم جاننے کا سبق لے کر داؤد کی زندگی میں آئی تھی۔ اس کے سامنے سر جھکائے رکھتی۔ داؤد کے گھر میں اسے ہر نعمت میسر تھی مگر شادی کو پچیس برس سے زائد عرصہ گزر جانے کے بعد بھی وہ اور داؤد اولاد کی نعمت سے محروم تھے۔

نیلوفر نے اپنی وزارت میں آنے جانے والے ایک شخص سے جس کا مستقل قیام انگلستان میں تھا، پینگیں بڑھا لیں اور اس سے شادی کر کے اس کے ساتھ انگلستان چلی گئی۔ چھوٹی بہن یاسمین سے کچھ عرصہ خط و کتابت رہی پھر بتدریج متروک ہو گئی۔ ایران میں ان کی ماں اچانک حرکت قلب بند ہو جانے سے انتقال کر چکی تھی۔ باپ کی ترش طبعی کے باعث دونوں بہنوں کو اس سے پہلے بھی کوئی خاص انس نہ تھا۔ ماں کے بعد تعلق بالکل ہی ختم ہو گیا۔

داؤد احمد نے اولاد کی خاطر یاسمین سے شادی کر لی۔ زرینہ عورت تھی۔ شوہر کی دوسری شادی سے اس کا دل تو دکھا مگر داؤد سے شادی کے طویل عرصے بعد بھی اس کا بے اولاد رہنا ایسا سبب تھا کہ وہ داؤد کی دوسری شادی پر کوئی احتجاج نہ کر سکی۔ داؤد پچاس کے پیٹے میں تھا، یاسمین نوخیز تھی۔

یاسمین سے شادی کے بعد داؤد احمد نے اسے اپنی پہلی بیوی سے علیحدہ ایک کوٹھی میں رکھا جو کہ اس نے اپنے دوستوں کے لیے بیٹھک اور مہمانوں کے لیے مہمان خانے کے طور پر تصرف میں رکھا تھا۔ کوٹھی شہر کے دولت مند گھرانوں کے علاقے میں واقع تھی۔ چاروں اطراف سبزہ زار تھا۔ کوٹھی کا ہر کمرا قیمتی فرنیچر، دبیز قالینوں، ریشمی پردوں اور آرائشوں سے مزین تھا۔ لیونڈر داؤد احمد کی پسندیدہ خوشبو تھی۔ کوٹھی ہمہ وقت لیونڈر کی خوشبو سے مہکتی۔ گھر کے کام کاج کے لیے پہلے ہی ایک ملازمہ اور اس کا شوہر موجود تھے۔ یاسمین سے شادی کے بعد داؤد نے اس کے لیے پردوں والی موٹر کار اور شوفر کا بندوبست بھی کر دیا۔ اپنی کاروباری مصروفیات کے باعث اس نے یاسمین کی تنہائی بانٹنے کے لیے اپنے ہوٹل کے ایک ملازم کی ادھیڑ عمر بیوہ ماں کو دن بھر یاسمین کی مصاحبت کے لیے رکھ لیا جو یاسمین کو داؤد کے مسلک کے دینی شعائر سے آگاہ کرتی اور اسے اردو بولنا بھی سکھاتی۔ شام کو جب یاسمین پردوں والی موٹر کار میں ہوا خوری کے لیے باہر جاتی تو وہ عورت بھی اس کے ہمراہ

ہوتی۔ شادی کے بعد داؤد کو ایرانی بلیوں کے لیے یاسمین کی چاہت کا علم ہوا تو اس نے اسے تین ایرانی بلیاں منگوا دیں۔ مرد عمر رسیدہ ہو اور بیوی جوان تو وہ عورت کی ناز برداری کا سامان کرتا ہی ہے۔

یاسمین کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ ایک نوآزاد ریاست میں اچھی ملازمت کی تلاش میں آنے پر اسے اتنی پُرآسائش زندگی میسر آ جائے گی۔ داؤد احمد سے شادی کے بعد اسے اپنی ذاتی ضروریات پوری کرنے کے لیے بھی زیادہ تگ و دو کی ضرورت نہ رہی تھی۔ صبح کو میز پر ناشتا تیار ملتا۔ دوپہر کو خانساماں کھانا پکاتی ہی تھی، داؤد بھی ہر روز ہوٹل سے اس کے لیے کچھ نہ کچھ بھجوا دیتا۔ رات کو اس کے کہنے سے پہلے ہی کھانا میز پر لگ جاتا۔ رات گئے داؤد گھر آتا تو بھی خالی ہاتھ نہ ہوتا۔ یاسمین سے شادی کے بعد وہ زرینہ کے پاس دن ہی میں جاتا تھا۔ رات یاسمین کے ساتھ ہی بسر کرتا۔ یاسمین کو اس کے کپڑے دھلے اور استری کیے ملتے۔ اس کے بالوں میں کنگھا ملازمہ کرتی۔ دن بھر اس کی مصاحبت معمر عورت کرتی۔ ہر شام پردوں والی موٹر کار میں بیٹھ کر وہ ہوا خوری کے لیے یوں نکلتی جیسے کوئی ملکہ اپنی اقلیم کا جائزہ لینے جا رہی ہو۔ یہ سب کچھ ایک طرف، داؤد اس کی اتنی ناز برداری کرتا جیسے روئے زمین پر وہ ایک ہی تو دل پسند عورت تھی اس کے لیے۔

وہ عورت جو داؤد نے اپنی عدم موجودگی میں یاسمین کی تنہائی بانٹنے کے لیے رکھی تھی، صبح کو اس کا بیٹا اپنی نوکری پر جاتے ہوئے اسے کوٹھی تک پہنچا جاتا۔ رات کو گھر واپس جاتے ہوئے اسے اپنے ساتھ واپس لے جاتا۔ ماں بیٹا دونوں خوش تھے کہ ادھر ہوٹل ملازمین میں بیٹے کی اہمیت بڑھ گئی تھی اور ادھر ماں یاسمین کی نوازشوں سے فیض پاتی۔ تقسیم کے ہنگاموں میں اس عورت کا خاوند بلوائیوں کے ہاتھوں شہید ہو گیا تھا۔ نوعمر اکلوتے بیٹے سلیم الدین کے ساتھ ہجرت کی صعوبتیں اٹھاتی وہ پاکستان پہنچی تھی۔ خاندانی عورت تھی۔ ماں اور بیٹا کچھ عرصہ کیمپ میں پڑے رہے پھر مہاجرین کے لیے قائم ایک نوتعمیر بستی میں پڑاؤ ڈال دیا۔ بیٹے کو داؤد احمد کے ہوٹل میں بیرا گیری کی نوکری مل گئی۔ داؤد احمد کی اعانت سے دونوں نے مل جل کر مہاجرین کی اس بستی میں ایک چھوٹا سا گھر بنا لیا۔ ماں نے اپنی ہی طرح کے ایک مہاجر گھرانے کی پندرہ سولہ سالہ لڑکی دیکھی اور اپنے نوجوان اکلوتے بیٹے کا گھر بسا دیا۔ ماں دیندار تھی۔ اسلامی شعائر سے آگاہ اور صوم و صلوٰۃ کی پابند تھی۔ داؤد احمد گھر بنانے کے لیے ان کی مدد کرتے ہوئے سلیم الدین کی ماں سے بھی ملا تھا۔ وہ اسے اچھے طور طریقوں کی عورت لگی تھی۔ اسی لیے اس نے یاسمین کی مصاحبت کے لیے اسے مناسب سمجھا تھا۔ ماں بیٹا دونوں اس اعزاز پر خوش تھے۔ رات کو سلیم الدین ہوٹل سے اتنا کھانا گھر لے جاتا کہ اس کی بیوی رخسانہ کو صبح ناشتے کے لیے اور دوپہر کو اپنے کھانے کے لیے کچھ پکانے کی حاجت نہ رہتی۔ صبح کو ناشتے کے لیے بس چائے بنانے کی ضرورت ہوتی۔ سلیم الدین کی ماں بھی کوٹھی سے خالی ہاتھ گھر واپس نہ جاتی۔ کبھی پھل، کبھی مٹھائی، کبھی بچی ہوئی ڈبل روٹی اور کبھی یاسمین اور داؤد کے استعمال شدہ کپڑے جنہیں سلیم اور اس کی بیوی تراش خراش کرا کے اپنے ناپ کا کرتے اور نہایت شوق سے پہنتے۔ یاسمین کے صوفیانہ رنگ کپڑے تو ماں خود بھی پہن لیتی۔ بہرحال، بیٹا داؤد کے ہوٹل کی نوکری اور ماں یاسمین کی مصاحبت کر کے بہت خوش تھے۔ ماں اٹھتے بیٹھتے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کرتی جس نے اچھے اور مہربان لوگوں سے واسطہ ڈال دیا تھا۔ شام کو پردوں والی موٹر کار میں بیگم کی سیر و تفریح میں اس کا ساتھ دینا سلیم الدین کی ماں کو تازہ دم کر دیتا۔ وہ بہو کو ہر روز نیا قصہ سناتی۔ ''آج بیگم صاحب سمندر کی سیل (سیر) کو گئی تھی۔''

''منوڑا؟'' بہو اشتیاق سے پوچھتی۔

''منوڑا شنوڑا میں نہ جانوں..... سمندر تھا اور اس میں کشتیاں اور دور بڑے بڑے جہاز۔''

''آج بیگم سلیما (سینما) دیکھنے گئی تھی۔ میں تو اپنی آنکھاں بند کیے بیٹھی رہی۔''

''کیوں اماں؟'' بہو پوچھتی۔

''ہاں صدقے، گناہ ہووے ہے۔''

''تو پھر بیگم کیوں گئی تھی؟''

''بڑے لوگوں کی بڑیاں باتاں..... میری تو مجبوری تھی..... نوکری جو ہوئی۔ بڑے بوڑھوں کی مثل ہے، نوکری تیرے نو نام، دسواں سلام۔''

''کیا مطلب اماں؟''

''مطلب یہ کہ نوکری کرو تو مالک کا ہر حکم سننا اور ماننا پڑے ہے۔ نہ مانو تو چھٹی۔''

''اماں! بیگم خوب صورت ہے؟'' بہو پوچھتی۔

''ہاں نا..... خوب صورت ہی تو ہے جو ہوٹل والے نے اس سے شادی کر لی۔''

"یہ بتاتے ہیں، پہلے ہوٹل پہ چلتی تھی۔"
"ماں صدقے، شریف مرد کو جب کوئی عورت بھا جاوے تو اسے عزت سے گھر بٹھا لیوے ہے۔۔۔ ہوٹل والا ہے شریف آدمی۔"
"پہلی بیوی کچھ نہیں بولی؟"
"کیوں۔۔۔ کیوں بولتی۔۔۔ دین ایک مرد کو چار کی اجازت دیوے ہے۔"
"اماں! سوکن تو سوکن ہوتی ہے۔"
"ماں صدقے۔۔۔ مرد کی خوشی کے لیے عورت کو برداشت کرنا پڑے ہے۔ ہوٹل والا امیر آدمی ہے۔ چار کا خرچہ اٹھا سکے ہے۔"
بہو دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کرتی کہ اس کا شوہر امیر آدمی نہیں تھا۔
"شہزادیوں کی طرح رہوے ہے بیگم۔"
"اور پہلی؟"
"اس کا میں نہ جانوں مگر کمی اسے بھی نہ ہوگی کسی چیز کی۔"
"کمی تو ہے نا اماں! یہ بتاتے ہیں، اولاد نہیں ہے کوئی اس کی۔"
"اولاد تو ابھی تک اس دوسری سے بھی نہ ہوئی ہے۔"
"دوسری سے بھی نہ ہوئی تو کیا ہوٹل والا تیسری کرے گا؟"
"مجھے کیا پتا۔۔۔ بیگم پہ تو وہ جان چھڑکے ہے۔ اس کے ہر قدم پہ بسم اللہ۔"
"تمہیں کیسے پتا اماں؟"
"ماں صدقے۔۔۔ اللہ پاک کو دیکھا نہیں تو کیا عقل سے تو پچھانا (پہچانا) ہے۔ عورت کے لیے مرد کا پیار اس کی آنکھوں سے جھانکے ہے۔"
"اچھا اماں!" الھڑ بہو حیرانی سے دوراندیش ساس کو دیکھتی۔
"ہاں۔"
بہو کی چشم تصور میاں کی آنکھوں میں جھانکنے لگتی۔
سلیم الدین کی ماں کو کوٹھی میں بسی لیونڈر کی مہک اپنے چھوٹے سے نیم پختہ گھر میں بھی یاد آتی رہتی۔ لیونڈر کی خوشبو جیسے اس کی سانسوں میں بس گئی تھی۔ گرمی کے موسم میں جب نوکر کوٹھی کے برآمدوں کی دھلائی کرتا تو یہ خوشبو اور نکھر جاتی۔
سلیم الدین کی ماں سے بہو کا ذکر سن سن کر ایک روز بیگم نے جو کہ اب خود بھی اردو بولنے لگی تھی، بڑی بی سے اپنی بہو کو بھی اپنے ساتھ کوٹھی پر لانے کو کہا۔ سلیم الدین کی ماں تو جیسے اس بات کے انتظار ہی میں تھی۔ اگلے ہی دن بہو کو اپنے ساتھ کوٹھی پر لے گئی۔ وہ دن بھر وہاں رہی۔ بیگم کچی پکی اردو میں اس سے باتیں کرتی رہی۔ بہو نے کوٹھی کی آرائش کو حیرت سے دیکھا۔ ایرانی بلیوں کو دیکھ کر متعجب ہوئی کہ ایسی بھی بلیاں ہوتی ہیں جو دیسی غریب بلیوں کی طرح گلیوں میں رلتی نہیں پھرتیں۔ کوڑے کرکٹ میں اپنا رزق تلاش کرنے کے بجائے ابلا ہوا گوشت مالکوں کے ہاتھوں سے کھاتی ہیں۔ چینی کی رکابیوں میں دودھ پیتی ہیں۔ شام کو جب بیگم موٹر کار میں ہوا خوری کے لیے نکلی تو بڑی بی کے علاوہ بہو کو بھی گاڑی میں بٹھا لیا۔ وہ راستے بھر موٹر کی کھڑکی پر تنا پردہ چٹکی سے پکڑ کر بار بار باہر جھانکتی رہی۔ سلیم الدین اس روز ماں کے ساتھ بیوی کو بھی کوٹھی سے گھر لے جانے کے لیے آیا تو بیگم، بہو کو بہت سی چیزیں ساتھ لے جانے کے لیے دے چکی تھی۔ رخصت کرتے وقت بیگم نے بہو کو پھر آنے کی دعوت دی جو اس نے بے حد گرمجوشی سے قبول کی۔ اس کا بس چلتا تو وہ وہیں رہنے لگتی۔ گھر واپسی پر بہو نے دن بھر کی روداد اور بیگم کی شان و شوکت اور ٹھاٹھ باٹھ کا قصہ آنکھیں پھیلا پھیلا کر شوہر کو سنایا۔
"بڑے لوگوں کے یہی ٹھاٹ ہوتے ہیں۔" سلیم الدین نے کہا۔
"ایمان سے ایسے ٹھنڈے ٹھنڈے کمرے تھے کہ میرا تو جی چاہ رہا تھا پڑ کر سو جاؤں۔" بہو بولی۔
"سو جاتی، کسی نے منع کیا تھا؟" سلیم الدین بولا۔
"لو، بیگم یہ نہ کہتی کہ گنوار یہاں سونے کو آئی ہے۔۔۔ اور خوشبو تو ایسی تھی کوٹھی میں جیسے جنت کی خوشبو۔"
"جنت کی خوشبو کا پتا ہے تجھے؟" سلیم الدین نے میٹھی میٹھی نظروں سے بیوی کو دیکھتے ہوئے کہا۔
"ایسی ہی ہوتی ہوگی جیسی کوٹھی میں تھی۔۔۔ اور پتا ہے کیا، شام کو میں بیگم کے ساتھ سیل (سیر) کو بھی گئی تھی۔۔۔ اماں بھی ساتھ تھیں۔"
"اماں کی تو روز کی ڈوٹی (ڈیوٹی) ہے۔۔۔ کیوں اماں! ہے نا؟"
"ہاں بیٹے! روز جاؤں ہوں بیگم کے ساتھ۔ میرا تو جی بھر گیا ہے اب سیل سے۔" ماں نے اپنی دانست میں بہو کو بھی سیر و تفریح سے متنفر کرنا چاہا۔
"لو، سیل سے بھی کوئی دل بھرتا ہے۔" بہو بولی۔
"اری دلہن، جب سیل روزانہ ہو تو جی بھر ہی جاتا

ہے۔ کوٹھی سے نکلے، بندر روڈ پہنچ گئے۔۔۔ بندر روڈ سے سیدھے سمندر پہ۔۔۔ بیگم کو سمندر کی سیل بہت بھاوے ہے۔"
"اماں! پھر چلوں گی کسی دن تمہارے ساتھ۔"
"جلدی نہیں۔۔۔ کچھ ٹھہر کے۔۔۔ بڑے بوڑھے کہوے ہیں، قدر کھو دیوے ہے روز کا آنا جانا۔ میری تو مجبوری ہے۔۔۔ نوکری جو ہوئی۔"
"ہاں، ہاں۔ مجھے بھی جلدی تھوڑی ہے۔" بہو جھینپ کر بولی مگر دل ہی دل میں اسے ساس سے پرخاش محسوس ہوئی کہ بڑھیا خود تو سارا دن ٹھنڈے ٹھنڈے خوشبودار کمروں میں گزار کر آتی تھی اور جب اس نے دوبارہ جانے کو کہا تو اسے بڑے بوڑھوں کی کہاوت یاد آگئی۔ خود کون سی جوان تھی بڑھیا جو اسے بڑے بوڑھوں کی مثل یاد آرہی تھی۔
رات کو جب بہو اپنے پلنگ پر لیٹی تو اسے بیگم کی خوبصورت چھپر کھٹ یاد آگئی جس پر گلابی ساٹن کی چادر بچھی تھی۔ لالٹین کی مدھم مدھم روشنی میں اپنے کھردرے ہاتھوں کو الٹ پلٹ کر دیکھتے ہوئے بہو کے دل میں ہوک سی اٹھی۔ بیگم کے ہاتھ کیسے گورے گورے اور نرم و ملائم تھے۔ اس کا جی تو چاہ رہا تھا بیگم کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اس کی نرماہٹ محسوس کرے مگر تکلف مانع رہا تھا۔ ہاں، اور بیگم کے بال کتنے چمکیلے تھے۔ دھلے دھلائے گھنگرالے۔۔۔ اور اس کے پیروں کی گرگابیاں تو جیسے بہو کے دل ہی میں اتر گئی تھیں۔۔۔ نرم اور مخملیں۔
ساس کے ساتھ داؤد احمد کی کوٹھی پر جانا اور بیگم سے ملنا اور اس کے ٹھاٹ باٹ دیکھنا بہو کے لیے ایک حیرت خیز تجربہ تھا۔ زندگی اتنی پُرآسائش بھی ہو سکتی ہے، اس نے زندگی کا یہ روپ پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ اگلے چند دنوں کے دوران اس نے شوہر اور ساس سے کئی مرتبہ بیگم کے ٹھاٹ باٹ کا نہایت لگاوٹ سے تذکرہ کیا۔ ساس جہاندیدہ تھی، سمجھ گئی کہ امنگوں بھرا دل رکھنے والی جوان بہو کو دوبارہ کوٹھی پر لے جا کر اس کے دیدوں میں ہوائیں بھرنے دے گی۔ آنے والے دنوں میں بہو نے کئی مرتبہ اس کے ساتھ کوٹھی پر جانے کی فرمائش کی اور اسے یہ بھی یاد دلایا کہ بیگم نے اسے دوبارہ آنے کی دعوت دی تھی مگر ساس زمانہ شناس عورت تھی، ٹال گئی۔

☆☆☆

اولاد خدا کی ہر دوسری نعمت کی طرح اللہ کی دین۔۔۔ جسے چاہے دے، جسے نہ چاہے، نہ دے۔۔۔ اور دینے میں بھی تقسیم۔ جسے چاہے بیٹا دے، جسے چاہے بیٹی اور جسے چاہے دونوں ہی۔
یاسمین سے بھی داؤد احمد کے ہاں اولاد نہ ہوئی۔ جتن بہت کیے۔ منتیں، مرادیں، ٹونے ٹوٹکے، علاج معالجے، صدقہ خیرات مگر اللہ کی مرضی ہی نہ تھی۔ سوکھی شاخ سوکھی ہی رہی مگر اولاد نہ ہونے کے باوجود جوں جوں وقت گزرتا گیا، یاسمین سے داؤد احمد کی محبت دن بہ دن بڑھتی چلی گئی۔ اب وہ پہلی بیوی کے پاس بہت ہی کم آتا جاتا۔ اس بے چاری کو اب داؤد کے انتظار کے سوا کوئی اور کام ہی نہ رہ گیا تھا۔ گھر کے کام کاج کے لیے گھر میں نوکر چاکر تھے۔ وہ دن رات داؤد کے انتظار میں رہتی۔ وہ آتا تو اس کے سامنے بچھ بچھ جاتی مگر داؤد کو تو اب فرصت ملتے ہی یاسمین کے پاس جانے کی جلدی ہوتی۔ زرینہ سے اس کی قربت برائے نام رہ گئی تھی۔ یاسمین جوان تھی، خوب صورت تھی، طرح دار تھی۔ دل کو لگی عورت مرد کو اس کے دوستوں سے بھی بے نیاز کر دیتی ہے۔ یاسمین سے شادی کے بعد داؤد کی اپنے دوستوں کے ساتھ محفلیں بتدریج معدوم ہی ہو گئی تھیں۔ وہ کوٹھی جہاں اس کی اپنے دوستوں کے ساتھ محفل آرائی ہوا کرتی تھی، وہاں تو اب اس کی دوسری بیوی رہتی تھی جو نہ صرف اس کی کوٹھی بلکہ اب اس کے دل میں بھی اپنا گھر کر چکی تھی۔
داؤد جیسے دولت مند آدمی کی شریک حیات ہونے کے باوجود زرینہ کو بے مائیگی کا احساس تھا۔ وہ داؤد کو اس کے اثاثوں کا وارث دینے سے محروم رہی تھی۔ جانتی تھی کہ داؤد کو اولاد کی از حد چاہت تھی مگر اولاد کا ہونا اس کے اختیار میں کب تھا۔ یہ تو اللہ کی دین تھی۔ اس کی عطا تھی پھر بھی ایک احساسِ جرم زرینہ کے دل میں پنجے گاڑے رکھتا۔ اولاد خریدی جانے والی نعمت ہوتی تو وہ خود کو بیچ کر داؤد کے لیے اولاد خرید لیتی۔ لوگ بیٹوں کی تمنا کرتے ہیں، زرینہ سوچتی۔۔۔ بیٹا نہ سہی، بیٹی سہی۔۔۔ ایک ہی سہی۔۔۔ مگر سوچنے سے خواہشیں کب پوری ہوتی ہیں۔۔۔ اوپر والے کی مرضی۔۔۔ اس کی عطا۔
یاسمین جوان اور خوب صورت تو تھی ہی، پُرادا بھی تھی۔ اسے اپنے اور داؤد کے درمیان عمر کے فرق کا احساس حد سے سوا تھا۔ زرینہ کی طرح شوہر کی اطاعت اور خدمت کو اپنا نصب العین سمجھنے کے بجائے وہ داؤد سے اپنی ناز برداریاں کراتی۔ ہر وقت بنی سنوری اور خوشبو میں بسی رہتی۔ داؤد اس کی ہر ادا پر نثار ہوتا۔ اس کے منہ سے نکلی ہر

...پوری کرتا۔ اس کی معمولی سی تکلیف پر بے چین ہو جاتا۔ داؤد سے شادی کے بعد اسے ایسی شاہانہ زندگی میسر آئی کہ نہ اسے کبھی اپنی مرحومہ ماں یاد آئی نہ باپ کا خیال ستاتا۔ رہی بہن نیلوفر تو اسے بھی وہ تقریباً بھول ہی گئی تھی۔ آپ سکھ جہان سکھ والا معاملہ تھا۔ عرصے میں نیلوفر بھی ...روی کر چلے تو وہ بھی خط لکھ کر حال چال پوچھ لیا کرتی تھی، اب وہ سلسلہ بھی بند ہوا تھا۔

اولاد نہ ہونے کے باوجود یاسمین پر داؤد کی والہانہ وارفتگی کو یاسمین سے اس کا عشق ہی کہا جاسکتا تھا جس نے داؤد کو اس کی پہلی بیوی سے اس حد تک لاتعلق کردیا کہ وہ شوہر پرست عورت دن رات گھٹ گھٹ کر اندر ہی اندر روگی بن گئی۔ سوکن اور شوہر کی بے التفاتی کا دکھ اس کے دل میں پنجے گاڑ کر بیٹھ گیا۔ ایک روز چکرا کر گری اور ایسی گری کہ پھر اٹھ ہی نہ سکی۔ دل کا روگ اسے دنیا ہی سے لے گیا۔ وفا پرست بیوی کے لیے شوہر کی بے اعتنائی سے بڑا دکھ اور کوئی نہیں ہوتا۔

اب داؤد کلی طور پر یاسمین ہی کا تھا۔ لاؤنج میں آکر اس نے وہ کوٹھی جس میں زرینہ رہا کرتی تھی، یاسمین کے نام کردی۔ یاسمین کے تو شاید گمان میں بھی نہ ہوگا کہ اچھی ملازمت اور روشن مستقبل کی تلاش میں اپنے وطن کو چھوڑ کر ایک نو آزاد مملکت میں آنے پر قسمت اس کی یوں یاوری کرے گی۔ کیا ہوا اگر داؤد اور اس کی عمر میں تقریباً تین عشروں کا فرق تھا۔ کوئی جوان آدمی ہوتا اور اس کی جیب خالی ہوتی تو وہ شاید آج بھی داؤد کے دل پر حکمرانی کرنے کے بجائے اس کے ہوٹل کے استقبالیہ پر بیٹھی گاہکوں کی پذیرائی کررہی ہوتی یا شاید کوئی دوسری ملازمت جو اسے یہ نازونعم اور آسائشیں فراہم نہ کرسکتی جو داؤد نے اس پر نچھاور کررکھی تھیں۔ اس کی بوڑھی اتالیق سلیم الدین کی ماں اسے داؤد کے مسلکی شعائر سے آگاہ کرنے اور اردو بول چال میں دسترس دینے کے بعد اپنے بیٹے کی اگلی نسل کی آبیاری کرنے کو گھر بیٹھ چکی تھی۔ کبھی کبھی آتی اور یاسمین اسے اب بھی دے دلا کر ہی رخصت کرتی۔

یاسمین کی شوفری کی خدمات انجام دینے والا ڈرائیور چھٹی پر گھر گیا اور فالج زدہ ہو کر بستر پر پڑ گیا۔ وہ داؤد کے اعتبار کا ملازم تھا۔ عرصۂ دراز سے ان کے ہاں نوکری کررہا تھا۔ یاسمین سے شادی کے بعد داؤد نے اسے مستقل طور پر یاسمین کی خدمت گاری کے لیے ہی وقف کردیا تھا۔ داؤد کے چند قریبی دوستوں کی بیویوں سے یاسمین کی اچھی دوستی ہوگئی تھی۔ یاسمین کو ان سے ملنے کے لیے جانا ہوتا یا خریداری کے لیے جانا مقصود ہوتا۔ شام کو ہوا خوری کے لیے نکلنا ہوتا یا کسی سہیلی کے ساتھ سینما دیکھنے کا پروگرام ہوتا، معمر ڈرائیور ہی اسے گھر سے باہر لے جاتا، لاتا۔ داؤد کو اس ڈرائیور پر پورا بھروسا تھا۔ بیوی جوان ہو، خوب صورت ہو اور اس کا آگے پیچھے کوئی اتا پتا بھی نہ ہو تو معمر شوہر خواہ کتنا ہی چاہنے والا کیوں نہ ہو، اس کے دل میں بیوی کی طرف سے کھٹکا تو بسا ہی رہتا ہے۔

یاسمین کا ذاتی ڈرائیور مفلوج ہوکر مالکن کی خدمت گاری سے معذور ہوا تو داؤد نے باہر کا کوئی انجانا آدمی بیگم کی شوفری پر مامور کرنے کے بجائے اپنے ہوٹل کے ایک ملازم حبیب کو جو اس کے ہوٹل میں بیرا گیری کررہا تھا، ہوٹل کی نوکری سے ہٹا کر یاسمین کے ڈرائیور کے طور پر رکھ لیا۔ حبیب جوان آدمی تھا۔ تھوڑا بہت پڑھا لکھا بھی تھا۔ پچھلے کچھ عرصے سے ہوٹل میں ویٹر کے طور پر کام کررہا تھا۔ صاف ستھرا رہتا، مہذب اور باادب تھا۔ ڈرائیوری جانتا تھا۔ ہوٹل کی ملازمت سے قبل مختلف جگہوں پر کام کرتا رہا تھا۔ کافی عرصہ ایک موٹر مکینک کے پاس بھی کام کرتا رہا تھا۔ جب سے داؤد کے ہوٹل کا ملازم ہوا تھا، اس کے بارے میں کسی سے کبھی کوئی شکایت نہیں ملی تھی۔ ہوٹل کے ساتھیوں اور آنے والے گاہکوں کے ساتھ اس کا رویہ بہت اچھا تھا۔ اس کی تمیز داری کے باعث داؤد نے اسے یاسمین کے ڈرائیور کے طور پر رکھ لیا۔ یاسمین کو بھی نیا ڈرائیور مناسب لگا کہ وہ ڈیوٹی کا پابند، چاق و چوبند اور تمیز دار تھا۔ اوکے، پلیز، تھینک یو، سوری، ویلکم اور پرابلم جیسے چند انگریزی الفاظ بھی بات چیت میں استعمال کرسکتا تھا۔

حبیب نے اپنے نئے مقام تعیناتی پر آنے کے بعد چند ہی دنوں میں اپنی تسلی بخش کارکردگی سے یاسمین کا اعتبار اور داؤد کا اعتماد حاصل کرلیا۔ یاسمین اس سے خوش تھی۔ سابقہ بوڑھے ڈرائیور کی طرح وہ بار بار کھانستا، کھنکھارتا بھی نہیں تھا۔ کئی کئی دن ایک ہی لباس بھی نہ پہنے رہتا۔ روزانہ تبدیل شدہ لباس میں ڈیوٹی پر آتا جس کا بے شکن ہونا کپڑوں کا استری شدہ ہونا ظاہر کرتا۔ یاسمین کو میڈم کہتا۔ گاڑی کو چمکا کر رکھتا اور گاڑی کی اندرونی فضا کو معطر رکھنے کے لیے ڈیش بورڈ پر خوشبودار تازہ پھول بھی نفاست سے چن کر رکھتا۔ اسے صاحب ذوق دیکھ کر یاسمین نے اسے گاڑی میں چھڑکنے کے لیے خوشبو کی ایک شیشی بھی منگوا دی۔ لیونڈر داؤد کی پسندیدہ خوشبو تھی۔

چند ہی دنوں میں یاسمین کو اندازہ ہوگیا کہ حبیب کوٹھی کے دوسرے نوکروں سے خاصا مختلف تھا۔ سابقہ بوڑھے ڈرائیور کی طرح وہ گھر کے دیگر نوکروں سے زیادہ خلط ملط نہ ہوتا۔ فارغ وقت میں وہ کوئی کتاب، جو وہ ڈیوٹی پر آتے ہوئے اپنے ساتھ لایا ہوتا، پڑھنے لگتا۔ یاسمین کو کہیں جانا ہوتا تو نہایت احترام سے اس کے لیے گاڑی کا دروازہ وا کرتا اور جب تک وہ گاڑی میں بیٹھ نہ جاتی، مستعد کھڑا رہتا۔ گاڑی کا دروازہ وا آہستگی سے بند کرتا۔ اپنی سیٹ پر بیٹھ کر پوچھتا۔ "کہاں میڈم؟" یاسمین اسے بتاتی کہ اسے کہاں جانا تھا۔ "اوکے میڈم!" وہ نہایت تابعداری سے کہتا۔

مگر یہ تابعداری کچھ عرصے بعد بے تکلفی میں بدل گئی اور بے تکلفی کا در یاسمین نے کھولا۔ "حبیب! فالتو وقت میں کیا پڑھتے رہتے ہو تم؟"

حبیب نے چونک کر اپنے سامنے لگے آئینے میں ایک نظر دیکھا پھر بولا۔ "میڈم! کبھی کوئی ناول پڑھتا ہوں، کبھی کوئی اسلامی یا تاریخی کتاب۔"

"تعلیم کتنی ہے تمہاری؟"

"چھ کلاسیں پڑھی ہیں میڈم! ساتویں میں تھا تو بڑے بھائی نے اسکول سے اٹھا کر کام پہ لگا دیا۔"

"آگے پڑھ لیتے۔"

"ماں باپ تھے نہیں میڈم! تقسیم کے وقت بلوائیوں کے ہاتھوں شہید ہوگئے۔ بس ہم دو ہی بھائی ہیں۔ بڑے بھائی نے پڑھائی چھوڑ کے کام کرنے کو بولا۔ میں نے کہا ہوگے...... بہت رُل کھل کے یہاں تک پہنچا ہوں میڈم...... دعا دیتا ہوں مستری استاد کو جس نے گاڑی کی مرمت کا کام سکھانے کے ساتھ مجھے ڈرائیوری بھی سکھا دی۔ آج کام آرہی ہے۔"

"گاڑی کی مرمت کا کام بھی جانتے ہو؟"

"جی میڈم! پر مکینکی میرے دل کو نہیں لگی۔ ہاتھ، منہ، کپڑے سب چیکٹ ہوجاتے تھے۔ شام کو آئینے میں خود کی صورت نہیں پہچانی جاتی تھی۔"

یاسمین دھیرے سے مسکرا دی۔

پھر گاہے بگاہے دوران سفر دونوں میں بات چیت ہونے لگی۔ حبیب نے بتایا اس کے بڑے بھائی کی شادی ہوچکی ہے۔ بچے بھی ہیں۔ گھر چھوٹا پڑنے لگا تھا لہٰذا وہ بھائی سے علیحدہ ہوگیا۔ ایک کوٹھری کرائے پر لے رکھی ہے۔ اس میں رہ رہا ہے۔ کوٹھری کا کرایہ اور ڈیوٹی پر کوٹھی آنے جانے میں اس کی تنخواہ کا اچھا خاصا حصہ خرچ ہوجاتا ہے۔ دوپہر کا کھانا تو کوٹھی میں مل جاتا تھا مگر صبح ناشتا اور رات کا کھانا اسے اپنے خرچے پر کھانا پڑتا تھا۔

"میڈم! ہوٹل کی نوکری میں کھانے پینے کا خرچہ بھی نہیں تھا، گاہکوں سے ٹپ بھی مل جاتی تھی مگر پھر بھی میں ڈرائیوری سے خوش ہوں۔ آدمی کا ایک ہی گھر کے لوگوں سے واسطہ ہوتا ہے۔ ہوٹل میں تو اپنے سے بچے بھی دس لوگوں کی سننا پڑ جاتی تھی۔ آدمی کی اپنی بھی کوئی عزت ہوتی ہے۔"

"ٹھیک کہتے ہو...... سیلف ریسپیکٹ۔"

"آگے شادی بھی ہونی ہے...... بال بچے بھی ہوں گے...... آدمی کو اپنی نہ سہی، ان کی عزت کا سوچنا چاہیے۔"

"بالکل ٹھیک۔" یاسمین نے تائید کی۔

"شادی کا کب تک ارادہ ہے؟"

"پیسے ہوں تو آج ہی کرلوں۔ بھائی کی شادی سے دیکھتا ہوں کہ شادی کے بعد آدمی ٹھکانے سے لگ جاتا ہے۔ پہلے بھائی کا حال بھی میری طرح تھا۔ مل گیا تو کھا لیا ورنہ بھوکے سو گئے۔ اب بھابی اسے شہزادے کی طرح رکھتی ہے۔ شادی کے لیے پیسے جمع کرنے کی کوشش تو کررہا ہوں مگر کمرے کا کرایہ اور کھانا پینا مار دیتا ہے۔"

"ہماری کوٹھی کے سرونٹ میں دو کمرے ہیں۔ صاحب سے بات کروں ایک کمرا تمہیں دینے کے لیے؟ کھانا پینا بھی مفت ہوجائے گا۔" یاسمین نے پیشکش کی۔

"میڈم! ساری زندگی آپ کا احسان مند رہوں گا۔"

"بات کرتی ہوں۔"

"آپ کی بات کو صاحب ٹال ہی نہیں سکتے۔"

"تم سے کس نے کہا؟"

"مجھے معلوم ہے۔"

"کیسے؟"

"اپنی عقل سے۔"

"بہت عقلمند ہو۔"

"بہت تو نہیں، تھوڑا تھوڑا میڈم!" وہ اپنے سامنے لگے آئینے میں دیکھتے ہوئے مسکرایا۔

یاسمین کی بات کو داؤد ٹال ہی نہیں سکتا تھا۔ حبیب کو سرونٹ کوارٹر کے دو کمروں میں سے ایک رہنے کے لیے مل گیا۔ کھانے پینے کی کوٹھی میں کوئی کمی تھی نہیں۔ صبح کو ناشتا اور دو وقت کھانے کا بھی بلا معاوضہ بندوبست ہوگیا۔ اسے اب صبح سے شام تک پورچ میں کرسی پر بیٹھ کر مالکن کے حکم کا منتظر رہنے کی ضرورت بھی نہ رہی تھی۔ یاسمین نے اسے یہ رعایت دے دی تھی کہ جب اسے گاڑی میں گھر سے باہر

جانے کی ضرورت ہوگی، وہ گھر کے کسی اور نوکر سے اسے طلب کرلیا کرے گی۔ حبیب کے تو مزے آگئے۔ ڈیوٹی کے اوقات میں بھی کمرے میں چارپائی پر پڑا اینٹھتا رہتا یا پھر کوٹھی کے چوکیدار اور مالی سے گپ شپ کرتا رہتا۔

"حبیب سیٹھ! تمہارے مزے ہیں۔" مالی کہتا۔

"ہمیں تو سردی، گرمی کھلے آسمان تلے کام کرنا پڑتا ہے۔ ابھی گوڈی کرنی ہے تو اب نئے بیج ڈالنے ہیں۔ کبھی باڑھ کی کاٹ چھانٹ تو کبھی پودوں کو پانی لگانا۔"

"ڈرائیوری سیکھ لینی تھی نا۔" حبیب کہتا۔

"اسے اب کیا سیکھوں گا۔ اب تو پودوں سے دل لگالیا۔"

چوکیدار کہتا۔ "حبیب! یار تمہارا نوکری اچھا ہے۔"

"خان! نوکری تو تمہاری بھی بری نہیں۔ سارا دن بیٹھے رہتے ہو۔ کوئی آیا گیا تو گیٹ کھول دیا ورنہ بیٹھے بیٹھے اونگھتے ہی رہتے ہو۔ چائے، کھانا سب اندر سے آجاتا ہے۔"

"داؤد صاحب کو خدا اور دیوے — نوکر لوگ کا بہت خیال رکھتا اے۔"

"بیگم بھی تو ہے۔"

"یارا! بیگم تو ادھر آکے ہی بن گیا اے — چوقسمت کھل گیا اے اس کا — تیرے کو معلوم اے یہ پہلے داؤد صاحب کا ہوٹل میں نوکری کرتا تا۔"

"ہاں — ہوٹل میں لوگ بات کرتے تھے۔"

"کچھ پتا نہیں چلتا کدھر سے آیا اے — داؤد صاب اولاد کا واسطے دوسری شادی بنایا پر اس سے بھی بچہ وچہ کچھ نہیں۔"

"چھوڑو خان جی، ہمیں کیا لینا دینا — بچہ ہو نہ ہو، ہمیں تو اپنی نوکری سے مطلب۔"

"لینا دینا کیوں نہیں یارا — مالک لوگ نوکر کا مائی باپ ہوتا اے۔ ام بہت دعا کرتا ہوں داؤد صاب کا واسطے — ایک بچہ ہوجاوے تو کافی اے۔"

"ارے خان! اس عمر میں بچہ — صاب کب اسے پالیں پوسیں گے؟ کب وہ بڑا ہوگا؟"

"خانہ خراب بچہ چھوٹا بھی ہووے تو باپ کا وارث ہوتا اے — اتنا دولت صاب کس کا واسطے چھوڑ کر جائیں گا۔"

"ہاں یہ تو ہے۔"

"ام دعا کرتا اے صاب کا واسطے ترقی کرے۔"

"کرو، کرو خان۔"

☆☆☆

شہر میں بین الاقوامی تجارتی نمائش لگی ہوئی تھی۔ یاسمین اپنی سہیلیوں سے اس نمائش کا چرچا سن رہی تھی۔ اس نے داؤد سے نمائش دیکھنے کی فرمائش کی تو وہ بولا۔ "سنا ہے بہت بڑی نمائش لگی ہے۔ چار پانچ گھنٹے تو آدمی آرام سے گھومتا رہے۔ سلیم الدین سے کہوں گا اپنی ماں کو بھیج دے۔ تم اس کے ساتھ چلی جانا۔ اچھی طرح سے گھوم پھر لینا۔"

"بوڑھی عورت اتنی دیر کہاں گھومے گی میرے ساتھ۔"

"تو سلیم کی بیوی کو بلا لو۔ وہ تو جوان ہے۔ گھوم لے گی تمہارے ساتھ۔"

"وہ اپنے بچے ساتھ لے آئی تو اور مصیبت۔ بچے سنبھالے گی یا میرے ساتھ گھومے گی۔"

داؤد ہنس دیا۔

"اس سے تو بہتر ہے میں خود ہی چلی جاؤں۔"

"اس سے اچھی کیا بات — حبیب سے کہوں گا تمہارے ساتھ ساتھ رہے۔ نمائش کی بھیڑ میں گم ہو گئیں تو میں کہاں جاؤں گا۔" داؤد نے یاسمین کو محبت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں گم ہونے والی چیز نہیں ہوں۔" یاسمین اترا کر بولی۔

"ہاں، جانتا ہوں میں۔ تم تو دوسرے کا ہوش گم کردینے والی چیز ہو۔" پختہ عمر داؤد شوہر، جوان بیوی کو محبت سے دیکھتے ہوئے بولا۔

یاسمین نمائش دیکھنے کے لیے خود ہی گئی۔ داؤد کی ہدایت کے مطابق حبیب اس سے دو قدم پیچھے محافظ بنا چلتا رہا۔ نمائش کیا تھی، نہایت عمدہ تفریح گاہ تھی۔ گہما گہمی لوگوں سے بھری ہوئی۔ مختلف ممالک سے آئے تجارتی وفود نے اپنی صنعت و حرفت کی نمائش کا خاطر خواہ اہتمام تو کر ہی رکھا تھا، نمائش دیکھنے کے لیے آنے والوں کی لذت کام و دہن کے لیے اشیائے خورد و نوش کے اسٹالز بھی لگے تھے اور تفریح طبع کے لیے ناچ گانا، کھیل تماشے، لاٹریاں، جوکروں کی شعبدہ بازیاں، نوع بنوع جھولے اور منی ریل میں سواری بھی کچھ تھا۔ یاسمین کو دائرے میں جاتے، آسمان کو چھوتے جھولے میں سواری کا شوق ہوا۔ ایک ہنڈولے میں آمنے سامنے چار افراد بیٹھ سکتے تھے۔ جھولے والے نے یاسمین کو ایک برقع پوش عورت اور اس کے مرد کے ساتھ اس طرح بٹھا دیا کہ مرد اور عورت پہلو بہ پہلو بیٹھے تھے اور یاسمین عورت کے روبرو تھی۔ جھولے والا چوتھی سواری بٹھانے کے لیے کچھ شش و پنج میں پڑ گیا۔ سواریاں تو بہت تھیں مگر اکیلی زنانہ سواری جو یاسمین کے ساتھ بیٹھ سکتی، کوئی نہ تھی۔ جھولے والے نے یاسمین سے کہا کہ یا تو وہ اپنے ساتھ اپنی ہی کوئی سواری بٹھائے ورنہ خود بھی اتر جائے تاکہ وہ دو سواریاں ہنڈولے میں بٹھا سکے۔ یاسمین کو جھولے سے اترنا گوارا نہ ہوا۔ اس نے دور کھڑے حبیب کو اشارہ کرکے بلایا اور خود سمٹ کر حبیب سے بھی ہنڈولے میں بیٹھ جانے کو کہا۔ حبیب ہچکچایا مگر حکم حاکم تھا۔ سواریوں کی تعداد پوری ہوئی تو جھولا پہلے آہستہ آہستہ حرکت میں آیا پھر حرکت بتدریج تیز ہوتی چلی گئی۔

جھولے کی حرکت تیز ہوئی تو یاسمین کا سارا شوق ہوا ہونے لگا۔ تیزی سے اوپر نیچے جاتے ہنڈولے میں اس کی گھگی بندھ گئی۔ ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ گئے، چکر آنے لگے اور اس نے خوف کے عالم میں حبیب کا بازو دبوچ لیا۔ حبیب ٹھٹکا گیا۔ "روکو — روکو۔" یاسمین چلانے لگی۔

عورت کے ساتھ بیٹھے مرد نے حبیب سے کہا۔ "اپنی عورت کو تسلی دو۔" حبیب کچھ نہیں کر سکا کرے۔

"کچھ نہیں ہوتا — کچھ نہیں ہوتا۔" اسے یاسمین کو تسلی دینے کو یہی فقرہ سوجھا۔ جھولے کی رفتار تھمنے تک یاسمین ادھوری ہوئی حبیب کے زانو پر پڑی تھی۔

یاسمین کو جھولے سے اترنے کے لیے حبیب نے سہارا دیا۔

☆☆☆

اس واقعے کے بعد حبیب سے یاسمین کی قربت کا آغاز یاسمین کی طرف سے ہوا۔ حبیب جوان تھا، خوش شکل تھا۔ مردانہ وجاہت رکھتا تھا۔ یاسمین اس کے ساتھ گاڑی میں باہر جاتی تو اپنی سہیلیوں سے ملنے یا ہوا خوری کے لیے نہیں — گھر سے کچھ دور نکل آنے کے بعد حبیب پردوں والی موٹر کار روکتا اور یاسمین پچھلی سیٹ سے اتر کر اگلی سیٹ پر اس کے ساتھ آبیٹھتی۔ گاڑی کے اندر شروع ہونے والا شیطانی کھیل داؤد کی کوٹھی کے اندر تک جا پہنچا۔ ہوٹل سے داؤد کی واپسی رات گئے ہوتی اور اس وقت تک — !

رقص ابلیس ایک مرتبہ شروع ہوجائے تو اس کا تھمنا مشکل ہوتا ہے۔ شیطان کے حصار میں آنے والا انسان اپنی عافیت سے بے نیاز ہوکر گناہ کی دلدل میں اترتا ہی چلا جاتا ہے۔ یاسمین اور حبیب بھی دلدل میں دھنستے ہی چلے گئے۔

☆☆☆

عورت کی گمراہی اس کے شوہر سے زیادہ عرصہ پنہاں نہیں رہتی۔ داؤد کو بھی یاسمین کے رنگ ڈھنگ سے شک ہوگیا۔ جہاندیدہ آدمی تھا۔ بیوی پر گھات لگائی تو بھید کھل گیا۔

ایک روز یاسمین سے دو دن کے لیے دوسرے شہر جانے کا کہہ کر گیا اور رات گئے اچانک گھر پہنچ کر یاسمین اور حبیب کو رنگے ہاتھوں پکڑ لیا۔ عزت دار آدمی تھا۔ جانتا تھا چیخے چلائے گا تو خود بھی تماشا بنے گا۔ شدید صدمے اور غصے کے باوجود اس نے اپنی آواز اونچی نہ کی۔ دونوں سے پوچھا۔ "کیا چاہتے ہو؟"

حبیب جو داؤد کے رعب داب اور اثر رسوخ سے بخوبی واقف تھا، ہاتھ جوڑ کر گھگھیایا۔ "معافی سیٹھ!"

داؤد نے یاسمین کی طرف دیکھا تو اس نے عورت کا آزمودہ ہتھیار آنسو آزمانے کی کوشش کی۔

داؤد نے حبیب سے کہا۔ "نہ تجھے معاف کرسکتا ہوں کہ تُو نے جس تھالی میں کھانا کھایا، اسی کو چھید دار کیا۔" اور یاسمین سے بولا۔ "تیری خاطر میں نے اپنی پاکباز اور اطاعت گزار بیوی کو اپنی محبت اور توجہ سے محروم کیا۔ وہ شریف عورت گھٹ گھٹ کر مرگئی۔ شاید اس کی بددعا لگی مجھے جو آج تیری بے وفائی اور گمراہی کا عذاب سہنا پڑا ہے مجھے۔ تو آج کے بعد میرے نکاح میں نہیں ہے — میں نے تجھے طلاق دی — طلاق دی — طلاق دی۔ عدت تک تجھے اس گھر میں رہنے کی اجازت ہے پھر جو تیری مرضی آئے کر۔ زرینہ کی کوٹھی تیرے نام کر چکا ہوں۔ مہر بھی مل جائے گا۔ تیرا میرا تعلق آج کے بعد ختم۔ عدت تک اس گھر میں رہنے کی اجازت اس لیے دے رہا ہوں کہ تیرے آگے پیچھے اس ملک میں کوئی نہیں۔ عدت کے بعد چاہے تو اس سے نکاح کر، چاہے کسی اور سے۔ اس دوران مجھے بھی تیری بے وفائی کا صدمہ جھیلنے کی تاب آجائے گی۔" حبیب سے کہا۔ "ابھی اور اسی وقت اس گھر سے نکل اور پلٹ کر نہ دیکھنا۔ اسے تیری ضرورت ہوگی تو یہ خود تیرے پاس آئے گی۔ مجھے اپنی منحوس شکل پھر نہ دکھانا۔"

حبیب پھر گھگھیایا تو داؤد نے اس کا گریبان پکڑ کر اسے دروازے سے نکال باہر کیا۔ یاسمین کو نفرت سے دیکھا اور بولا۔ "تُو نے مجھ سے بے وفائی کی ہے۔ وقت تجھے ذلیل کرے گا۔"

یاسمین کو مجرمانہ احساس میں چھوڑ کر داؤد دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ غصہ، رنج، صدمہ، پچھتاوا اس کے اعصاب کو توڑنے لگے۔ دوسرے کمرے میں جاکر کبھی اٹھتا، کبھی بیٹھتا، کبھی برآمدے میں نکل جاتا۔ جس عورت کو

اس نے لوٹ کر چاہا تھا، وہ ایک معمولی آدمی کی خاطر اسے دھتکار گئی تھی۔ یہ صدمہ ناقابلِ بیان تھا۔

اگلی صبح شہر میں خبر گرم تھی کہ شہر کے معروف ہوٹل کا مالک داؤد سیٹھ مر گیا۔ لوگوں کو صدمہ ہوا مگر حیرانی نہ ہوئی۔ عمر رسیدہ آدمی کی موت کوئی اچنبھا تو نہیں ہوتی۔ داؤد احمد تو پھر بھی ساٹھ سے اوپر ہو چکا تھا۔ لوگ تو بھری جوانی میں مر جاتے ہیں۔ سلیم الدین کی ماں اور بیوی بھی پرسے کے لیے کوٹھی گئیں۔

یاسمین اپنے جوبن میں بیوہ ہو گئی۔۔۔۔ طلاق کی بات یاسمین اور حبیب دونوں ہی گول کر گئے۔ دولت مند بیوہ! داؤد کی موت کے بعد وہ اس کے تمام اثاثوں کی تن تنہا وارث تھی۔ ان اثاثوں کی اپنے نام منتقلی کے کچھ عرصے بعد اس نے حبیب سے نکاح کر لیا۔

سلیم الدین نے اپنی ضعیف العمر ماں کو آہستہ سے بتایا۔ ''اماں! لوگ کہتے ہیں داؤد سیٹھ اپنی موت نہیں مرا۔''

''کیا مطلب؟'' ماں نے چونک کر کہا۔

''لوگوں کو شک ہے کہ داؤد سیٹھ کو اس کی بیوی اور ڈرائیور حبیب نے زہر دے کر مارا ہے۔''

''ماں صدقے! لوگوں کو کہنے دے۔۔۔۔ تو اپنے منہ سے بھی نہ نکالیو یہ بات۔''

''تمہیں بتا رہا ہوں اماں۔۔۔۔ میں نے ہوٹل میں چہ میگوئیاں سنی ہیں۔'' سلیم الدین بولا۔

''دفع کر۔ تجھے اپنی نوکری سے مطلب۔''

''وہ سالا ڈرائیور حبیب اچانک سے ہوٹل کا مالک بن گیا ہے۔''

''بننے دے۔ تجھے کیا میرے بچے، ایسی باتوں سے دور رہا کر۔''

''اماں! بے گزیٹ۔۔۔۔ داؤد سیٹھ کی بیوی کو ڈرائیور حبیب ہی ملا تھا شادی کرنے کو۔۔۔۔ اور بہت تیار ہوتے اس سے شادی کرنے کو۔''

''چپ کر۔'' بوڑھی ماں نے بیٹے کو آنکھیں دکھائیں۔ ''ایسی بات منہ سے بھی نہ نکالیو کسی کے سامنے۔ تو بولے گا کہیں، لوگ بڑھا چڑھا کر آگے بتا دیں گے۔۔۔۔ نوکری سے بھی جاوے گا تو۔''

''ٹھیک بات ہے اماں۔۔۔۔ ہوٹل کا مالک تو سالا اب وہ حبیب ڈرائیور ہی بن گیا ہے نا۔''

''اپنی زبان کو تالا لگا کے رکھ۔۔۔۔ داؤد بے چارے کی تو اب ہڈیاں بھی گل گئی ہوں گی قبر میں۔''

''کسی روز بیگم کے پاس چکر لگاؤ۔'' سلیم الدین بولا۔

''کس لیے؟''

''اس کے رنگ ڈھنگ دیکھنے کو۔''

''رنگ ڈھنگ دیکھنے والا اوپر بیٹھا ہے۔۔۔۔ خیر ملنے کو چلی جاؤں گی کسی دن۔۔۔۔ میرے ساتھ تو بیگم اچھی ہی رہی۔ اب بھی عید بقر عید پر جاؤں تو دیے دلائے بغیر واپس نہیں آنے دیتی۔۔۔۔ چل لے چلیو کسی دن مجھے۔''

''کل ہی چلو۔''

اگلے دن ڈیوٹی پر جاتے ہوئے سلیم الدین اپنی ماں کو بھی ساتھ لے گیا۔ اسے کوٹھی پر چھوڑا اور ڈیوٹی سے واپسی پر ساتھ لینے کی بات کر کے رخصت ہوا۔ یاسمین کچھ دیر سلیم الدین کی ماں سے کچھ کھنچی کھنچی رہی پھر پہلے کی طرح نارمل ہو گئی۔ حبیب سے اپنے نکاح کی بات نہ اس نے چھیڑی نہ سلیم الدین کی ماں کو اس سے کچھ پوچھنے کی ہمت ہوئی۔ جہاندیدہ عورت تھی۔ یاسمین کی چال ڈھال اور اٹھنے بیٹھنے سے سمجھ گئی کہ وہ امید سے تھی۔ رات کو ڈیوٹی سے گھر واپس جاتے ہوئے بیٹا اسے اپنے ساتھ لے جانے کو آیا تو وہ ہمیشہ کی طرح یاسمین کی عنایات سے لدی پھندی تھی۔

☆☆☆

قسمت مہربان ہو جائے تو لوگوں کے دن ایسے ہی بدل جاتے ہیں جیسے حبیب کے بدل گئے تھے۔ ڈرائیور سے صاحب بن بیٹھا تھا۔ کوٹھی کے نوکر اور ہوٹل کے ملازم اسے آتے جاتے سلام، سیلیوٹ کرتے۔ پیٹھ پیچھے البتہ اسے برا بھلا ہی کہتے۔ دل میں ہر ایک کے یہی شبہ تھا کہ داؤد کی موت میں اس کی بیوی اور حبیب کا کچھ نہ کچھ ہاتھ ضرور تھا۔ داؤد عمر رسیدہ ضرور تھا مگر اس کی صحت عمدہ تھی۔ اتنی جلدی جانے کا کوئی اندیشہ ہی نہ تھا۔ بھائی، بہن کوئی تھا نہیں جو اس کی اچانک موت پر واویلا مچاتا اور کسی پر شبہ ظاہر کرتا۔ یاسمین عدت کے بعد خود سے کم عمر ڈرائیور حبیب سے نکاح کر کے بیٹھ گئی تھی اور حبیب ڈرائیور سے حبیب سیٹھ بن گیا تھا۔ داؤد کے تمام اثاثے یاسمین کی ملکیت اور حبیب کے تصرف میں تھے۔

حبیب سے نکاح کے تیرہ چودہ ماہ بعد یاسمین نے ایک بیٹی کو جنم دیا۔ وہ ماں بن کر بہت خوش تھی۔ داؤد سے شادی کے بعد اسے ہر نعمت ملی تھی، سوائے اولاد کے جس کی کمی اسے کلفت میں رکھتی تھی۔ حبیب سے شادی کے بعد یہ محرومی بھی دور ہو گئی تھی۔ بیٹا یا بیٹی، اسے اس سے غرض نہ تھی۔ بس اولاد ہونی چاہیے تھی۔ اس کے وجود کا حصہ جسے

سینے سے لگا کر وہ اپنی ممتا کی تسکین کر سکتی۔ حبیب بھی صاحبِ اولاد ہو کر بہت خوش تھا۔ بچی کا نام یاسمین کی خواہش پر لیلیٰ رکھا گیا۔ لیلیٰ، یاسمین کا پسندیدہ نام تھا۔ سونے کا چمچہ منہ میں لے کر پیدا ہونے والی لیلیٰ نہایت خوبصورت بچی تھی۔ یاسمین کے لیے لیلیٰ دنیا بھر کے خزانوں سے زیادہ قیمتی متاع تھی۔ ایرانی بلیوں سے اس کا عشق جاتا رہا تھا۔ اب وہ بچی کو بلیوں کے روئیں سے کوئی بیماری لگ جانے کے خدشے سے نہ ان پالتو بلیوں کو اپنی گود میں بٹھاتی نہ ان کے نرم نرم روئیں پر محبت سے ہاتھ پھیرتی۔ اس نے انہیں بے گھر بے در تو نہ کیا تھا تاہم ان کی دیکھ بھال اور انہیں کھلانا پلانا اب گھر کے نوکروں کے ذمے تھا۔ یاسمین دن بھر لیلیٰ کی دیکھ بھال میں لگی رہتی۔ لیلیٰ اس کے لیے مرکزِ قلب و نگاہ بن گئی تھی اور لیلیٰ کا باپ ہونے کے ناتے حبیب اس کے لیے نہایت اہم اور محترم بن گیا تھا۔ دنیا میں اس کے لیے اب دو ہی رشتے تھے جنہیں وہ معتبر اور اپنے دل کے نزدیک سمجھتی تھی۔ لیلیٰ جو اس کی جگر گوشہ تھی اور حبیب جو لیلیٰ کا باپ اور اس کا شوہر تھا۔

لیلیٰ جوں جوں بڑی ہوتی گئی، اس کی محبت کی جڑیں یاسمین کے دل میں اتنی ہی پھیلتی چلی گئیں۔ لیلیٰ اسے اپنی زندگی کا حاصل اور دنیا کی اہم ترین متاع محسوس ہوتی۔ لیلیٰ کے مقابلے میں اسے دنیا کی ہر نعمت ہیچ لگتی۔ اسے نہ سیر و تفریح سے دلچسپی رہی تھی، نہ سہیلیوں سے ملنے ملانے میں۔ وہ تمام وقت پروانہ بنی لیلیٰ کے ننھے سے وجود کے گرد رقصاں رہتی۔ اب کبھی کبھی اسے اپنی اس زیادتی کا خیال بھی آتا جو ایران سے روشن مستقبل کی تلاش میں نو آزاد مملکت پاکستان آنے کے بعد اس سے اپنے والدین کے حق میں سرزد ہوئی تھی۔ ماں بے چاری مر گئی تھی۔ پاکستان آنے کے بعد شروع کے چند ماہ تو ماں سے اس کی خط کتابت رہی تھی پھر وہ اپنی زندگی میں ایسی مگن ہوئی کہ ماں کی خبر لینے کی فرصت ہی نہ ملی۔ نیلوفر نے اسے خط کے ذریعے ماں کی موت کی خبر دی تھی۔ وہ چار دن رو کر وہ پھر اپنی زندگی میں مگن ہو گئی تھی۔ باپ کی خیر خبر لینے کی تو اس نے کبھی ضرورت ہی محسوس نہ کی تھی۔ اب لیلیٰ کی پیدائش کے بعد خود ماں بن کر اسے اپنے ماں باپ کے درد کا احساس ہوتا تھا۔ وہ بھی اس کے اور اس کی بہن نیلوفر کے لیے اسی طرح بے چین رہتے ہوں گے جیسے وہ لیلیٰ کے لیے رہتی تھی۔ اس کی ذرا سی تکلیف پر وہ مضطرب ہو جاتی تھی۔ راتوں کو اس کے لیے جاگتی۔ اپنی نیند قربان کر کے اسے اس وقت تک تھپکتی رہتی

جب تک وہ سو نہ جاتی۔ ذرا جاگتی تو فوراً اٹھ بیٹھتی۔ اس کا بستر ذرا گیلا نہ رہنے دیتی۔ وہ معمولی سا بیمار ہوتی تو اسے شہر میں بچوں کے سب سے ماہر ڈاکٹرز کو دکھانے پہنچتی اور جب تک اس کی تکلیف رفع نہ ہو جاتی، ایک پاؤں سے اس کی دیکھ بھال کو کھڑی رہتی۔ بیٹی سے پیار حبیب بھی بہت کرتا تھا مگر اس کی محبت میں وہ دیوانگی نہ تھی جو یاسمین کو لاحق تھی۔ یاسمین کے لیے تو لیلیٰ ایسا انمول رتن تھی جس کی قیمت کوئی چکا ہی نہ سکتا تھا۔

سلیم الدین کی ماں ایک روز یاسمین سے ملنے کے بعد گھر واپس گئی تو اس نے بیٹے اور بہو سے کہا۔ ''بیگم تو اب پہلے والی بیگم ہی نہیں۔''

''کیوں اماں! کیا ہوا؟'' سلیم الدین نے چونک کر پوچھا۔

''ارے بیٹے! سارا وقت بچی کی سیوا میں لگی رہوے ہے بیگم۔۔۔۔ نوکر ہوتے ساتے اس کا ہر کام خود کرے ہے۔''

''اولاد ایسے ہی پلتی ہے اماں!'' بہو بولی۔

''لے! تو مجھے بتاوے گی اب۔'' ساس نے بہو کو تیز سی نظر سے دیکھا۔

''اللہ نہ کرے۔ میرا یہ مطلب نہیں تھا۔'' بہو شرمندہ ہو گئی۔

سلیم الدین نے بیوی کو شرمندہ ہوتے دیکھا تو ماں سے بولا۔ ''ارے اماں! ہم غریبوں کے بچے تو رل کھل کے پل جاتے ہیں۔ امیروں کے چونچلے ہی اور۔۔۔۔ اس تمہاری بہو نے تو گھر کے دھندے بھی نمٹائے اور بچے بھی پالے۔ بیگم کو کرنے کو اور کچھ نہیں اس لیے سارا وقت اپنی بچی کی سیوا میں لگی رہتی ہو گی۔''

''ماں صدقے! میرے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ بچی نے بیگم کو اس کی سدھ بدھ بھلا دی۔۔۔۔ نہ وہ پہلے کی سی سنگھار پٹی، نہ وہ نخرہ۔ داؤد سیٹھ کی زندگی میں تو بیگم کا پیر زمین سے نہ لگے تھا۔ بچے کے لیے تو پھر کی سی دکھائی ہوں بیگم کو۔''

''سیل (سیر) کو نہیں لے گئی تمہیں بیگم؟'' سلیم الدین مسکرایا۔

''اس کی سیل تو اب اس کی گود میں ہے۔''

''اماں! کسی روز مجھے بھی لے چلنا بیگم کی بیل کو دکھانے۔'' بہو بولی۔

''ہاں، ہاں۔۔۔۔ موقع دیکھوں گی۔'' ساس نے ٹالنے والے انداز میں کہا۔

☆☆☆

تین چار سال گزر گئے۔

سلیم الدین نے ایک روز ماں کو خبر سنائی کہ حبیب نے ہوٹل کسی اور کو فروخت کر دیا تھا۔ دونوں کوٹھیوں کا سودا بھی ہو گیا تھا۔ حبیب بیوی اور بیٹی کے ساتھ ملک سے باہر جا رہا تھا۔

"تیری نوکری کا کیا ہو گا؟" سلیم الدین کی ماں کو حبیب اور یاسمین کے ملک سے باہر جانے کی خبر سے زیادہ بیٹے کی نوکری کی فکر ہوئی۔

"وہ تو نئے مالک کے آنے پر پتا چلے گا۔" سلیم الدین نے کہا اور ماں کو فکرمند دیکھ کر تسلی دی۔ "اماں! تم پریشان کیوں ہوتی ہو۔ ہوٹل چلتا رہا تو میری نوکری بھی چلے گی اور اگر نہ بھی چلی تو کیا پروا... کسی اور ہوٹل میں کام کرنے لگوں گا۔"

"ہاں رازق تو اللہ ہے جو پتھر میں کیڑے کو کھلاتا ہے۔ ہمیں بھوکا سلائے گا کیا؟"

"بس تو پھر کا ہے کو پریشان ہوتی ہو۔"

"اللہ مالک ہے۔" اللہ پر توکل کا اطمینان سلیم الدین کی ماں کے چہرے پر پھیل گیا۔

"کسی روز بیگم سے جاکے مل لو پھر تو وہ چلی ہی جائے گی۔" سلیم الدین نے ماں سے کہا۔

"ارے بیٹا! اب کہیں آنے جانے کی ہمت تو نہیں ہوتی۔ پھر کسی دن جاؤں گی۔ آدمی جس کا نمک کھائے اس کا لحاظ بھی کرے۔"

"میں تمہیں موٹر رکشے میں لے چلوں گا۔"

"مجھے بھی لے چلنا۔" سلیم الدین کی بیوی اس سے بولی۔

"موٹر رکشے میں دو جنے ہی بیٹھ سکتے ہیں۔"

"ارے پھنس پھنسا کے تین بھی بیٹھ جاتے ہیں۔ دل میں جگہ ہونی چاہیے۔" بہو نے کن انکھیوں سے ساس کے تیور تاڑنے کی کوشش کی۔

"پھنس پھنسا کے بیٹھنے سے تو میرا سانس رکتا ہے اور ہڈیاں الگ چر مر ہونے لگتی ہیں۔"

"بڑھیا کب سے قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھی ہے پر ساس بنے سے باز نہیں آتی۔" بہو نے جبڑے بھینچتے ہوئے دل ہی دل میں سوچا اور جلے بھنے لہجے میں بولی۔ "ٹھیک ہے... ٹھیک ہے اماں! تم ہی چلی جانا۔ مجھے ویسے بھی کوئی شوق نہیں ہے بیگم سے ملنے کا۔"

"شوق تو بتیرا... بس انگور کھٹے ہیں۔" ساس دل میں بولی۔

سلیم الدین ماں کو بیگم سے ملانے کوٹھی پر چھوڑ کر اپنی ڈیوٹی پر چلا گیا۔

للی کو سلیم الدین کی ماں نے تیسری مرتبہ دیکھا تھا۔ پہلی بار جب وہ شیر خوار تھی، دوسری مرتبہ جب وہ بیٹھنے لگی تھی۔ اب وہ چلتی پھرتی اور بھاگتی دوڑتی بچی تھی۔ بچی کیا تھی، کوئی پری ہے... اس نے فیروزی رنگ کی خوبصورت فراک پہن رکھی تھی۔ سنہری بالوں کی دو چھوٹی چوٹیاں بندھی تھیں۔ اس کے پیروں میں بند جوتے تھے۔ یاسمین اس کی ہر ہر ادا پر مر مرتی۔

"بچی کی نظر اتارتی رہا کرو بیگم!" سلیم الدین کی ماں نے یاسمین سے کہا۔

"خالا! میں تو اسے نظر لگنے کے ڈر سے نظر بھر کے دیکھتی بھی نہیں ہوں۔" یاسمین بولی۔

"اچھا کرتی ہو۔ نظر پہلے اپنے پیاروں ہی کی لگے ہے۔"

"میری سب سے بڑی دولت یہی ہے۔" یاسمین نے للی کے سنہری بالوں پر محبت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"میں نے سنا آپ کہیں باہر ملک جا رہی ہیں؟" سلیم الدین کی ماں نے قدرے تکلف سے پوچھا۔

"ہاں... ہم لوگ باہر جا رہے ہیں۔"

"ہوٹل؟ کوٹھی؟"

"ہوٹل بیچ دیا ہے... کوٹھیوں کا سودا بھی ہو گیا ہے۔"

"بہت یاد آؤ گی آپ۔"

"یاد تو مجھے بھی آؤ گے آپ سب لوگ مگر حبیب کی مرضی یہی تھی۔ شوہر کی رضا میں تو راضی ہونا ہی پڑتا ہے۔"

"ہاں... سچ بات ہے۔ بیٹے نے بتایا مجھے... میں نے سوچا مل آؤں۔"

"اچھا کیا۔"

"آپ کے بڑے احسان ہیں ہم غریبوں پر بیگم!"

"نہیں نہیں... ایسی کوئی بات نہیں۔"

"باہر ملک سے واپس کب آؤ گی؟"

"کچھ پتا نہیں۔"

"چلو اللہ جہاں لے جاوے، اپنی عافیت میں رکھے... جہاں رہو خوش رہو۔"

"دعاؤں میں یاد رکھنا۔"

"اللہ خوش رکھے۔" سلیم الدین کی ماں نے اپنے دوپٹے کا پلو پسار کر دعا دی۔

یاسمین نے سلیم الدین کی ماں کو گھر واپس جاتے وقت ہمیشہ کی طرح دے دلا کر رخصت کیا۔

☆☆☆

ہوٹل کے نئے مالک نے کاروبار سنبھال لیا۔ ملازمین کی نوکریاں برقرار رہنے سے ان کی بے چینی اور بے سکونی کا ازالہ ہوا۔ سلیم الدین کی ماں شکرانے کے نفل پڑھتے نہ تھکتی۔

"بیگم گئی باہر کے ملک؟" اس نے بیٹے سے پوچھا۔

"ہاں، چلی ہی گئی ہوگی... سنا ہے کوٹھی میں نئے مالک آ گئے۔"

سلیم الدین کی ماں کے منہ سے بے اختیار ایک سرد آہ نکلی۔

"کیا ہوا اماں؟"

"بچارے بڑے بھلے تھے... داؤد سیٹھ کا خیال آ گیا... بھلا آدمی تھا... بیگم کو راج کرایا اس نے۔"

"بیگم باہر ملک جاکے بھی راج ہی کرے گی اماں... پیسے والے جہاں جائیں ان کی شہنشاہی۔ ہوٹل، کوٹھی، مال متاع... سنا ہے بہت پیسا لے کر گئے ہیں دونوں۔" سلیم الدین ایک پل کو رکا پھر بولا۔ "تم مانو یا نہ مانو اماں! لوگ ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ داؤد سیٹھ اپنی موت نہیں مرا۔"

"چپ کر۔" ماں نے بیٹے کو آنکھیں دکھائیں۔ "لوگوں کو کہنے دے۔ تو اپنی زبان بند رکھ۔ اگر جو کسی نے برا کیا ہو گا تو وہ آپ بھگتے گا۔ یہ دنیا مکافات عمل ہے جو بیچ کر جگ ہے ماں صدقے۔"

☆☆☆

کئی سال بیت گئے۔ سلیم الدین اب جوان نہیں رہا تھا۔ اس کے بال کھچڑی ہو چکے تھے۔ بچے جوان تھے۔ بیوی بھاری بھرکم دانا عورت کا روپ دھار چکی تھی۔ سلیم الدین کی ماں بھی لمبی عمر لکھوا کر لائی تھی۔ نہ ہاتھوں میں دم رہا تھا، نہ پاؤں ساتھ دیتے تھے۔ بینائی بھی کم ہو چکی تھی۔ سماعت کا یہ حال کہ اس سے بات کرتے ہوئے بات کرنے والے کو اپنی آواز کا والیوم بڑھانا پڑتا۔ زیادہ وقت چارپائی پر بیٹھے گزارتی۔ اٹھتی تو جسم کانپنے لگتا۔ قدم لڑکھڑاتے پھر بھی جیے جا رہی تھی۔ وقت سے پہلے نہ کوئی آیا نہ گیا۔ سلیم الدین اب دوسرے ہوٹل کی نوکری کر رہا تھا۔ دن چڑھے ڈیوٹی پر جاتا، رات کو واپس آتا۔ مشقت کی زندگی تھی۔ گھر کے حالات بھی کچھ زیادہ نہ بدلے تھے۔ باپ بیٹے سب کام کرتے تب دال دلیا چلتا۔

سلیم الدین ایک روز خلافِ معمول ڈیوٹی سے جلدی گھر آیا تو ایک برقع پوش عورت بھی اس کے ساتھ تھی۔ گھر کے اندر آ کر اس عورت نے نقاب الٹی تو سلیم الدین کی ماں

نے اپنی آنکھوں پر اپنے ہاتھ کا چھجا بناتے ہوئے اپنی دھندلائی بینائی سے اسے دیکھنے اور پہچاننے کی کوشش کی۔
"اماں پہچانیں؟" سلیم الدین نے پوچھا۔
"کیا خبر کون ہے۔" ماں نے معذوری ظاہر کی۔
بہو پہلی نظر میں ہی آنے والی کو پہچان کر بھونچکا کھڑی تھی۔
"خالا! میں یاسمین ہوں۔"
"یاسمین؟" سلیم الدین کی ماں سوچ میں پڑ گئی۔
"اماں، یہ بیگم ہیں.....اپنے داؤد سیٹھ کی....."
"بیگم!" بڑی بی کو جیسے کرنٹ لگا۔
"بیگم کہاں رہی خالا!" سلیم الدین کے ساتھ آنے والی نے درد انگیز آواز میں کہا۔
"بیگم!" سلیم الدین کی ماں نے آنکھیں چندھیاتے ہوئے اسے دیکھا۔
سلیم الدین کے ساتھ آنے والی عورت نے ایک سرد آہ کھینچی۔
"بیگم کہاں سے آگئی؟" سلیم الدین کی ماں نے نظر اٹھا کر بیٹے کو کچھ اشتباہ سے دیکھا۔
"بس آگئیں اماں!" پاس کھڑا سلیم الدین بولا۔
"بہت دنوں سے تلاش میں تھی۔ داؤد کے ایک دوست سے پتا چلا کہ سلیم الدین اب کسی اور ہوٹل میں کام کرتا ہے۔ پوچھتی پوچھتی ڈھونڈتی ڈھانڈتی پہنچ گئی۔ بہت یاد آتے تھے تم لوگ..... خالا! تم سے تو میں نے بہت کچھ سیکھا۔"
"سلیم بیٹا! بیگم آئی ہیں۔ کچھ شربت وربت..... ٹھنڈی بوتل..... چائے۔" ماں نے سلیم الدین سے کہا۔
"کچھ نہیں خالا۔"
"بہو! کرسی لا..... بیگم کھری چارپائی پہ بیٹھی ہیں۔"
بڑی بی نے چارپائی ٹٹولی۔
"ٹھیک ہے خالا..... ٹھیک ہے۔" پاس بیٹھی یاسمین نے بڑی بی کی سوکھی کلائی پکڑتے ہوئے کہا۔
"اے واہ، ایسے کیسے۔"
بہو کرسی لے آئی۔ یاسمین کو اصرار کرکے کرسی پہ بٹھایا۔ دل میں حیران تھی کہ جس عورت کو شاہانہ زندگی بسر کرتے دیکھ چکی تھی وہ آج کس حال میں اس کے گھر آئی بیٹھی تھی۔
"اور سناؤ..... باہر ملک سے کب آئیں؟" سلیم الدین کی ماں نے پوچھا۔
"باہر ملک گئی ہی کب تھی؟"
"کیا مطلب؟" بڑی بی اور بہو دونوں چونکیں۔

سلیم الدین محلے کی دکان سے ٹھنڈی بوتل لانے جا چکا تھا۔
"حبیب میری بچی کو لے کر چلا گیا تھا۔"
"میں سمجھی نہ۔" سلیم الدین کی ماں بولی۔
سلیم الدین ٹھنڈی بوتل لے آیا تھا۔ بیوی کو پکڑاتے ہوئے بولا۔ "گلاس میں ڈال کر دو۔"
"سلیم اماں صدقے، بیگم بتارہی ہیں یہ تو باہر ملک گئی ہی نہ تھیں۔" ماں نے سلیم الدین کو قدرے تعجب سے بتایا۔
"ہاں اماں..... بیگم نے رستے میں بتایا تھا مجھے۔"
"تو بچی اور آپ کا گھر والا وہ؟" سلیم الدین کی ماں کا لہجہ تجسس میں ڈوبا ہوا تھا۔
"پتا نہیں خالا..... دونوں کوٹھیاں تو حبیب نے فروخت کرادی تھیں۔ ہم ہوٹل میں تھے۔ لندن جانے کی تیاری تھی۔ مجھے اس نے کہا ائرپورٹ جانے کے لیے ٹیکسی کرتا ہوں۔ لیلی اس کی گود میں تھی۔ میں نے کہا لیلی کو مجھے دے جاؤ۔ کہنے لگا تم سامان کا دھیان رکھو۔ کوئی چیز یہاں رہ نہ جائے۔ لیلی کی فکر نہ کرو۔ لیلی نے جاتے جاتے باپ کی گود میں مجھے بائے بائے کیا۔ باپ کے ساتھ باہر جانے سے وہ بہت خوش ہوئی تھی۔ میں انتظار کرتی رہی۔ جب بہت دیر ہوگئی اور حبیب واپس نہ آیا تو میں نے ہوٹل کے کمرے سے باہر نکل کے دیکھا۔ کافی دیر باہر کھڑی انتظار کرتی رہی پھر ہوٹل والوں کو بتایا کہ میرا شوہر بچی کے ساتھ باہر ٹیکسی لینے گیا تھا۔ ہمیں ائرپورٹ جانا تھا۔ وہ واپس نہیں آیا۔ انہوں نے آس پاس دکھوایا۔ کچھ پتا نہ چلا۔ فلائٹ کا وقت بھی گزر گیا۔ سامان رکھا رہ گیا۔ میرا پاسپورٹ اور ٹکٹ بھی اسی کے پاس تھا۔ داؤد کے دوستوں کی بیویاں میری سہیلیاں تھیں۔ جب حبیب کو گئے بہت زیادہ وقت ہوگیا تو میں داؤد کے ایک دوست کے گھر گئی اور اس کی بیوی کو بتایا۔ انہوں نے حبیب کا پتا چلانے کی کوشش کی۔ اسپتالوں اور تھانوں میں دیکھا کہ کوئی حادثہ نہ ہوگیا ہو، کچھ پتا نہ چلا۔ میرا وہ حال کہ بچی کی وجہ سے مردہ سے بدتر..... نہ کھانے کو جی چاہتا نہ پینے کا ہوش۔ دن رات روتی رہتی..... پھر حبیب کے بھائی کا اتا پتا ڈھونڈا۔ وہاں سے پتا چلا کہ حبیب نے تو مجھ سے شادی کے بعد ایک اور شادی بھی کررکھی تھی۔ مجھے ساتھ لے کر باہر جانے کا اس نے ڈھونگ رچایا تھا۔ اصل میں تو اسے دوسری بیوی کو ساتھ لے جانا تھا۔ اسے اور میری بچی کو ساتھ لے کر وہ باہر چلا گیا۔" یاسمین نے بار بار اپنے آنسو پونچھتے ہوئے، درد بھری داستان سنائی۔ سلیم الدین

اور اس کی ماں اور بیوی دم بخود سنتی رہیں۔
"کمبخت مارا۔" سلیم الدین کی ماں یاسمین کے چپ ہوجانے پر بولی۔
"آپ بھی گئی ہوتیں اس کے پیچھے۔" سلیم الدین کی بیوی بولی۔
"کہاں جاتی..... کچھ اتا پتا تو ہوتا۔"
"اس کے بھائی یا دوسری بیوی کے گھر والوں سے... اتا پتا لیتیں۔"
"وہ کہتے تھے، ہمیں کچھ معلوم نہیں۔"
"پھر؟" سلیم الدین کی ماں نے رنجور لہجے میں پوچھا۔
"پھر کیا خالا..... بے گھر بے در ہوگئی۔ کبھی کسی کے گھر، کبھی کسی کے گھر۔" یاسمین نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ "ہوٹل اور کوٹھیوں کو فروخت کرنے سے جو پیسا ملا تھا، وہ سب حبیب نے اپنے پاس ہی رکھا تھا۔ مجھے بھی کوئی شبہ نہ تھا اس پر۔ میرا اس سے نکاح تھا۔ میری بچی کا باپ تھا وہ۔ میں کیسے اس پر شک کرسکتی تھی۔"
"آپ پڑھی لکھی ہو بیگم..... اس کے پیچھے تو گئی ہوتیں۔" سلیم الدین کی ماں بولی۔
"انگلینڈ میرے لیے انجانا دیس تھا خالا! میں کہاں ڈھونڈتی اسے۔ وہ بے ایمان آدمی تو میرا پاسپورٹ اور ٹکٹ بھی اپنے ساتھ لے گیا تھا۔"
"دوسرا بنوا لیتیں۔"
"جا کے ڈھونڈتی کہاں اور کیسے؟"
"آپ تو بتا رہی تھیں، آپ کی بہن بھی تھی لندن میں۔"
"اس کا بھی کچھ اتا پتا نہیں مجھے۔"
"اپنوں سے آدمی کبھی غافل نہ ہووے۔ برے بھلے وقت اپنے ہی کام آوے ہیں۔"
"ٹھیک کہتی ہو خالا!" یاسمین نے کہا۔ "اچھے وقت میں ہم انسان اتنے مست ہوجاتے ہیں اپنی زندگی میں کہ ہمیں یہ خیال ہی نہیں آتا کہ وقت بدل بھی سکتا ہے۔ ہمیں اپنوں کی ضرورت پڑسکتی ہے۔"
"اب کہاں رہتی ہیں آپ؟" سلیم الدین کی بیوی نے پوچھا۔
"دنیا بہت بڑی ہے۔" یاسمین نے جھینپتے ہوئے گول مول سا جواب دیا۔ سیاہ برقعے کے نچلے کنارے سے یاسمین کے پیروں کی خستہ حال گرگابیوں میں اس کے پیروں کے گرد آلود پنجے جھانک رہے تھے۔ ہر وقت نوک پلک سے آراستہ رہنے والی بیگم کے چہرے پر غازہ وغازہ سرخی.....

بے بسی تھی اور آنکھوں سے اداسی امڈ رہی تھی۔
"برقع اتار دیں بیگم! آرام سے بیٹھیں۔ میں کھانا لاتی ہوں۔" سلیم الدین کی بیوی نے کہا۔
"نہیں نہیں..... کھانے کی ضرورت نہیں۔"
"آپ پہلی بار ہم غریبوں کے گھر آئی ہو۔ کھانا کھائے بغیر کیسے جانے دیں گے۔"
"دعا کرو میری بچی مل جائے مجھے۔"
"اللہ کرے گا ضرور ملے گی۔" سلیم الدین کی ماں نے تسلی دی۔
یاسمین برقعے کے نقاب سے اپنی آنکھیں پونچھنے لگی۔ سلیم الدین کی ماں دل ہی دل میں ترساں ہوئی۔ ہمیشہ خوشبو میں بسے رہنے والے سراپا سے پسینے کی بو آرہی تھی۔
سلیم الدین کی بیوی کھانا لے آئی۔ چنگیر میں دستر خوان میں لپٹی چپاتیوں اور رکابی میں ماش کی دال جس پر سبز دھنیے کی پتیاں کتر کر بہو نے اپنی سلیقہ مندی ظاہر کی تھی۔ یاسمین کھانا کھانے سے گریزاں ہوئی مگر سلیم الدین، اس کی ماں اور بیوی کے اصرار نے اسے کھانا کھانے پر مجبور کردیا۔
کھانے کے بعد یاسمین نے جانے کا قصد کیا تو سلیم الدین کی ماں نے کہا۔ "پھر آئیو۔"
"ان شاء اللہ..... گھر دیکھ لیا ہے، آؤں گی۔"
"میں اسٹاپ تک چھوڑ آتا ہوں۔ آپ نے جانا کہاں ہے؟" سلیم الدین نے پوچھا۔
"میں چلی جاؤں گی۔" یاسمین نے سلیم الدین کے سوال کا جواب دینے سے گریز کیا۔
"اسٹاپ تک تو رستہ بتادوں۔" سلیم الدین بولا۔
"اتنا کھوئی ہوں کہ اب مجھے سب رستے آگئے ہیں۔" یاسمین کے لہجے میں درد تھا۔
یاسمین کے تردد کے باوجود سلیم الدین اسے بس اسٹاپ تک چھوڑنے گیا اور اس کی مطلوبہ نمبر بس میں بٹھانے کے بعد گھر واپس آگیا۔
"توبہ توبہ" سلیم الدین کی بیوی نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے ترسناک لہجے میں کہا۔ "خدا کسی کی بنی یوں نہ بگاڑے۔"
"اس عورت کو اپنے کیے کی سزا ملی ہے۔" سلیم الدین بولا۔ "اس نے داؤد جیسے بھلے آدمی کی قدر نہیں کی۔ اماں! میں کہتا تھا نا تم سے لوگ کہتے ہیں داؤد سیٹھ اپنی موت نہیں مرا۔ اس کی بیوی اور حبیب مل کر اس سے ہاتھ کرگئے ہیں۔"
"چپ کر۔ ہم کون ہوتے ہیں یہ فتویٰ دینے والے کہ کس کو کس کے کیے کی سزا ملی ہے۔ بندوں کا کیا اللہ ہی

جانے۔" ماں نے سلیم الدین کو گھر کی دی۔
"مجھے تو بڑا ترس آیا اماں!" بہو بولی۔
"بس بہو! اللہ سے پناہ مانگتے رہنا چاہیے بندے کو۔ اچھے وقت میں یہ نہ بھولے کہ وقت پلٹ بھی سکتا ہے۔ کیسی شان تھی اس عورت کی۔"
"اماں! مجھے تو آج بھی کوٹھی کی ٹھنڈک اور خوشبو یاد آتی ہے۔" سلیم الدین کی بیوی نے میاں کو دیکھا اور بولی۔ "تم دیکھتے نا..... کوٹھی میں تو بلیاں بھی قالینوں پر بیٹھتی تھیں..... اور پردوں والی موٹر کار میں سیر کا تو مزہ ہی کچھ اور تھا۔ بیگم موٹر میں ایسی شان سے بیٹھتی تھی کہ جیسے کوئی ملکہ۔"
"مجھے لگتا ہے اب تو اس کے پاس رہنے کو کوئی ٹھکانا بھی نہیں ہے۔ میں بس اسٹاپ تک چھوڑنے گیا تو بھی کہتی تھی گرومندر جاؤں گی اپنی سہیلی کے گھر۔ بھی پوچھتی تھی چیل کوٹھی جانے والی بس مل جائے گی یہاں سے؟"
"تو تم نے کون سی بس میں بٹھا دیا؟"
"چیل کوٹھی جانے والی بس کب ملتی ہے اپنے اسٹاپ پہ۔ میں تو گرومندر والی بس میں بٹھا آیا۔"

☆☆☆

وہ ہی دن گزرے تھے کہ یاسمین پھر سلیم الدین کے گھر آ گئی۔ پہلے سے شرابور..... حال سے بے حال..... ایک تھیلے میں کوئی درجن بھر کیلے لائی تھی جو اس نے آتے ہی سلیم الدین کی بیوی کو تھما دیے۔
"یہ کس لیے؟"
"کھاؤ..... بچوں کو کھلاؤ۔" یاسمین نے فیاضانہ لہجے میں کہا۔
"بچے تو اب بڑے ہو گئے۔ اپنی مرضی کا لاتے ہیں، اپنی مرضی کا کھاتے ہیں۔"
"خالا کو دو۔"
"ضرورت کیا تھی لانے کی۔"
"اس دن تو سلیم کے ساتھ آ گئی تھی۔ بس خالی ہاتھ چلی آئی۔"
"کوئی بات نہیں۔ ساری زندگی بھر بھر کے دیتی بھی تو رہی ہو۔"
"اللہ کی مہربانی تھی۔ حبیب نے میرے ساتھ اچھا نہیں کیا۔ مال دولت کی مجھے پروا نہیں۔ خالی ہاتھ آئی تھیں ہم دونوں بہنیں ایران سے پاکستان۔ اللہ نے بہت دیا..... بہن کو بھی اور مجھے بھی..... بس میری بیٹی کو نہ لے جاتا وہ۔" بیٹی کے ذکر پہ یاسمین کی آنکھوں میں آنسو اور آواز میں رقت گھل گئی۔ "بھولتا نہیں مجھے اس کو آخری مرتبہ دیکھنا۔ اس نے حبیب کی گود میں مجھے ہاتھ ہلا کر بائے بائے کہا تھا۔"
"کبھی کوئی خیر خبر نہیں ملی اس کی؟" سلیم الدین کی ماں نے پوچھا۔
اس نے مایوسی سے نفی میں سر ہلا دیا پھر اچانک اس کی آنکھوں میں ایک جوت سی دکھائی دی۔ "اب تو ماشاء اللہ بڑی ہو گئی ہو گی۔ ویسے حبیب پیار بہت کرتا تھا اس سے۔"
"مگر تمہیں تو دھوکا دے گیا۔" سلیم الدین کی ماں یاسمین کی زبوں حالی دیکھ کر آپ سے تم پر آ گئی۔
"کوئی بات نہیں۔ اس کا کیا اس کے ساتھ۔ آدمی کسی کے ساتھ بُرا کرے گا تو بھگتتا تو ہے۔"
"تم نے تو سب کے ساتھ ہمیشہ اچھا ہی کیا۔"
"شاید کسی کے ساتھ بُرا بھی ہو گیا ہو۔" اس نے دھیرے سے کہا۔
دو تین گھنٹے بیٹھ کر واپس جانے لگی تو اس نے سلیم الدین کی ماں سے کہا۔ "کوئی کام ہو..... یا کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتانا۔"
"اللہ خوش رکھے۔"
"بس دعا کرو کہ میری بیٹی ایک بار مجھے مل جائے۔"
جاتے جاتے اس نے اپنے پیروں میں پہنی چپلیں اتارتے ہوئے سلیم الدین کی بیوی سے کہا۔ "یہ تم پہن لو۔ اپنی کوئی پرانی چپل دے دو مجھے۔"
"نہیں نہیں..... اس کی ضرورت نہیں۔" وہ گھبرا کر بولی۔
"میری خوشی ہے۔ میری سہیلی نے تحفے میں دی تھی مجھے۔ اس کا خاوند باہر سے لایا ہے۔"
"آپ پہنو..... مجھے ضرورت نہیں۔"
"میں خوشی سے دے رہی ہوں۔ اسے سمجھاؤ خالا! جب کوئی پیار سے کچھ دے تو انکار نہیں کرنا چاہیے۔"
"لے لو بہو!"
اپنی چپلیں دے کر اور خود سلیم الدین کی بیوی کی ٹوٹی ہوئی پرانی چپل پہن کر یاسمین رخصت ہو گئی۔

☆☆☆

سلیم الدین کے گھر میں یاسمین کا پاؤں کھلا تو وہ اکثر آنے جانے لگی۔ جب آتی، ہاتھ میں تھوڑا بہت کچھ نہ کچھ لے کر۔ کبھی کوئی پھل، کبھی سبزی، کبھی ڈبل روٹی، کبھی نان پکوڑے۔ یوں لگتا جیسے وہ سلیم الدین کے گھر اپنی..... آمد و رفت اور کھانے پینے کا بدلہ اتارنا چاہتی ہو۔ کبھی اپنے سر کا

دوپٹا اتار کر سلیم الدین کی بیوی سے اس کی کوئی پرانی اوڑھنی لے لیتی، کبھی سویٹر اتار کر بہ اصرار سلیم الدین کی ماں کو پہنا دیتی۔ کبھی اپنے بٹوے میں سے کچھ پیسے نکال کر اس کی مٹھی میں دبا دیتی۔ سلیم الدین کی ماں جہاندیدہ عورت تھی۔ یاسمین کی باتوں سے سمجھتی تھی کہ یاسمین کا کوئی مستقل ٹھکانا نہ رہا تھا۔ کبھی کسی شناسا کے گھر پڑ رہتی، کبھی کسی کے۔ مستقل کسی کو کوئی کب رکھتا ہے اپنے گھر میں اور وہ بھی ایسی عورت کو جو نہ کسی کو کچھ دے سکتی تھی نہ ہاتھ پاؤں سے کسی کی خدمت گزاری کر سکتی تھی۔ سلیم الدین کی ماں یہ بھی سمجھتی تھی کہ یاسمین جو اس کے گھر تھوڑی بہت کوئی چیز لے آتی تھی یا اس کے بٹوے میں گنے چنے پیسے ہوتے تھے، وہ بھی اس کے شناساؤں کی احسان مندی کی بدولت..... باتوں باتوں میں وہ بتا جاتی تھی کہ فلاں کے گھر گئی تو اس نے یہ دے دیا، فلاں کے ہاں گئی تو اس نے زبردستی اتنے پیسے دے دیے۔ وقت بگڑے تو امیر فقیر بن جاتے ہیں۔ یاسمین بھی وقت بگڑنے پر خانم سے خانہ بدوش بن گئی تھی۔
رفتہ رفتہ وہ سلیم الدین کے ہاں ایسی بے تکلف ہوئی کہ اس نے شب بسری کے لیے اسی گھر کو اپنا مسکن بنا لیا۔ البتہ زیادہ بوجھ نہ بننے کے لیے صبح کو برقع اوڑھ کے اور بغل میں کپڑے کا خالی تھیلا دبا کر وہاں سے چلی جاتی اور شام کو اسی تھیلے میں کبھی کھانے پینے کی چیز، کبھی استعمال شدہ زنانہ کپڑے، کبھی پرانے سینڈلز، کبھی نئی چپل، کبھی بستر پر بچھانے کو استعمال شدہ چادر، کبھی گھریلو استعمال کی کوئی چیز لے کر آتی اور سلیم الدین کی ماں یا بیوی کے سپرد کر دیتی۔ رات کو وہ سلیم الدین کی ماں کے نزدیک ہی ایک چارپائی پر سو رہتی۔
سلیم الدین اب اکثر ناراضی کا اظہار کرنے لگا تھا۔ "یہ کیا طریقہ ہے اس عورت کا۔ صبح برقع اوڑھ کے نکل جاتی ہے، شام کو آ جاتی ہے۔"
"اللہ کسی کی بنی نہ بگاڑے۔" سلیم الدین کی ماں ترس کھاتی۔
"اماں اپنی اس عورت نے خود بگاڑی ہے۔ داؤد سیٹھ کی وفادار رہتی، اس کی قدر کرتی تو یہ وقت نہ دیکھنا پڑتا اسے۔"
"ماں صدقے! اللہ سے پناہ مانگنی چاہیے۔"
"گھر میں تو یہ ہمارے پڑی ہے نا۔ شرافت سے پڑی رہے ایک کونے میں..... روٹی ٹکڑا مل ہی جائے گا۔ یہ کیا کہ صبح ہوئی برقع اوڑھا اور نکل گئی۔ ہمیں کیا پتا دن بھر کہاں رہتی ہے، کیا کرتی ہے؟ محلے والے کیا سوچتے ہوں گے؟"
"ارے بیٹا! محلے والے جو سوچا کریں، سوچنے دے انہیں۔ لوگ دوسروں کے لیے اچھا کب سوچتے ہیں..... اور محلے والوں نے اس بے چاری کا اچھا وقت کب دیکھا ہے بھلا جو اب اس کے بُرے وقت میں اس کے لیے اچھا سوچیں گے۔ ماں صدقے! ہم نے تو دیکھ رکھی ہے نا اس نصیبوں جلی کی بادشاہی..... قالینوں سے نیچے پاؤں نہ پڑا کریں تھے اس کے۔ اب جو شام کو گھر آوے ہے تو منہ پہ تھکن، پیروں پہ منوں دھول مٹی جمی ہووے ہے۔"
"اماں! تمہیں ہوگی اس سے ہمدردی..... مجھے اچھا نہیں لگتا کہ اس کے رہنے سے محلے میں ہماری بدنامی ہو۔"
"آدھی عمر کی عورت ہے بیٹے! اس نے کون سا کوئی غلط کام کرنا ہے جو ہماری بدنامی ہووے گی۔ رات گزارنے آوے ہے، صبح چلی جاوے ہے۔" سلیم الدین کی ماں بیٹے کی ناراضی دور کرنے کو یاسمین کی وکالت کرتی۔
"ہاں تو یہ شریف عورتوں کا شیوہ کب ہوتا ہے۔ اس سے کہو شرافت سے گھر میں بیٹھے ورنہ اپنا کوئی اور ٹھکانا کرلے۔"
"ہائے میرے بچے!" ماں نے دہل کر سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "کسی روز اس بے چاری نے سن لیں تیری یہ باتاں تو پلٹ کے قدم نہ رکھے گی وہ اس گھر میں۔"
"نہ رکھے۔ میں بھی یہی چاہتا ہوں۔ تمہیں ہوگی اس سے ہمدردی..... مجھے بالکل نہیں ہے۔"
"ماں صدقے! نمک کھا رکھا ہے ہم نے اس کا۔"
"مفت میں نہیں کھایا..... خدمت بھی کی ہے۔"
"خاک خدمت کی ہے۔ داؤد سیٹھ کو اللہ جنت میں جگہ دے..... جو کام لیا کرے تھا اس کی تنخواہ دیا کرے تھا، تجھے بھی اور مجھے بھی۔"
"اماں! مجھے بحث میں پڑنا اچھا نہیں لگتا۔ سیدھی سی بات ہے..... بچے جوان ہو رہے ہیں..... بہوویں بھی لانی ہیں ہمیں اس گھر میں۔ اس عورت سے کہو اپنا کوئی اور ٹھکانا کرے۔"
"مجھے بھی نکال باہر کرنا تو اس گھر سے ایک دن اپنی بہوؤں کے لیے جگہ بنانے کو۔" ماں کو غصہ آ گیا۔
"ناراض کیوں ہوتی ہو۔ تم تو میری ماں ہو۔"
"تو اگر سمجھے تو وہ بھی تیری ماں کی طرح ہے۔"
"اللہ نہ کرے جو میری ماں کی طرح ہو۔ پتا ہے نا اس نے کیسے دغا دی داؤد سیٹھ کو۔ لوگ ٹھیک ہی کہتے تھے..... پہلے سے چکر چل رہا ہوگا اس کا اور اس ڈرائیور حبیب کا۔ جبھی تو عدت پوری کرتے ہی اس سے نکاح کر بیٹھی۔"

"یہ اللہ کا اور بندے کا معاملہ ہے۔ بندہ خطا کا پتلا ہے، اس حد تک بندہ جانے، اللہ جانے۔"
"اللہ دکھا تو رہا ہے گناہ گار کا انجام ہمیں۔"
"تو پھر کر توبہ۔"
"توبہ ہی کرتا ہوں اماں اس عورت کا انجام دیکھ کر توبہ ہی کرتا ہوں۔ ایک اچھے آدمی سے بے وفائی کی کیسی سزا ملی ہے اسے۔"
"میں تو ڈروں ہوں کہ تیری یہ کل کل کسی دن اس بے چاری کے کانوں میں نہ پڑ جاوے۔"
"تم اتنا کیوں ڈرتی ہو اس سے؟"
"اس سے نہیں، اللہ سے ڈروں ہوں..... اس کا اچھا وقت دیکھ رکھا ہے میں نے۔ اس کے گھر کی تو بلیاں بھی چکنی کے برتنوں میں کھاویں پیویں تھیں۔ اب اس کے اپنے سامنے بچے دھر دو، وہ چھپ کرکے کھالیوے ہے۔ رات کو کھری چارپائی پر اپنے سر کے نیچے برقع رکھ کے سو جاوے ہے۔ اللہ معافی..... اللہ معافی۔" سلیم الدین کی ماں نے کانوں کو ہاتھ لگایا۔

☆☆☆

ایک روز وہی ہوا جس کا سلیم الدین کی ماں کو ڈر تھا۔ سلیم الدین کی کل کل یاسمین کے کانوں میں پڑ گئی۔
دو کمروں کا چھوٹا سا گھر تھا۔ ایک کمرے میں سلیم الدین اور اس کی بیوی سوتے تھے۔ دوسرے میں سلیم الدین کی ماں اور اس کے دونوں بیٹوں کی چارپائیاں تھیں۔ یاسمین کے آنے کے بعد دونوں لڑکے اپنی چارپائیاں برآمدے میں لے گئے تھے۔ یاسمین کے لیے وقت بے وقت کسی مہمان کے لیے دیوار کے سہارے کھڑی چارپائی سلیم الدین کی ماں کے کمرے میں بچھادی گئی تھی۔ سردیاں آگئیں تو سلیم الدین کی بیوی نے اپنے جہیز کے پرانے بڑے صندوق میں رکھی ایک رضائی نکال کر یاسمین کو اوڑھنے کے لیے دے دی۔ چارپائی پر بچھانے کے لیے ایک پرانا گدا یاسمین ایک روز خود ہی نہ جانے کس سے اور کہاں سے لے آئی۔
انہی دنوں سلیم الدین کا ایک ماموں زاد بھائی کسی کام سے حیدرآباد سے کراچی آیا اور سلیم الدین کے گھر مہمان ہوا۔ رات کو سونے کے لیے چارپائی کا مسئلہ ہوا۔ سلیم الدین کے بڑے بیٹے نے اپنا بستر اٹھایا، چارپائی مہمان کے لیے خالی کی اور رات گزارنے کے لیے محلے کی مسجد میں چلا گیا۔
گھر چھوٹا تھا۔ ایک کمرے میں کی جانے والی بات دوسرے کمرے میں بھی کان لگا کر سنی جاسکتی تھی اور رات کے سناٹے میں تو کان لگائے بغیر ہی..... یاسمین جو رات کے سناٹے میں چارپائی پر لیٹی بیٹی کو یاد کرکے اپنا دل مسوس رہی تھی، سلیم الدین اور اس کی بیوی کی آوازیں سن کر اپنا غم بھلا بیٹھی۔
"سردی آج بڑھ گئی ہے۔" سلیم الدین کہہ رہا تھا۔
"میرا بچہ مسجد میں جانے کیسے سو رہا ہوگا؟" سلیم الدین کی بیوی بولی۔
"اور خاطریں کرو تم اس عورت کی..... اور ہمدردی کریں اماں اس سے..... مہمانوں والی چارپائی رضائی اسے دے کر یہ تو ہونا ہی تھا۔ اولاد ہماری مسجد میں سو رہی ہے اور یہ عورت ٹھاٹ سے چارپائی پر قبضہ کیے پڑی ہے۔"
"ارے مجھے کیا کہتے ہو۔ میرا تو اپنے بچے کی وجہ سے دل دکھ رہا ہے۔ اپنی اماں کو دعائیں دو جنہوں نے اس عورت کو لارا لگایا۔ آئی تھی، تھوڑی دیر بیٹھ کر چلی جاتی تھی۔ ایک روز تمہاری اماں ہی نے کہا..... رک جاؤ..... اسے تو آسرا چاہیے تھا..... گوند ہوگئی۔"
"اب نہیں جاتی یہ یہاں سے..... کون رکھتا ہے ایسیوں کو..... ارے جو اس آدمی کی نہ ہوئی جس نے اسے ہوٹل کی تماش بینی سے اٹھا کر اپنے گھر کی عزت بنایا..... اسے راج کرایا..... وہ کسی اور کی کیا ہوگی۔ اماں نے تو خوامخواہ کی مصیبت سر لے لی۔"
یاسمین سانس روکے پڑی تھی۔ بیٹی کی جدائی کا غم تحقیر ذات کے دکھ تلے محو ہو چکا تھا۔ باقی رات اس نے اسی دکھ میں گزاری۔
صبح ہوئی تو اس نے چائے کی پیالی، رات کی باسی روٹی اور باسی سالن کے چند نوالوں کے ساتھ زہر مار کی پھر حسب معمول جانے کی تیاری کی۔ برقع اوڑھا، اپنا تھیلا اٹھایا اور سلیم الدین کی ماں سے کہا۔ "اچھا خالا..... جارہی ہوں..... رات کو شاید نہ آؤں۔"
"کیوں؟" سلیم الدین کی ماں چونکی۔
"میری ایک جاننے والی نے بلایا ہے مجھے کچھ دنوں کے لیے۔"
"کتنے دنوں کے لیے؟"
"جاکے پتا چلے گا۔"
"تمہارے آنے سے تو میرا اتنا دل لگ گیا تھا۔ شام کو جب تک نہ آجاتی تھی، دروازے پر آنکھیں لگی رہوے

تھیں میری۔"
"خالا! پھر لگ جائے گا تمہارا دل اپنے بچوں میں..... تمہارے پاس تو تمہارا بیٹا ہے، بہو ہے، پوتے ہیں..... میری تو بیٹی کو بھی دھوکے سے مجھ سے دور لے گیا حبیب..... دعا کرنا، ایک بار تو مل جائے وہ مجھے۔"
"تمہارے دل کی لگی کو اللہ ضرور سنے گا۔" سلیم الدین کی ماں بولی۔ "تمہاری بیٹی ایک نہ ایک دن ضرور آوے گی تم سے ملنے۔"
یاسمین کھل اٹھی۔ "آمین..... ثم آمین خالا!" پھر اس نے کہا۔ "میں تم سے ملوانے کے لیے لاؤں گی اسے۔"
یاسمین چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی سلیم الدین کے گھر سے چلی گئی۔ پھر وہ اس شام نہ اس کے بعد ہی کسی شام واپس لوٹی۔
سلیم الدین کی کل کل بند ہوگئی۔
اس کے دونوں بیٹوں کی چارپائیاں دوبارہ برآمدے سے دادی کے کمرے میں بچھ گئیں۔
سلیم الدین کی ماں اکثر یاسمین کو یاد کرتی۔
"اللہ کی بندی آئی نہیں پلٹ کے۔" وہ بہو سے کہتی۔
"ڈھونڈ لیا ہوگا کوئی دوسرا ٹھکانا۔"
"ایسیوں کے بہتیرے ٹھکانے ہوتے ہیں۔" سلیم الدین بے رحمانہ لہجے میں کہتا۔
"غیر لوگ دو چار دن کو ہمدردی میں رکھے ہیں پھر اکتانے لگے ہیں تیری طرح..... اپنے گھر اور اپنی گود سے اچھا ٹھکانا اور کوئی نہ ہووے ہے۔" ماں سلیم الدین کو یاسمین کے بارے میں اس کے ناروا طرز عمل کا احساس دلانے کی کوشش کرتی۔
"اچھا ہوا چلی گئی۔"
"ہاں، اچھا ہی ہوا..... کسی روز تیری کل کل اس کے کان میں پڑ جاتی تو اس کا دل برا ہوتا۔"
سلیم الدین کی ماں کو کیا پتا کہ ایسا ہو چکا تھا۔ یاسمین اسی لیے گئی تھی اور پھر پلٹ کر نہیں آئی تھی کہ اس نے سلیم الدین اور اس کی بیوی کی باتیں سن لی تھیں۔

☆☆☆

بہت دن گزر گئے۔ سلیم الدین کی ماں بھی گزر گئی۔ سلیم الدین نوکری سے تھک کر اسے خیر باد کہہ کر گھر بیٹھ رہا۔ گھر میں سلیم الدین کے بڑے بیٹے کی دلہن آگئی۔ سلیم الدین کا ہوٹل کے زمانے کا ایک ساتھی جس کا سر اب چٹا ہو چکا تھا، ایک روز اس سے ملنے آیا تو اس نے بتایا داؤد سیٹھ کی دوسری بیوی مر گئی۔
"ابے! داؤد سیٹھ کی بیوی کب رہی تھی وہ۔ وہ تو حبیب ڈرائیور کی بیوی بن گئی تھی۔"
"خیر، جس کی بھی تھی..... مر گئی۔" بتانے والے نے بے نیازی سے بتایا۔
"تجھے کیسے پتا؟"
"مجھے کسی نے بتایا۔"
"کیسے مری؟"
"کیسے مرتا ہے بندہ..... موت آئی، مر گئی..... سڑک پار کر رہی تھی، گاڑی کے نیچے آگئی۔ اس کے بٹوے سے ایک بچی کی تصویر ملی اور ایک پرچی جس پر لکھا تھا..... داؤد معاف کر دینا مجھے۔"
"داؤد نام کے تو ہزاروں ملتے ہیں اس دنیا میں۔ یہ کیسے پتا کہ وہ اپنے داؤد سیٹھ والی عورت ہی تھی؟"
"اس کی تصویر چھپی تھی اخبار میں۔ پہچاننے والوں نے پہچان لیا۔"
"کفن دفن؟" سلیم الدین کو خود اپنی آواز کوسوں دور سے آتی لگی۔
"کر دیا ہوگا کسی خیراتی ادارے نے۔" سلیم الدین کو یاسمین کی موت کی خبر سنانے والے دوست نے کچھ اس طور کہا جیسے کسی زمانے میں شہر کے معروف ترین ہوٹل کے مرحوم و مغفور مالک داؤد کی سابقہ بیوی کی نہیں، کسی لاوارث عورت کی موت اور تکفین و تدفین کی بات کر رہا ہو۔
برسوں پہلے اپنی آنکھوں میں روشن مستقبل کے خواب سجا کر اپنے وطن سے ایک نو آزاد مملکت کی طرف اپنا رخ کرنے والی دو نوجوان اور خوبرو بہنوں میں سے ایک اپنے خوابوں کی تعبیر پانے اور اپنی توقعات سے بڑھ کر عروج دیکھنے کے بعد شیطان کی گمراہ کن چال میں آکر نہایت بے بسی کے اندھیروں میں ماری گئی تھی۔ دوسری بہن نہ جانے کہاں تھی اور کس حال میں تھی۔
بندے کو چاہیے کہ ملنے والی نعمت کی قدر کرے اور ..... عورت وہی آبرومند جو اپنے مرد کی اطاعت شعار ہو اور اس کی غیر حاضری میں بھی اس کی ناموس کی حفاظت کرے۔
سورۃ النساء میں ارشاد ربانی ہے۔
"پس نیک عورتیں (ہوتی ہیں) اطاعت شعار، حفاظت کرنے والیاں (مردوں کی) غیر حاضری میں، ان سب چیزوں کی جن کو محفوظ بنایا ہے اللہ نے۔"

XXX

زندگی پیار کا گیت ہے مگر... صرف وہاں جہاں معاشرہ ناہمواریوں کا شکار نہ ہو... جہاں انصاف اور توازن عنقا نہ ہوں اور بدقسمتی سے وہ جس معاشرے میں رہتا تھا وہاں ناانصافیوں کی تندوتیز آندھیوں نے اسے محض سراپا انتقام بنا دیا تھا... ایک طرف فنونِ حرب وضرب کے ماہر ہاتھوں نے اسے ناقابلِ شکست بنایا تو دوسری طرف ظلم و جبر کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے والے اس پُرعزم نوجوان کو حرفِ غلط کے مانند مٹائے جانے کے منصوبے بنائے جارہے تھے... اس کی زندگی جوالمیوں کا شکار... اندھیروں کے قریب اور روشنی سے دور تھی لیکن... بے خبری میں جنم لینے والے عشق کی لو اسے تیرگی میں بھی راستہ دکھا رہی تھی... رفتہ رفتہ وہ ایک ایسے طوفان کا روپ دھار گیا جس میں شعلوں کی لپک اور بجلی کی چمک تھی... اس کی بے قراریوں کو قرار دینے کے لیے اس کا جنون، اس کا پیار اس کے ساتھ تھا... پھر وہ کیسے زمانے کی چیرہ دستیوں کے آگے ہار مان لیتا... اگرچہ تارِ عنکبوت نے طاقت اور گھمنڈ کے نشے میں چور لوگوں پر پردہ ڈالا ہوا تھا لیکن وہ ہر وار کا توڑ کرتا حق و باطل کی ازلی جنگ یوں لڑتا رہا کہ وارداتِ قلب بھی اس کے فرض کی راہ میں حائل نہ ہوسکی...

اپنے حریفوں پر قہر بن کر نازل ہونے والے ایک سراپا انتقام نوجوان کی حیرت انگیز داستان

کی۔ اس نے ریکارڈ کے لیے جو ایڈریس اور فون نمبر لکھوایا تھا وہ فرضی ہے۔" ایک سوال کے جواب میں میڈم ایکس کو تمام معلومات فراہم کر دی گئیں۔

"تمہارا اس ویڈیو کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"جس طرح ویڈیو میں صرف باذل کو فوکس کیا گیا ہے، اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ ویڈیو ان ہی لوگوں نے تیار کی ہے جن سے وہ معاملہ طے کر رہا ہے۔"

"اور ہمیں ویڈیو بھجوانے میں بھی ان ہی لوگوں کا ہاتھ ہے۔"

"آف کورس میڈم! ایسا لگتا ہے کہ باذل کو پھنسانے کے لیے جال بچھایا گیا ہے۔" خیال آرائی کی گئی۔

"جال بچھانے کی اصطلاح تو اس وقت استعمال ہوتی جب مخالف پارٹی کی طرف سے ڈیل آفر ہوتی۔ اس ویڈیو سے صاف ظاہر ہے کہ آفر لے کر باذل ان کے پاس گیا تھا۔" میڈم ایکس نے اس کی رائے سے اختلاف کیا۔

"آپ درست کہہ رہی ہیں میڈم! لیکن ویڈیو سے بہرحال یہ اندازہ ہوتا ہے کہ دوسری پارٹی کا بھی کوئی انٹرسٹ ہے۔"

"گڈ پوائنٹ۔ اب ایسا کرو کہ باذل کو بلواؤ۔ دوسری پارٹی کون ہے، یہ اسی سے پتا چلے گا پھر ہم ایک ساتھ دونوں سے نمٹ لیں گے۔ ہمارا اتنا بڑا نقصان ہوا ہے، جواب تو دینا ہوگا انہیں۔"

"اوکے میڈم!" ماتحت حکم کی تعمیل کے لیے چلا گیا جبکہ میڈم ایکس کمرے میں ادھر سے اُدھر ٹہلنے لگی۔ اسے جو ویڈیو موصول ہوئی تھی وہ لالہ عیسیٰ کے ٹھکانے پر ہونے والی گڈو اور باذل کی ملاقات کی ویڈیو تھی لیکن ویڈیو میں گڈو نظر نہیں آ رہا تھا۔

"ایک کے بعد ایک ہر روز ایک نیا مسئلہ نکل آتا ہے۔" ٹہلتے ٹہلتے وہ زیرِ لب بڑبڑائی پھر انٹرکام کے قریب جا رکی۔

"سونیا کے بارے میں کوئی اطلاع؟" اس نے دوسری طرف لائن پر موجود شخص سے پوچھا۔

"ایک مبہم سی خبر آئی ہے میڈم! میں آپ سے شیئر کرنے آنے ہی والا تھا۔"

"فوراً آجاؤ۔" اس نے حکم دیا۔ اگلے چند سیکنڈوں میں اس کا ایک اور ماتحت اس کے روبرو کھڑا تھا۔

"کیا خبر ہے؟"

"خبر حیدرآباد دکن سے موصول ہوئی ہے۔ خبر کی تفصیلات سے زیادہ اس کے ساتھ موصول ہونے والی یہ فوٹیج زیادہ اہم ہے۔" اس نے لیپ ٹاپ کی اسکرین میڈم ایکس کے سامنے کی۔ اس فوٹیج میں ایک لمبے قد کا مرد، ایک چہرے کو چادر کے پلو سے چھپائے عورت اور عورت کی گود میں موجود بچہ نمایاں تھے۔

"مرد اور عورت کے بارے میں شک ہے کہ یہ معاذ اور کنول ہیں اور کنول کی گود میں موجود بچہ اس کا بیٹا اعظم۔ ہمارے ذریعے نے یہ فوٹیج اصل میں بچے کی وجہ سے ہی بھیجی ہے۔ اسے یقین ہے کہ یہ بچہ صداقت شاہ کا نواسہ اعظم شاہ ہی ہے۔"

"مجھے بھی ایسا ہی لگ رہا ہے۔ تم فوٹیج میں نظر آنے والے جوان پر غور کرو۔ اگرچہ اس کی شکل و صورت مختلف ہے لیکن قد کاٹھ اور کھڑے ہونے کا انداز بالکل معاذ جیسا ہے۔"

"اگر یہ وہی لوگ ہیں تو مجھے شک ہے میڈم سونیا اس وقت مشکل میں ہوں گی۔"

"کیا مطلب؟" ماتحت کے چہرے کے گمبھیر تاثرات نے میڈم کو چونک کر سوال کرنے پر مجبور کیا۔ جواباً اسے ساری تفصیل سنا دی گئی۔

"میری سمجھ سے باہر ہے کہ یہ اسٹوپڈ لڑکی کرتی کیا پھر رہی ہے۔ میں نے اسے معاذ کو تلاش کرنے کی ذمے داری سونپی تھی اور یہ ہے کہ اس کا ساتھ دیتی پھر رہی ہے۔" اس کے انداز میں سونیا کے لیے غصہ تھا۔

"میڈم سونیا سے ملاقات سے پہلے کوئی حتمی نتیجہ نکالنا درست نہیں ہوگا میڈم! میڈم سونیا بہت ذہین ہیں اور ہم کچھ نہیں کہہ سکتے کہ وہ جو کچھ کر رہی ہیں اس کے پیچھے کیا ریزن ہے۔" وہ ان کا بہت پرانا ساتھی تھا اور اس نے سونیا کو تنظیم کے لیے بے شمار کارنامے انجام دیتے دیکھا تھا اس لیے اسے یہ یقین کرنے میں تامل تھا کہ وہ تنظیم کے بجائے کسی اور کا ساتھ دے رہی ہے۔

"آئی ہوپ کہ ایسا ہی ہو لیکن فی الحال میں اس سب سے بہت پریشان ہوں۔ کافی عرصے سے ہمیں مسلسل ناکامیوں کا سامنا ہے اور یہ چیز میرے لیے شرمندگی کا باعث بنی ہوئی ہے۔"

"مجھے تو ایسا لگتا ہے میڈم کہ معاذ ہمارے لیے منحوس ثابت ہوا ہے۔ جب سے ہم نے اسے اپنے ساتھ ملانے کی کوششیں شروع کی تھیں، تب سے ہی ہم مسائل کا شکار ہیں۔" ماتحت نے ایک ایسی بات کی جس پر میڈم ایکس اس کی شکل دیکھتی رہ گئی۔

"میں نے کچھ غلط کہہ دیا میڈم؟" وہ اس کے یوں دیکھنے پر بوکھلایا۔

"نہیں۔ بس میں یہ سوچ رہی تھی کہ ہماری ناکامی کے پیچھے ہماری بیڈلک نہیں بلکہ معاذ کی گڈلک ہے۔ وہ غیر معمولی صلاحیتوں والا جوان ہے اور ایسے لوگوں کی قسمت بھی ان کا بہت زیادہ ساتھ دیتی ہے۔ کاش کہ ہم اس کی گڈلک کے ساتھ اسے اپنا وفادار بنانے میں کامیاب ہو جاتے تو آج ہماری کامیابیوں کا تناسب ہی کچھ اور ہوتا۔" میڈم کے لہجے میں ایک حسرت سی تھی۔

"آپ فکر نہ کریں۔ مجھے پوری امید ہے کہ میڈم سونیا اسے گھیر کر ہمارے پاس واپس لانے میں کامیاب ہو جائیں گی۔" وہ کتنی خوش کن امیدیں دلا رہا تھا۔ میڈم ایکس کو اپنے مزاج میں ایک خوشگوار سی تبدیلی کا احساس ہوا۔ واقعی اس انداز میں تو اس نے سوچا ہی نہیں تھا۔

"مگر سونیا....." اچھا سوچتے سوچتے سونیا کے خیال نے اسے بے چین کر دیا۔ اس نے محسوس کیا تھا کہ سونیا کے انداز میں کوئی تبدیلی در آئی ہے بلکہ اسے شک تھا کہ سونیا، معاذ کی طرف ملتفت ہے اور یہی شک اسے سونیا پر وہ اعتماد نہیں کرنے دیتا تھا جو اب بھی اردگرد کے لوگوں کو اس پر تھا۔ وہ سونیا کے بارے میں کئی منفی رپورٹس سننے کے باوجود بھی ابھی تک اس کے لیے منفی انداز میں نہیں سوچ رہے تھے اور ان کے دلوں میں یہی خیال تھا کہ وہ جو کچھ کرتی پھر رہی ہے، اس کے پیچھے کوئی گہری چال ہے۔

"کاش کہ تم میری تربیت کی لاج رکھو اور تمہارا خون اپنا اثر نہ دکھائے۔" اس نے ماتحت کو رخصت کر دیا اور سونیا کا تصور کرتے ہوئے غائبانہ اس سے مخاطب ہوئی۔ تصور بھلا اسے کیا جواب دیتا لیکن یادوں کا ایک سلسلہ تھا جو اسے اپنی گرفت میں لے چکا تھا۔ بہت سخت دل اور عملی افراد کی زندگی میں بھی کبھی کوئی کمزور لمحہ آیا ہوتا ہے اور وہ لمحہ ایسا ہوتا ہے جو پوری حیات پر پھیل جاتا ہے۔ میڈم ایکس بھی اپنی زندگی کے اس کمزور لمحے کی گرفت میں تھی۔

☆☆☆

"جو کچھ تو کر رہا ہے، اس کا انجام سوچا ہے شہزادے؟"

"انجام ان شاء اللہ اچھا ہی ہوگا۔ بس تم تیل دیکھو اور تیل کی دھار دیکھو۔" شہزادہ مطمئن تھا۔

"وہ حرام..... باذل پھنسے گا تو ساتھ ہماری بھی ٹانگ گھسیٹے گا۔" گڈو استاد کی تشویش برقرار تھی۔

"گھسیٹنے دو ٹانگ۔ ہماری ٹانگ گھسیٹ کر بھی وہ اپنی گردن نہیں بچا سکے گا۔"

"یہ تو تو ٹھیک کہہ رہا ہے۔" گڈو استاد نے اس کی تائید کی۔

"دیکھو استاد! اس پوری ویڈیو میں کہیں بھی یہ ظاہر نہیں ہو رہا کہ ہم اوپر والوں کو کوئی نقصان پہنچانا چاہتے ہیں۔ یہ ایک کام کی آفر تھی جو ہمیں باذل نے دی تھی۔ ہمیں نہیں پتا تھا کہ اس سے کس کا نقصان ہوگا۔ ہم تو انجان لوگ ہیں اور لالہ عیسیٰ کے بعد خود سے اپنے قدم جمانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ لالہ گہرا آدمی تھا اور اپنے تمام معاملات کی اپنے قریبی ساتھیوں کو بھی ہوا نہیں لگنے دیتا تھا اس لیے ہمیں اس کی ڈیلنگز کا بھی علم نہیں تھا۔ باذل نے بھی میڈم کا نام بعد میں اس وقت لیا جب ہم ناکام ہو گئے اور وہ ہماری ناکامی پریکٹس میں آ گیا۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ باذل کی پانی سب کے ساتھ ساتھ ہمیں بھی پھنسانے کی کوشش تھی۔ اگر ہم مال سمیت پولیس کے ہاتھوں گرفتار ہو جاتے تو ہمارا برا حشر ہو جاتا۔"

"یہ تو بالکل ٹھیک بات ہے۔ تمہاری ہمت اور پھرتی نے بچا لیا ہمیں ورنہ ابھی کسی ریڈیشن پر ہر طرف ہائے لڑتو دکھائی دے رہے ہوتے۔" گڈو نے اعتراف کیا۔ اسی وقت اس کے موبائل پر کوئی پیغام موصول ہوا۔ اس نے پیغام بھیجنے والے کا نام پڑھا تو فوراً اسے کھول کر پڑھنے لگا۔ پیغام پڑھ کر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

"مبارک ہو استاد! باذل کو میڈم کے آدمی اپنے ساتھ لے گئے ہیں۔"

"بس تو پھر ہمارا بلاوا بھی آتا ہی ہوگا۔" گڈو بے ساختہ بولا تو اس کا قہقہہ نکل گیا۔

"بلاوا آنے سے پہلے مجھ سے سارے اہم پوائنٹ ڈسکس کر لو۔ میڈم کے سامنے یہ کیس تم نے ہی لڑنا ہے۔ میں تو گونگا ہوں۔" جملے کے آخر میں اس نے مظلوم سی شکل بنائی تو گڈو استاد ہنس دیا اور محبت سے بولا۔

"تو بھی سالا بڑا ڈرامے باز ہے۔"

"وہ تو ہوتا ہی ہے۔ آخر تعلق کہاں سے ہے میرا۔" اس نے کالر کھڑا کیا۔

"تعلق جہاں سے بھی ہو، ہماری تو تُو جان ہے۔" گڈو کی آنکھوں میں اس کے لیے ڈھیروں محبت تھی۔

"میرے خیال میں اظہارِ محبت بہت ہو چکا۔ اب کام کی باتیں کر لیں۔" اس نے کہا تو گڈو استاد ہمہ تن گوش ہو گیا۔ بہت دیر تک دونوں باریک بینی سے ایک ایک نکتے پر مباحثہ کرتے رہے۔ جب کافی حد تک اطمینان ہو گیا تو ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد قہوے کا سلسلہ چل

رہا تھا جب ایک شخص نے آکر اطلاع دی۔
"حامد آیا ہے۔"
"کون حامد؟" گرو استاد چونکا۔
"داراب خان کا ملازم۔ وہی جو اس کی بیوی کا سیکریٹری ہوتا تھا۔"
"وہ کیوں آیا ہے؟ بلاؤ اسے۔" حیران انداز سے گرو نے اجازت دی۔
"داراب خان وہی ہے نا جس کی بیوی بہت خوبصورت اور بیگ ہے؟"
"ہاں وہی ہے، بلکہ تھا۔ کافی عرصہ ہوا اچانک ہی اس کے مرنے کی اطلاع ملی تھی۔ کچھ عرصے بیوی نے کاروبار سنبھالا لیکن اب تو وہ بھی کافی عرصے سے منظر پر نہیں ہے۔" گرو نے اس کی معلومات میں اضافہ کیا۔ وہ مزید کوئی سوال کرتا اس سے پہلے حامد وہاں پہنچ گیا۔
"کیسے آنا ہوا؟" مصافحے اور چند رسمی جملوں کے تبادلے کے بعد گرو استاد نے اس سے دریافت کیا۔ جواباً اس نے گرو کے پیچھے کھڑے کشتی بالوں والے نوجوان کی طرف دیکھا۔
"یہ لوکا میرا ہے۔ اس کی پروا کیے بغیر جو کہنا ہے کھل کر کہو۔" گرو نے اس کا مطلب سمجھتے ہوئے اسے تسلی دی۔
"میں ایک بہت خاص کام سے تمہارے پاس آیا ہوں۔ ویسے تو میرے پاس آدمیوں کی کمی نہیں لیکن ہمارے سارے آدمی ہمارے دشمنوں کے جانے پہچانے ہیں اس لیے میں باہر سے بندے ہائر کرنا چاہتا ہوں۔"
"پہیلیاں نہ بجھواؤ۔ جو کام ہے صاف بولو۔" گرو نے حامد کو ٹوکا۔
"میں میڈم کو تلاش کروانا چاہتا ہوں۔"
"میڈم..... مطلب سونیا خان؟" کام سن کر گرو نے حیرت سے پوچھا جس کے جواب میں حامد نے اثبات میں سر ہلا دیا۔
"یعنی تمہاری میڈم غائب ہے اور تم اس کا کھوج لگانا چاہتے ہو؟"
"ایسی ہی بات ہے۔ کافی عرصے سے ہمارے پاس میڈم کے سلسلے میں کوئی کنفرم خبر نہیں آئی ہے اور میں ان کے لیے بہت پریشان ہوں۔" حامد نے انکشاف کیا۔
"تمہاری میڈم گئی کہاں تھی؟ میرا مطلب ہے کہ اپنا کوئی اتا پتا تو دے کر گئی ہوگی۔"
"بس اتنا معلوم ہے کہ وہ انڈیا گئی تھیں۔ آخری اطلاع کے مطابق انہیں حیدرآباد میں دیکھا گیا تھا لیکن وہاں سے بھی کوئی اچھی خبر نہیں ملی۔ ایسا لگتا ہے وہاں وہ کچھ لوگوں کی قید میں ہیں اور ان لوگوں کی اجازت کے بغیر کچھ نہیں کر سکتیں ورنہ اب تک مجھ سے رابطہ کر چکی ہوتیں۔" حامد بڑی عجیب و غریب داستان سنا رہا تھا۔
"تم نے اوپر والوں سے اس سلسلے میں مدد نہیں مانگی؟" گرو نے دبے لہجے میں پوچھا۔ نام کوئی نہیں لیتا تھا لیکن معلوم سب کو تھا کہ شہر میں جتنے بھی گروہ کام کر رہے ہیں سب کے تانے بانے کہاں جا کر جڑتے ہیں۔
"اوپر والے بس کام اور مال کی بات کرتے ہیں۔ ہمارے اندرونی مسائل سے ان کا کوئی لینا دینا نہیں۔ اسی طرف سے مایوس ہو کر ہی تو میں یہاں مدد کے لیے آیا ہوں۔"
"معقول معاوضہ ملے تو انکار کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔" گرو فوراً بزنس مین بن گیا۔
"منہ مانگا معاوضہ دوں گا۔ بس کام ہونا چاہیے۔" حامد نے اسے یقین دہانی کروائی۔
"کام ایک دم چکاس ہوگا۔ اپنے سب سے قابل بندے لگاؤں گا میں اس کام پر لیکن تمہیں نقدی پر ساتھ کام سے پہلے دینا ہوگا اور ساتھ ہی خرچہ پانی بھی۔" گرو بڑی تیزی سے اس کے ساتھ معاملات طے کرنے لگا۔
"او کے ڈن۔" حامد اس کی ساری شرطیں ماننے کے لیے تیار تھا۔
"ایسا ہے تو میری طرف سے بھی ڈن ہے۔ تم مجھے میڈم کے بارے میں ساری انفارمیشن دے دو۔ آگے کا کام میرے آدمی سنبھال لیں گے۔" گرو استاد نے ہامی بھرلی۔ اس کے ہامی بھرنے کے بعد ان کے درمیان مزید کچھ معاملات طے پائے پھر حامد رخصت ہوگیا۔
"یہ کیا ہوا؟ ہم تو کسی اور کے انتظار میں تھے اور یہاں کوئی اور چلا آیا۔" حامد کے رخصت ہوتے ہی لوکا بول پڑا۔
"چکر تو اپنے پلے بھی نہیں پڑا۔ اسی واسطے ہاں بول دی ہے۔ کبھی کبھی چکر میں پڑ کر ہی چکر سمجھ آتا ہے۔"
"یہ سونیا گڑبڑ گھٹالا عورت ہے۔ بشریٰ گلزار کی زندگی خراب کرنے میں بھی اس کا بڑا ہاتھ تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ یہ چکرباز عورت خود کیسے گم ہو سکتی ہے۔" وہ الجھا ہوا ہی تھا۔
"کبھی کبھی چوروں کو بھی مور پڑ جاتے ہیں۔" گرو ہنسا۔
"میرا ذہن اس سب کو قبول نہیں کر رہا۔ کچھ ہے جو کھٹک رہا ہے۔"
"مجھے بھی کھٹک رہا ہے اور اسی لیے میں نے اس کام

کو کرنے کی ہامی بھری ہے۔ یہ سونیا خان معمولی بندی نہیں ہے۔ تنظیم کی ہر پارٹی میں کافی نمایاں ہوتی تھی۔ مجھے تو شک ہے کہ اس کا میڈم ایکس سے ڈائریکٹ کانٹیکٹ تھا۔ اگر ہم میڈم ایکس تک پہنچنا چاہتے ہیں تو اس کو تلاش کرنا ہوگا۔" گرو کے الفاظ میں اس کا تجربہ بول رہا تھا۔
"ٹھیک ہے..... پھر کسے بھیجو گے اس کام کے لیے؟" وہ کچھ کچھ قائل ہو گیا۔
"ابھی سوچا نہیں۔ تو ایسا کر حامد نے جو انفارمیشن دی ہیں، ان کو سامنے رکھ کر تھوڑا ہوم ورک کروا لے اس پر۔ یہ ضرور نوٹ کرنا کہ آج کل حیدرآباد میں حالات کیسے ہیں؟ حالات کی گڑبڑ سے بھی کوئی سراغ مل سکتا ہے۔" گرو، لالہ بھی کا تربیت یافتہ تھا اور اسی کی طرح منطقی انداز میں سوچ رہا تھا۔
"اور یہ میڈم ایکس اور بازل کا کیا ہوگا؟ جتنی دیر ہوگئی ہے اس کی طرف سے بازل کو ٹھوائے، اتنی دیر میں تو کوئی نتیجہ نکل جانا چاہیے تھا۔ ظاہر ہے بازل ہماری نشاندہی کرنے میں کسی تکلف سے تو کام لے گا نہیں۔" وہ ایک بار پھر پہلے والے مسئلے پر آ گیا۔ اصل میں اس نے ویڈیو میڈم ایکس تک رسائی کے لیے ہی بھجوائی تھی۔ عام حالات میں تو میڈم کی مرضی کے بغیر اس سے رابطہ ممکن ہی نہیں تھا۔ بس ایک فوٹو شاپ کا ایڈریس تھا جہاں اشد ضرورت کے وقت پیغام بھجوانے کی اجازت تھی، وہ بھی ڈاک یا کوریئر وغیرہ کے ذریعے۔ براہِ راست کوئی وہاں قدم بھی نہیں رکھ سکتا تھا۔ شاپ پر بھجوائے جانے والے پیغام پر ردعمل دینا یا نہ دینا میڈم کی مرضی پر ہوتا تھا۔ اسے پہلے اس سارے سیٹ اپ کا علم نہیں تھا۔ اسے بہت اہمیت دینے کے باوجود لالہ نے بہت سے معاملات میں اسے لاعلم رکھا ہوا تھا اور اب وہ آہستہ آہستہ ان معاملات کو جان کر سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔
"کاہے کو سوچ سوچ کر اپنا دماغ چٹنی کرتا ہے۔ جب جو ہونا ہوگا، ہو جائے گا۔" گرو نے اسے ڈانٹنے کے انداز میں ٹوکا تو وہ خاموشی اختیار کر گیا۔ اس کے بعد دونوں ہی اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہو گئے۔ رات گئے تک باوجود انتظار کے کہیں سے کوئی رابطہ نہیں کیا گیا۔ رات سونے کے لیے لیٹنے سے قبل جب گرو اپنا آخری جام پی رہا تھا، اس کے فون کی گھنٹی بجی۔ نمبر انجان تھا پھر بھی اس نے کال ریسیو کرلی۔
"جو تم لوگوں نے میرے ساتھ کیا ہے، اسے میں کبھی نہیں بھولوں گا۔" دوسری طرف سے بازل کی پھنکارتی ہوئی آواز سنائی دی تو وہ سیدھا ہو بیٹھا۔
"کیا مطلب؟ کیا کہہ رہے ہو؟" وہ انجان بنا۔
"اب یہ نہ کہنا کہ تمہارے اڈے پر تمہارے لوگوں کے سوا بھی کوئی وہ ویڈیو بنا سکتا تھا۔" بازل کے لہجے کی پھنکار برقرار رہی۔
"کون سی ویڈیو؟" اس نے اب بھی تجاہل برتا۔
"وہی ویڈیو جسے دیکھ کر میڈم ایکس نے مجھے میرے ٹھکانے سے اٹھوا لیا تھا کیونکہ اس ویڈیو میں، میں تمہارے ساتھ مل کر اس کا مال غائب کرنے کی پلاننگ کر رہا تھا۔"
"کیا کہہ رہے ہو؟ اس کا مطلب ہے میڈم کا اگلا نشانہ ہم ہوں گے۔" گرو نے گھبرانے کی اداکاری کی۔
"زیادہ انجان مت بنو۔ وہ ویڈیو تمہارے آدمی نے بنائی تھی اس لیے اس میں تمہارا تھوبڑا موجود نہیں ہے۔" بازل غرایا۔
"تم بنا سوچے سمجھے مجھ پر الزام لگا رہے ہو۔"
"میں الزام لگا رہا ہوں تو تم اپنی خیر مناؤ۔ تمہاری اس حرکت سے مجھے جو بھگتنا پڑا ہے، اس کا دس گنا تمہیں نہ لوٹاؤں تو میرا نام بدل دینا۔" بازل غصے سے باقاعدہ ابل رہا تھا۔
"تم کہاں ہو؟ مل کر بیٹھتے ہیں اور سکون سے اس مسئلے پر بات کرتے ہیں۔" گرو نے اسے پکارا۔
"میں اس وقت مفرور ہوں۔ میڈم ایکس کے آدمیوں کی قید سے نکل کر بھاگا ہوں اور ان کے تشدد کی وجہ سے زخمی بھی ہوں لیکن میں بہت جلد تم سے حساب لینے واپس آؤں گا۔" بازل اب انڈین فلموں کے ہیروز کی طرح بڑکیں مار رہا تھا۔
"تم نے میڈم کے سامنے میرا نام تو لیا ہوگا؟" گرو اپنے تجسس پر مزید قابو نہیں پا سکا۔
"نہیں لیا..... کیونکہ اسی ایک سوال کا جواب حاصل کرنے کے لیے اس نے مجھے زندہ رکھا ہوا تھا۔ میں زندہ ہوں اس لیے یاد رکھو کہ اب تمہیں اور تمہارے گروہ کو کوئی تباہی سے نہیں بچا سکتا۔" اس کی دھمکیوں کا سلسلہ جاری تھا۔
"بے وقوفی کی باتیں مت کرو۔ ہم مل بیٹھ کر اس مسئلے پر بات کر سکتے ہیں بلکہ میں تمہیں میڈم سے بچانے میں مدد کر سکتا ہوں۔" گرو نے اسے پیشکش کی۔ بازل کی باتوں سے یہ الجھن تو دور ہو گئی تھی کہ میڈم ایکس کی طرف سے ابھی تک ان کے خلاف کوئی ایکشن کیوں نہیں لیا گیا تھا۔
"تم جو کچھ کر چکے ہو وہ کافی ہے۔ اب بس اس کا

انکار کرو جو میں تمہارے ساتھ کروں گا۔" باول نے آخری دھمکی دیتے ہوئے فون بند کر دیا تو گلو نے اضطراب میں جام میں بچا سارا مشروب ایک سانس میں حلق میں انڈیل لیا۔ اس کے چہرے پر سرخی اُتر آئی۔ وہ پیتا تھا لیکن لالہ کی طرح بلانوش نہیں تھا۔

"یہ دیکھو استاد! یہ ایک بڑی زبردست نیوز لی ہے حیدرآباد اخبار سے۔"

"کیسی خبر شہزادے؟" گلو نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی اور اچانک دروازہ کھول کر اندر آنے والے کی طرف متوجہ ہوا۔

"تم ٹھیک تو ہو استاد؟"

"ٹھیک ہوں۔ بس ذرا زیادہ پی لی ہے۔"

"لالہ بننے کی کوشش کر رہے ہو؟" وہ ہنسا۔

"شراب پینے سے کوئی لالہ بن سکتا تو شراب خانے بھرے ہوتے۔" گلو نے بے ساختہ جواب دیا پھر بات بدلتے ہوئے بولا۔

"تو دکھا، کون سی خبر دکھانے آیا تھا؟"

"یہ خبر دیکھو۔ میرا دل کہہ رہا ہے کہ اس خبر میں کچھ نہ کچھ ہمارے مطلب کا ہے۔ تم اس تصویر میں موجود خاتون کو دیکھو۔ مجھے ایسا لگ رہا ہے یہ وہی خاتون ہیں جنہیں ایک بار میں نے آشیانۂ آزادی میں معاذ بھائی کے ساتھ دیکھا تھا۔" اس نے گل کی جانب تصویر پر انگلی رکھی ہوئی تھی۔

"پھر..... کیا ارادہ ہے تیرا؟" گلو نے اس کے جوش کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"مجھے لگتا ہے کہ مجھے وہاں جا کر خود تحقیق کرنا چاہیے۔" اس نے کچھ جھجکتے ہوئے جواب دیا۔

"بس تو پھر ٹھیک ہے۔ جانے کی تیاری کر۔ میری طرف سے تجھے پوری اجازت ہے۔" گلو نے فیصلہ سنایا۔ لاشعوری طور پر وہ اسے باول کے جنون اور عتاب سے دور کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

☆☆☆

"یہ کس کا کمرا ہے؟" ایک بند کمرے کے آگے کھڑے ہو کر اس نے الوپ سے پوچھا۔ وہ رات کی تاریکی میں ہاشو اور الوپ کو اسلحے کے زور پر الوپ کے مالکان کے بنگلے پر لائے تھے۔ ان حالات میں مالکان سے خالی یہ بنگلا ان کے لیے ایک اچھا ٹھکانا ثابت ہو سکتا تھا اس لیے انہوں نے ہاشو کے غیر محفوظ جھونپڑے نما مکان کو چھوڑ کر یہاں آنے کا فیصلہ کیا تھا۔

"یہ چھوٹی مالکن کا کمرا ہے۔"

"اس کی چابی ہے تمہارے پاس؟"

"نہیں۔"

"مطلب ہمیں اس کا لاک توڑنا پڑے گا۔"

"تم ایسا نہیں کر سکتے۔ چھوٹی مالکن بنا اجازت کسی کا اپنے کمرے میں آنا پسند نہیں کرتیں۔ اسی لیے انہوں نے صفائی ستھرائی کے لیے مجھے اپنے کمرے کی چابی نہیں دی تھی۔" الوپ نے منہ بنا کر جواب دیا۔

"اس وقت یہاں باس ہم ہیں اس لیے پسند ناپسند بھی ہماری چلے گی۔" اس نے الوپ کو خاطر میں لائے بغیر پسٹل لہراتے ہوئے اسے جتایا اور لاؤنج میں اعظم کو گود میں لیے کھڑی گل کی طرف رخ کر کے اس سے پوچھا۔

"ہیئر پن ہو گی آپ کے پاس؟"

گل نے جواب میں کچھ کہنے کے بجائے اپنی چادر کے اندر ہاتھ ڈال کر بالوں میں لگی پن نکالی اور اس کی طرف بڑھائی۔

"آپ اعظم کو لے کر وہاں صوفے پر بیٹھ جائیں۔ بس ابھی دو منٹ میں یہ لاک کھل جائے تو پھر آپ اطمینان سے اندر کمرے میں آرام کیجیے گا۔" اس نے گل کے ہاتھ سے پن لیتے ہوئے اس سے کہا اور پھر مڑ کر کمرے کے آٹو میٹک لاک کی طرف متوجہ ہو گیا۔ بند تالوں کو کھولنے کی تربیت اسے میڈم ایکس کی قید میں دی گئی تھی۔

ٹک ٹک ٹک...... وہ کان لگائے تالے کی پنیں بجنے کی آوازیں سن رہا تھا۔ اس کا پسٹل اس کی پینٹ میں اڑسا ہوا تھا۔

الوپ نے اسے مصروف دیکھا تو موقع کا فائدہ اٹھا کر اسے قابو کرنے کا سوچا اور عقب سے اس پر حملہ آور ہوا۔ معاذ کے لیے یہ غیر متوقع نہیں تھا۔ بظاہر تالے کے ساتھ مصروف وہ الوپ کی طرف سے بھی چوکنا تھا چنانچہ جیسے ہی وہ اس کے قریب آیا، اس کی ٹانگ گھومی اور الوپ تقریباً اڑتا ہوا ایک شیشے کی تپائی سے ٹکرایا۔ ٹکرانے سے شیشہ ٹوٹ گیا اور اس کا ایک ٹکڑا الوپ کے بازو میں جا گھسا۔ اس کے منہ سے ایک تیز سسکاری نکلی جبکہ اعظم میں مگن آواز سن کر متوجہ ہونے والی گل ہڑبڑا کر اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی۔

"گڈ شارٹ۔" ہاشو کو سنگ لے کر بنگلے کے معائنے کے لیے نکلے ہوئے جارو نے عین اسی وقت منظر میں قدم رکھا تھا اور معاذ کو اس کی پھرتی اور مہارت پر بے ساختہ داد

دی تھی۔

"اس کا تو بہت خون نکل رہا ہے۔" جارو کے ساتھ اندر آنے والا ہاشو تڑپ کر زخمی الوپ کی طرف بڑھا۔

"شکر کرو کہ زندہ ہے ورنہ مجھ پر حملہ کرنے کے جرم میں جان سے بھی جا سکتا تھا۔" معاذ غصیلے لہجے میں غرایا۔ حالات کو اپنے قابو میں رکھنے کے لیے جارحانہ رویہ اختیار کرنا ضروری تھا ورنہ ان دونوں میں سے کسی کو بھی ہیرو بننے کا شوق چڑھ سکتا تھا۔ خصوصاً الوپ مزاج کا ذرا تیکھا لگتا تھا اور اس کا معاندانہ رویہ بھی واضح تھا۔

"کاہے کو اپنی جان خطرے میں ڈالتا ہے۔ جو یہ کرتے ہیں، کرنے دے۔ مالک کے لیے جان دے دے گا تو مالک کون سا تجھے سورگ میں جگہ دلوا دے گا۔" ہاشو نے ناراضی سے لہجے میں الوپ کو ٹوکا۔ بولنے کے ساتھ ساتھ اس کے ہاتھ بھی کام کر رہے تھے۔ اس نے الوپ کی تیزی سے سرخ ہوتی آستین پھاڑ ڈالی تھی اور اس کے زخم کا جائزہ لینے کی کوشش کر رہا تھا۔

"اس کو معلوم ہو گا کہ یہاں ایمرجنسی میڈیکل باکس کہاں رکھا ہے۔ وہ نکالو اور اس کی مرہم پٹی کر دو۔" معاذ نے مشورہ دیا اور مڑ کر ایک بار پھر تالے پر طبع آزمائی کرنے لگا۔ اگلے چند سیکنڈوں میں تالا کھل چکا تھا۔

"آیئے گل!" اس نے گزرے ہوئے واقعے پر ہنوز ششدر بیٹھی گل کو مخاطب کیا اور خود آگے بڑھ کر اعظم کو گود میں اٹھا لیا۔ ہاشو اور الوپ، جارو کی نگرانی میں میڈیکل باکس لینے وہاں سے جا چکے تھے۔

"مجھے معلوم ہے کہ موجودہ صورتِ حال میں آپ بہت پریشان ہیں اور آپ کو کئی مسائل کا سامنا ہے لیکن میری آپ سے درخواست ہے کہ مجھ پر تھوڑا سا اعتبار کرتے ہوئے ہر پریشانی کو سر سے جھٹک کر اس ملنے والی مہلت کا فائدہ اٹھائیں اور فریش ہو کر سکون سے سو جائیں۔ باہر میں اور جارو کسی بھی مشکل سے نمٹنے کے لیے جاگتے رہیں گے۔" آراستہ و پیراستہ کمرے میں داخل ہو کر اس نے اعظم کو بستر پر لٹایا اور گل سے مخاطب ہوا۔

"جی ٹھیک ہے۔" گل نے گویا اس کی بات سے اتفاق کیا۔

"میں یہ الماری کھول دیتا ہوں۔ آپ اس میں سے اپنی ضرورت کے حساب سے کوئی لباس نکال کر پہن لیں۔" اب وہ مقفل الماری کا تالا کھول رہا تھا۔

"رہنے دیں۔ میں انہی کپڑوں میں ٹھیک ہوں۔"

اسے عجیب لگا کہ وہ کسی اجنبی لڑکی کے وارڈ روب میں سے بلا اجازت اس کے کپڑے نکال کر پہن لے۔

"بالکل بھی ٹھیک نہیں ہیں آپ۔ لباس اتنا خراب اور میلا ہو رہا ہے کہ سوال ہی نہیں پیدا ہوتا اس میں آپ کو سکون کی نیند آ جائے۔" اپنے کام میں مصروف رہتے ہوئے اس نے گل کے انکار کو رد کیا۔

"لیجیے کھل گیا لاک۔ اب اپنے حساب سے کپڑے نکال لیں۔" اس نے الماری کا پٹ کھول کر اندر موجود کپڑوں کی طرف اشارہ کیا اور خود کمرے سے باہر نکل گیا۔ گل نے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کیا اور پھر الماری میں موجود کپڑوں کا جائزہ لینے لگی۔ وہ زیادہ تر مغربی انداز کے کپڑے تھے۔ بڑی مشکل سے اس نے ایک شلوار قمیص ڈھونڈ کر نکالا۔

اعظم پُرسکون نیند سو رہا تھا اور اسے معلوم تھا کہ وہ ابھی اتنی جلدی نہیں جاگے گا اس لیے اطمینان سے ملحقہ غسل خانے میں گھس گئی۔ غسل کرنے کے بعد صاف ستھرے کپڑے پہنے تو طبیعت میں ایسا ہلکا پھلکا پن محسوس ہوا کہ بے ساختہ معاذ کے لیے دل سے دعا نکلی۔ اگر وہ اصرار نہ کرتا تو وہ اس سکون سے محروم رہتی۔ بال خشک کر کے بستر پر لیٹنے سے قبل اس نے ذرا سا دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔ ہاشو اور اکوپ رسیوں میں جکڑے مخالف سمتوں میں قالین پر پڑے ہوئے تھے جبکہ معاذ کروٹ بدلے ایک صوفے پر سویا ہوا تھا۔ جارو کو اس نے دوسرے صوفے پر بیٹھ کر اونگھتا ہوا پایا۔ یقیناً انہوں نے سونے کے لیے باریاں لگائی تھیں اور اس وقت جارو پہرے کے لیے جاگ رہا تھا۔ اس سارے منظر پر ایک نظر ڈال کر وہ پلٹنے ہی لگی تھی کہ معاذ نے کروٹ بدلی اور اس کا چہرہ سامنے آ گیا۔ اس وقت وہ اس میک اپ زدہ حلیے میں نہیں تھا جس میں وہ اسے اتنے دنوں سے دیکھ رہی تھی۔ شاید میڈیا پر تصاویر آنے کے بعد اس حلیے کو خطرناک سمجھتے ہوئے اس نے اپنا میک اپ اتار دیا تھا اور اس وقت اپنی اصل شکل و صورت میں تھا۔ کشادہ پیشانی پر سیاہ سلکی بال بکھرے ہوئے تھے اور چہرے پر وہ اطمینان تھا جو حق کی راہ پر چلنے والوں ہی کا نصیب ہوتا ہے۔ وہ اس شخص کے کردار، گفتار اور اطوار کی شفافیت کی گواہ تھی اور جانتی تھی کہ وہ جو اس کی آنکھوں میں اس کے لیے جذبے جھلکتے ہیں وہ بہت خالص ہیں لیکن اسے اپنا آپ اس لائق نہیں لگتا تھا کہ ان خالص اور شفاف جذبوں کی پذیرائی کر سکے۔

"تم بہت اچھے ہو معاذ اور مجھ سے بہت زیادہ اچھی

لڑکی ڈیزرو کرتے ہو۔" اس کے چہرے پر نظریں ٹکا کر اس نے بند لبوں سے سرگوشی کی پھر بے آواز دروازہ بند کر کے بستر پر آ گئی۔ ایک اداسی سی تھی جس نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ بستر پر سوئے ننھے اعظم کے معصوم چہرے پر نظر پڑی تو اس اداسی میں مزید اضافہ ہو گیا۔

"معلوم نہیں میں تمہیں ایک محفوظ اور پُرسکون زندگی دے بھی پاؤں گی یا نہیں۔ موجودہ حالات میں تو مجھے خود اپنی زندگی کا بھی بھروسا نہیں ہے۔" بچے کو دیکھتے ہوئے ایک حسرت سی تھی اس کی آنکھوں میں۔ ان حسرت زدہ آنکھوں پر نیند کی دیوی کو ہی رحم آیا اور چپکے سے اسے اپنی مہربان آغوش میں لے لیا۔

☆☆☆

"گل کو لیے بغیر میں اس شہر کو چھوڑ دوں، سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" عالم شاہ اور سرمد، سونیا کی ہدایت پر حلیہ تبدیل کر کے گھر سے نکل تو پڑے تھے لیکن باہر نکلتے ہی عالم نے اپنا فیصلہ سنا دیا تھا۔

"جیسا آپ کا حکم سائیں!" سرمد تو تھا ہی حکم کا غلام۔

"مجھے یقین ہے کہ یہ میڈم سونیا بھی اس طرح شہر چھوڑ کر نہیں جائے گی۔ اسے ہم میں سے کسی کی پروا ہو یا نہیں، معاذ کی پروا ضرور ہے اور سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ وہ معاذ کو یوں مشکل میں چھوڑ کر چلی جائے۔" سونیا کا معاذ سے التفات عالم کی نظروں سے چھپا ہوا نہیں تھا اس لیے اس نے بالکل درست اندازہ لگایا تھا۔

"آپ نے کرنے کا کیا سوچا ہے؟" سرمد نے لائحہ عمل جاننا چاہا۔

"ہم یہیں کہیں رک کر سونیا کے باہر نکلنے کا انتظار کریں گے اور پھر اس کا تعاقب کریں گے۔ وہ چالاک عورت ہے اور اس طرح کے حالات سے نمٹنے کا تجربہ رکھتی ہے اس لیے اس کو فالو کرنا ہمارے لیے فائدہ مند ہو گا۔" عالم شاہ کا منصوبہ بہت سادہ تھا۔

"میرے خیال میں ہمیں کسی گاڑی کا بندوبست کرنا ہو گا۔ میڈم سونیا ہوشیار عورت ہے۔ اس کا کسی ٹیکسی کی مدد سے تعاقب کرنا مشکل ہو گا۔ ٹیکسی ڈرائیور اس کی ہوشیاری کا مقابلہ نہیں کر سکے گا۔" ایک بات طے ہو گئی تو دوسرے پہلوؤں کا جائزہ لیا جانے لگا۔

"کہہ تو تم ٹھیک رہے ہو لیکن گاڑی کا حصول بھی آسان نہیں ہے۔"

"آسان نہیں تو انگلیاں ٹیڑھی کر لیتے ہیں سائیں!"

سرمد کا لہجہ معنی خیز ہو گیا۔

"کیا کرنا چاہتے ہو؟" عالم شاہ نے چونک کر پوچھا۔

"وہ سفید گاڑی دیکھ رہے ہیں آپ؟"

"وہ جس پر کارڈ شیٹ پر ٹیکسی لکھ کر چپکایا گیا ہے؟" عالم شاہ نے اس کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا اور تصدیق چاہی۔

"بالکل وہی سائیں! ہم اس گاڑی کو اپنے مقصد کے لیے حاصل کر سکتے ہیں۔ اب آیئے میرے ساتھ۔" سرمد نے قدم اٹھائے تو عالم شاہ کو بھی اس کا ساتھ دینا پڑا۔

"ہاں بھئی، اسپتال تک چلو گے؟" ڈرائیور گاڑی کے بونٹ پر بیٹھا سگریٹ سے شغل کر رہا تھا۔ سرمد نے قریب جا کر مخاطب کیا تو اس کی طرف متوجہ ہوا۔

"بالکل چلیں گے سر! آپ بتائیں کون سے اسپتال جانا ہے؟ یہ جو قریب میں پرائیویٹ اسپتال ہے، اس میں یا سرکاری اسپتال؟" اس نے فوراً سگریٹ پھینک کر چہرے سے مسلا اور خوش اخلاقی سے پوچھا۔

"سرکاری اسپتال۔"

"ٹھیک ہے، لے چلوں گا مگر تین سو روپے چارج کروں گا۔" اس نے صاف بات کی۔

"ٹھیک ہے بھائی! ہم تمہیں تین سو ہی دیں گے مگر اب ذرا جلدی کرلو۔" سرمد نے اسے جواب دیا اور خود ہی پچھلی طرف کا دروازہ کھول کر عالم شاہ کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ بیٹھ چکا تو خود اس نے ڈرائیور کے ساتھ والی نشست سنبھال لی۔

"لگتا ہے پارٹ ٹائم جاب کے طور پر یہ کام کرتے ہو؟" گاڑی چل پڑی تو سرمد نے گفتگو کا سلسلہ چھیڑا۔

"آج کل تو یہی فل ٹائم جاب بنی ہوئی ہے۔ ڈاؤن سائزنگ کا شکار ہو کر دو مہینے سے جاب لیس ہوں۔ مہینا بھر تو مختلف کمپنیوں میں نوکری کے لیے چکر لگاتے ہوئے جمع پونجی میں سے کھاتا رہا پھر خیال آیا کہ اگر لمبے عرصے تک نوکری نہیں ملی تو جمع پونجی ختم ہونے کے بعد چیزیں بیچنے کی نوبت آ جائے گی۔ اچھے دنوں میں بچت کر کے یہ چھوٹی سی گاڑی لی تھی۔ بس اسی کو روزی روٹی کا ذریعہ بنانے کا سوچا اور کارڈ شیٹ پر ٹیکسی لکھ کر شیشے پر چپکا دیا۔ اب جاب کے لیے دفتروں کے چکر بھی لگاتا ہوں اور کوئی پسنجر مل جائے تو چار پیسے بھی کما لیتا ہوں۔ مالک کا احسان ہے کہ نوکری جانے کے باوجود گھر کا گزارہ چل رہا ہے۔" اس نے سرمد کے سوال کا تفصیلی جواب دیا۔

"پھر تو یہ تمہاری خوش قسمتی ہے کہ تمہاری ہم سے ملاقات ہو گئی۔"

"کیا مطلب؟ کیا آپ مجھے کہیں جاب دلوا سکتے ہیں؟" ڈرائیور اس کی بات سن کر چونکا اور تھوڑا سا پُرجوش ہوا۔

"جاب تو نہیں مگر آج کی خدمت کا اچھا معاوضہ دے سکتے ہیں۔ بس تمہیں تھوڑی سی تکلیف اٹھانا پڑے گی۔"

"کیسی تکلیف؟" سرمد کی بات نے اسے الجھن میں ڈالا۔

"تمہیں اپنے ہاتھ پیر بندھوا کر گاڑی کے پچھلے حصے میں پڑا رہنا ہو گا۔ ہم جب تمہاری گاڑی چھوڑ کر جائیں گے تو تمہیں اتنی رقم دیں گے کہ تم مہینا بھر کام کر کے بمشکل اتنا کما سکو گے۔"

"یہ کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ؟" اس نے سرمد کی باتوں پر لہجہ تیز کر کے اپنی خفگی کا اظہار کرنا چاہا لیکن اس کی آواز کی لرزش سے ظاہر تھا کہ وہ خوفزدہ ہو چکا ہے۔ ہر اس شریف آدمی کی طرح جو کسی بندھی زندگی گزارتا اپنے حال سے مطمئن ہوتا ہے اور زندگی کے کسی موڑ پر اگر کوئی غیر معمولی صورتِ حال پیش آ جائے تو گھبرا جاتا ہے۔

"ہم جیسی بھی باتیں کر رہے ہیں، تم اس پوزیشن میں نہیں ہو کہ ہمیں انکار کر سکو۔" سرمد نے اپنا ریوالور نکال کر اس کے زانو سے چھوتے ہوئے اسے باور کروایا۔

"یہ...... یہ کیا ہے؟" وہ بے چارہ گھبرا گیا۔

"یہ وہ ہے جو اس وقت تک بے ضرر رہتا ہے جب تک بات مانی جاتی رہے۔ نافرمانی کی صورت میں یہ باغی ہو جاتا ہے۔" سرمد نے اس ڈرے ہوئے آدمی کو مزید ڈرایا۔

"میں تمہاری ہر بات مانوں گا بس اسے دور کرلو۔" اس بے چارے کی گھگھی بندھ گئی۔

"گاڑی کو سائیڈ میں روک لو اور اتر کر پچھلی سیٹ پر چلے جاؤ۔ خبردار! بھاگنے کی کوشش مت کرنا۔ میرا نشانہ بہت اچھا ہے۔ میں یہیں بیٹھے بیٹھے تمہاری کھوپڑی بھی اڑا سکتا ہوں۔" سرمد اس کے خوف کا بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کو ڈرا ڈرا کر اپنی ہر بات منوا رہا تھا۔

"تم گاڑی چلاؤ۔ اسے میں ہینڈل کرلوں گا۔" ڈرائیور اتر کر پچھلی نشست پر چلا گیا تو عالم شاہ نے سرمد کو تاکید کی۔ سرمد ذرا سا ہچکچایا لیکن پھر عالم کی بات مان لی۔ تھوڑی دیر میں ہی وہ اتنی دور نکل آئے تھے کہ سونیا کی نگرانی ممکن نہیں رہی تھی۔ اگر مزید دیر ہو جاتی تو اندیشہ تھا کہ سونیا نکل جائے گی اور انہیں خبر بھی نہیں ہو سکے گی۔ اس نے گاڑی موڑ کر واپسی کی راہ اختیار کی تو عالم شاہ اپنی کارروائی شروع کر چکا تھا۔ اس نے ڈرائیور کی قمیص اتروا

کر اسی سے پٹیاں پھاڑنے کے کام کا آغاز کروا دیا تھا۔ اب وہ قریب بیٹھا بنیان پہنے اپنی قمیص کو اپنے ہاتھوں سے ٹکڑوں میں تبدیل کر رہا تھا۔

”یقین کرو دوست! ہم بُرے لوگ نہیں ہیں۔ بس ہماری تھوڑی سی مجبوری ہے۔ تمہیں جو تکلیف پہنچ رہی ہے، اس کی ہم پوری پوری اجرت دیں گے۔“ اس نے سونیا سے ملنے والی نوٹوں کی گڈی ڈرائیور کی گود میں رکھ دی۔ یکمشت اتنی ساری رقم دیکھ کر پہلے اس کی آنکھیں پھٹی رہ گئیں پھر رضا کارانہ طور پر خود کو بندھوانے کے لیے تیار ہو گیا۔ اس کے ہاتھ پاؤں باندھنے کے ساتھ ساتھ عالم نے اس کے منہ میں بھی کپڑے کا گولا ٹھونسا اور پھر اسے نشست سے نیچے لڑھکا دیا۔ جتنی دیر میں یہ کام نمٹا وہ واپس اسی علاقے میں پہنچ چکے تھے جہاں ایک گھر میں سونیا موجود تھی۔

”ذرا راؤنڈ مار کر دیکھ لو کہ وہ لوگ نکلے تو نہیں۔“ اگرچہ انہیں ڈرائیور کو قابو کر کے گاڑی حاصل کرنے میں بہت زیادہ وقت نہیں لگا تھا پھر بھی عالم شاہ نے چاہا کہ اپنی تسلی کر لے۔ اس کی خواہش پر سرمد نے گلی کا ایک چکر لگایا۔ جنگی کی گاڑی موجود تھی اس لیے اطمینان ہو گیا کہ وہ لوگ ابھی موجود ہیں۔ وہ ایک مناسب جگہ رک کر انتظار کرنے لگے۔ اس بار انتظار زیادہ طویل ثابت نہیں ہوا۔ انہوں نے سونیا کو بدلے ہوئے حلیے میں جنگی کے ساتھ جاتے ہوئے دیکھا اور احتیاط سے ان کی گاڑی کا تعاقب شروع کر دیا۔ درمیانی فاصلہ زیادہ رکھنے کے باعث تھوڑی سی تشویش تو تھی کہ کہیں وہ لوگ ہاتھ سے ہی نہ نکل جائیں لیکن خود کو پوشیدہ رکھنے کے لیے یہ احتیاط ضروری تھی۔ خوش قسمتی رہی کہ ان لوگوں نے سفر کے لیے زیادہ پُرپیچ راستے اختیار نہیں کیے۔ یوں زیادہ پریشانی نہیں ہوئی۔

”دیکھا، میں نے کہا تھا نا کہ یہ شہر نہیں چھوڑے گی۔“ سونیا اور جنگی ایک اپارٹمنٹ بلڈنگ میں جاتے ہوئے دکھائی دیے تو عالم شاہ بول اٹھا۔

”بالکل سائیں!“ سرمد نے کہا پھر گاڑی سے اترتے ہوئے بولا۔

”میں ذرا معلومات لے کر آتا ہوں کہ دونوں کہاں ٹھہرے ہوئے ہیں۔“

”ٹھیک ہے جاؤ۔“ عالم شاہ نے اسے اجازت دی اور خود ایک سگریٹ سلگا کر اس کے کش لینے لگا۔ وہ جس جگہ گاڑی روک کر کھڑے تھے، وہاں سے عمارت کا مرکزی دروازہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ پندرہ بیس منٹ انتظار کی کوفت اٹھانے کے بعد اسے سرمد واپس آتا دکھائی دیا۔

”سب معلوم کر کے آیا ہوں سائیں اور ساتھ ہی ان کے سامنے والے فلیٹ میں جگہ بھی حاصل کر لی ہے۔“ وہ اپنی کارکردگی پر خوش تھا۔

”یہ تو زبردست کام ہو گیا پر تم نے کیا کیسے؟“ عالم شاہ نے بھی خوشی کا مظاہرہ کیا۔

”تھوڑے نوٹ خرچ کیے تو چوکیدار قابو میں آ گیا اور ساری مشکلیں آسان کر دیں۔“ اس نے دانت نکالتے ہوئے بتایا۔

”کام تو تم نے اچھا کیا ہے لیکن اس کا کیا کریں گے؟“ عالم نے اپنے قدموں کے قریب پڑے جیسی ڈرائیور کی طرف اشارہ کیا۔

”اس کو سمجھا بجھا کر اندر اپنے ساتھ لے چلتے ہیں۔ اگر گڑبڑ کی کوشش کی تو گولی مار دیں گے۔“ سرمد نے دانستہ آخری الفاظ تیز آواز میں ادا کیے۔

”سن لیا تم نے۔ اب بتاؤ کیا ارادہ ہے؟“ عالم شاہ جھک کر قدموں میں پڑے ڈرائیور سے مخاطب ہوا۔ اس نے جلدی جلدی سر ہلاتے ہوئے اپنی رضامندی کا عندیہ دیا۔ عالم شاہ نے اس کی بندشیں کھول کر منہ میں ٹھونسا کپڑا بھی نکال دیا۔ وہ لمبی لمبی سانسیں لیتا ہوا اٹھ بیٹھا۔

”شرٹ تو ہے نہیں اس کے پاس۔ صرف بنیان پہنے ہوئے ہے۔“

”کوئی مسئلہ نہیں ہے سائیں۔ اس بلڈنگ میں زیادہ تر مزدور پیشہ لوگ رہ رہے ہیں اور وہ ہر طرح کے حلیے میں گھومتے پھرتے ہیں۔“ سرمد نے اسے تسلی دی تو وہ لوگ بلڈنگ کی طرف چل پڑے۔ سرمد چابی پہلے ہی حاصل کر چکا تھا چنانچہ وہ لوگ سیدھے اپارٹمنٹ میں پہنچ گئے۔ قدرے میلا اور بے سروسامان اپارٹمنٹ تھا لیکن باہر گاڑی میں رات گزارنے کے مقابلے میں بہتر تھا۔

”میں کچھ کھانے پینے کے لیے لے آتا ہوں۔“ سرمد انہیں چھوڑ کر باہر نکل گیا۔

”آپ لوگ کون ہیں؟“ خاموشی سے ایک کونے میں بیٹھے ڈرائیور نے ہمت کر کے عالم سے پوچھا۔

”ہم جو بھی ہیں، تم یہ بھروسا رکھو کہ جب تک تم ہمارے لیے خطرہ نہیں بنو گے، ہماری ذات سے تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ رقم میں تمہیں دے چکا ہوں۔ رات بھر کی کوفت یہ سوچ کر برداشت کر لو کہ تمہیں اسی کوفت کا معاوضہ دیا گیا ہے۔“ عالم نے سنجیدگی سے اس کے سوال کا جواب دیا۔ ”شاید یہ کسی ذاتی دشمنی کا معاملہ ہے۔ ویسے دیکھنے میں تو آپ لوگ مجھے جرائم پیشہ نہیں لگتے۔“ ڈرائیور نے اندازہ لگایا جس کی تصدیق یا تردید کی عالم شاہ نے ضرورت نہ سمجھی۔ اسی وقت اسے باہر کچھ کھٹ پٹ سنائی دی تو تیزی سے اٹھ کر دروازے تک گیا اور ڈور آئی سے باہر جھانکا۔ اسے جنگی اپارٹمنٹ سے نکل کر سیڑھیوں کی طرف جاتا ہوا دکھائی دیا۔

”کیا مجھے اس کے پیچھے جانا چاہیے؟“ اس نے ایک لمحے کے لیے سوچا لیکن پھر واپس مڑ گیا۔ وہ ڈرائیور کو یہاں اکیلا چھوڑ کر نہیں جا سکتا تھا اور سب سے بڑا اطمینان یہ تھا کہ سونیا اندر ہی موجود تھی۔

”شاید جنگی بھی سرمد کی طرح ضرورت کا سامان لینے گیا ہو۔“ اس نے اندازہ لگایا اور سکون سے بیٹھ گیا لیکن اس بار اس نے دروازے کا پٹ تھوڑا سا کھلا چھوڑ دیا تھا تاکہ سامنے والوں کی نقل و حمل پر نظر رکھ سکے۔ کافی دیر اسی طرح گزر گئی۔ اس کی ایک آنکھ ڈرائیور پر تھی تو دوسری دروازے سے باہر۔ ڈرائیور تو بالآخر اکتا کر زمین پر ہی لیٹا اور سو گیا لیکن اس کی بے چینی ہر گزرتے لمحے کے ساتھ بڑھتی چلی گئی۔ سرمد کو گئے کافی وقت گزر چکا تھا اور ظاہر ہے اتنا زیادہ وقت صرف کھانا لانے میں نہیں لگ سکتا تھا۔ وہ ادھر سے اُدھر ٹہلتا اس کا انتظار کرنے لگا۔ اتفاق سے جنگی بھی واپس نہیں آیا تھا۔ ایک ایسے لمحے پر جب اس کی پریشانی اپنے عروج پر پہنچ چکی تھی، اس نے جنگی کو واپس آتا ہوا دیکھا۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں سامان کے تھیلے تھے جس سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ خاصی خریداری کر کے واپس آیا ہے۔

”لیکن سرمد کہاں رہ گیا؟ وہ تو صرف کھانا لینے گیا تھا۔ اب مجھے مزید انتظار میں وقت ضائع کرنے کے بجائے باہر نکل کر دیکھنا چاہیے۔“ اب اس میں مزید صبر کا یارا نہیں رہا تھا اور سوئے ہوئے ڈرائیور کو دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ جانے سے پہلے ایک بار پھر اسے باندھنے کا انتظام کرنا ہوگا۔ ابھی وہ اپنی اس سوچ کو عملی جامہ نہیں پہنا سکا تھا کہ سرمد چلا آیا۔

”کہاں رہ گئے تھے تم؟ کچھ اندازہ بھی ہے کہ میں تمہارے لیے کتنا پریشان تھا؟“ اس کی شکل دیکھتے ہی وہ اس پر برس پڑا۔

”معافی چاہتا ہوں سائیں!“ سرمد نے فوراً ہی اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیے اور پھر وضاحت دیتے ہوئے بولا۔

”میں کھانا لے کر واپس آ رہا تھا تو جنگی کو گاڑی میں بیٹھ کر جاتا ہوا دیکھا۔ میں بھی اس کے پیچھے لگ گیا۔“ اس نے عالم شاہ کو ساری تفصیل سنا دی کہ جنگی کہاں کہاں گیا تھا اور کیا کیا خریداری کر کے واپس لوٹا ہے۔ خریداری کی تفصیل کے ساتھ اس نے بھی ساتھ رہائش گاہ پر پولیس کے ریڈ کی اطلاع دی۔

”جنگی کو دیکھتے ہوئے میں نے بھی کچھ خریداری کی ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ میڈم سونیا کے پیچھے جانے کے لیے ہمیں بھی کچھ اس جیسی ہی تیاری کی ضرورت ہو گی۔“ اس نے اپنا کارنامہ بتایا اور اپنی خریدی ہوئی اشیا اسے دکھانے لگا۔

”تم تو بہت سمجھ دار ہو گئے ہو یار!“ سب چیزیں دیکھ کر عالم نے اسے سراہا۔

”سب آپ کی صحبت کا کمال ہے سائیں!“ سرمد کی وفاداری اسے کوئی کریڈٹ کہاں لینے دیتی تھی۔

”نہیں یار! سچ یہ ہے کہ تم میری صحبت میں اس لیے ہو کہ باکمال آدمی ہو۔ تم اتنے باکمال نہ ہوتے تو میں تمہیں یوں اپنی ناک کا بال بنا کر اپنے ساتھ کیوں رکھتا؟“ عالم شاہ نے کھل کر اس کی تعریف کی۔

”مہربانی سائیں!“ سرمد تعریف سن کر جھینپ گیا۔

”چلو آؤ، اب کھانا کھا لیتے ہیں پھر باقی کی تیاری کریں گے۔ کچھ معلوم نہیں کہ کب روانہ ہونا پڑ جائے۔“

”جی سائیں!“ سرمد جلدی سے کھانے کے سامان والا تھیلا کھولنے لگا۔

”اس غریب کو بھی جگا دیتا ہوں۔ ہمارے چکر میں یہ بے چارہ خود بھی خوار ہوتا پھر رہا ہے۔“ عالم شاہ ڈرائیور کو آوازیں دینے لگا۔ دو تین آوازیں دینے پر اس کی آنکھ کھلی۔

”واہ بھئی۔ تم ایسے حالات میں بھی اتنے مزے سے اتنی گہری نیند سو گئے ہو۔“ عالم کو اس پر رشک آیا۔

”کل رات کسی نے ائیرپورٹ سے مہمان لانے کے لیے گاڑی بک کروائی ہوئی تھی۔ رات تین بجے کی فلائٹ تھی۔ گھر آ کر سونے تک ساڑھے چار ہو گئے۔ صبح ایک جگہ انٹرویو کے لیے جانا تھا تو اس چکر میں جلدی جاگ گیا۔ اب یہاں کرنے کو کچھ نہیں تھا تو سوچا ادھوری نیند پوری کر لوں۔ آپ لوگوں کے بارے میں اتنا تو وشواس ہو گیا ہے کہ برے لوگ نہیں ہو۔ کم سے کم سوتے میں تو میری جان بالکل نہیں لو گے۔“ وہ انگڑائی لے کر اٹھ بیٹھا اور پوچھتا ہوا غسل خانے میں گھس گیا۔ اس کے منہ ہاتھ دھو کر واپس آنے تک وہ لوگ اس کا انتظار کرتے رہے۔

"واہ بھئی، مزہ آ گیا۔ بڑے دنوں بعد اتنا اچھا کھانا کھانے کو ملا۔" وہ اپنے لیے لایا گیا کھانا مکمل چٹ کر کے خوش ہو گیا۔ پیٹ بھر کر مزیدار کھانے اور مشروبات پینے کے بعد ڈرائیور دوبارہ سونے کے لیے لیٹ گیا اور جلد ہی خراٹے لینے لگا۔

"کمینے کو تو مصیبت میں پھنسا ہوا ہے لیکن پھر بھی مجھے اس پر رشک آ رہا ہے۔" عالم نے اسے یوں گہری نیند سوتے دیکھا تو بول پڑا۔

"اس کے لیے اس پرسکون نیند کا انتظام میں نے کیا ہے سائیں۔ یہ گہری نیند سوتا رہے گا تو ہمیں بھی بے فکری رہے گی۔" سرمد نے معنی خیزی سے مسکراتے ہوئے اسے آگاہ کیا۔

"مطلب تم نے......"

"جی سائیں! مطلب یہ کہ میں نے اس کے کھانے میں تھوڑی سی نیند کی دوا ملا دی تھی تاکہ ہم کھل کر اپنا کام کر سکیں۔" سرمد نے اسے جواب دیا اور پھر حرکت میں آ گیا۔ تھیلوں سے اس نے اپنے اور عالم کے لیے پرانے اور میلے لباس برآمد کیے۔ لباس کے ساتھ ہی بظاہر پرانے دکھنے والے لیکن مضبوط جوتے بھی تھے۔ لنڈے میں بہت سا مال ایسا بکتا ہے جسے امراء دل بھر جانے پر نکال پھینکتے ہیں اور غرباء اس میں سے اپنی ضرورت کے حساب سے بہترین چن کر کام چلا لیتے ہیں۔ سرمد جو جوتے لایا تھا اگر انہیں دھو کر صاف ستھرا کر لیا جاتا تو وہ اتنے بُرے نہیں لگتے جتنے اس وقت لگ رہے تھے۔ بہرحال انہیں تو اپنے بہروپ کو حقیقت سے قریب تر رکھنے کے لیے ایسے ہی بدوضع جوتے اور لباس درکار تھے۔ ان دونوں اشیا کی تبدیلی کے ساتھ انہوں نے اپنے حلیوں میں مزید کچھ تبدیلیاں کیں۔ میک اپ کے فن میں دونوں میں سے کسی کو مہارت حاصل نہیں تھی اس لیے یہ تبدیلیاں معمولی نوعیت کی تھیں۔ دونوں نے اپنے سروں میں خوب سارا سرسوں کا تیل ڈال کر بالوں کو بیچ کی مانگ نکال کر اچھی طرح جمانے کے ساتھ ساتھ آنکھوں میں بھر بھر کر سرمہ بھی ڈال لیا تھا۔ مونچھوں کو بھی خوب تیل پلا کر بل ڈال لیے گئے تھے۔ گلے کے لیے کچھ منکوں وغیرہ کا بھی انتظام تھا۔ مجموعی طور پر ان کی شخصیت اب اس سے خاصی مختلف ہو چکی تھی جس حلیے میں وہ سونیا سے جدا ہوئے تھے۔

انہیں یقین تھا کہ سرسری نظر میں انہیں شناخت نہیں کیا جا سکے گا۔ حلیوں کی تبدیلی سے مطمئن ہونے کے بعد دونوں گھنٹے آرام کا وقت مقرر کیا گیا۔ یوں جب صبح سونیا کے قصبے میں بیدار کے آثار محسوس ہوئے تو وہ دونوں تھوڑی تھوڑی نیند لے کر قدرے تازہ دم ہو چکے تھے۔

"میرے خیال میں یہاں بیٹھے رہنے کے بجائے باہر چل کر انتظار کرتے ہیں۔ یہ تو طے ہے کہ وہ زیادہ دیر یہاں بیٹھی نہیں رہے گی اور باہر نکل کر کچھ نہ کچھ کرے گی۔" باہمی مشورے کے بعد وہ دونوں باہر نکل گئے۔ ڈرائیور ہنوز گہری نیند سویا ہوا تھا۔ رقم وہ پہلے ہی اس کے حوالے کر چکے تھے جاگنے کے بعد اب یہ اس کی مرضی پر منحصر تھا کہ خاموشی سے اپنی راہ لیتا یا اپنے ساتھ بیتی کو ہجوم جمع کر کے سناتا۔

وہ دونوں عمارت سے باہر آئے اور سب سے پہلے وہ تھیلا کچرے کے ڈرم میں ڈالا جس میں ان کے اتارے ہوئے کپڑے، جوتے اور رات کے کھانے کے باکس وغیرہ موجود تھے۔ اس کام سے فارغ ہو کر وہ اپارٹمنٹ بلڈنگ کے عین سامنے موجود چھپر ہوٹل میں جا بیٹھے۔ یہاں وہ ناشتا کرنے کے ساتھ ساتھ عمارت کے خارجی راستے پر بھی نظر رکھ سکتے تھے۔ اپنے حلیے کی مناسبت سے ابھی وہ چائے پراٹھے پر مشتمل سادہ سا ناشتا کر کے فارغ ہی ہوئے تھے کہ عمارت سے ایک عورت کو جھاڑو اٹھائے باہر آتے دیکھا۔

"یہ سونیا ہے۔" حلیہ یکسر تبدیل ہونے کے باوجود سرمد نے اسے پہچان کر عالم کے کان میں سرگوشی کی۔ اس نے سونیا کو اس کے لباس اور جھاڑو کی وجہ سے شناخت کیا تھا۔ یہ چیزیں کل جنگی نے اس کے سامنے ہی خریدی تھیں۔ ان کے دیکھتے ہی دیکھتے وہ سڑک پار کر کے اسٹاپ پر آ کر کھڑی ہوئی اور اس جانب دیکھنے لگی جہاں سے بسیں آ رہی تھیں۔ ان دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور جلدی سے بل ادا کر کے ہوٹل سے باہر نکلے۔ اسی وقت ایک بس اسٹاپ پر آ کر رکی اور سونیا اس میں سوار ہونے لگی۔ وہ دونوں بھی بھاگ کر پچھلے دروازے سے بس میں سوار ہو گئے۔ دونوں نے بیٹھنے کے لیے الگ الگ سیٹیں منتخب کی تھیں اور خیال رکھا تھا کہ ایسے زاویے سے بیٹھیں کہ سونیا کی ان پر نظر نہ پڑ سکے۔ بس لمبے روٹ کی تھی۔ راستے میں کئی مسافر اترے اور کئی نئے مسافر چڑھے۔ وہ پہلے ہی احتیاطاً آخری اسٹاپ کا ٹکٹ لے چکے تھے اس لیے آرام سے بیٹھے رہے۔ اللہ اللہ کر کے یہ طویل سفر ختم ہوا اور سونیا ایک اسٹاپ پر اتری۔ وہ دونوں دانستہ اپنی نشستوں پر بیٹھے رہے کہ اس اسٹاپ پر اترنے والی سونیا واحد فرد تھی اور وہ اس کے ساتھ اتر کر اس کی توجہ اپنی طرف مبذول نہیں کروانا چاہتے تھے۔

اس کے اترنے کے بعد بس چلی تو ایک منڈے ہوئے سر والا مرد بھاگ کر دروازے تک پہنچا اور آواز لگائی۔
"تھوڑا آسرا کر استاد۔"
"آگے اسٹاپ پر اترنا۔" وہ چلایا۔
"ادھر سے اور پڑے گا استاد!" اس نے دانت نکالتے ہوئے جواب دیا۔ اسی اثنا میں عالم شاہ بھی نشست چھوڑ کر پچھلے دروازے پر جا کھڑا ہوا اور بس روکنے کے لیے دروازے پر زور سے ہاتھ مارا۔ ڈرائیور نے تسلسل لگا سے باری باری دونوں کو دیکھا اور منہ ہی منہ میں بڑبڑاتے ہوئے بس روک دی۔
"میں آگے جاتا ہوں سائیں! آپ میرے پیچھے تھوڑے فاصلے سے آنا۔" مرد نے لباس کی جیب میں ہاتھ ڈال کر منکے باہر نکالے اور انہیں گلے میں ڈال لیا۔ لباس تو اس کا تھا ہی بوسیدہ اور پھٹا ہوا۔ گلے میں منکے ڈالنے سے وہ اچھا خاصا فقیر لگنے لگا۔ اپنے اسی فقیرانہ حلیے میں وہ تیز تیز چلتا اس اسٹاپ کی طرف چلا جہاں سونیا اتری تھی۔ اسٹاپ پر تو اسے سونیا نہیں دکھائی دی لیکن یہ اندازہ ہو گیا کہ وہ کس راستے سے گزری ہوگی۔ وہ خود بھی اسی راستے سے گزرتا ہوا بستی میں داخل ہو گیا۔ دو چار گلیاں گھومنے کے بعد اسے سونیا دکھائی دے گئی۔ وہ کسی بھی معاملے میں دخل دیے بغیر دور دور سے اس پر نظر رکھتا رہا۔ عالم شاہ کی بستی میں آمد کا بھی اسے علم ہو گیا لیکن دانستہ اس کے قریب نہیں گیا۔
شامو نامی بچے کے سونیا کی جھاڑی میں سے گیند چرانے اور سونیا کے اسے پکڑ کر اس کے گھر تک لے جانے کا منظر اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ سونیا جو کچھ کر رہی تھی، وہ کچھ سمجھ تو نہیں آرہا تھا لیکن یہ واضح تھا کہ اس کا اصل مقصد مجاز تک رسائی ہے اس لیے پوری دلجمعی اور احتیاط سے اس کے پیچھے تھا۔ پہلے اس کا اندازہ تھا کہ سونیا اس گھر سے کچھ معلومات کے حصول کے بعد باہر نکل آئے گی لیکن جب بہت دیر تک وہ باہر نہ نکلی تو اسے بے چینی ہونے لگی۔ اس نے وقفے وقفے سے بھیک کے لیے ہانک لگانے کا سلسلہ چھوڑا اور اس جھونپڑی نما گھر کے قریب ہی ایک درخت کے نیچے ڈیرا جما کر بیٹھ گیا۔ کچھ وقت مزید گزرا تو اس نے چوری کرنے والے بچے کو باہر آتے ہوئے دیکھا۔ بچے کے ایک ہاتھ میں پلاسٹک کی رنگین گیند اور دوسرے میں مٹی سے بنا طوطا تھا۔
"شامو...... یہ تیرے پاس کہاں سے آیا؟" آس پاس کھیلتے دو تین بچے اس کے ہاتھ میں کھلونے دیکھ کر اس کی طرف لپکے آئے۔
"یہ موسی نے مجھے تحفے میں دیے ہیں۔" اس نے چمکتی آنکھوں سے تھوڑا اترا کر اپنے ہم جولیوں کو اطلاع دی۔
"وہ اس کھلونے والی نے؟ وہ تو تجھے تیری ماں سے مار کھلوانے گئی تھی۔" بچوں کے لیے وہ اطلاع حیران کن تھی۔
"ہاں، پر اس نے مجھے معاف کر دیا اور ماں نے اس کو اپنی دیدی بنا لیا۔" اس نے کھلونوں کو اپنے ساتھیوں کے سامنے لہراتے چمکتے ہوئے بتایا۔
"اچھا، جب ہی وہ اتنی دیر سے تیرے گھر میں بھی بیٹھی ہے۔"
"ہاں تو پھر کیا۔ ماں نے اسے کھانے پر روک لیا ہے۔ اب وہ کھانا کھا کر ہی ہمارے گھر سے جائے گی۔"
"آؤ کھیلتے ہیں۔" بچے، جنہوں نے اپنی زندگی میں شاید صرف محرومیاں ہی دیکھی تھیں، اس کے ہاتھ میں موجود کھلونوں کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولے لیکن شامو نے ان کی یہ خواہش رد کر دی اور بولا۔
"ابھی میرا کھیلنے کو من نہیں ہے۔ میں اپنے کھلونے چاچی کو دکھانے لے جا رہا ہوں۔" وہ وہاں سے بھاگ گیا اور دوسرے بچے بھی منہ بناتے ہوئے ادھر ادھر ہو گئے۔ مرد کے پاس انتظار کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ وہ اپنی جگہ بیٹھا ادھر ادھر دیکھتا رہا۔ وہ فقیر کے بہروپ میں تھا لیکن اس غربت کی سطح سے نیچے زندگی گزارنے والے بستی کے باسی اسے بھیک کہاں سے دیتے۔ اسے کچھ نہ سوجھا تو منہ سر لپیٹ کر اسی درخت کے نیچے لیٹ گیا اور مندی مندی آنکھوں سے نگرانی کرنے لگا۔
ادھر عالم شاہ ایک پریشان حال شخص کا کردار نبھاتا بستی میں کوئی خالی جھگی تلاش کر رہا تھا۔ اس کی کہانی یہ تھی کہ وہ جس کھولی میں رہتا تھا اسے مالک خالی کروا رہا تھا اور اس کے پاس گنجائش نہیں تھی کہ وہ زیادہ کرائے پر دوسری کھولی حاصل کر سکے اس لیے اس بستی میں بھٹکتا پھر رہا تھا کہ اپنی گنجائش کے مطابق کوئی جھگی کرائے پر حاصل کر سکے۔ ایک دو لوگوں سے پوچھنے پر اسے انکار سننے کو ملا۔ اسے کون سا جھگی کرائے پر چاہیے تھی کہ انکار سن کر پریشان ہوتا۔ اسے تو بس سونیا پر نظر رکھنے کے لیے بستی میں اپنی موجودگی کا جواز چاہیے تھا لیکن پھر ایک جگہ وہ پھنس گیا۔ اسے بتایا گیا کہ ایک جھگی خالی ہے لیکن وہاں بجلی کا کوئی بندوبست نہیں۔
"بنا بجلی کے میں کیسے رہوں گا؟" اس نے بجلی کی عدم موجودگی کو انکار کا جواز بنانا چاہا۔

"چنتا نہ کر یارا! میں اپنے پاس سے ایک تار دے دوں گا۔ رات کو سوتے سمے پنکھا چلا لینا۔ دن کو تو تم ویسے بھی اپنے کام دھندے پر رہو گے۔" خالی جھگی کی اطلاع دینے والے نے اس کا یہ مسئلہ بھی حل کر دیا۔ پہلے اس نے سوچا کہ مزید کوئی بہانہ بنا کر انکار کر دے پھر خیال آیا کہ اگر کچھ رقم خرچ کر کے سکون سے بیٹھنے کو ٹھکانا مل رہا ہے تو حاصل کر لینا چاہیے۔ اس طرح کم از کم ادھر ادھر بھٹکنے سے تو بچ جائے گا۔
"ٹھیک ہے پھر جھگی دکھا دو۔ میں تھوڑا ایڈوانس دے کر قبضہ لے لیتا ہوں۔ باقی رقم اپنا سامان ادھر لاؤں گا، تب دوں گا۔" اس نے شرط رکھی جسے تھوڑی سی بحث کے بعد قبول کر لیا گیا۔ اچھی بات یہ تھی کہ جھگی اس مکان سے زیادہ دور نہیں تھی جہاں سونیا گھسی بیٹھی تھی۔ جھگی کے دروازے سے جھانک کر بھی اس مکان کی نگرانی کی جا سکتی تھی۔ بس اب اسے فکر اس بات کی تھی کہ موقع ملے تو مرد کو بھی دربدر بھٹکنے سے بچا کر وہیں بلا لے۔ یہ موقع اس نے اس طرح نکالا کہ جھگی کی صفائی کے بہانے وہاں موجود کچھ کچرا اکٹھا کیا اور اسے پھینکنے کے بہانے اس درخت تک گیا جس کے نیچے مرد لیٹا سونے کی اداکاری کر رہا تھا۔
"میں نے وہ نیلے دروازے والی جھگی کرائے پر لے لی ہے۔ جب موقع ملے، نظر بچا کر وہاں آ جانا۔" کچرے کا تھیلا رکھتے ہوئے اس نے سرگوشی کی اور خود واپس جھگی میں آ گیا۔ مرد باہر نگرانی کے لیے موجود تھا اس لیے فی الحال اسے زحمت کی ضرورت نہیں تھی۔ اس نے ادھوری نیند کو پورا کرنے کا فیصلہ کیا اور فرش پر ہی لیٹ گیا۔ صداقت شاہ اپنے اکلوتے بیٹے کو اس حالت میں دیکھ لیتے تو تڑپ اٹھتے۔ وہ جو ان کی وسیع جائداد کا وارث تھا، دھول مٹی سے اٹے فرش پر بنا بستر کے ایک ایسی جھگی میں سو رہا تھا جہاں زندگی کی بنیادی سہولیات بھی دستیاب نہ تھیں۔

☆☆☆

"تم کو ان لوگوں کے بارے میں کیا اندازہ ہوا؟ کچھ پتا چلا کہ کون تھے وہ لوگ؟" سونیا نے اپنی دھڑکنوں کو سنبھال کر سرسوتی سے سرسری لہجے میں پوچھا۔
"میں کیا اندازہ لگاتی؟ بس حیران ہوتی رہی کہ ایسے لوگ باشو کے ملنے جلنے والوں میں کہاں سے آ گئے۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں پستول بھی دیکھا تھا میں نے لیکن اصل بات جب سمجھ آئی جب پولیس آتنک وادیوں کی تلاش میں بستی میں آئی۔"
"پھر تو نے پولیس کو بتایا اس بارے میں؟"
"نہ بابا نہ۔ میں گریب (غریب) کدھر اس چکر میں پڑتی۔ میں تو منہ سی کر بیٹھی رہی۔" سرسوتی نے اپنے کانوں کو ہاتھ لگائے۔
"پھر...... پھر کیا ہوا؟ وہ لوگ کدھر گئے؟" سونیا کو جاننے کی بے کلی تھی۔
"کہاں گئے، یہ تو نہیں پتا بس میں نے یہ دیکھا کہ آدھی رات کے بعد باشو اور اس کا یار الوپ ان لوگوں کو لے کر جھگی سے نکل گئے پھر اس کے بعد لوٹ کر نہیں آئے۔"
"یہ الوپ کون ہے؟" سونیا کی ہر بات پر توجہ تھی۔
"باشو کا یار ہے۔ اسی کے ساتھ رہتا ہے۔ جو بنگلے والی باجی آج کل گھومنے گئی ہوئی ہے، الوپ اسی کے بھائی کے بنگلے پر کام کرتا ہے۔ وہ لوگ بھی میری باجی کے پریوار کے ساتھ ہی گھومنے گئے ہوئے ہیں پر الوپ کے پاس ان کے بنگلے کی چابیاں ہیں۔ باجی کی بھاوج صفائی کو لے کر بڑی جھلی ہے اس لیے اس نے الوپ کو حکم دے رکھا ہے کہ اس کے پیچھے بھی روزانہ گھر کی پابندی سے صفائی کرتا رہے۔" سرسوتی نے الوپ کے تعارف میں جو تفصیلات سنائی تھیں، وہ خاصی قابلِ غور تھیں اور سونیا کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر رہی تھیں۔
"لگتا تو یہ مجھے کوئی بڑا چکر ہے۔ تو نے اچھا کیا کہ اپنا منہ بند رکھا۔ ہم گریب (غریب) لوگ کہاں یہ پولیس تھانے کے چکر میں پڑ سکتے ہیں۔ ایک اکلوتا تیرا بچہ ہے۔ پولیس اور آتنک وادیوں کے چکر میں پڑ کر اس کو کچھ ہو گیا تو، تو کیا کرے گی۔ یہ آتنک وادی اور غنڈے لوگ تو اپنا بدلہ چکانے کو سب سے پہلے انسان کے کلیجے پر ہی ہاتھ ڈالتے ہیں۔" وہ چاہتی تھی کہ سرسوتی جو کچھ اسے بتا چکی ہے، اسے کسی دوسرے کے سامنے بیان نہ کرے اس لیے اسے مزید ڈرانے کا کام انجام دیا۔
"شبھ شبھ بولو دیدی! میرا شامو تو میرے جینے کی آس ہے۔" سرسوتی نے دہل کر سینے پر ہاتھ رکھا۔
"جگ جگ جیے تیرا شامو۔ میں اسی کی خاطر تو تجھ کو منہ بند رکھنے کا بول رہی ہوں۔"
"منہ تو سمجھو اب سل گیا۔" سرسوتی نے گویا عہد کیا۔
اس کے بعد ان کے درمیان اس موضوع پر مزید بات چیت نہیں ہوئی۔ سرسوتی نے کھانا پکایا اور کھانے سے فارغ ہونے کے بعد اپنے کام پر جانے کے لیے تیار ہو گئی۔
"میں بھی تیرے ساتھ چلتی ہوں۔ شاید تیرے بنگلے والی باجیوں میں سے کوئی میرے کھلونے خرید لے۔" سونیا

بھی اس کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہو گئی۔
"وہ کالے کوئلیں کی یہ پلاسٹک اور مٹی کے کھلونے۔ ان کے بچوں کے پاس تو بڑے بڑے مہنگے کھلونے ہیں۔ زیادہ تر تو باہر کے ملکوں سے آئے ہوئے ہیں۔" سرسوتی اس کی بات سن کر ہنس کر بولی اور اپنے مالکان کی شان جتانے لگی۔
"کیا پتا ترس کھا کر لے لیں یا پھر ایسے ہی کچھ دے دلا دیں۔ مجھے تو پتا ہے آج میرا دھندا نہیں ہوا۔ چار پیسے مل گئے تو میرا بھلا ہو جائے گا۔"
"تجھے کو آس ہے تو چل لے میرے ساتھ پر پہلے ہی بتا دوں تجھے کہ ان بڑے لوگوں کا کچھ پتا نہیں ہوتا۔ موڈ ہوا تو جھولی بھر دیتے ہیں ورنہ گالی اور دھکے دے کر نکال دیتے ہیں۔" سرسوتی کو تجربہ تھا اونچے گھروں کے لوگوں کے رویوں کا اس لیے بے دلی سے اسے اپنے ساتھ لے چلنے کی ہامی بھر لی۔ سونیا کو بھی بھلا کیا لینا دینا تھا ان لوگوں کے رویوں سے۔ وہ تو بس اس علاقے میں پہنچ کر اس بنگلے تک رسائی حاصل کرنا چاہتی تھی جہاں انوپ کام کرتا تھا۔
"میں تجھے اپنے ساتھ بنگلے میں لے کر نہیں جاؤں گی۔ میرے اندر جانے کے تھوڑی دیر بعد تو خود کھسک جا لینا۔ میں ساتھ لے کر گئی تو ویدی مجھ پر خفا ہوں گی۔" سرسوتی کے اپنے تحفظات تھے چنانچہ راستہ چلتے چلتے اس نے سونیا پر آگے کی صورت حال بھی واضح کر دی تھی۔
"تو چنتا نہ کر۔ میں کسی کو پتا نہیں لگنے دوں گی کہ میں تیرے ساتھ آئی ہوں۔" سونیا نے اسے تسلی دی اور اردگرد کا جائزہ لیا۔ کافی پیچھے اسے ایک فقیر آتا ہوا دکھائی دیا۔ بھری دوپہر میں ان دونوں کے علاوہ صرف وہی تھا جو بنگلوں کی طرف جانے والے بے سایہ دار راستے پر چلا جا رہا تھا۔ شاید اسے بھی ان بڑے لوگوں سے کچھ مل جانے کی امید تھی۔
"جس بنگلے پر تو سویرے کام پر آتی ہے، وہ کون سا ہے؟" کافی فاصلہ طے کرنے کے بعد جب وہ دونوں اس مقام پر پہنچیں جہاں سے بنگلوں کا آغاز ہو رہا تھا تو سونیا نے سرسوتی سے پوچھا۔
"آگے چل کر آئے گا وہ بنگلا۔" سرسوتی نے اسے جواب دیا تو وہ "اچھا" کہہ کر اس کے ساتھ آگے بڑھتی چلی گئی۔ ان کے پیچھے آنے والا فقیر بھی بنگلوں کی قطاروں کے درمیان پہنچ چکا تھا اور گھنٹیاں بجا کر بھیک کے لیے صدا لگا رہا تھا۔
"وہ دیکھ، وہ جو کالے گیٹ اور پیلے پتھر کی دیواروں والا بنگلا نظر آ رہا ہے، وہاں جاتی ہوں میں سویرے کام کرنے۔" کچھ اور آگے بڑھنے کے بعد سرسوتی نے ایک اونچی دیواروں والے بنگلے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اسے بتایا۔
"ہائے رام..... یہ تو بہت بڑا ہے۔ تو تو تھک جاتی ہوگی اس کی جھاڑو پونچھ کرتے کرتے۔" اس نے سرسوتی سے ہمدردی جتائی۔
"اب تو عادی ہو گئی ہوں۔" سرسوتی نے لاچاری مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔
"وہ تیرا پڑوسی انوپ ساتھ کے سفید گیٹ والے بنگلے میں کام کرتا ہے؟" اس نے باتوں باتوں میں اہم سوال کیا۔
"ہاں، اسی میں کرتا ہے۔ دیکھو حرام خور نے گیٹ صاف بھی نہیں کیا۔ سارا دھول مٹی میں اٹا ہوا ہے۔" سرسوتی نے جواب دینے کے ساتھ ساتھ تبصرہ بھی کیا۔
"کام پر آیا ہوگا تو صفائی کرے گا نا۔ تو ہی تو بتا رہی تھی کہ آتنک وادیوں کے ساتھ گئے ہیں وہ اور ہاشو۔"
"ہش..... بھول جا اس بات کو۔ اب کسی کے سامنے زبان پر نہ لانا۔" اس کے سرگوشی میں کیے گئے تبصرے پر بھی سرسوتی بوکھلا گئی۔
"لے..... میں نے کس کے سامنے بولنا ہے۔ یہاں سے آگے تو اپنے راستے، میں اپنے راستے۔" اس نے منہ بنایا پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔
"ایسا کر تو اپنے دھندے پر جا۔ میں پہلے دوسرے بنگلوں پر پھیرا لگا کر اپنا مال بیچنے کی کوشش کرتی ہوں۔ بعد میں پھرتی پھراتی تیری ویدی کے بنگلے پر بھی پہنچ جاؤں گی۔"
"ہاں، یہ ٹھیک ہے۔ اس طرح ویدی کو مجھ پر شک بھی نہ ہوگا۔" سرسوتی کو اس کی تجویز اچھی لگی اور جلدی جلدی کچھ الوداعی کلمات ادا کر کے آگے بڑھ گئی۔ سونیا اس کے نظروں سے اوجھل ہونے تک وہیں کھڑی رہی پھر پلٹ کر اس قطار کی طرف واپس آئی جہاں اس کا مطلوبہ بنگلا موجود تھا۔ سیاہ اور سفید گیٹ والے ساتھ ساتھ موجود دونوں بنگلوں میں سے اگرچہ سفید گیٹ والے بنگلے میں اصل دلچسپی تھی لیکن اس وقت وہ سیاہ گیٹ والے بنگلے کو جانچتی ہوئی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ امرا کے رہائشی علاقوں کی روایت کے عین مطابق یہاں ویرانی تھی اور کوئی اس کی حرکات و سکنات کو دیکھنے والا نہیں تھا۔ وہ چاہتی تو دونوں بنگلوں میں سے کسی کا بھی گیٹ پھاند کر آرام سے اندر جا سکتی

تھی لیکن ارادہ باندھ کر اندر کودنے سے قبل ہی گلی کے کونے پر اسے کسی کے لباس کی جھلک دکھائی دی۔ اس نے اندر جانے کا ارادہ ترک کیا اور تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی کونے تک پہنچی۔
بوسیدہ لباس والا ایک آدمی ایک بنگلے کی اطلاعی گھنٹی پہ انگلی رکھے کھڑا تھا۔ وہ اپنی جگہ کھڑی اس آدمی کا جائزہ لیتی رہی۔ وہ اس کے بائیں جانب فاصلے سے کھڑی تھی لیکن وہ گردن موڑ کر اس کی جانب دیکھنے کے بجائے سر جھکائے کھڑا تھا اور صرف ایک بار نگاہیں ترچھی کر کے اس کی جانب دیکھا تھا۔
"ہاں بھئی کون ہو؟ کیا کام ہے؟" بنگلے کا دروازہ کھلا اور چہرے سے چوکیدار دکھنے والے شخص نے باہر جھانک کر سخت بیزار لہجے میں پوچھا۔
"کام دھندے کی تلاش میں ہوں۔ کوئی کام مل سکتا ہے یہاں؟ میں سارے کام کر لیتا ہوں۔ مالی کا، صفائی ستھرائی کا اور......"
"کوئی اور گھر دیکھو بھائی۔ یہاں سارے نوکر پورے ہیں۔" چوکیدار نے اسے پوری بات کرنے کا موقع نہیں دیا اور نہایت بے مروتی سے جواب دے کر گیٹ زوردار آواز سے بند کر دیا۔ سونیا باہر کھڑے آدمی کا ردعمل دیکھنے کے لیے مزید وہاں نہیں رکی اور پلٹ کر دوبارہ کالے گیٹ والے بنگلے کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ آس پاس کا علاقہ اب بھی سنسان تھا۔ اس نے اپنے سامان کی چھابڑی بنگلے کے گیٹ کے سامنے رکھی اور خود گیٹ پر چڑھ کر دوسری طرف کود گئی۔ دوسری طرف پہنچنے کے بعد گیٹ کھولنے اور اپنی چھابڑی کو اندر پہنچانے میں اسے زیادہ دقت پیش نہ آئی۔ اس کام سے فارغ ہو کر اس نے بنگلے کا جائزہ لیا۔ پورچ میں کور چڑھی گاڑی کھڑی تھی جو ظاہر کر رہی تھی کہ مالکان واقعی گھر میں موجود نہیں ہیں اور ان دنوں یہ گاڑی کسی کے زیر استعمال نہیں ہے۔ سرسبز و شاداب، صاف ستھرا اور خوبصورت پودوں سے سجا لان البتہ اس تاثر کی نفی کر رہا تھا۔ لان کی حالت سے صاف ظاہر تھا کہ اس کی باقاعدگی سے دیکھ بھال کی جا رہی ہے لیکن لان کے پار رہائشی حصے کا بند دروازہ اور ہر طرف چھایا سکوت اس بات کی تائید کر رہے تھے کہ مکین موجود نہیں ہیں۔ وہ بچ بچ کر قدم اٹھاتی دروازے تک پہنچی۔ بند دروازے کو کھولنا اس کے لیے کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ اب بھی اسی ارادے سے اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا لیکن پھر چونک گئی۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہاں سکیورٹی سسٹم نصب ہے۔ اس قسم کے سکیورٹی سسٹم کو توڑنا اس کے لیے دشوار نہیں تھا لیکن ظاہر ہے اس میں عام لاک کو توڑنے کے مقابلے میں زیادہ محنت اور احتیاط کی ضرورت تھی۔ اردگرد سے بے نیاز اس نے پورے انہماک سے یہ کام انجام دیا اور آخرکار اندر داخل ہونے میں کامیاب ہو گئی۔ اس کامیابی کے حصول کے بعد اس کے لیے سب سے اہم کام دوسرے لباس کا حصول تھا۔ گھیردار گھاگرے اور بڑے سے دوپٹے میں وہ خود کو غیر آرام دہ محسوس کر رہی تھی۔
"واہ بھئی واہ، یہاں تو زبردست کلیکشن موجود ہے۔" تھوڑی سی کوشش کے بعد جب وہ ایک زنانہ وارڈروب تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو چکی تھی، اندر لٹکے مغربی طرز کے بہترین برانڈڈ ملبوسات دیکھ کر اس کی زبان سے بےساختہ ہی تعریفی کلمات نکلے۔ ان ملبوسات میں سے اپنے لیے ایک لباس منتخب کر کے بدن کی زینت بنانے میں اس نے زیادہ وقت نہیں لیا۔ لباس کی تبدیلی کے بعد حلیے کو اس لباس سے ہم آہنگ کرنے کے لیے اس نے خاتون خانہ کا میک اپ کا سامان بھی فراخدلی سے استعمال کیا۔ جس وقت وہ یہ کام کر رہی تھی، اسے باہر لان میں دو بار دھم دھم کی معمولی آوازیں سنائی دیں۔ ان آوازوں کو جان بوجھ کر نظرانداز کرتے ہوئے اس نے اپنا کام جاری رکھا اور جب پوری طرح سے تیار ہو گئی تو ٹہلتی ہوئی دروازے کی طرف گئی اور لان کا جائزہ لینے لگی۔ جلد ہی اس کی تیز نظروں نے بھانپ لیا کہ اندر کودنے والے وہ دونوں نفوس کہاں چھپے ہوئے ہیں۔
"چھپنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ بہتر ہے تم دونوں سامنے آ کر مجھ سے بات کر لو۔" اس کی آواز بہت بلند نہیں تھی لیکن اتنی ضرور تھی کہ وہ دونوں سن لیں۔ انہوں نے سن کر ردعمل دینے میں زیادہ دیر نہیں لگائی اور کچھ جھینپے ہوئے سے اس کے سامنے آ کھڑے ہوئے۔
"اندر آ جاؤ۔ بیٹھ کر آرام سے بات کرتے ہیں۔" اس نے ایک طرف ہٹتے ہوئے انہیں اندر آنے کی اجازت دی۔
"آپ جانتی تھیں کہ ہم آپ کے پیچھے ہیں؟" بوسیدہ کپڑوں میں ملبوس عالم نے اس کے مقابل بیٹھتے ہوئے کھسیانے لہجے میں پوچھا۔
"میں نے تم لوگوں کو بس میں ہی نوٹس کر لیا تھا۔ دشمن ہوتے تو چھٹکارے کا بھی انتظام کر لیتی لیکن یہ سوچ کر نظرانداز کر دیا کہ میری طرح تم بھی اپنے ساتھیوں کی فکر میں ہو

بک بہن اور بھانجے کی وجہ سے تمہاری فکر بھی ہے کچھ بڑھ کر ہی ہوگی۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ میرے لیے ممکن ہی نہیں تھا کہ ان لوگوں کو یہاں مشکل میں چھوڑ کر خود محفوظ مقام پر منتقل ہو جاؤں۔ کنول نے میری خاطر ویسے ہی بہت زیادہ تکلیف اٹھائی ہے۔" عالم شاہ کبھی نہیں بھول سکتا تھا کہ کنول نے صرف اور صرف اس کی خاطر فیصل سے نکاح کا طوق اپنی گردن میں ڈال لیا تھا۔

"میں تمہاری کیفیت سمجھ سکتی ہوں لیکن بات یہ ہے کہ ہماری تعداد جتنی زیادہ ہوگی، ہمارا پولیس کی نظروں سے بچ کر نکلنا اتنا ہی مشکل ہو جائے گا۔ تم نے نوٹس کیا ہوگا کہ اس علاقے کے خارجی راستوں پر پولیس کا ناکا لگا ہوا ہے اور یہاں سے کسی کا نکل کر جانا اتنا آسان ثابت نہیں ہوگا۔"

"کیا ان لوگوں کی یہاں موجودگی کے کوئی شواہد ملے ہیں آپ کو؟" جو ہونا تھا، وہ ہو چکا تھا اس لیے سونیا کی باتوں پر کوئی ردعمل دینے کے بجائے وہ اصل معاملے پر آ گیا۔

"تمہارا اندازہ درست ہے۔" سونیا نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے اس کے اندازے کی تصدیق کی اور پھر لہجے کو ذرا پراسرار بناتے ہوئے سرگوشی میں بولی۔

"مجھے کافی حد تک یقین ہے کہ میں ان تک پہنچ چکی ہوں۔"

"کہاں..... کہاں ہیں وہ لوگ؟" عالم شاہ بےتاب ہوا۔

"شاید ہمارے پڑوس میں۔"

"کیا واقعی؟" عالم شاہ اس کا جواب سن کر اچھل پڑا۔

"حالات و واقعات سے تو یہی اندازہ ہو رہا ہے۔"

اس نے اپنے شک کی وجوہات بیان کیں پھر وکیل دینے والے انداز میں بولی۔

"پولیس والوں نے جس طرح خارجی راستوں پر پہرا لگایا ہے، اس کو دیکھتے ہوئے اس بات کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کہ وہ لوگ یہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو گئے ہوں گے۔ ایسی صورت میں ان کے لیے سب سے محفوظ پناہ گاہ الوپ کے مالکان کا خالی بنگلا ہی ہے۔"

"کہہ تو آپ ٹھیک رہی ہیں لیکن میری سمجھ میں یہ نہیں آ رہا کہ آپ اس بنگلے کو چھوڑ کر یہاں کیوں آ گئی ہیں؟"

"حالات کا درست اندازہ لگانے کے لیے۔ اگر یہ بنگلا اتنا خالی نہ ہوتا تو مجھے براہ راست دوسرے بنگلے کا ہی رخ کرنا پڑتا لیکن مجھے ایک اچھا آپشن ملا تو میں نے اسے ضائع کرنا مناسب نہ سمجھا۔" اس نے وضاحت دی۔

"اب کیا ارادہ ہے؟"

"رات تک انتظار کرتے ہیں۔ تم لوگ چاہو تو اس مہلت سے فائدہ اٹھا کر فریش ہو سکتے ہو۔ یہاں ضرورت کا تمام سامان اور سہولیات موجود ہیں۔ میرے اندازے کے مطابق تم لوگوں کے ناپ کے مردانہ کپڑے بھی مل جائیں گے۔" اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا تو وہ دونوں بھی اخلاقاً مسکرا دیے۔ ویسے بھی اب انہیں ایک قسم بن کر رہنا تھا۔

☆☆☆

سہولیات سے آراستہ کمرے میں آرام دہ بستر پر سونے کے باوجود آنے والی صبح کنول کے لیے خوشگوار ثابت نہیں ہوئی تھی۔ آنکھ کھلتے ہی اسے اپنے سر میں درد محسوس ہوا تھا اور آہستہ آہستہ اس درد میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ سردرد کی اس تکلیف کے ساتھ اعظم کو سنبھالنا اس کے لیے دشوار ہو رہا تھا۔ خصوصاً اس لیے بھی کہ اپنے ساتھ کوئی سامان نہ ہونے کے سبب اس کے پاس اعظم کے لیے کپڑے اور ڈائپرز موجود نہیں تھے اور اس ڈر سے کہ کہیں بچہ جسم پر موجود واحد لباس کو بھی خراب نہ کر لے، وہ اسے بار بار واش روم لے کر جا رہی تھی۔ عمومی حالات میں بہت سکون سے رہنے والا اعظم اس صورت حال پر کچھ چڑچڑے پن کا مظاہرہ کر رہا تھا اور اس کا چڑچڑا پن کنول کے سردرد میں مزید اضافے کا سبب بن رہا تھا۔

"کیا بات ہے کنول! کیا کوئی مسئلہ ہے آپ کو؟" معاذ سے بہت دیر تک اس کی پریشانی چھپی نہ رہ سکی اور بالآخر وہ اس سے پوچھ بیٹھا۔

"نہیں..... کوئی خاص مسئلہ نہیں۔" اس نے بتانے میں تکلف سے کام لیا۔

"جو عام مسئلہ ہے، وہی بتا دیں۔" معاذ نے اصرار کیا۔

"اعظم کے استعمال کے لیے کپڑے اور ڈائپرز وغیرہ نہیں ہیں میرے پاس۔" اس نے دھیمے سے بتایا تو معاذ کو صورت حال کا کچھ کچھ اندازہ ہوا۔ مرد ہونے کے ناتے ان میں سے کسی نے بھی اس مسئلے کی طرف دھیان نہیں دیا تھا۔ خود ان کے لیے تو فی الحال خوراک اور پناہ گاہ میسر آ جانا کافی تھا لیکن ایک چھوٹے بچے کے مسائل یقیناً اس سے زیادہ تھے۔

"آپ پریشان مت ہوں۔ میں دیکھتا ہوں کہ اس سلسلے میں کیا انتظام ہو سکتا ہے۔" اس نے کنول کو تسلی دی اور جاتے جاتے پلٹ کر پوچھا۔ "آپ کی طبیعت کیسی ہے؟ مجھے آپ کچھ ٹھیک نہیں لگ رہیں۔ اس سارے چکر میں آپ کی دوا کیں بھی تو رہ گئی ہیں نا۔" اس کے انداز میں کنول کے لیے سچی فکرمندی تھی۔

"میں ٹھیک ہوں۔ فی الحال دواؤں کے بغیر بھی گزارہ ہو رہا ہے۔" کنول نے اسے اپنی تکلیف سے آگاہ کرنا مناسب نہ سمجھا لیکن وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ بتائے بغیر بھی اس کی تکلیف کو محسوس کر چکا تھا۔ باہر آ کر اس نے خود کچن کا رخ کیا اور ایک گلاس دودھ گرم کر کے ساتھ میڈیکل باکس میں سے دو پین کلرز نکال کر اس کے لیے لے گیا۔

"یہ زحمت کیوں کی آپ نے؟" کنول اسے یوں اپنی خدمت میں دودھ اور دوا پیش کرتے دیکھ کر جھینپی۔

"آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، یہ مجھے اچھی طرح معلوم ہے۔ صبح ناشتے میں بھی آپ نے برائے نام ہی کھایا تھا اس لیے بہتر ہوگا کہ دودھ کے ساتھ یہ دوا لے لیں۔ آپ کی پرانی دوا تو نہیں ہے لیکن امید ہے کہ درد میں کچھ نہ کچھ افاقہ ضرور ہو جائے گا۔" کیسی فکر اور پروا تھی اس کے لہجے میں۔ کنول کی آنکھیں اپنے خیال پر بھیگنے لگیں۔ فیصل کا ساتھ تو چلو سراسر تباہی آزار لیکن معظم شاہ جو اس کی زندگی میں آنے والے پہلے مرد تھے اور روایتی حد تک ایک اچھے شوہر بھی، کبھی اس طرح بن کہے اس کی تکلیف کو نہیں بوجھ پائے تھے۔

"شکریہ۔" بےاختیار ہی اس نے اپنی احسان مندی کا اظہار کیا۔

"شکریے کی کوئی بات نہیں۔ میں اعظم کو اپنے ساتھ باہر لاؤنج میں لے جا رہا ہوں۔ آپ یہ دوا اور دودھ پئیں اور کمرا بند کر کے اطمینان سے آرام کریں۔ اعظم کو میں سنبھال لوں گا۔" اس نے اعظم کو اپنی گود میں لے لیا۔

"لیکن....." وہ کہنا چاہتی تھی کہ اعظم کی وجہ سے اسے زحمت ہوگی لیکن معاذ نے اسے موقع نہیں دیا اور قدرے رعب سے بولا۔

"کوئی لیکن ویکن نہیں۔ آپ آرام کر کے خود کو فٹ کریں۔ اعظم کو میں ہینڈل کر لوں گا۔" وہ اعظم کو لے کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

"بچے کے لیے ڈائپرز اور دوسرے کپڑوں کی ضرورت ہے۔ کہیں سے یہ چیزیں مل سکتی ہیں؟" باہر لاؤنج میں آ کر اس نے چاروں کی گمرانی میں بیٹھے الوپ اور ہاشو سے دریافت کیا۔

"کسی سپر اسٹور پر چلے جاؤ، سب مل جائے گا۔" الوپ نے جلے کٹے لہجے میں جواب دیا جس کے نتیجے میں اسے اپنے بوتھے پر اس کا ایک عدد گھونسا برداشت کرنا پڑا۔ اس کو گھونسا پڑتے ہی ہاشو تڑپ کر اٹھا اور بولا۔

"اس کو چھوڑ دو جی۔ یہ نادان ہے۔ میں آپ کو اس کا اپائے بتاتا ہوں۔ آپ آؤ میرے ساتھ۔" اس نے معاذ کو بااصرار الوپ سے دور ہٹایا۔ الوپ مضروب رخسار پر ہاتھ رکھے کینہ توز نظروں سے معاذ کو گھورتا رہ گیا۔

☆☆☆

"پہنچ گیا ہوں استاد! بالکل ٹھیک اور مزے میں ہوں۔" اس نے گلو استاد کو اپنی خیریت کی اطلاع دیتے ہوئے ایک نظر ہوٹل کے آرام دہ اور پرتعیش کمرے پر ڈالی۔

"نہیں، سفر میں کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔ آرام سے پہنچ گیا ہوں۔ تھوڑی دیر آرام کروں گا اور پھر حیدرآباد کے لیے نکل جاؤں گا۔" دوسری طرف سے گلو نے اس سے کوئی سوال کیا تھا جس کے جواب میں اس نے اسے تسلی دیتے ہوئے اپنے اگلے پروگرام سے بھی آگاہ کیا اور چند ایک مزید باتیں کر کے سلسلہ منقطع کر دیا۔ اب اس کے پاس آرام کرنے اور ایک شخص کی آمد کا انتظار کرنے کے سوا کوئی کام نہیں تھا۔ آرام دہ کاؤچ پر نیم دراز وہ یہ وقت بتاتا اپنی یہاں آمد کے بارے میں سوچنے لگا۔

کہنے کو دونوں ممالک کے درمیان معاندانہ تعلقات تھے اور دونوں طرف کے لوگوں کو ہی ایک دوسرے سے بہت سے خطرات لاحق رہتے تھے لیکن حامد نے اسے اتنی تیزی اور سہولت سے پاکستان سے یہاں منتقل کروایا تھا جیسے کیک کا پیس کاٹ کر پلیٹ میں رکھنے کا معمولی کام ہو۔ اسے شہر کے ایک اچھے ہوٹل میں قیام کی سہولت بھی بغیر کسی مشکل کے میسر آ گئی تھی اور اب وہ اس پرتعیش کمرے میں بیٹھا اس شخص کا انتظار کر رہا تھا جسے اس کے لیے شناختی کاغذات سمیت دوسری اہم دستاویزات پہنچانے آنا تھا۔ یہاں آمد سے قبل اس نے اپنے حلیے میں خاطرخواہ تبدیلیاں کر لی تھیں اور اب وہ چھوٹے سیاہ بالوں، سیاہ آنکھوں اور گھنی مونچھوں کے ساتھ اس شخص سے بالکل مختلف لگ رہا تھا جو گونگے بہرے کا بہروپ دھارے گلو استاد کے باڈی گارڈ کے فرائض انجام دیا کرتا تھا۔

"کیا سونیا بچ بچ کسی مشکل میں گھر گئی ہے اور مجھے اسے اس مشکل سے نکالنے کے لیے ہائر کیا گیا ہے یا یہ ان لوگوں کا کوئی دھوکا ہے؟" وہ خود سے یہ سوال کرتے ہوئے الجھن میں پھنسا ہوا تھا۔ ایک ایسے وقت میں جبکہ وہ لوگ میڈم ایکس سے چھیڑ چھاڑ کر رہے تھے، حامد کا اس کام کو لے کر چلے آنا اسے زیادہ ہضم نہیں ہوا تھا اور وہ اس کے پیچھے خطرے کی بو محسوس کر رہا تھا۔

"جو بھی ہے سامنے آ ہی جائے گا۔ سوچ سوچ کر خود کو ہلکان کرنے سے کچھ حاصل نہیں۔" کچھ دیر الجھنے کے بعد اس نے خود ہی اپنے خیالات کو ذہن سے جھٹکا اور کافی منگوانے کے ارادے سے انٹرکام کی طرف بڑھا لیکن اس کے ریسیور اٹھانے سے پہلے ہی انٹرکام بج اٹھا۔

"یس!" اس نے محتاط لہجے میں یک لفظی سوال کیا۔

"آپ سے ملاقات کے لیے مسٹر امر تشریف لائے ہیں سر! کیا میں انہیں آپ کے کمرے میں بھجوا دوں؟" دوسری طرف سے شستہ انگریزی میں پوچھا جا رہا تھا۔

"جی بالکل۔" اس نے بھی بہ زبان انگریزی شائستگی سے جواب دیا۔ امر وہی شخص تھا جس کا اسے انتظار تھا۔ اس کی طرف سے اجازت ملتے ہی ڈیڑھ منٹ کے اندر وہ شخص اس کے کمرے کے دروازے پر موجود تھا۔ دروازے پر ہی انہوں نے ایک دوسرے کے سامنے مخصوص کوڈ ادا کیے اور وہ شخص اسے ایک پیکٹ تھما کر واپس لوٹ گیا۔ اس نے اندر آ کر اس پیکٹ کو کھول کر دیکھا۔ اندر تمام ضروری دستاویزات موجود تھیں یعنی اسے کہیں آنے جانے کی صورت میں کسی پریشانی کا سامنا نہیں کرنا تھا۔ ان دستاویزات کے ساتھ حیدر آباد جانے کے لیے ائر ٹکٹ بھی موجود تھا۔ یہ سب دیکھ کر اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ وہاں ان لوگوں کے وسیع ذرائع موجود تھے۔ ایسے میں انہیں سونیا کی تلاش کے لیے کسی کو باہر کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی تھی یہ ایک بڑا سوال تھا جس کا جواب اسے وقت کے ساتھ ہی ملنا تھا۔

وقت کے سوال کو وقت پر چھوڑ کر وہ ہوٹل سے نکل کھڑا ہوا۔ فلائٹ میں ابھی خاصا وقت تھا اور وہ یہ وقت شہر میں ادھر ادھر گھوم کر گزارنا چاہتا تھا۔ ہوٹل سے چیک آؤٹ کرتے ہوئے البتہ یہ اس پر واضح نہیں تھا کہ گھومنے کے لیے شہر کے کس مقام پر جائے گا۔

"کہاں چلنا ہے صاحب؟" باہر نکل کر وہ سامنے آنے والی پیلی ٹیکسی میں بیٹھا تو ڈرائیور نے اس سے دریافت کیا۔

"جامع مسجد۔" بلا ارادہ ہی اس کی زبان سے پھسلا۔ اس کی پرورش جس ماحول میں ہوئی تھی، وہاں مذہب کا زیادہ عمل دخل نہیں تھا لیکن بہرحال اس کی رگوں میں ایک مسلمان کا خون تھا اور وہ اپنی بنیاد سے الگ نہیں ہوسکتا تھا۔ ٹیکسی ڈرائیور نے اسے مسجد پر چھوڑا تو وہ شاہجہاں کی تعمیر کروائی سرخ پتھروں والی اس مسجد کے پُرشکوہ گنبدوں اور میناروں کا جائزہ لیتا ہوا سیدھا وضو خانے میں جا پہنچا۔ اگرچہ یہ نماز کا وقت نہیں تھا لیکن وضو کر کے وہ نوافل کی نیت باندھ کر کھڑا ہو گیا۔

"یا اللہ! ہماری زندگیوں میں امن و سکون لا اور ایسے اسباب پیدا کر کہ جب میرا بچہ اس دنیا میں آنکھ کھولے تو اسے ان مصائب اور حالات کا سامنا نہ کرنا پڑے جن سے ہم گزر رہے ہیں۔" نوافل کی ادائیگی کے بعد دعا کے لیے ہاتھ بلند کیے تو بے اختیار ہی اس پر رقت طاری ہو گئی اور خود سے بہت دور دنیا کے الگ تھلگ گوشے میں بیٹھی وہ اپنی نازک اندام بیوی یاد آئی جسے بہت چاہ سے اپنی زندگی میں شامل کیا تھا اور چاہتا تھا کہ دنیا کی ہر خوشی اس کے قدموں میں ڈھیر کر دے۔

"وہ بہت معصوم ہے میرے مالک! اسے مزید آزمائشوں سے بچا لے اور مجھے توفیق دے کہ میں اس کے دکھوں کا مداوا کر سکوں۔" اپنے پروردگار کے حضور درخواست پیش کر کے وہ باہر نکلا تو دل کافی ہلکا پھلکا ہو چکا تھا۔ اپنی ہی دھن میں سیڑھیاں اترتا وہ جانے کس طرح اوپر چڑھتے ایک شخص سے ٹکرا گیا۔ اس ٹکر کے نتیجے میں وہ شخص پیچھے لڑھکتا اس سے قبل ہی اس نے سہارا دے کر اسے سنبھال لیا۔

"اماراناک پھوڑ ڈالا خانہ خراب کا بچہ!" بھاری جسامت اور قدرے پست قامت والا وہ شخص اپنی ناک پکڑے برہمی کا اظہار کرنے لگا۔

"آئی ایم سوری خان صاحب! آئی ایم رئیلی ویری سوری۔" مقابل کا پٹھان ہونا محسوس کر کے اس نے اسے "خان" کہہ کر پکارا اور معذرت کی۔

"یہ تم پڑھے لکھوں کا اچھا طریقہ ہے۔ پہلے اگلے کا نقصان کرتے ہو پھر یہ جھوٹ موٹ کی سوری سوری کر کے جان چھڑا لیتے ہو۔" اس کی طرف سے پیش کی جانے والی معذرت نے بھی خان کی ناراضی کو دور نہ کیا۔

"نہیں خان صاحب! میں جھوٹ موٹ کی سوری نہیں کر رہا ہوں۔ مجھے سچ مچ بہت افسوس ہے کہ میری غلطی کی وجہ سے آپ کو تکلیف اٹھانا پڑی۔" اس نے وضاحت دی اور دلچسپی سے اس شخص کا جائزہ لیا۔ روایتی گھیر دار لباس اور ٹوپی پہنے وہ گول مٹول چہرے والا فربہ شخص اس ماحول میں بالکل منفرد دکھائی دے رہا تھا۔

"چلو ٹھیک ہے۔ تم اتنا عاجزی سے بولتا ہے تو ام تمہیں مابد (معاف) کر دیتا ہے۔" آخرکار اس کا دل پسیج گیا۔

"کیا آپ میرے ساتھ بیٹھ کر چائے پینا پسند کریں گے؟" اسے وہ شخص دلچسپ لگا تھا اور دل چاہا تھا کہ اس کے ساتھ کچھ وقت بتایا جائے۔

"پسند کا بات کرتا ہے تو پھر ام قہوہ پیے گا۔" خان نے اتنی معصومیت سے جواب دیا کہ وہ بے اختیار ہنس پڑا اور ہنستے ہنستے بولا۔

"ٹھیک ہے، قہوہ ہی سہی۔"

دونوں ساتھ ساتھ چلتے ایک قریبی ہوٹل میں جا بیٹھے۔ وہ خاصا پُررونق علاقہ تھا اور بازار کی وجہ سے بہت زیادہ آمد و رفت تھی۔

"اگر زیادہ تکلیف ہے تو میں آپ کو ڈاکٹر کے پاس لے چلتا ہوں۔" ہوٹل میں ایک دوسرے کے مقابل بیٹھے اس نے خان کی سرخ پڑی ناک کو دیکھ کر پیشکش کی۔

"اب ایسا چھوئی موئی بھی نئی اے گل خان کہ ذرا سی تکلیف پر ڈاکٹر کی طرف دوڑ جائے۔ نرکا بچہ اے، نرکا بچہ اور اس سے بڑی بڑی چوٹیں ہنس کر سہہ چکا اے۔ تم امارا ٹانگ کا لنگڑاہٹ دیکھا ہوگا نا۔ پوچھو یہ کیسا ہوا؟"

"کیسے ہوا؟" اس نے خان کے جوش سے سرخ پڑتے چہرے کو دلچسپی سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"گولی لگا تھا ادھر۔ مالک اور اس کے مہمانوں کو بچاتے ہوئے ام نے اپنا جان خطرے میں ڈال دیا تھا۔" سینے پر ہاتھ مار کر بتاتے ہوئے اس کے انداز میں ایک فخر سا تھا۔ اس فخر کے ساتھ اپنی زندگیاں وار دینے والے کئی نمک خوار اس نے دیکھ رکھے تھے جن میں سے زیادہ تر کے آقاؤں کو ان کی قربانی کی قدر بھی نہیں ہوتی تھی اس لیے گل خان سے اس کی بہادری کا سارا قصہ جاننے کے لیے اصرار کرنے کے بجائے آرڈر لینے کے لیے آنے والے بیرے کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"بے شک آپ جی دار انسان ہیں لیکن مجھے پھر بھی افسوس ہے کہ میری بے پروائی کی وجہ سے آپ کو تکلیف پہنچی۔ اصل میں میرا دھیان کسی اور طرف تھا اس لیے میں آپ کو دیکھ ہی نہیں سکا تھا۔" بیرا آرڈر لے کر چلا گیا تو اس نے گل خان کے سامنے ایک بار پھر معذرت خواہانہ وضاحت دی۔

"چھوڑو یار! سارا غلطی تمہارا نئی تھا۔ تھوڑا قصور سور امارا بھی تھا۔ ام بھی تھوڑا پریشانی میں تھا اس لیے ام نے بھی تمہارا طرف دھیان نئی دیا تھا۔" خان اس کے اخلاق کے آگے مکمل طور پر پگھل چکا تھا اس لیے اس بار اپنی غلطی تسلیم

لاعلمی

بچے نے باپ سے پوچھا۔ "ڈیڈی! سورج زمین سے کتنی دور ہے؟"

"بیٹا! مجھے معلوم نہیں۔" باپ نے جواب دیا۔

بیٹا برا سا منہ بنا کر بولا۔ "آپ کی لاعلمی کی سزا کل اسکول میں مجھے ملے گی۔"

وضاحت

پادری صاحب ایک خوبصورت عورت کا ہاتھ تھامے ایک تقریب میں پہنچے تو ایک خاتون نے خوشگوار حیرت سے آنکھیں پھیلاتے ہوئے پوچھا۔

"فادر! یہ آپ کی وہی بیوی ہیں جن کے حسن کے ہم نے بہت چرچے سنے ہیں؟"

"یہ میری واحد بیوی ہیں۔" پادری صاحب نے تصحیح کرنے کے انداز میں کہا۔

(مرسلہ: عاصم خان، کراچی)

کر لینے میں حرج نہیں سمجھا تھا۔

"کیسی پریشانی؟ کہیں گھر میں کوئی بیمار ویمار تو نہیں؟" اس نے خان کی پریشانی کی نوعیت کے بارے میں اندازہ لگانا چاہا۔ اس کے اندازے کے مطابق خان مالی طور پر زیادہ مضبوط شخص نہیں تھا اور وہ اس کی پریشانی کی نوعیت جان کر اس کی مالی مدد کرنا چاہتا تھا۔

"ارے نئی بابا! گھر میں تو سب اچھا ہے بلکہ خوشخبری ملا اے کہ امارا دوسرا بیوی کے ہاں بیٹا ہوا ہے۔ ابھی ام اپنا پریشانی میں بیٹے کو دیکھنے بھی نئی جاسکا اے۔" وہ تھوڑا سا اداس دکھائی دیا۔

"اگر چاہو تو مجھے اپنی پریشانی کے بارے میں بتا سکتے ہو۔" وہ جانتا تھا کہ اسے زیادہ دیر اس شہر میں نہیں رکنا ہے پھر بھی گل خان کی سادگی و بے ساختگی نے اس کے لیے دل میں نرم گوشہ پیدا کر دیا تھا اور خواہش محسوس ہو رہی تھی کہ اس کی مدد کی جائے۔

"بس کیا بتاؤں یارا! کچھ محسن اور دوست اے جو گم ہو گیا اے اور امارا عقل میں نئی آرہا کہ کیسے انہیں تلاش کرے۔" گل خان واقعی پریشان تھا۔ وہ حیدر آباد سے دہلی واپس آگیا تھا لیکن ساتھیوں میں سے کوئی دوسرا وہاں

نہیں دیکھا تھا۔

''تمہارے وہ دوست کوئی بچے تھے جو گم ہو گئے؟'' اس نے دن کر حیرت کا اظہار کیا لیکن گل خان کے جواب دینے سے پہلے بیرا لوازمات لے پہنچ گیا اور انہیں میز پر سجانے لگا۔ بیرے کی موجودگی میں خاموشی مناسب تھی۔

''ام نے صرف قہوہ پینے کا بولا تھا۔ تم نے یہ اتنا سارا سامان کیوں منگوایا؟'' گل خان نے اعتراض کیا۔

''مجھے بھوک لگی تھی اس لیے منگوایا ہے۔ تم بس میرا ساتھ دے دو۔ ویسے بھی اب میں زیادہ دیر تمہارے ساتھ نہیں بیٹھ سکوں گا۔ مجھے کچھ دیر میں ائرپورٹ پہنچ کر وہاں سے حیدرآباد کے لیے فلائٹ پکڑنا ہے۔'' اس نے کھانے کی ابتدا کے ساتھ انصاف شروع کرتے ہوئے گل خان کو بھی اپنا ساتھ دینے کا اشارہ کیا لیکن گل خان حیدرآباد کے ذکر پر ٹھٹک گیا تھا۔

''حیدرآباد...... حیدرآباد کیا کرنے جا رہے ہو؟'' کچھ کھوئے کھوئے لہجے میں سوال بھی کر ڈالا۔

''مجھے بھی کسی کی تلاش ہے۔'' اس نے مسکرا کر جواب دیا اور آلو کا ایک تلا ہوا ٹکڑا اپنے منہ میں رکھا۔

''کسے تلاش کرنے جا رہے ہو؟ ام کو بتاؤ۔ ام ابھی تو حیدرآباد سے واپس آیا اے۔ شاید ام اسے جانتا ہو۔'' خان نے ایسے سوال کیا جیسے حیدرآباد کوئی چھوٹا موٹا گاؤں ہو جہاں گنتی کے چند لوگ بستے ہوں اور وہ اپنے قیام کے عرصے میں ان تمام لوگوں سے مل کر آیا ہو۔

''چلو ٹھیک ہے۔ میں تمہیں اس کی تصویر دکھاتا ہوں۔'' سادہ لوح خان کی پیشکش نے اسے شرارت پر آمادہ کیا اور موبائل کی گیلری کھول کر سونیا کی تصویر نکالی۔ یہ تصویر حامد ہی نے اسے فراہم کی تھی۔ تصویر میں سونیا چست جینز کی پینٹ پر سرخ ٹی شرٹ پہنے اپنی تمام تر حشر سامانیوں سمیت مسکرا رہی تھی۔ اس نے یہ مسکراتی ہوئی تصویر گل خان کے آگے کر دی۔ تصویر پر نظر پڑتے ہی خان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

''کیا بات ہے خان؟ میں نے تمہیں اتنی خوبصورت لڑکی کی تصویر دکھائی ہے لیکن تمہارا رنگ ایسے فق ہو گیا ہے جیسے کوئی بھوت دیکھ لیا ہو۔'' اس سے گل خان کی کیفیت چھپی نہ رہ سکی۔

''تم اس کو کیوں ڈھونڈتی اے؟'' حیرت کی زیادتی نے آخر کار گل خان سے تذکیر و تانیث کی غلطی کروا ہی دی۔

''اس کے والی وارثوں کا کہنا ہے کہ یہ گم ہو گئی ہے اور میں ان کے کہنے پر اسے ڈھونڈنے کے لیے جا رہا ہوں۔'' خان کی کیفیت پر وہ اندر سے جوش و اضطراب میں مبتلا ہو گیا تھا لیکن لہجے کو اس نے سادہ اور ہموار ہی رکھا تھا۔

''اس کا کوئی والی وارث بھی اے؟'' خان نے یوں حیرت کا اظہار کیا جیسے یہ کوئی ناممکن بات ہو۔

''والی وارث تو سب کے ہوتے ہیں یار! یہ کوئی آسمان سے تو نہیں ٹپکی ہو گی نا؟'' سرسری لہجے میں جواب دیتے وہ خان کے چہرے کے بدلتے تاثرات کا بغور جائزہ لے رہا تھا۔

''پر کوئی کوئی بندہ بڑا خودمختار ہوتا اے۔ اس کو والی وارث کا ضرورت ای نہیں ہوتا۔'' خان نے سونیا کی دبنگ شخصیت دیکھ رکھی تھی اس لیے یہ کہنے میں حق بجانب تھا۔

''مجھے لگتا ہے تم اس خاتون کو جانتے ہو۔'' وہ دیر سے ذہن میں مچلتا خیال زبان پر لے آیا۔ خان نے اس سوال کے جواب میں خاموشی اختیار کر لی۔

''خاموش کیوں ہو گئے دوست! کچھ تو بولو اور اگر اس کے بارے میں کچھ جانتے ہو تو مجھے بتاؤ۔ تمہیں نہیں معلوم کہ میرا اس کے بارے میں جاننا کتنا ضروری ہے۔ اس خاتون کی تلاش کے ساتھ کئی افراد کی خوشیاں بلکہ زندگیاں جڑی ہوئی ہیں۔'' اس نے خان کا ہاتھ تھام کر زور سے دبایا اور جذباتی لہجے میں بولا۔

''پہلے تم ام کو سچ سچ بتاؤ کہ تم سچ مچ اسی کو ڈھونڈتی اے یا اس کے پیچھے کسی اور کی تلاش میں اے؟'' سادہ اور معصوم دکھائی دینے والے خان نے اس سے ایک پیچیدہ سوال کیا۔ ایسا سوال جو گویا استاد کے ذہن میں بھی نہیں آیا تھا۔ وہ اس سوال پر کچھ دیر تک خاموشی سے خان کو گھورتا رہا پھر ایک گہری سانس لے کر بولا۔

''سچ یہ ہے کہ میں ایک ایسے بندے کی تلاش میں ہوں جس کے غیاب کا اس خاتون سے گہرا تعلق ہے۔''

''اس شخص کا نام کیا اے؟'' خان کے بھولپن نے مکمل سنجیدگی اور بردباری اوڑھ لی تھی اور وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے اس سے بات کر رہا تھا۔

''معاذ!'' اسے لگا کہ اگر وہ کامیابی حاصل کرنا چاہتا ہے تو اسے یہ داؤ کھیلنا ہی پڑے گا چنانچہ پُراسرار لہجے میں معاذ کا نام لے ڈالا۔

''کیا تم کو اس کے کسی اور ساتھی کا بھی پتا اے؟'' خان کے سوالات کا سلسلہ رکا نہیں تھا۔

''مجھے کنفرم نہیں ہے لیکن مجھے لگتا ہے کہ اگر معاذ کے

ساتھ اس کا کوئی دوست موجود ہے تو وہ یقیناً عالم شاہ ہو گا۔'' وہ مسلسل جوا کھیل رہا تھا اور اس کھیل میں اسے کھلاڑی پر نظر ڈالنا بھی بھول گیا تھا۔

''تم کون اے؟'' خان کا لہجہ اس بار سخت ہو گیا اور اسے یوں لگا کہ اس نے میز کی آڑ میں اپنے گھیر دار لباس کے اندر ہاتھ ڈال کر کچھ نکالا ہے۔ شاید کوئی ہتھیار......

''تم مجھے دوست بھی کہہ سکتے ہو اور خیر خواہ بھی۔ شاید خود تم بھی یہی حیثیت رکھتے ہو لیکن مجھ میں اور تم میں ایک فرق ہے۔ تمہارا ان لوگوں سے تعلق نیا ہو گا جبکہ میرا ان سے پرانا ہی نہیں، بہت گہرا تعلق ہے۔'' وہ پوری طرح خان پر کھل گیا تھا لیکن خان اب بھی تذبذب میں بیٹھا تھا کہ اس پر اعتماد کرے یا نہ کرے۔

''یوں خاموش نہ بیٹھو دوست! میں جانتا ہوں کہ وہ لوگ مشکل میں ہیں اور میں ان کی مدد کی نیت لے کر یہاں آیا ہوں۔ تم ان کے بارے میں جو کچھ جانتے ہو، مجھے بتا دو تو تمہاری بڑی مہربانی ہو گی۔'' وہ اب باقاعدہ خان سے التجا کر رہا تھا۔

''ام کیا بتائے تم کو۔ ام تو خود ان لوگوں سے بچھڑ گیا اے اور کچھ سمجھ نہیں آتا کہ ان کو ڈھونڈنے کدھر جائے۔'' آخر کار خان تھوڑا سا کھلا اور اداس سے لہجے میں ایک حقیقت اس کے گوش گزار کی۔

''تم مجھے تفصیل سے سب کچھ بتاؤ پھر ہم مل کر فیصلہ کریں گے کہ ہمیں کیا کرنا ہے۔'' اس نے ایک بار پھر خان کے دونوں ہاتھ تھام لیے اور جذباتی لہجے میں بولا۔ اس بار خان نے بھی مزاحمت نہیں کی اور سرگوشیوں میں اسے حالات سے آگاہ کرنے لگا۔

☆☆☆

''کپڑوں کا تو زبردست کلیکشن موجود ہے یہاں۔ زیادہ تر امپورٹڈ ورائٹی ہے۔'' بڑی سی وارڈ روب کھولے کپڑوں کا جائزہ لیتے سرمد نے مختلف ہینگرز کو اِدھر اُدھر کرتے تحسین آمیز لہجے میں عالم شاہ کو آگاہ کیا۔

''اتنے خوبصورت اور شاندار بنگلے میں رہنے والا کوئی فٹ پاتھیا تو ہو نہیں سکتا اس لیے اس کے کپڑوں کا کلیکشن بھی شاندار ہی ہونا چاہیے۔'' عالم شاہ نے بنا تکیے سے سر اٹھائے بے نیازی سے جواب دیا۔ کئی گھنٹوں کی بے آرامی اور دربدری کے بعد لیٹنے کے لیے یہ آرام دہ بستر میسر آیا تھا تو اس کے سوا کسی اور شے میں دلچسپی لینے کا موڈ نہیں ہو رہا تھا۔ ویسے بھی وہ سونے کا چمچہ منہ میں لے کر پیدا ہونے والوں میں سے تھا جسے دنیا کی ہر نعمت میسر رہی تھی اس لیے کسی کے کپڑوں کی کلیکشن اسے متاثر نہیں کر سکتی تھی۔

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں سائیں! لیکن مجھے کپڑوں کے قیمتی ہونے سے زیادہ خریدنے والے کی چوائس نے متاثر کیا ہے۔ ہر پیسے والا خوش ذوق بھی ہو، یہ ضروری نہیں ہوتا۔'' سرمد نے اسے جواب دیتے ہوئے ہلکے نیلے رنگ کا ایک تھری پیس سوٹ باہر نکال کر اس کے سامنے کیا۔

''یہ دیکھیں، کتنا نفیس سوٹ ہے۔ میرے خیال میں آپ یہ پہن لیں۔ ناپ بھی آپ کے حساب سے ہے۔''

''خدا کو مانو یار! میں ان حالات میں تھری پیس سوٹ پہن کر کہاں بھاگتا پھروں گا۔ بہتر ہے تم میرے لیے کوئی ٹی شرٹ اور ٹراؤزر وغیرہ نکال دو۔ بہت سے بہت جینز چل جائے گی۔'' تھری پیس سوٹ دیکھ کر پہلے عالم نے اسے گھورا پھر کوشش کر کے لہجے کو نرم بناتے ہوئے ٹوکا۔

''سوری سائیں! مجھے تو اس بات کا دھیان ہی نہیں رہا تھا۔'' سرمد اس کے ٹوکنے پر جھینپ گیا اور سوٹ کو واپس لٹکا کر وارڈ روب کا دوسرا حصہ کھولا۔ اس حصے میں اسے اپنے مطلب کے کپڑے دکھائی دیے۔ یہ کپڑے بھی خوبصورت اور اعلیٰ کوالٹی کے تھے۔ خود اپنے لیے تو وہ ان میں سے کوئی بھی لباس آنکھیں بند کر کے نکالتا اور پہن لیتا لیکن عالم شاہ کے لیے سب سے عمدہ لباس کے انتخاب کے چکر میں اس نے تیزی سے ہینگرز کو اِدھر سے اُدھر سرکانا شروع کر دیا۔ یہ کام کرتے ہوئے اچانک ہی اس کی نظر بھٹکی اور اسے ایسا محسوس ہوا کہ وارڈ روب کے پچھلے حصے میں کچھ ہے جو لکڑی کی رنگت کا ہو کر بھی لکڑی سے قدرے مختلف ہے۔ بغور دیکھنے پر اس پر انکشاف ہوا کہ وہ ایک چھوٹا سا پینل ہے جس پر کچھ ہندسے درج ہیں۔

''لگتا ہے آج کا سارا دن تم نے مالک کے ذوق سے متاثر ہوتے ہوئے ہی گزار دینا ہے اس لیے بہتر ہو گا کہ میں نہا کر کپڑے بدلنے کی خواہش کو چھوڑوں اور ایسے ہی میلے کپڑوں میں سو جاؤں۔'' عالم شاہ کو اس کی تاخیر نے جھنجلاہٹ میں مبتلا کر دیا۔

''معافی سائیں! بس نکال رہا ہوں کپڑے۔ ذرا ایک چیز دیکھ کر الجھ گیا تھا۔'' عالم کی ناراضی محسوس کر کے وہ گڑبڑایا اور جلدی سے ایک سوٹ نکال کر اس کی طرف پلٹا۔

''کس چیز کی بات......؟'' عالم کا سوال ابھی منہ میں

ہی تھا کہ کمرے کے دروازے پر سونیا نمودار ہوئی اور اشارے سے انھیں باہر آنے کو کہا۔ باہر آنے کے اشارے کے ساتھ ساتھ اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر انھیں خاموش رہنے کی ہدایت بھی دے دی تھی جس نے انھیں کسی غیر معمولی صورت حال کا احساس دلایا اور اپنی آپس کی گفتگو بھول کر فوراً اس کے پیچھے چل پڑے۔ وہ انھیں اپنے ساتھ لیے داخلی دروازے کی طرف بڑھی اور اشارے سے دروازے کے دائیں بائیں پوزیشن لینے کی ہدایت دی۔ اس ہدایت کی روشنی میں وہ سمجھ گئے تھے کہ کوئی ہے جو بنگلے کے اندر داخل ہونے کی کوشش کر رہا ہے۔ مداخلت کار سے نمٹنے کے لیے دروازے کے دائیں بائیں ہوشیاری سے کھڑے انھوں نے ایک حیران سی نظر سونیا پر ڈالی جو دروازے کے عین سامنے رکھے صوفے پر بڑے انداز سے ٹانگ پر ٹانگ چڑھا کر بیٹھ گئی تھی۔ دروازے پر ہونے والے تحرک نے انھیں سونیا کے اس انداز پر زیادہ غور کرنے کی مہلت نہیں دی۔ دروازہ بے آواز کھلا۔ آنے والا یقیناً اس یقین کے ساتھ آیا تھا کہ بنگلا بالکل خالی ہے اس لیے اس نے بے پروائی سے پہلا قدم اندر رکھا اور پھر سامنے بیٹھی سونیا کو دیکھ کر بری طرح ٹھٹک گیا۔ اسے ٹھٹک کر سنبھلنے کی مہلت دیے بغیر عالم شاہ اور سرمد دائیں بائیں سے اس پر پل پڑے۔ ردعمل میں اس نے ایک گھونسا رسید کیا اور دوسرے کی پسلیوں میں کہنی سے وار کیا۔ چوٹ کھا کر وہ دونوں مشتعل ہوئے اور اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کی نیت سے اسے زمین پر پچھاڑنے کی کوشش کی لیکن سونیا ہنستی ہوئی صوفے سے کھڑی ہوئی اور شوخ لہجے میں بولی۔

"بس کرو بھئی۔ تمہارا اپنا دوست ہے یہ۔"

اس کے جملے نے چابک کا سا کام کیا اور وہ دونوں اسے چھوڑ کر پھرتی سے پیچھے ہٹے۔ آنے والا جو کہ معاذ تھا، سیدھا کھڑا ہو کر انھیں دیکھنے لگا۔

"اوئے یار تو؟ ہم سمجھے، جانے کون چور اچکا اندر گھس آیا ہے۔" عالم شاہ سرشار سا گلے لگنے کے لیے اس کی طرف لپکا۔

"چل اوئے چل۔ میری کسی بھیک منگے سے کوئی دوستی نہیں ہے۔" اس نے عالم کے جملے پر چوٹ کی لیکن پھر بھرپور جوش سے اسے گلے لگا لیا۔

"یہ بھیک منگا اچھا نہیں لگ رہا تو میں ابھی بابو بن کر آ جاتا ہوں۔ ایک سے ایک بڑھیا ورائٹی موجود ہے یہاں وارڈروب میں۔ اپنا سرمد تو ہر دوسرے سوٹ پر فدا ہو رہا تھا۔ تم چاہو تو اپنے لیے بھی دو چار جوڑے پسند کر لو۔" وہاں حلوائی کی دکان پر نانا جی کی فاتحہ کے مصداق فراخدلی سے دوست کو دوسرے کی وارڈروب سے استفادہ کرنے کی پیشکش کی جا رہی تھی۔

"مجھ جیسا بھگوڑا اتنے جوڑے سمیٹ کر کیا کرے گا یار۔ دشمنوں کے ساتھ آنکھ مچولی میں کچھ باقی ہی نہیں رہتا۔ بہتر ہے جس بیچارے کا مال ہے، اسی کے پاس موجود رہے۔" اس حقیقت کو بیان کرتے ہوئے بے ساختہ ہی اسے کیرتھر کے باسی فیتو کے تحائف یاد آئے۔ بچھڑتے سمے فیتو نے اسے بہت انوکھے اور نادر تحائف دیے تھے جن میں سے ایک سفوف اس نے آشیانۂ آزادی سے فرار کے لیے استعمال بھی کیا تھا۔ اس سفوف کی خصوصیت یہ تھی کہ کھانے والا بظاہر مُردہ دکھائی دینے لگتا تھا۔ آشیانۂ آزادی میں ڈاکوؤں نے اسی وجہ سے اس سے دھوکا کھایا تھا اور وہ گل و معظم شاہ کی آزادی کا وسیلہ بن گیا تھا۔ اس سفوف کی طرح کے دیگر جادو اثر تحائف مسلسل بھاگ دوڑ میں اس سے گم ہو گئے تھے اور اسے ابھی تک ان کا رنج تھا۔

"تم دیوار پھاند کر یہاں کس سلسلے میں آئے تھے؟"

سونیا کے سوال نے اسے ماضی کی یاد سے باہر نکالا۔

"اوہو یار...... میں تو تم لوگوں کو دیکھ کر اپنی یہاں آمد کا مقصد ہی بھول گیا۔ اصل میں اعظم کے لیے کپڑوں اور ڈائپرز وغیرہ کی ضرورت ہے اور پتا چلا ہے کہ اس گھر میں کوئی چھوٹا بچہ پایا جاتا ہے اس لیے میں نے ٹریس پاس کیا ہے۔" اس نے بولتے ہوئے ادھر اُدھر متلاشی انداز میں نظریں دوڑائیں۔

"وہ سب سے کونے والا کمرا بے بی کا ہے۔ تمہیں وہاں سے اپنے مطلب کی چیزیں مل جائیں گی۔" سونیا چونکہ گھوم پھر کر پورے بنگلے کا سرسری جائزہ لے چکی تھی اس لیے بچے کا کمرا اس کے علم میں تھا۔

"ٹھیک ہے۔ میں دیکھتا ہوں۔"

"میں تمہاری ہیلپ کرتی ہوں۔" سونیا اس کی ہم قدم ہوئی۔

"تم لوگ شاید ہمیں تلاش کرتے ہوئے یہاں تک پہنچے ہو۔" جس طرح اس کا اس بنگلے میں استقبال ہوا تھا اس سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ وہ لوگ پڑوس میں ان کی موجودگی سے واقف تھے۔

"ظاہر ہے تمہیں حالات کے رحم و کرم پر تو نہیں چھوڑ سکتی تھی میں اس لیے مجھے تمہارے پیچھے آنا پڑا۔ عالم کو بھی

بہن اور بھانجے کی فکر تھی تو بس ہم سب کسی نہ کسی طرح یہاں تک پہنچ گئے۔ تفصیلات میں تمہیں فرصت ملنے پر سناؤں گی۔" وہ ایک الماری میں سر دیے سامان کا جائزہ لینے میں مصروف تھی اس لیے معاذ اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکتا تھا اور اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ سونیا کا لہجہ ہی اس کے جذبات کا عکاس تھا۔

"یہ لو۔ یہ کپڑے اعظم کے لیے ٹھیک رہیں گے اور ڈائپرز کا پیک بھی ہے۔" سونیا نے الماری میں سے مطلوبہ اشیا نکال کر اس کی طرف بڑھائیں پھر بولی۔

"ذرا رکو۔ میں دیکھ کر کوئی بیگ نکالتی ہوں تاکہ گل کو بچے کی چیزیں رکھنے میں آسانی رہے۔" اب وہ گھٹنوں کے بل بیٹھی الماری کی نچلی درازوں کا جائزہ لے رہی تھی۔ جلد ہی اس نے وہاں سے خوش نما رنگوں والا ایک ایسا بیگ نکال لیا جس پر رنگ برنگے ستارے بنے ہوئے تھے۔

"لگتا ہے اس بچے کے والدین کو ستارے بہت پسند ہیں۔ بچے کے استعمال کی اشیا سے لے کر کمرے کی ڈیکوریشن تک، ہر شے میں ستارے ہی ستارے نمایاں ہیں۔" اس کے ہاتھ سے بیگ لے کر اس میں سامان رکھتے ہوئے معاذ نے تبصرہ کیا تو وہ جو پہلے بس باہر سے ہی کمرے کا سرسری جائزہ لے کر چلی گئی تھی، ہر طرف نظریں گھمانے لگی۔ معاذ کی بات بالکل ٹھیک تھی۔ بستر کی چادر، پردوں اور دیوار پر لگے فریمز سمیت ہر جگہ ستارے نمایاں تھے۔ ان ستاروں کو دیکھتے ہوئے اس کا ذہن اپنے بچپن میں چلا گیا اور اسے یوں لگا کہ یہ اسی کا کمرا ہو۔

"کہاں گم ہو گئی ہو؟" معاذ نے اس کا غائب دماغ ہونا محسوس کیا تو اسے پکارا۔

"کہیں نہیں۔ بس تمہاری بات پر ہی غور کر رہی تھی۔ واقعی اس بچے کے والدین ستاروں کے خبط میں مبتلا دکھائی دیتے ہیں۔ پسند الگ چیز ہے لیکن دنیا کی ہر شے چھوڑ کر بچے کے لیے بس ایک مخصوص شے کا انتخاب کر لینا زیادتی ہے۔ سیکھنے کی عمر میں تو بچوں کو مختلف النوع اشیا سے متعارف کروانا چاہیے۔" بولتے ہوئے اس کے چہرے پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔

"ہم کیا کہہ سکتے ہیں۔ یہ تو ماں باپ کی اپنی مرضی ہے۔" اس نے بے نیازی کے اظہار کے لیے شانے اچکائے پھر بولا۔

"میں ذرا یہ سامان گل کو پہنچا دوں پھر ایک جگہ بیٹھ کر تفصیل سے گفتگو کرتے ہیں۔ آسنہ کا لائحہ عمل بھی تو طے کرنا ہے۔"

"ہاں ٹھیک ہے، تم جاؤ۔" سونیا نے کھوئے کھوئے سے لہجے میں جواب دیا اور کسی معمول کی طرح ستارے کی شکل کے اس فوٹو فریم کی طرف بڑھی جس میں ایک جوڑے کی تصویر جڑی ہوئی تھی۔

"یہ شاید بچے کے دادا دادی ہیں۔ دونوں میاں بیوی کی عمروں میں خاصا فرق محسوس ہو رہا ہے۔" معاذ نے اس کی توجہ کا مرکز بھانپ کر تصویر پر تبصرہ کیا۔ تصویر میں نظر آنے والا مرد بلاشبہ ساٹھ سال سے اوپر کا تھا جبکہ عورت پینتالیس چھیالیس سے زیادہ کی نہیں محسوس ہو رہی تھی۔

"اس بنگلے کے ماسٹر بیڈ روم میں بھی اسی جوڑے کی تصویر لگی ہوئی ہے۔ میں نے ان دونوں کے علاوہ یہاں کسی اور کی تصویر نہیں دیکھی۔" تصویر کو یک ٹک دیکھتے ہوئے اس نے معاذ کی بات کا جواب دیا۔

"مطلب یہ دونوں اس بچے کے پیرنٹس ہیں؟" معاذ کے لہجے میں بے یقینی تھی۔ سونیا نے اس کے سوال کا جواب نہیں دیا اور بات بدلتے ہوئے بولی۔

"تم جلدی جاؤ۔ تمہارے اتنی دیر یہاں رکنے سے باقی لوگوں کو تشویش ہو رہی ہوگی۔"

"اس کا مسئلہ نہیں۔ وہ لمبے کانوں والا ہاتھی ہے نا ہمارے ساتھ۔ سب سن گن لے کر نہ صرف خود مطمئن بیٹھا ہوگا بلکہ گل کو بھی تسلی دے دی ہوگی۔"

"چارو کی بات کر رہے ہو؟ اسے تو میں بھول ہی گئی تھی۔" وہ مسکرائی لیکن اس مسکراہٹ میں پھیکا پن تھا۔

"بہت اچھا اور مخلص آدمی ہے۔ ان حالات میں بالکل اس طرح ساتھ دے رہا ہے جیسے کوئی پرانا دوست ہو۔"

"گل تمہاری راہ دیکھ رہی ہوگی۔ تم اسے بچے کا سامان پہنچا دو تاکہ وہ اسے نہلا دھلا کر چینج کروا دے۔" ایسا لگا کہ اس نے چارو سے متعلق معاذ کا تبصرہ سنا ہی نہ ہو۔ معاذ کو اس کا یہ انداز عجیب لگا لیکن پھر دھیان گل کی پریشانی کی طرف چلا گیا۔ صاف ستھرا رہنے کا عادی اعظم مسلسل ایک ہی لباس میں رہنے کی وجہ سے چڑچڑا ہو رہا تھا اور گل کی طبیعت بھی کچھ ٹھیک نہیں تھی۔

"او کے۔ میں یہ سامان دے کر تھوڑی دیر میں واپس آتا ہوں۔ بلکہ ایسا کرو کہ تم لوگ بھی اس طرف ہی آ جاؤ۔ وہاں ہمارے پاس ایک اچھا خاصا سامان موجود ہے۔ تم لوگوں کو اس کے ہاتھ سے مزیدار سا کھانا بنوا کر کھلاؤں گا۔" وہ اسے پیشکش کرکے باہر نکل گیا۔ اس کے جاتے ہی

سونیا نے دیوانہ وار پورے گھر کا باریک بینی سے جائزہ لینا شروع کردیا۔ اسے اعتراف تھا کہ پہلے اس نے اس گھر کا صرف سرسری جائزہ لیا تھا اس لیے کیمروں کو نہیں دیکھ سکی تھی جو بے شک بہت مہارت سے خفیہ طور پر ایسے مقامات پر لگائے گئے تھے جہاں کسی کا دھیان نہیں جاسکتا تھا لیکن اس جیسی تربیت یافتہ بندی کے لیے ان کیمروں کو دریافت کرنا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ بس ہوا یہ تھا کہ وہ ذرا سی بے پروا ہوگئی تھی۔

''یہ میری غلطی ہے۔ یہ سب میری غلطی ہے۔ مجھے تو یہاں نصب سیکیورٹی سسٹم کی موجودگی پر ہی ہوشیار ہوجانا چاہیے تھا۔'' وہ دیکھ چکی تھی کہ وہاں نصب سارے کیمرے وائی فائی سے کنیکٹ ہیں اور ایسے میں یہ ممکن نہیں تھا کہ اس سمیت کسی کی بھی یہاں موجودگی اب تک مالکان سے پوشیدہ رہی ہو۔ اپنے تئیں وہ ایک غیر متعلقہ انجان گھر میں داخل ہوئی تھی اس لیے کسی خطرے کو دھیان میں ہی نہیں رکھا تھا اور سیکیورٹی سسٹم کو بھی یہ سوچ کر نظر انداز کر دیا تھا کہ اب عام امراء بھی سیکیورٹی کے لیے افرادی قوت کے بجائے ٹیکنالوجی پر انحصار کرنے لگے ہیں۔ اس کی یہ غلطی اب انہیں بری طرح ڈبونے والی تھی۔

''ہمیں فوری طور پر یہاں سے نکلنے کی کوشش کرنا چاہیے۔ ہوسکتا ہے ابھی ہمیں موقع مل جائے۔'' وہ بہت زیادہ پُرامید نہیں تھی لیکن پھر بھی کوشش کر کے دیکھ لینا چاہتی تھی۔

''عالم، سرمد......! کیا کررہے ہو تم لوگ؟ آؤ، جلدی سے میرے ساتھ چلو۔'' وہ آوازیں دیتی ہوئی اس کمرے میں پہنچی جہاں ان دونوں نے ٹھکانا کیا ہوا تھا۔ وہ دونوں اس کے پکارنے کے باوجود اس کی طرف متوجہ نہ ہوئے اور کپڑوں کی اس کھلی وارڈروب کی طرف رخ کیے کھڑے رہے جس کے تمام کپڑے نکال کر بستر پر ڈھیر کردیے گئے تھے۔

''یہ کیا کررہے ہو تم لوگ؟'' وہ دیکھ سکتی تھی کہ وہ دونوں ہی نہا کر لباس تبدیل کرچکے ہیں لیکن اس کو ان کا یوں انہماک سے وارڈروب میں سر گھسا کر کھڑے ہونا سمجھ نہیں آرہا تھا اس لیے حیرت اور جھنجلاہٹ کی ملی جلی کیفیت میں بہ آوازِ بلند انہیں مخاطب کیا۔

''ذرا قریب آکر یہ دیکھیں۔'' سرمد نے پلٹ کر اسے مخاطب کیا تو اس کے لہجے میں ہیجان سا تھا۔ وہ عجلت میں مبتلا ہونے کے باوجود کسی نئے انکشاف کی بو سونگھتی خودکار انداز میں ان لوگوں کے ساتھ جا کھڑی ہوئی۔ نظر آنے والا منظر اس کے بدترین خدشات کو تقویت دینے کے لیے ایک بڑا ثبوت فراہم کررہا تھا۔ وارڈروب کا عقبی پینل کھسکا ہوا تھا اور مختلف خانوں میں منقسم ایک بڑی سی تجوری دکھائی دے رہی تھی۔ تجوری کا سب سے بڑا خانہ جدید قسم کے اسلحے اور بارودی مواد سے بھرا ہوا تھا جبکہ نسبتاً چھوٹے دونوں خانوں میں سے ایک میں ملکی اور غیر ملکی کرنسی اور دوسرے میں سونے کے سکوں کے ڈھیر کے علاوہ زیورات کے چھوٹے بڑے ڈبے دکھائی دے رہے تھے۔

''یہ سرمد نے دریافت کیا ہے۔ اوہ خدایا...... مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ ہم انجانے میں کسی انڈرورلڈ ڈان کے گھر میں گھس گئے ہیں۔'' عالم شاہ نے زخجتنی دنیا دیکھی تھی، وہ اسلحہ اور مال و دولت کا یہ خفیہ ذخیرہ دیکھ کر بھی اندازہ لگا سکتا تھا لیکن سونیا جانتی تھی کہ یہ کسی انڈر ورلڈ ڈان کا انداز نہیں ہے۔ عالم شاہ کے تبصرے پر اپنی کوئی بھی رائے دیے بغیر اس نے زیورات کے ڈبوں کے درمیان رکھی ایک جانی پہچانی سی مخملیں ڈبیا نکالی اور مخصوص جگہ نصب چھوٹا سا بٹن دبا کر ڈبیا کا ڈھکن کھولا۔ ڈبیا میں سلور دائرے کے اندر نصب چھ کونوں والا سنہری ستارہ جگمگا رہا تھا۔ ستارے کے ہر کونے پر ایک ننھا سا ہیرا نصب تھا اور یہ چھ کے چھ ہیرے ایسے جھلملا رہے تھے کہ آنکھیں خیرہ ہوئی جاتی تھیں۔

''سو بیوٹی فل۔'' عالم شاہ نے بھی اس کے شانوں کے اوپر سے سلور ہالے میں نصب اس سنہری ستارے کا نظارہ کیا اور بے ساختہ ہی بول پڑا۔

''جتنا اسلحہ، ایمونیشن اور گرینیڈز لے سکتے ہو، ساتھ لے لو۔ میں جا کر معاذ اور دوسرے ساتھیوں کو تیاری کرنے کا کہتی ہوں۔ ہمیں دو منٹ کے اندر اندر ہر حال میں یہ جگہ چھوڑنی ہے۔'' اس نے بے حد سخت تاثرات کے ساتھ تحکمانہ لہجے میں ہدایات دیں اور عالم و سرمد کی حیرت سے بے نیاز ایک گن اور اس کی گولیوں کی بیلٹ کھینچ کر نکالی اور تیزی سے باہر نکل گئی۔ مخملی ڈبیا بھی ہنوز اس کے قبضے میں ہی تھی۔ ان اشیا سمیت پڑوس کے بنگلے میں کودتے ہوئے اس نے اس بات کا بالکل خیال نہیں رکھا تھا کہ کوئی اس کی یہ حرکت دیکھ رہا ہے یا نہیں۔ جو خطرہ سر پر منڈلا رہا تھا، وہ کسی عام فرد کے دیکھ لینے کے مقابلے میں بہت بڑا اور ہولناک تھا۔

سب تین مہینے پہلے شروع ہوا تھا جس دن میں نے اپنا ناول لکھنا شروع کیا تھا۔ مجھے وہ دن اب بھی بہت واضح طور پر یاد ہے جب میں نے کنٹری ہاؤس کا اشتہار دیکھا تھا۔ یہ میرے ان باکس میں رنگین تصاویر اور بے شمار تعریفوں کے ساتھ آیا تھا۔ اب سوچتا ہوں تو خیال آتا ہے کہ یہ میرے ہی ان باکس میں کیوں آیا۔ یہاں تک کہ کسی نے اس پر ایک چھوٹی سی نظم بھی لکھی تھی۔ میں نے کچھ دیر یہ میل پڑھی پھر اپنے ناول کی پہلی سطر پر توجہ مرکوز کی، لیکن اسی وقت دروازے کی گھنٹی بجی۔

میں نے دروازہ کھولا تو پھٹی ہوئی آستینوں والی پیلے رنگ کی شرٹ پہنے ہوئے ایک موٹے سے آدمی نے مجھے بتایا کہ میرا لان ان کے ترقیاتی کام کے آڑے آرہا ہے جسے تہس نہس کرنے کی وہ پوری تیاری کر رہے ہیں۔ اچانک میری سماعتوں پر ایک چنگھاڑتی آواز حملہ آور ہوئی۔ میں نے اس آدمی کے پیچھے دیکھا تو پتا چلا کہ ایک پوری کنسٹرکشن کمپنی میرے ڈرائیو وے پر اتر آئی ہے۔

میں اپنے دفتر میں واپس بیٹھ گیا اور اپنی پہلی لائن کو گھورتا رہا۔ جیسے ہی میں نے اگلا پیراگراف شروع کیا، اس بار میرے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ یہ میری گرل فرینڈ تھی۔

''گیبریل! ہمیں بات کرنے کی ضرورت ہے۔''

انفرادی مقام پانے والے ایک قلمکار کی عجیب منطق اور انجام کا قصہ

وہ ایک مشہور لکھاری تھا... لوگوں کے لیے نئے نئے موضوعات پر لکھنا اس کا جنون تھا اور پھر یہی جنون ایسے مقام پر اسے لے گیا جہاں سارے جنون مٹی کا ڈھیر بن گئے... کیونکہ دنیا سے کٹ کر دنیا کے لیے لکھنا کوئی آسان کام نہیں ہوتا۔

کنٹری ہاؤس

عائشہ نصیر
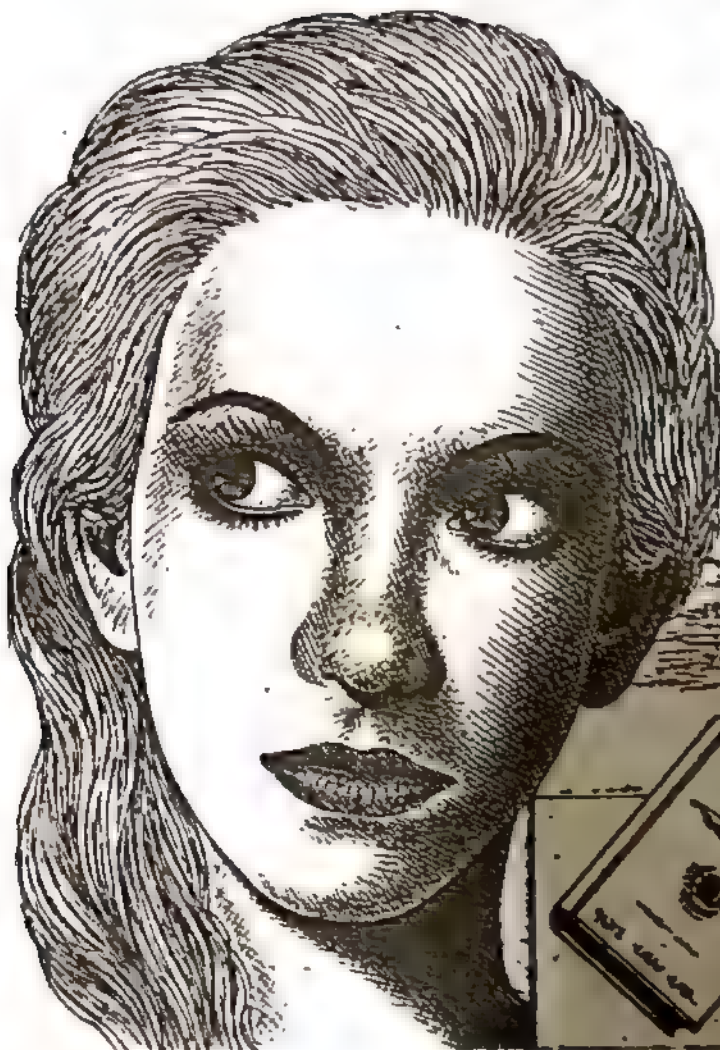
اس نے کہا۔
"میں اس وقت بات کرنے کے موڈ میں بالکل نہیں ہوں۔" میں نے کہا۔
"مجھے نہیں لگتا کہ میں مزید ایسے رہ سکتی ہوں۔۔۔"
"تو تم فون پر مجھ سے رشتہ توڑ رہی ہو؟"
"میں نے سوچا تھا کہ تم جیسے رائٹر کے ساتھ رہنا ایک اچھا تجربہ ہوگا لیکن کیا تم نے کبھی میرے لیے بھی کچھ لکھا ہے؟" وہ پوچھ رہی تھی۔
"میں نے اپنی آخری کتاب تمہیں ڈیڈیکیٹ کی تھی۔" میں دھیرے سے بولا۔
"تم نے اسے اپنی ملکہ کے لیے وقف کیا اور یہ کوئی بھی ہو سکتی ہے!" اس کی آواز میں غصہ تھا۔
"ڈیل ہیتا! میں سمجھ گیا ہوں کہ تم کیا کہنا چاہتی ہو۔ تم واقعی سچ کہہ رہی ہو، ہم ایسے مزید نہیں رہ سکتے۔ تو کیوں نہ ہم اسی وقت ایک دوسرے کو الوداع کہہ دیں۔ بیسٹ آف لک۔۔۔ اچھی زندگی گزارنا، میں تمہیں تمہارا سامان بھجوا دوں گا۔"
دل کی بھڑاس نکال کر میں نے فون بند کر دیا۔ لوگ واقعی پریشانی بنتے جا رہے تھے۔
میں نے محسوس کیا کہ مجھے یہ نیا ناول لکھنے میں جو مسائل درپیش تھے، اس کے ذمے دار وہ لوگ تھے۔ میرا ایجنٹ، میرا پبلشر، میری ماں، میری گرل فرینڈ۔۔۔ سابقہ گرل فرینڈ۔ فہرست لامتناہی تھی۔
اسی وقت ایک زوردار دھماکے نے پورے گھر کو ہلا کر رکھ دیا۔ میں نے لڑکھڑا کر کھڑکی کی طرف دیکھا۔ تعمیراتی عملے نے میرے ڈرائیو وے کے ایک اور حصے کو تباہ کر دیا تھا اور ایک ٹی ایل بی میرے خوبصورت لان کو کھودتی اس کا ستیاناس کر رہی تھی۔
"میں یہاں اور نہیں رہ سکتا۔۔۔" میں نے ہسٹریائی انداز میں سوچا۔ تب ہی میرے ذہن میں کنٹری ہاؤس کا اشتہار آیا۔ میں نے ای میل کھولی اور نظم پر ایک نظر ڈالی۔ یہ عجیب تھی۔ میں نشے میں بھی اس سے بہتر لکھ لیتا۔ میں نے ویب سائٹ کے لنک کو فالو کیا تو مارکیٹنگ کی تفصیل نظم سے بہتر تھی۔ "سیکس کاؤنٹی کے قدیم جنگل میں واقع، کنٹری ہاؤس ہر اس شخص کے لیے ایک بہترین پناہ گاہ ہے جو دنیا کے ہنگاموں سے دور جنگل میں رہنا چاہتا ہے اور پیار کرنا چاہتا ہے۔"
"یہ پیار کے بجائے زندگی ہونا چاہیے۔" میں نے کمپیوٹر سے کہا۔ مجھے جنگل میں جانے اور زندگی گزارنے میں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ میں نے فوری طور پر ویب سائٹ پر دیا گیا نمبر ڈائل کیا اور پوچھا کہ کیا میں کنٹری ہاؤس کرائے پر لے سکتا ہوں۔
"کیا آپ سنجیدہ ہیں؟" لڑکی نے پوچھا۔
"ہاں میں سنجیدہ ہوں۔" میں نے کہا۔ "مجھے چند ماہ کے لیے اس کی ضرورت ہے۔"
"ٹھیک ہے۔" اس نے کہا۔ میں نے اسے ٹائپ کرتے سنا۔ "کیا آپ کو یقین ہے، سر؟"
"میں سنجیدہ کیوں نہیں ہوں گا؟" میں نے حیران ہو کے پوچھا۔
"میں نے سوچا کہ آپ نے ویب سائٹ پر موجود نظم کی ٹائپنگ میں غلطی کی نشاندہی کے لیے فون کیا ہے۔"
"ہاں۔۔۔ یہ 'محبت' کے بجائے 'زندگی' ہونا چاہیے۔"
"ہم جانتے ہیں۔ ہم اسے تبدیل کرتے ہیں اور پھر اچانک، دوبارہ لفظوں میں گڑبڑ ہو جاتی ہے۔ ہمیں لگتا ہے کہ کوئی سائٹ ہیک کرتا ہے۔" اس نے ٹائپ کرنا بند کر دیا اور میرا نام اور بینک کی معلومات پوچھی۔ "کیا آپ کو یقین ہے سر؟" اس نے دوبارہ پوچھا جب ساری تفصیلات جان لیں۔
"کیوں نہیں؟" میں نے پوچھا۔ "کیا جگہ کے ساتھ کچھ گڑبڑ ہے؟"
"وہ لڑکا جس نے یہ نظم لکھی تھی وہ اسے پسند کرتا تھا۔ ہم نے اسے لکھنے کے لیے ادائیگی کی تھی۔" اس نے کہا اور آہ بھری۔ "کنٹری ہاؤس کی چابی ہمارے دفتر میں ہوگی۔ باقی کی تفصیلات آپ ای میل میں دیکھ لیں۔"
یہ مرحلہ سر ہوا تو مجھے لگا جیسے میرے کندھوں سے کوئی بوجھ اتر گیا ہو۔ میں جنگل میں رہنے جا رہا تھا جہاں کوئی مجھے ڈسٹرب کرنے والا نہ تھا۔۔۔ میں ناول ختم کرنے جا رہا تھا۔

☆☆☆

رینٹل آفس ایک پیارے سے چھوٹے سے قصبے میں واقع تھا۔ میں اس پوری جگہ کے جارجیائی فنِ تعمیر سے متاثر ہوا۔ میز کے پیچھے وہی عورت تھی جس سے میں بات کر رہا تھا۔ میں نے اس کی آواز کو پہچان لیا۔
"تم واقعی آ گئے!" اس کی بھوری آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔
"یقیناً۔۔۔" میں نے کہا۔ "آپ کے پاس میرا کریڈٹ کارڈ نمبر ہے۔"
"مجھے نہیں لگتا تھا کہ آپ واقعی آ جائیں گے۔" اس نے کہا۔
میں نے ارد گرد دیکھا۔ لوگ ساتھ والے کمروں سے باہر جھانکنے لگے۔ جب وہ کاغذی کارروائی کر رہی تھی تو میں نے دیکھا کہ اس کے ہاتھ کانپ رہے ہیں۔
"کیا کچھ گڑبڑ ہے؟" میں نے پوچھا۔
وہ جواب دینے کے بجائے میرے عقب میں دیکھ رہی تھی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ گہرے سوٹ میں ملبوس ایک بوڑھا، پتلا آدمی وہاں کھڑا اپنی ٹائی ٹھیک کر رہا تھا۔
اس نے اپنا پتلا ہاتھ بڑھایا اور میں نے اسے احتیاط سے تھام لیا۔ اس کی جلد خشک اور تھوڑی کھردری تھی۔
"کیوں نہ ہم میرے آفس میں بیٹھ کر بات کریں۔" اس نے کہا۔
"آپ کنٹری ہاؤس کیوں لینا چاہتے ہیں؟" جب میں اس کی بڑی سی میز کے مقابل رکھی کرسی پر بیٹھا تو اس نے مجھ سے سوال کیا۔
"میں صرف امن اور خاموشی چاہتا ہوں۔ میں ایسی دیواریں چاہتا ہوں جو دنیا کو مجھ سے دور رکھیں۔"
اس نے اپنی عینک درست کی۔ "اوہ، یہ جگہ اس کے لیے پرفیکٹ ہے۔ مگر سیل فونز کے لیے ایک ڈیڈ زون ہے۔ لینڈ لائن اور انٹرنیٹ ہے لیکن آپ کسی وجہ سے راؤٹر استعمال نہیں کر سکتے، سگنل مستحکم نہیں رہے گا۔"
"ٹھیک ہے۔" میں نے کہا۔ "مجھے لگتا ہے مجھے یاد ہے کہ اپنے کمپیوٹر کو کیسے پلگ ان کرنا ہے۔"
"کیا آپ نے کنٹری ہاؤس کی تاریخ دیکھی ہے؟"
"نہیں۔" میں نے کہا۔ "آپ کی سائٹ نے کہا کہ یہ الگ تھلگ ہے، لہٰذا میں یہی چاہتا ہوں۔"
"کیا آپ بھوتوں پر یقین رکھتے ہیں؟" وہ دراصل یہ پوچھتے ہوئے شرمندہ نظر آیا۔
"بھوت؟" میں ہنسا۔ "میں ادبی افسانے لکھتا ہوں۔ میرے پاس بھوتوں کے لیے وقت نہیں ہے۔"
اس نے سر ہلایا۔ "اس کا ایک ماضی ہے، اس کا پچھلا مالک یونیورسٹی میں پروفیسر تھا۔" اس نے کہا۔ "وہ پاگل ہو گیا تھا اور فی الحال ایک سینی ٹوریم میں ہے۔ اس سے پہلے والا مالک مکمل طور پر غائب ہو گیا۔ پچھلے مالک کے خاندان نے گھر بیچ دیا اور موجودہ مالک کو اسے کرائے پر دینے کا خیال آیا۔ آپ سے پہلے اسے کسی نے کرائے پر نہیں لیا۔۔۔ آپ یہاں کے پہلے کرایہ دار ہیں۔"
"ہاں۔ یقیناً۔۔۔" میں نے کہا۔ "اگر یہاں بھوت بھی ہیں تو میں ان کے ساتھ خوشی خوشی وقت گزارنا پسند کروں گا۔ کم از کم وہ میرے ارد گرد رہنے والے لوگوں سے تو کم ہی پریشان کریں گے۔" یہ کہہ کر میں نے چابی کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔
"میں آپ سے گزارش کرتا ہوں کہ آپ اپنا ارادہ بدل لیں۔" چابیاں دیتے ہوئے اس نے مجھ سے آخری بات یہی کی مگر میں پاگل تو نہیں تھا کہ ارادہ بدلنے کے لیے اتنی دور تک کا سفر کرتا۔
بیس منٹ بعد ہی میں اپنی گاڑی کنٹری ہاؤس کے باہر پارک کر رہا تھا۔ یہ شہر کے باہر ایک پہاڑی پر واقع تھا۔ سامنے پوری وادی پھیلی ہوئی تھی۔ گھر ایک سفید چبوترے کے پیچھے تھا جو گلابوں سے بھری ہوئی تھی۔ یہ میری توقع سے بڑھ کر تھا۔ ایک طرف پرانی اینٹوں اور پتھروں کی محرابیں نظر آ رہی تھیں جس پر اب گھر کے مرکزی ڈھانچے کا قبضہ تھا۔ ٹرکدار اور ڈھلوان چھت کے نیچے ایک بڑا دروازہ اور دو قطاروں میں کئی کھڑکیاں تھیں۔
اسے کسی چیز کے کھنڈرات سے بنایا گیا ہوگا۔ جب میں اس جگہ کا جائزہ لے رہا تھا تو میں نے پرانی بنیادوں کی اینٹوں کی چوکوں کو دیکھا، جن میں سے ایک، گھر کے اینٹوں کے حصے سے نکلا ہوا تھا۔ پہاڑی سے تھوڑا نیچے، مجھے ایک پرانا قبرستان اور کسی چیز کے کھنڈرات ملے جو شاید ایک چھوٹا سا چیپل ہو۔ چلتے چلتے میں نے پھولوں کی ہلکی اور خوشگوار مہک محسوس کی۔ گھر تک آتے آتے یہ خوشبو اور تیز ہو گئی تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے اس خوشبو سے میرے ذہن کے بند دروازے کھل رہے ہوں کیونکہ جب میں لکھنے بیٹھا تو حیران تھا۔ الفاظ اتنی جلدی میری انگلیوں تک کبھی نہیں پہنچے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے میرے ہاتھ کی بورڈ پہ اڑ رہے ہوں۔
میں نے رات ہونے تک لکھا پھر میں نے اپنے بیگ کو سونے کے کمرے میں منتقل کیا۔ بستر بنا ہوا تھا اور مجھے بتایا گیا تھا کہ ایک نگراں ہفتے میں ایک بار آتا ہے تاکہ یہ یقینی بنائے کہ سب کچھ ٹھیک ہے۔ پورا بیڈروم سوئیٹ اچھی لکڑی کا تھا اور ہیڈ بورڈ پر لو، لف اور ٹائم کے الفاظ کندہ تھے۔ سر تکیے پر رکھتے ہی میں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گیا۔
صبح کے تقریباً تین بجے کا وقت تھا جب میری آنکھ اچانک کھلی۔ میں دیواروں میں کھرچنے کی آواز سے بیدار ہوا تھا۔ میں اٹھ کر بستر پر بیٹھ گیا اور پھولوں کے پرنٹ والے پیپر کے پیچھے کہیں مسلسل کھرچنے کی آوازیں سنتا رہا۔ میں نے لائٹ آن کی اور ایک دو پُرسکون سانسیں لیں۔ یہ شاید کوئی جانور تھا، شاید ایک گلہری۔ جب آپ آبادی سے دور

ایک جنگل میں رہنے آئے ہیں تو آپ کو اس قسم کی چیزوں کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ میں اٹھ کر واش روم چلا گیا۔ واپس آنے کے بعد میں نے مزید کھرچنے کی آواز نہیں سنی۔ میں جلد ہی دوبارہ..... سو گیا تھا۔

صبح میں ناشتا کرنے کے لیے نیچے اترا تو مجھے کچھ عجیب سا محسوس ہوا۔ سامنے کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور گھر کے اندر چاروں طرف سوکھے پتے بکھرے ہوئے تھے۔ اسی وقت ایک تیز ہوا کا جھونکا سوکھے پتوں کو ادھر اُدھر اڑا لے گیا اور اس سے جو سنسناتی ہوئی آواز پیدا ہوئی اس نے حقیقتاً میری ریڑھ کی ہڈی میں سرد لہر دوڑا دی۔

مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ رات کو سونے سے پہلے میں نے دروازہ لاک کیا تھا۔ میں نے ناب کو چیک کیا تو معلوم ہوا کہ یہ ابھی تک بند تھا۔ میں نے ناب کو گھمائے بغیر اسے کھولنے کی کوشش کی تو یہ نہیں کھلا۔ پھر بھی، ایک ناقابلِ اعتماد دروازہ بہت زیادہ پریشانی کا باعث نہیں تھا۔ میں نے سوچا میں اس بارے میں نگران کو بتاؤں گا۔

میں نے اپنے کمپیوٹر کو آن کیا تو ایک نئی حیرت میری منتظر تھی۔ رات کو کسی نے میری کتاب میں ایک نئی سطر لکھی تھی۔ میں نے اسے مٹایا اور خالی گھر کے اندر گرد دیکھا۔

"ہیلو؟" میں نے پوچھا۔ میری آواز خالی کمروں میں گونجی۔

میں خوف سے کانپ گیا اور کافی کا مگ ہتھیار کی طرح تھامے گھر میں گھومنے لگا۔ ہر کمرا خالی تھا۔ درحقیقت، ان میں سے کچھ ایسے لگ رہے تھے جیسے سالوں سے اس کے اندر کسی نے قدم نہ رکھے ہوں۔

اب واحد جگہ جو دیکھنی رہ گئی تھی، وہ نہ جانے کتنا پرانا بارن ووڈ دروازے والا تہ خانہ تھا..... میں وہیں کھڑا رہا۔ کالی، لوہے کی کنڈی پر ہاتھ رکھا، لیکن میں نے دروازہ کھولنے کے لیے کنڈی نہیں اٹھائی۔ اس کے بجائے، میں نے یقینی بنایا کہ سیاہ، لوہے کا بولٹ محفوظ طریقے سے اپنی جگہ پر تھا۔ ایسا کوئی طریقہ نہیں تھا کہ کوئی اس بولٹ کو اندر سے دوبارہ لاک کر سکے اور ایسا لگتا تھا کہ کسی نے اسے بہت طویل عرصے سے کھولا ہی نہیں تھا۔

جب میں پورچ میں اپنے کمپیوٹر پر بیٹھ گیا تو میں نے ان الفاظ کے بارے میں سوچا جو میں نے دریافت کیے تھے۔ کیا میں نے انہیں لکھا تھا؟ مجھے نیند میں چلنے کی بیماری نہیں تھی لیکن میں اس امکان کو رد بھی نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے چھت کے پنکھے آن کیے اور فطرت کی باتیں سنتے ہوئے اپنی کافی ختم کی۔ برآمدے سے وادی کا نظارہ خوب صورت تھا۔ ندی اور گھروں کی چھتوں پر چھایا کہرا اتنا دلکش لگ رہا تھا کہ میں کافی دیر تک مسحور ہو کر دیکھتا رہا اور تب مجھے خیال آیا کہ میں وہ سطریں لکھ سکتا تھا، وہ اسی نظم کی تھیں جس کے کچھ الفاظ میرے بیڈ کے ہیڈ بورڈ پر بھی کندہ تھے اور سونے سے پہلے بھی میں اینڈریو مارویل کے کام پر غور کر رہا تھا، لہٰذا یہ قابلِ فہم تھا کہ میں نے نیند میں گھوم پھر کر ان کی نظم ٹو ہز کوئے مسٹریس سے دو لائنیں ٹائپ کر دی ہوں۔ ناشتا کے بعد، میں نے لکھنا شروع کیا۔ میری انگلیوں سے الفاظ ایسے گرتے رہے جیسے وہ میرے اندر کہیں قید ہوں اور انہیں آزاد ہونے کے لیے بس منظرنامے کی تبدیلی کی ضرورت ہو۔ دروازے پر ہونے والی دستک نے میرا ارتکاز توڑ دیا تھا۔ میں قدرے جھنجلا کر سوکھے پتوں کو قدموں تلے روندتے ہوئے دروازے کی سمت آیا۔

دروازہ کھولتے ہی میری نظر ان بوڑھے مرد اور عورت پر پڑی۔ بوڑھا جوڑا نگران نکلا۔ وہ کافی اچھے جوڑے کی طرح لگ رہے تھے۔ میں نے اپنی جھنجلاہٹ کو چھپانے کی کوشش کی جب وہ اپنی ڈیوٹی انجام دیتے ہوئے گھر کے اندر گھوم پھر رہے تھے۔

"پیچھے مت جاؤ۔"

میں اپنے کمپیوٹر کے سامنے بیٹھا ان کے جانے کا انتظار کر رہا تھا جب مجھے اپنی پشت پر اس بوڑھی عورت کی آواز سنائی دی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔

"بولٹ آدھا کھلا ہے۔" اس نے مزید کہا۔

"ہاں، میں نے کچھ آواز سنی تو چیک کرنے گیا تھا....." میں نے کندھے اچکائے۔ "میں تہ خانے کے اندر نہیں گیا۔"

"میری بیوی کو فکر ہے کہ تم اندر بند ہو جاؤ گے۔" ہارورڈ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "وہ دروازہ تین سو سال پرانا ہے۔ تم ہوشیار رہنا۔"

"میں دھیان رکھوں گا۔" میں نے کہا۔

ان کے جانے کے بعد میں نے دروازہ بند کر دیا لیکن تالا نہیں لگایا۔ ہارورڈ نے کہا تھا کہ وہ دروازہ ٹھیک کرنے کے لیے واپس آئے گا۔

اس کے بعد پورے ایک ہفتے تک کوئی خاص واقعہ رونما نہیں ہوا لیکن اس کے بعد چیزیں پھر عجیب ہو گئیں۔ جب ایک رات پھر اس منحوس کھرچنے کی وجہ سے میری نیند غائب ہوئی۔ کھرچنے کو کوستے ہوئے میں اٹھ گیا اور باتھ روم

اور اپنے بستر سے [illegible] جہاں سے آ رہی تھی۔ کوریڈور کی لائٹ آن کرتے ہوئے میں سیڑھیاں اتر کر نیچے ہال میں آ گیا۔ تہ خانے کا دروازہ ویسے ہی مضبوطی سے بند تھا اور اب کھرچنے کی آواز بھی آنا بند ہو گئی تھی۔

"پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں۔" میں نے پانی پیتے ہوئے اپنے آپ سے کہا۔

میں نے ایک ہفتے سے نگرانوں کے علاوہ کسی کو نہیں دیکھا تھا اور میں بہت اچھا محسوس کر رہا تھا۔ مجھے جلد ہی کرسمس کے لیے شہر واپس جانا پڑے گا، اس سوچ کے آتے ہی مجھے اپنے خوش گوار خیالات برباد ہوتے محسوس ہوئے۔

جیسے ہی میں سیڑھیوں کی طرف بڑھا، میں نے دوبارہ کھرچنے کی آواز سنی۔ میں نے کوٹھری کے دروازے سے کان لگایا، آواز تیز ہوتی گئی..... اور رفتار بھی!

میں نے ہال کی لائٹس آن کر دیں اور دونوں ہاتھ بولٹ پر رکھے۔ اس پرانی کنڈی کی آواز ایسی تھی جیسے کوئی چاک بورڈ پر کیلوں کو گھسیٹ رہا ہو۔ جب میں نے دروازے کے دونوں پٹوں کو دھکیل کر کھولا تو وہاں کوئی نہیں تھا اور آواز بھی بند ہو گئی تھی۔ کافی دیر تک تہ خانے کی بدبو اور سیلن زدہ ہوا کو پھیپھڑوں میں اتارنے کے بعد میں نے دروازہ بند کر کے تالا لگا دیا۔

"کچھ نہیں ہے..... یہ آواز میرے دماغ میں ہے اور بس۔" خود پر ہی غصہ ہوتے ہوئے میں نے ہال کی لائٹس بھی آف کر دیں اور تب ہی میں نے دیکھا کہ کوئی ہیولا سا باہر کی کھڑکی سے گزر رہا ہے۔

میں چیخا اور ہڑبڑاہٹ میں بند کھڑکی کے شیشوں پر ہی مکے برسانے لگا۔

'مجھے کوئی ہتھیار لے کر باہر نکلنا چاہیے۔' اس خیال کے آتے ہی میں کچن کی سمت بھاگا اور پھل کاٹنے والی چھری اٹھا کر محتاط قدموں سے باہر نکل آیا۔

سامنے والے دروازے کی لائٹس کی روشنی زیادہ دور تک نہیں پھیلی تھی، لیکن آسمان پر چاند روشن تھا۔ چوکنا نظروں سے چاروں جانب دیکھتے ہوئے جب میں گھر کے اطراف کا چکر لگا کر سامنے کے دروازے کی طرف واپس آیا تو گلاب کے ٹریلس کے ستون کے عین درمیان میں دروازے کے ساتھ ہی روشنیوں کی حد میں ایک ڈھیلا سا جبہ پہنے کوئی شخص موجود تھا۔

میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ اس رات جیسی وحشت میں نے زندگی میں کبھی محسوس نہیں کی تھی۔ میں نے اپنے کانپتے ہاتھ سے چھری گرا دی اور چیخنے لگا۔

میں بچنے سے قاصر تھا، لیکن میرے اندر کا سائرن چنگھاڑتے ہوئے مجھے اس ڈراؤنے جبے والی شخصیت سے دور بھاگنے کو کہہ رہا تھا۔ میں دروازہ بند کر سکتا تھا اور پولیس کو کال کر سکتا تھا۔

"مجھے افسوس ہے کہ میں نے آپ کو ڈرا دیا۔" [illegible] سے ایک نسوانی آواز ابھری تھی۔

میری چیخوں کو یکدم بریک لگ گیا جیسے کوئی چلتے ہوئے ٹیپ ریکارڈر کا بٹن آف کر دے۔

وہ میرے قریب آ رہی تھی اور تب مجھے اندازہ ہوا کہ اس کا وجود اتنا بھی ڈراؤنا نہیں جتنا اس جبے میں نظر آ رہا تھا بلکہ میرا اندرونی خوف مجھے دکھا رہا تھا۔

اس نے پاس آ کر ہڈ پیچھے پلٹ دیا۔ چمک دار سنہری بالوں پر چاندنی چمک رہی تھی اور سفید چہرے پر ہونٹوں کا ایک گلابی جوڑا مسکرا رہا تھا۔ وہ ایک عورت تھی۔ بے حد حسین!

"مجھے یقین نہیں تھا کہ واقعی کوئی یہاں رہ رہا ہے۔" اس نے کہا۔

"تو کیا تم رات کے تین بجے آ کر یہ چیک کر رہی ہو؟" میں نے کسی قدر تلخی سے پوچھا۔

اس نے کندھے اچکائے۔ "میرا بچپن اسی جنگل میں گزرا ہے۔ میں اکثر رات کو آوارہ گردی کرنے باہر نکل آتی ہوں۔ میں نے کل بھی یہاں روشنی دیکھی تھی..... تو اسی لیے سوچا کہ آ کر دیکھ لوں..... یہاں کافی عرصے کے بعد کوئی رہنے آیا ہے۔"

میں بھاگنے کے لیے تیار ہونے سے سیدھا ہوا اور ہر ممکن حد تک بے فکر نظر آنے کی کوشش کی۔

"میں بس جھانک رہی تھی۔" اس نے کہا۔ "مجھے امید نہیں تھی کہ آپ مجھے دیکھیں گے لیکن جب آپ مجھے ڈھونڈتے ہوئے باہر آئے تو میں نے سوچا کہ آپ سے بات کرنا ہی بہتر رہے گا۔"

"تم ہو کون؟" میں نے پوچھا۔

اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔ "جولیانا۔"

"گیبریل۔" میں نے اس کا نرم ہاتھ تھاما۔

"مجھے یہ نام پسند ہے۔" وہ مسکرائی۔

"شکریہ۔" میں نے بھی اس سارے وقت میں پہلی بار کچھ ریلیکس فیل کیا۔

اس نے ادھر ادھر دیکھا اور ہنس کر کہنے لگی۔ "ملنے کا ایک خوفناک طریقہ ہے، ہے نا..... شاید مجھے کل شام واپس آنا چاہیے؟ میں سارا دن مصروف ہوتی ہوں، لیکن میں رات

میں یہاں آسکتی ہوں اگر آپ میری کمپنی چاہیں تو۔۔۔"

"ضرور۔۔۔ بالکل۔۔۔" میں نے کہا۔ "مجھے خوشی ہوگی۔"

"شب بخیر۔۔۔" اس نے ہونٹ بالکل میرے کان کے قریب کرکے یہ سرگوشی کی تھی۔ میرے پورے جسم میں بجلی سی دوڑ گئی۔۔۔ مجھے اپنے رونگٹے کھڑے ہوتے محسوس ہوئے تھے۔

اس نے اپنا نقاب چہرے پر گرایا اور روشنی سے باہر نکلتے ہی اندھیرے میں غائب ہوگئی۔ میرے نتھنے پھولوں کی مہک سے بھر گئے تھے۔ جیسے ہی میں نے دروازہ بند کیا، میں اپنے کمپیوٹر پر گیا اور سورج نکلنے تک لکھتا رہا۔

پھر نہ جانے کب تھک کر اپنے بستر پر گرا۔۔۔۔ مجھے کچھ یاد نہیں۔۔۔۔ مجھے بس اپنے خواب یاد ہیں جن میں سنہری بالوں والی ایک خوبصورت لڑکی تھی اور میں اس سے یہی کہتا رہا۔ "کاش ہمارے پاس کبھی نہ ختم ہونے والا وقت ہوتا۔"

☆☆☆

گزری شاپنگ نے مجھے جھنجلاہٹ اور غصے سے بھر دیا تھا۔ اس سے پہلے کبھی لوگوں کی موجودگی اس قدر میرے اعصاب پر سوار نہیں ہوئی تھی جتنی اپنے آس پاس چلتے پھرتے وجود سے مجھے وحشت ہو رہی تھی۔۔۔۔ میں خود پر حیران تھا۔

واپسی میں، میں نے لائبریری سے تین کتابیں ایشو کروائیں۔ ان میں سے دو مقامی یونیورسٹی پریس نے شائع کی تھیں۔ ایک میں تو میری دلچسپی کی وجہ یہ تھی کہ اس میں کنٹری ہاؤس کے ماضی پر روشنی ڈالی گئی تھی۔

اس میں بتایا گیا تھا کہ جہاں یہ کنٹری ہاؤس اب کھڑا تھا وہاں کبھی کانوینٹ ہوا کرتا تھا۔ لائبریرین نے درحقیقت اسے تحریری کہا تھا لیکن شیکسپیئر کے علاوہ کوئی بھی ان چیزوں کو تحریری نہیں کہتا۔ اس پرانے کانوینٹ میں سترھویں صدی میں مذہبی رسومات کے نام پر ہونے والی قربانی یا سیدھے لفظوں میں کہا جائے تو قتل کی ایک رسم ادا کی جاتی تھی۔ اس بات نے مجھے چونکا دیا کیونکہ میں اسے خالصتاً پرامن علاقہ سمجھ رہا تھا۔

اس جگہ کی راہبائیں قربانی کے لیے ایک خوبصورت عورت کو لائی تھیں۔ یہ سنسنی خیز تھا۔۔۔۔ بالکل سترھویں صدی کے کیتھولک گوتھک ناولوں کی طرح۔ اس نے مجھے مارویل کی ایپلٹن ہاؤس کی نظم یاد دلا دی تھی۔

مگر قربانی سے پہلے ہی کانوینٹ میں آگ لگ گئی، راہبائیں بھاگ گئیں اور عورت غائب ہوگئی۔ اس کے بعد کسی نے کانوینٹ کی جلی ہوئی باقیات کو اس گھر میں تبدیل کردیا اور یہ آج تک اسی طرح کھڑا ہے۔ خیر تب اس گھر کے مکینوں کو اپنے عجیب و غریب پاگل پن اور گمشدگیاں اس گھر کے بھوتوں کا شاخسانہ لگی ہوں گی، مگر آج کل کے اس نئے دور میں کوئی بھوت، کوئی روح کشش نہیں ہوتا۔

اس شام سورج ڈوبتے ہی کسی نے میرے دروازے پر دستک دی تھی۔ میں نے دروازہ کھولا اور وہ کمرے میں تیرتی دکھائی دی۔ اس کی نیلی آنکھیں اتنی تابناک تھیں کہ ان سے شعلے سے لپکتے دکھائی دے رہے تھے۔ اس کے بال قدرتی طور پر سنہری بلکہ تقریباً سفید تھے، ان کی جڑیں سیاہ نہیں تھیں۔ ہم نے ساری رات شہر، لوگوں، ادب، گھر، ہر چیز کے بارے میں بات کی۔ صبح تقریباً تین بجے اس کے جانے کے بعد ہی مجھے احساس ہوا کہ میں نے اس سے اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں پوچھا۔۔۔۔ وہ کون ہے؟ کہاں رہتی ہے اور کیا کرتی ہے۔۔۔۔ اور نہ اس نے مجھ سے۔۔۔۔ خیر میرے بارے میں تو وہ جان ہی گئی تھی لیکن مجھے اس کے بارے میں تجسس کیوں نہیں ہوا۔۔۔۔ یہ حیران کن بات تھی۔ اس کے جاتے ہی پھولوں کی مہک پھر سے میرے دماغ میں گھسنے لگی تھی۔۔۔۔ میں پھر سے لکھنے بیٹھا اور اس وقت تک لکھتا رہا جب تک کہ میری آنکھیں نیند سے بند نہ ہونے لگیں۔

☆☆☆

وقت میرے لیے وہاں ایک عجیب سی چیز بن گیا تھا۔۔۔۔ دن میرا لکھنے میں یا کنٹری ہاؤس کی تحقیق میں گزرتا۔ رات میں جولیانا آجاتی۔۔۔۔ ایک اور عجیب بات یہ تھی کہ میں لوگوں سے نفرت کرنے لگا تھا، ان کی موجودگی سے۔۔۔۔ انہیں دیکھنے سے۔ جب بھی مجھے اپنے ایجنٹ یا اپنے پبلشر سے بات کرنا پڑتی، میرے جسم میں چیونٹیاں سی رینگنے لگتی تھیں۔ یہاں تک کہ گلی کوچوں کی خاموش ڈیوڑھیاں بھی میرے اعصاب پر بوجھ بنی رہتیں۔

میرا ایجنٹ ایک بار شہر میں مجھ سے ملا۔ اس نے کہا کہ میں دبلا پتلا اور بیمار لگ رہا ہوں۔۔۔ وہ حقیقی طور پر فکرمند لگ رہا تھا۔ مجھے نہ جانے کیوں شدید قسم کا غصہ آگیا اور میں نے اس سے بدتمیزی شروع کردی لیکن مجھے ایک پل کے لیے بھی پچھتاوا نہیں ہوا کہ میرا رویہ غلط تھا۔ ہاں جب جولیانا میرے ساتھ ہوتی تو میرا موڈ خوشگوار رہتا۔۔۔۔ اس کے ساتھ یوں لگتا تھا جیسے وقت ساکت ہوگیا ہو۔

مجھے وقت گزرنے کا احساس صرف تب ہوتا جب وہ چلی جاتی۔

اور پھر وہ خوفناک رات آگئی۔ جب کوئی دیواروں کو کھرچتا مجھے گہری نیند سے بیدار کرگیا تھا۔ یہ تقریباً تین بجے

قصۂ مختصر

مرزا امجد بیگ

"لالچ بری بلا ہے" اگرچہ یہ جملہ ہزاروں سال پرانا ہے... مگر ہر بار ایک نئی اور انوکھی کہانی کو جنم دیتا آرہا ہے... یہ قصہ بھی کچھ ایسا ہی ہے... جب انسان اچھے اور پُرسکون حالات میں سانس لے رہا ہو تو اسے شاید مزید عیش و عشرت کی... طلب یونہی خوار کر دیتی ہے جیسے اس کی زندگی میں اچانک بھونچال آگیا تھا... زیادہ کی خواہش میں تھوڑا بھی ہاتھ سے نکلا تو احساس ہوا کہ اس تھوڑے میں تو اس کی خوشیاں پوشیدہ تھیں... بہرحال ایسے وقت میں اگر کوئی فرشتہ بن کر مدد کردے تو یقیناً اللہ کی طرف سے کسی نہ کسی نیکی کا انعام اسے ملا ہوتا ہے... نیک اعمال تو ویسے بھی نسل در نسل مصیبتوں میں ڈھال بن جاتے ہیں... جیسے اس کے باپ کی نیکی نےاس کے رستے کے کانٹے چن لیے اور اسے علم تک نہ ہو سکا۔

کاروبار اور زیادہ منافع کے نام پر دغابازوں کی سرگرمیوں کا

دلخراش احوال

عدالت کی سالانہ چھٹیاں ختم ہوگئی تھیں۔ وہ موسم برسات کی ایک سہانی شام تھی۔ میں حسبِ معمول اپنے آفس میں بیٹھا ہوا تھا کہ ایک پُرتاثر شخصیت کا مالک مجھ سے ملنے آیا۔ میں نے پیشہ ورانہ مسکراہٹ سے اس کا استقبال کیا۔ رسمی علیک سلیک کے بعد اس نے شائستہ لہجے میں کہا۔

"بیگ صاحب! میں جانتا ہوں آپ ایک مصروف انسان ہیں۔ روزانہ آپ کو نت نئے موکلین سے ملنا پڑتا ہے اس لیے سب کی صورتوں کو یاد رکھنا کوئی آسان کام نہیں ہے لیکن میں اپنی زندگی میں صرف ایک ہی وکیل سے ملا ہوں اور وہ بھی برسوں پہلے.... چنانچہ آپ کی شکل میرے ذہن میں نقش ہے۔ آج ہماری دوسری ملاقات ہے۔"

بات کے اختتام پر وہ زیرِ لب مسکرایا تو میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ "معذرت، میں واقعی آپ کو نہیں پہچان پایا ہوں۔ اپنے بارے میں کچھ بتا کر یاد دلانے کی کوشش کریں۔"

"میرا نام فاروق نذیر ہے۔" وہ اپنا تعارف کراتے ہوئے بولا۔ "آج سے پندرہ سال پہلے آپ نے مجھے چوری کے ایک کیس سے بری کرایا تھا۔ ان دنوں میں بے روزگار تھا اور صبح سے شام تک کراچی کی سڑکیں ناپا کرتا تھا۔ ایسی ہی ایک ستم ظریف شام کوئی چور اپنا کام دکھا کر نکل گیا تھا اور لوگوں نے مجھے چور سمجھ کر دھر لیا تھا۔ بہرحال...." لمحاتی توقف کرکے اس نے ایک گہری سانس خارج کی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

"تو جناب.... آپ نے اپنی پیشہ ورانہ صلاحیتوں کا استعمال کرکے مجھے اس جھمیلے سے نکالا تھا۔ آج میں نہ تو بے روزگار ہوں اور نہ ہی "چور، چور" کی صداؤں کے ساتھ لوگ میرے تعاقب میں دوڑ رہے ہیں۔ مجھے اپنے ایک دوست کے سلسلے میں آپ کی مدد درکار ہے اور اسی غرض سے میں آپ کے پاس حاضر ہوا ہوں لیکن آپ کے چہرے کے تاثرات سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ مجھے پہچان نہیں پائے ہیں۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا بیگ صاحب؟"

"نہیں.... آپ کا اندازہ درست ہے۔" میں نے کہا۔ "میں ابھی تک آپ کو اپنی یادداشت میں تازہ نہیں کر پایا ہوں۔ خیر، آپ بتائیں۔ آپ کے دوست کے ساتھ کیا مسئلہ ہے؟"

"اس شخص کا نام مقصود ہے اور وہ اس وقت جیل میں

''کیا تمہیں محمود آباد اور منظور کالونی میں کوئی فرق نظر نہیں آتا؟'' وہ طنزیہ لہجے میں مستفسر ہوا۔ ''دونوں جگہوں کے مکانات کی قیمت ایک جیسی نہیں ہے اللہ کی بندی!''

''او اللہ کے بندے!'' نوشابہ نے ترکی بہ ترکی کہا۔ ''میں تو صرف اتنا جانتی ہوں کہ یہ دونوں گلے آپس میں جڑے ہوئے ہیں۔''

''سبحان اللہ!'' منصور نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ''تمہاری یہ دلیل تو سونے میں تولنے کے لائق ہے۔''

''پتا نہیں تم کیا کہنا چاہ رہے ہو؟'' وہ بیزاری سے بولی۔

''جہاں تک دو علاقوں کا آپس میں جڑے ہونے کا مسئلہ ہے تو یہ اپنا محمود آباد، ڈیفنس ہاؤسنگ سوسائٹی سے بھی جڑا ہوا ہے لیکن ان دونوں کی زمین کی قیمت میں زمین آسمان کا فرق ہے۔''

''اچھا بابا! تم ہی ٹھیک کہتے ہو۔'' وہ بات ختم کرنے والے انداز میں بولی۔ ''تم اسٹیٹ ایجنسی سے پتا کرو۔ جو حقیقت ہوگی، سامنے آجائے گی۔''

آئندہ ایک ہفتے میں منصور نے اپنے علاقے کے ہر اسٹیٹ ایجنٹ سے مل کر دیکھ لیا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا ان سب نے ایکا کر رکھا ہے۔ کوئی بھی ڈھائی، پونے تین لاکھ سے زیادہ کی بات نہیں کر رہا تھا۔ اس صورت حال نے منصور کو مایوس بھی کیا۔ وہ اپنے مکان کو پانچ لاکھ روپے میں فروخت کرکے اس رقم پر ماہانہ پچاس ہزار روپے منافع کما رہا تھا لیکن زمینی حقائق نے اس کے منافع کو گھٹا کر آدھا کر دیا تھا۔ بہرحال، وہ ہمت ہارنے والوں میں سے نہیں تھا۔ چند روز بعد وہ دوبارہ ''حاجی کارپوریشن'' کے آفس پہنچ گیا۔ اب کی بار نوشابہ اس کے ساتھ نہیں تھی۔

''جی منصور صاحب! آپ نے سروے کرلیا؟'' رسمی علیک سلیک کے بعد بڑے حاجی نے پوچھا۔

''حاجی صاحب! آپ بہت زیرک اور تجربہ کار لوگ ہیں۔'' منصور نے شکست خوردہ انداز میں کہا۔ ''میں نے پوری مارکیٹ گھوم لی ہے۔ کوئی بھی تین لاکھ سے زیادہ قیمت نہیں لگا رہا۔''

''ویسے ایک بات بتاؤں منصور صاحب!'' چھوٹے حاجی نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''آپ ہیں بہت نصیب والے۔''

''وہ کیسے فضل صاحب؟'' منصور نے چھوٹے حاجی سے پوچھا۔

''کل ایک پارٹی ہم سے چار لاکھ روپے قرض لینے آئی تھی۔'' چھوٹے حاجی نے معتدل انداز میں کہا۔ ''میں نے اس سے پوچھا، تمہارا ضمانتی کون ہے؟ وہ بولا، میرے پاس کوئی بھی گارنٹر نہیں ہے۔ میں نے کہا چار لاکھ روپے کوئی معمولی رقم نہیں ہے۔ کسی معتبر شخص کی گارنٹی کے بغیر ہم تو اتنا بڑا قرضہ نہیں دے سکتے۔ اگر کسی ضمانت نہیں ہے تو کوئی پلاٹ یا مکان کے کاغذات ہمارے پاس رکھوانا ہوں گے۔ وہ دکھی لہجے میں بولا۔ حاجی صاحب! اگر میرے پاس اپنا گھر ہوتا تو پھر مجھے چار لاکھ روپے قرض لینے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ میں یہ رقم ایک مکان خریدنے کے لیے ہی تو لے رہا ہوں۔ اس کی بات سنتے ہی آپ میری یادداشت میں تازہ ہوگئے۔ میں نے اس بندے سے پوچھا، بھائی! آپ کو کتنا بڑا مکان چاہیے اور کراچی کے کس علاقے میں؟ اس نے جواب دیا، ایک سو یا ایک سو بیس گز پر بنا ہوا کوئی بھی معقول مکان اور جہاں تک علاقے کی بات ہے تو میرے زیادہ تر رشتے دار اختر کالونی اور محمود آباد میں رہتے ہیں۔ اگر ان علاقوں یا اس سے ملحقہ دوسرے محلوں میں مجھے کہیں گھر مل جائے تو زیادہ بہتر ہوگا۔ اس کی ...... میرا مطلب ہے، شکیل کی یہ بات سنتے ہی میں آپ کا وکیل بن گیا منصور صاحب......!'' لمحاتی توقف کرکے اس نے ستائش طلب نظر سے منصور کو دیکھا پھر اپنے بیان کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

''میں نے شکیل نامی اس بندے کو بتایا کہ ایک صاحب کا محمود آباد میں ایک سو بیس گز پر بنا ہوا زبردست مکان ہے جس کی اس وقت مارکیٹ ویلیو پانچ لاکھ کے قریب ہے لیکن اس بندے کو پیسوں کی فوری ضرورت ہے لہٰذا وہ چار لاکھ میں بھی اپنا گھر فروخت کرنے پر تیار ہوجائے گا۔ اس نے کہا، لیکن میرے ہاتھ میں تو چار ہزار بھی نہیں ہیں......! میں نے اسے سمجھایا، دیکھو شکیل میاں! تمہارے پاس رقم ہے اور نہ ہی کوئی پکا ضمانتی لیکن آپ کو اپنے لیے ایک گھر بھی چاہیے تو اس کا ایک ہی راستہ ہے۔ اس نے پوچھا کون سا راستہ؟ میں نے اسے بتایا کہ ہم چار لاکھ روپے ادا کرکے پارٹی سے محمود آباد والا وہ گھر آپ کو دلوا دیتے ہیں اور اس رقم کی ادائی کے لیے ہم اپنے مارک اپ کو شامل کرکے ماہانہ ایک آسان قسط باندھ دیتے ہیں۔ آپ اس مکان میں رہائش اختیار کرلو اور پابندی سے ہر ماہ مخصوص قسط ادا کرتے رہو۔ جب تک یہ چار لاکھ روپے مع سود کی رقم ادا نہیں ہوجاتے، مذکورہ مکان کے اور یجنل لاکیومنٹس کی فائل ہمارے پاس رہے گی اور آپ کے لیے خوشخبری یہ ہے کہ شکیل اس ڈیل کے لیے تیار ہوگیا ہے۔ اب گیند آگئی ہے آپ کی کورٹ میں منصور صاحب!''

''میں سمجھا نہیں فضل صاحب؟'' منصور نے الجھن زدہ نظر سے چھوٹے حاجی کو دیکھا۔

''میں سمجھاتا ہوں منصور صاحب!'' بڑے حاجی نے کہا۔ ''آپ اپنا محمود آباد والا آبائی گھر ہمارے نام کردیں اور ہم چار لاکھ روپے آپ کی طرف سے ''حاجی کارپوریشن'' میں انویسٹ کردیتے ہیں۔ شکیل صاحب سے کیسے ڈیل کرنا ہے، یہ آپ کا دردِسر نہیں ہے۔''

''یعنی میرا مکان شکیل صاحب کو نہیں، آپ کو ٹرانسفر ہوگا؟''

''ظاہری بات ہے، جو شخص پیسا خرچ کرے گا، مکان تو اسی کے نام ہونا چاہیے نا۔'' حاجی شفیق احمد نے دوٹوک انداز میں کہا۔ ''جب تک شکیل ہماری رقم مع سود لوٹا نہیں دے گا، اس مکان کی ملکیت ہماری ہوگی۔ آپ دونوں ہمارے معزز کلائنٹس ہیں اور ہم آپ دونوں کے فائدے کی بات کر رہے ہیں۔''

منصور گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

''آپ یہ نہیں پوچھیں گے کہ آپ دونوں کا فائدہ کس طرح ہوگا؟'' چھوٹے حاجی نے منصور سے استفسار کیا۔

''آں...... !'' منصور نے گردن گھما کر فضل حسین کی طرف دیکھا اور بولا۔ ''آپ ہی بتا دیں حاجی صاحب!''

''دیکھیں جناب...... !'' چھوٹا حاجی سمجھانے والے انداز میں بولا۔ ''یہ بات تو آپ بھی اچھی طرح جانتے ہیں کہ جائداد وغیرہ کے انتقال میں وقت لگتا ہے۔ اگر آج ہی یہ پروسس شروع کردیا جائے تو کم ازکم ایک ماہ کے بعد آپ کا مکان ہمارے نام منتقل ہوسکے گا جبکہ آپ کا میٹر آج ہی سے چالو ہوجائے گا۔ میرا مطلب ہے، ہم آج ہی آپ سے چار لاکھ روپے کی انویسٹمنٹ کا اگریمنٹ کرلیں گے اور جب تک وہ مکان قانوناً ہماری ملکیت بنے گا، آپ اپنے چار لاکھ پر پورے چالیس ہزار روپے پرافٹ لے چکے ہوں گے۔ یہ تو ہوگئی آپ کے فائدے کی بات......'' وہ لمحے بھر کو رکا پھر اپنے بیان کو مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''جہاں تک شکیل کا معاملہ ہے تو جب تک وہ اس قرضے کو مع سود واپس نہیں کر دیتا، اس گھر میں بغیر کرایہ ادا کیے رہائش اختیار کیے رہے گا۔ اس کے لیے یہ بہت بڑا فائدہ ہوگا۔ امید ہے، یہ وضاحت آپ کی سمجھ میں آگئی ہوگی۔''

انسان اپنے فائدے اور نقصان کی بات کو بہت جلدی اور آسانی سے سمجھ جاتا ہے۔ منصور کو ان حاجی صاحبان نے کمال ہوشیاری سے اپنے شیشے میں اتار لیا تھا۔ آئندہ ایک ماہ میں منصور کا وہ آبائی گھر حاجی فضل حسین کے نام منتقل ہوگیا اور ''حاجی کارپوریشن'' کے پلیٹ فارم سے منصور کو پہلے ماہ کا منافع چالیس ہزار روپے بھی وصول ہوگیا۔

اگرچہ وہ لوگ اپنے گھر سے نکل کر کرائے کے ایک چھوٹے گھر میں آگئے تھے لیکن وہ دونوں بہت خوش تھے۔ چالیس ہزار روپے منصور کی تنخواہ اور مکان کے کرائے سے کئی گنا زیادہ تھے۔ انہوں نے کرائے کا وہ مکان بھی محمود آباد ہی میں لیا تھا۔ وہ اب دن رات یہی خواب بنتے رہتے تھے کہ ایک سال کے بعد ان کے پاس چار لاکھ اسی ہزار پرافٹ کے جمع ہوجائیں گے اور چار لاکھ ان کی اصل انویسٹمنٹ ہوگی۔ یہ آٹھ لاکھ اسی ہزار روپے ایک نئی اور شاندار زندگی شروع کرنے کے لیے کافی ہوں گے۔

یہ ضروری نہیں ہے کہ انسان کا ہر خواب پورا بھی ہوجائے اور دن میں جاگتی آنکھوں سے دیکھے جانے والے خوابوں کا تو ''اللہ حافظ'' ہی سمجھ لیں۔ ان دونوں کے خواب کی تعبیر بھی بڑی بھیانک اور خون کے آنسو رلا دینے والی تھی۔ دو ماہ تک ''حاجی کارپوریشن'' نے منصور کو پابندی سے اس کی کاغذی انویسٹمنٹ پر منافع دیا۔ اس کے بعد کھیل ختم اور دکان بند...... !

تیسرے ماہ جب منصور اپنے منافع کے چالیس ہزار وصول کرنے ''حاجی کارپوریشن'' کے آفس پہنچا تو وہاں ماتم سا بچھا ہوا تھا۔ دونوں حاجی صاحبان تو آفس میں موجود تھے مگر ان کے چہرے اترے ہوئے اور تھوبڑے لٹکے ہوئے تھے۔ ''ایک کاروبار میں ہمیں تین ارب کا نقصان ہوا ہے۔'' بڑے حاجی نے دکھی لہجے میں بتایا۔ ''لہٰذا کچھ عرصے کے لیے ہم نے اپنے کام کو روک دیا ہے۔ ان شاء اللہ جلد ہی ہم سنبھل جائیں گے۔''

''صرف تین چار ماہ تک آپ لوگوں کو صبر و تحمل سے ہمارا ساتھ دینا ہوگا۔'' چھوٹے حاجی نے کہا۔ ''ایسے کرائسس پہلے بھی ہم پر آتے رہے ہیں لیکن اللہ کے فضل سے ہم ہر مصیبت کو جھیل گئے ہیں۔ اب کی بار بھی اللہ ہم پر کرم کرے گا۔ ہمیں اس ذاتِ باری سے پوری امید ہے۔''

''اور ہماری انویسٹمنٹ کا کیا ہوگا؟'' منصور کے استفسار سے گہری تشویش جھلکتی تھی۔

''ہمارے ہر کلائنٹ کا سرمایہ ایک مقدس امانت کے طور پر ''حاجی کارپوریشن'' میں محفوظ ہے۔'' بڑے حاجی نے جواب دیا۔ ''جیسا کہ فضل صاحب نے فرمایا کہ آپ کو اس نازک موقع پر ہم سے تعاون کرنا ہوگا۔ ہم کوشش کر رہے ہیں۔ بس دو تین ماہ کی بات ہے پھر سب ٹھیک ہوجائے گا۔''

منصور پوچھے بنا نہ رہ سکا۔ ''اس بحرانی کیفیت میں

آپ ہم سے کس قسم کا تعاون چاہتے ہیں؟"

"جب تک ہمارا بزنس رننگ میں نہیں آتا، ہم آپ لوگوں کو ماہانہ منافع نہیں دے سکیں گے اور یہ تکلیف زیادہ سے زیادہ تین ماہ کی ہے۔"

"فرض کریں......" مقصود نے ایک فوری خیال کے تحت پوچھ لیا۔ "اگر یہ کاروباری بحران طول پکڑ لیتا ہے تو؟"

"تو ہم عرض پکڑ لیں گے......" چھوٹا حاجی بڑے اعتماد سے بولا۔ "آپ آج سے کاؤنٹ ڈاؤن شروع کر دیں۔ مجھے اللہ کی رحمت پر پورا بھروسا ہے کہ ہم نوے دن کے اندر اپنے مالی بحران پر قابو پالیں گے اور اگر آپ کے خدشات کے مطابق ایسا نہ ہو سکا تو ہم اپنے انویسٹرز کی تمام رقوم واپس کر دیں گے۔ یہ ہمارا آپ سب سے وعدہ ہے۔"

چھوٹے حاجی کے جواب نے مقصود کو لاجواب کر دیا تھا۔

اس وقت مقصود کے علاوہ بھی وہاں درجن بھر انویسٹرز موجود تھے اور حاجی صاحبان نے یہ بری خبر انہیں ویٹنگ ہال میں آ کر دی تھی۔ ان میں سے ہر کسی نے "حاجی کارپوریشن" میں رقم لگا رکھی تھی۔ دوسروں کا تو پتا نہیں لیکن مقصود کو صرف دو ماہ تک منافع ملا تھا۔ اگر سادہ سا حساب لگا لیں تو یہی سنگین حقیقت سامنے آتی تھی کہ مقصود نے ڈھائی تین لاکھ مالیت کا گھر محض اسی ہزار کے عوض چھوٹے حاجی فضل حسین کے نام لگا دیا تھا۔

حاجی صاحبان نے آفس پر تالا ڈال کر فرار کی راہ اختیار نہیں کی تھی اور روزانہ آفس میں بیٹھ کر لوگوں کو دلاسے دے رہے تھے۔ ان کا یہ رویہ انویسٹرز کو اطمینان دلاتا تھا کہ وہ لوگ فراڈ نہیں ہیں۔ چنانچہ ان کی رقوم ڈوبنے کا کوئی خدشہ نہیں۔ کسی نہ کسی طرح یہ تین ماہ بھی گزر ہی جائیں گے۔

جب تین ماہ گزر گئے اور "حاجی کارپوریشن" کے حالات میں کوئی بہتری دیکھنے کو نہ ملی تو بعض جذباتی انویسٹرز طیش میں آگئے۔ وہ اپنی رقوم کی واپسی کا مطالبہ کرنے لگے۔ مقصود بھی انہی میں سے ایک تھا۔ ایک روز وہ "حاجی کارپوریشن" کے آفس پہنچا اور اس نے چھوٹے حاجی سے دوٹوک بات کی۔

"فضل صاحب! آپ کے معاملات تو سدھرنے کا نام ہی نہیں لے رہے۔" اس نے خفگی بھرے لہجے میں کہا۔ "میں مزید انتظار نہیں کر سکتا۔ برائے مہربانی آپ لوگ میرے چار لاکھ روپے واپس کر دیں۔"

اس دن بڑا حاجی آفس میں موجود نہیں تھا۔ ان دنوں وہ دونوں ایک ساتھ بہت کم نظر آتے تھے۔ اگر کوئی یہ سوال کرتا کہ دوسرے حاجی صاحب کہاں ہیں تو یہ کہہ کر اسے مطمئن کر دیا جاتا کہ وہ بزنس کو سنبھالنے کی کوششوں میں مصروف ہیں۔

"آپ تو چار لاکھ کا ذکر اس طرح کر رہے ہیں جیسے آپ نے یہ کیش میرے ہاتھ پر رکھا ہو۔" چھوٹے حاجی نے کہا۔

"حاجی صاحب! میں نے اپنا مکان آپ کے نام کیا ہے۔" مقصود تنک کر بولا۔ "جائداد کی قیمت نقد رقم سے کہیں زیادہ ہوتی ہے جناب!"

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں مقصود صاحب!" چھوٹا حاجی رسانیت بھرے لہجے میں بولا۔ "میں مانتا ہوں کہ آپ نے اپنا مکان میرے نام منتقل کیا تھا لیکن یہ بات آپ کو بھی اچھی طرح معلوم ہے کہ آپ کے اس گھر کی مارکیٹ ویلیو تین لاکھ سے زیادہ نہیں تھی اور ہمارا حوصلہ دیکھیں کہ ہم نے وہ گھر چار لاکھ کی انویسٹمنٹ کے عوض شکیل صاحب کے حوالے کیا ہوا ہے اور اس رقم کو بطور قرضہ جان کر ہم شکیل صاحب سے ماہانہ قسط بھی وصول کر رہے ہیں۔ کاروبار میں یہ نشیب و فراز تو بھگتنا ہی پڑتے ہیں۔"

"مجھے آپ کے ساتھ کوئی کاروبار کرنا ہے اور نہ ہی آپ کے حوصلے کو ناپنے میں مجھے کوئی دلچسپی ہے۔" مقصود نے روکھے لہجے میں کہا۔ "چلو نہ سہی، آپ مجھے تین لاکھ ہی لوٹا دیں اور اس معاملے کو ختم کریں۔"

"تو آپ نے اپنی انویسٹمنٹ نکالنے کا فیصلہ کر لیا ہے؟"

"ہاں...... یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔" مقصود نے اٹل لہجے میں کہا۔

"ایسا حتمی فیصلہ کرنے سے پہلے آپ کو ایگریمنٹ میں درج "حاجی کارپوریشن" کے قواعد و ضوابط کو لازمی پڑھ لینا چاہیے تھا۔" چھوٹے حاجی نے واشگاف الفاظ میں کہا۔ "وہاں بڑے واضح انداز میں لکھا ہوا ہے کہ کوئی بھی انویسٹر ایک سال سے پہلے ہمارے بزنس سے اپنی رقم نہیں نکال سکتا اور ابھی آپ کو انویسٹ کیے لگ بھگ آٹھ ماہ ہوئے ہیں۔"

"میں نے آپ کے قواعد و ضوابط کو بغور پڑھا ہے حاجی صاحب!" وہ معتدل انداز میں بولا۔ "وہاں یہ بھی لکھا ہوا ہے کہ کارپوریشن ہر ماہ منافع دینے کی پابند ہے۔ پچھلے چھ ماہ سے مجھے آپ لوگوں نے ایک روپیہ بھی نہیں دیا۔ یہ بھی تو قواعد و ضوابط کی کھلی خلاف ورزی ہے۔"

"مقصود صاحب! اس وقت ہماری کارپوریشن اپنی تاریخ کے نازک دور سے گزر رہی ہے۔" فضل حسین نے بہلانے والے انداز میں کہا۔ "یوں سمجھیں کہ ہم حالت

جنگ میں ہیں۔"

"جنگ ہو یا امن، میں تو اصول کی بات کر رہا ہوں۔" مقصود نے سپاٹ آواز میں کہا۔ "مجھے میرے تین لاکھ چاہئیں۔ بس......!"

"ٹھیک ہے......!" حاجی فضل حسین نے متاسفانہ انداز میں کہا۔ "جب آپ نے ہمارا ساتھ چھوڑنے کا فیصلہ کر ہی لیا ہے تو پھر ہم آپ کو زبردستی تو روک نہیں سکتے۔ آپ ایک کام کریں......!" وہ سانس ہموار کرنے کے لیے متوقف ہوا پھر گہری سنجیدگی سے بولا۔

"آپ کل سہ پہر میں آجائیں۔ میں بڑے حاجی صاحب سے مشورہ کرنے کے بعد آپ کے مسئلے کو حل کر دوں گا۔ کل آپ کی امانت آپ کو لوٹا دی جائے گی لیکن ایک بات کا خیال رہے کہ آپ کسی سے اس بات کا ذکر نہیں کریں گے کہ ہم نے آپ کی انویسٹمنٹ واپس کر دی ہے۔ اگر یہ معاملہ لیک ہو گیا تو ہمارے لیے بڑی مشکل کھڑی ہو جائے گی۔ ہمارے تمام انویسٹرز آفس کے سامنے دھرنا دے کر بیٹھ جائیں گے اور اپنی رقوم کی واپسی کا مطالبہ کریں گے۔ آپ ہماری مجبوری کو سمجھ رہے ہیں نا؟"

"آپ بے فکر ہو جائیں حاجی صاحب!" مقصود نے کہا۔ "میں یہ بات کسی کو نہیں بتاؤں گا لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آرہی کہ آپ نے مجھے کل کیوں بلایا ہے؟ کل تو جمعہ ہے اور جمعے کے روز آپ چھٹی کرتے ہیں۔"

"اس جمعۃ المبارک سے چھٹی بند ہے مقصود صاحب!" فضل حسین نے بتایا۔ "ہم اپنے کلائنٹس کو پورا ہفتہ آفس میں ملیں گے۔ ہاں، یہ ضرور ہے کہ جمعے کے دن ہم جمعے کی نماز کے بعد آفس کھولا کریں گے اسی لیے تو میں آپ کو کل سہ پہر میں آنے کو کہہ رہا ہوں۔"

حاجی فضل حسین کی بات مقصود کی سمجھ میں آگئی اور وہ آئندہ روز آنے کا وعدہ کر کے "حاجی کارپوریشن" کے آفس سے نکل آیا۔

وہ اگلے روز یعنی جمعے کی سہ پہر دوبارہ وہاں پہنچا اور بڑے حاجی شفیق احمد سے اس کی ملاقات بھی ہوئی مگر یہ ملاقات نتیجہ خیز ثابت نہ ہو سکی۔ بڑے حاجی نے رقم کی واپسی کے لیے جو طریقۂ کار اختیار کیا، وہ مقصود کے لیے قابل قبول نہیں تھا چنانچہ وہ غصے سے بھرا ہوا وہاں سے واپس آگیا تھا۔ پھر اسی رات نو بجے اسے اس کے گھر واقع محمود آباد سے گرفتار کر لیا گیا تھا۔ اس پر بڑے حاجی شفیق احمد کے قتل کا الزام تھا۔

☆☆☆

عدالتی کارروائی کا آغاز ہوا تو میں نے اپنا وکالت نامہ اور ملزم کی درخواست ضمانت دائر کر دی۔ جج نے میری طرف دیکھا اور مجھے مخاطب کیے بغیر بولا۔

"اوہ! تو اس کیس کا دفاعی وکیل تبدیل ہو گیا ہے۔"

میں نے اثبات میں گردن ہلانے پر اکتفا کیا۔

"جرح شروع کی جائے۔" جج نے وکیل استغاثہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

اس کیس کو عدالت میں لگے کم و بیش چھ ماہ ہو گئے تھے مگر ابھی تک کوئی قابل ذکر کارروائی نہیں ہوئی تھی۔ اس دوران میں استغاثہ کی طرف سے تین چار گواہ بھی بھگتائے جا چکے تھے۔ مقصود کے وکیل کی کارکردگی بہت ہی افسوسناک اور مایوس کن رہی تھی۔ درحقیقت وہ وکیل ایک نو آموز تھا اور کم فیس کے چکر میں نوشابہ نے اسے اپنے شوہر کے دفاع کے لیے مقرر کر لیا تھا مگر اب صورت حال تبدیل ہو چکی تھی۔ یہ کیس میرے ہاتھ میں آگیا تھا اور اس کا تمام تر خرچہ فاروق بشیر کا ایک عزیز علی عمران اٹھا رہا تھا۔ تاہم میں نے مقصود اور نوشابہ کو اس بات کی بھنک بھی نہیں پڑنے دی تھی کہ اس خیر خواہی کے پیچھے کس کا ہاتھ تھا۔ انہیں میں نے یہی بتایا تھا کہ ایک مقامی فلاحی تنظیم نے یہ کیس مجھے سونپا ہے۔ یہ اس وعدے کی ادائیگی تھی جو فاروق بشیر نے مجھ سے لے رکھا تھا۔

جج کے حکم پر وکیل استغاثہ کٹہرے کے نزدیک چلا گیا اور ملزم مقصود کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"کیا تم وقوعہ کی سہ پہر یعنی آٹھ جنوری بروز جمعہ "حاجی کارپوریشن" کے آفس گئے تھے؟"

"جی۔ میں گیا تھا۔" ملزم نے جواب دیا۔

اس پیشی سے قبل میں نے اپنے موکل مقصود سے کُل تین ملاقاتیں کی تھیں جس کے نتیجے میں مجھے اس کیس کے تمام زاویوں کے حوالے سے مکمل معلومات حاصل ہو گئی تھیں۔ رہی سہی کسر میں نے اپنی تحقیق سے پوری کر لی تھی۔ الغرض مجھے اس کیس پر مکمل دسترس حاصل ہو چکی تھی۔ میں نے اپنے موکل کو بھی اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ اسے کس بھرپور اعتماد کے ساتھ وکیل سرکار کا سامنا کرنا ہے۔ وہ میری ہدایات کے عین مطابق پرفارمنس دے رہا تھا۔

"کیا اس روز کارپوریشن کے آفس میں مقتول حاجی شفیق احمد سے تمہاری ملاقات ہوئی تھی؟" وکیل استغاثہ نے پوچھا۔

ملزم نے اثبات میں جواب دیا۔

"کیا یہ سچ ہے کہ تم نے حاجی کارپوریشن میں تین

لاکھ روپے لگا رکھے تھے جس پر تمھیں ماہانہ دس فیصد منافع ملا کرتا تھا؟" وکیل سرکار جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ "تو اس کی سیدھی سی بات یہ ہے کہ تم اپنی رقم واپس لینے گئے تو تمہارے اور مقتول کے بیچ تکرار ہوئی جس کے نتیجے میں تم نے طیش میں آ کر ایک کرسی اٹھائی اور پوری قوت سے مقتول کے سر پر دے ماری۔ مقتول اس کاری ضرب کی تاب نہ لاتے ہوئے موقع پر ہی ہلاک ہو گیا تھا؟"

"آبجیکشن یور آنر!" قبل اس کے کہ ملزم وکیل استغاثہ کے استفسار کے جواب میں کچھ کہتا، میں فوراً اس کی مدد کو پہنچ گیا۔ "جناب عالی!" میں نے جج کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "اس کیس میں استغاثہ کی جانب سے حقائق کو توڑ مروڑ کر میرے موکل کے خلاف پیش کیا گیا ہے۔ ملزم بے گناہ ہے۔ ایک گہری سازش کے تحت اسے قربانی کا بکرا بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ میں اپنے موکل کی بے گناہی ثابت کر کے دکھاؤں گا۔ سردست میں عدالت کے علم میں صرف اس نکتے کا اضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ میرے موکل نے "حاجی کارپوریشن" میں اپنے ہاتھ سے ایک روپیہ بھی انویسٹ نہیں کیا تھا۔ اس بے چارے کے ساتھ دھوکا اور دھوکا ہوا ہے اور دھوکا کیا گیا ہے۔"

"میرے فاضل دوست!" وکیل استغاثہ نے طنزیہ انداز میں مجھے مخاطب کیا۔ "آپ کو یہ کیس ہاتھ میں لیے جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے ہیں اور آپ نے اس کیس کو الف سے ے تک نہ صرف اپنے حافظے میں اتار لیا ہے بلکہ اس حوالے سے بلند بانگ دعوے بھی کرنے لگے ہیں۔"

"میرے مشاہدے کی قوت، حافظے کی وسعت اور دعوے کی صداقت سے آپ بالکل واقف نہیں ہیں۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے تیکھے لہجے میں کہا۔ "آپ تھوڑا تحمل سے کام لیں۔ میں نے جو کہا ہے اسے ثابت بھی کر دکھاؤں گا پھر سب پر واضح ہو جائے گا کہ پچھلے چھ ماہ سے استغاثہ اندھیرے میں تیر چلا رہا تھا۔"

میرا آخری جملہ سنسنی خیز ہونے کے ساتھ ہی خاصا ڈرامائی بھی تھا۔ وکیل استغاثہ ایک لمحے کے لیے گڑبڑا کر رہ گیا پھر کھسیانے انداز میں بولا۔

"دیکھتے ہیں آپ اپنی جادو کی پٹاری میں سے کون سا سانپ نکالتے ہیں۔"

"آبجیکشن سسٹینڈ!" جج نے کہا پھر مجھے مخاطب کرتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔ "بیگ صاحب! آپ کسی "جادو کا کھیل" کی بات کر رہے تھے۔ عدالت آپ کا موقف سننا چاہتی ہے۔"

جج کی خصوصی دلچسپی ہمارے کیس کے لیے خوش آئند تھی۔ بات دراصل یہ ہے کہ کسی بھی کیس میں جج کی حیثیت ایک قانون داں منصف سامع کی ہوتی ہے۔ وہ کیس کے کسی بھی زاویے پر اپنی ذاتی رائے نہیں دے سکتا بلکہ دونوں اطراف کے وکلا کے دلائل کو انصاف کی میزان میں تولنے کے بعد وہ حقائق و واقعات کی روشنی میں فیصلہ صادر کرتا ہے۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ ایک چابک دست، حاضر دماغ اور مضبوط اعصاب کا مالک وکیل اکثر جج پر بھاری پڑ جاتا ہے۔ مجھے یہ سمجھ لینے میں کوئی دقت محسوس نہیں ہوئی کہ گزشتہ چھ ماہ کی عدالتی کارروائی نے اس کیس کے منصف کو مدو جزر کیا تھا اسی لیے وہ میری زبان سے کچھ نیا سننے کا خواہشمند دکھائی دیتا تھا۔

"تھینک یو یور آنر!" میں نے مؤدبانہ انداز میں کہا پھر اس کیس کے حقیقی پس منظر کو عدالت کے سامنے اجاگر کرنے لگا۔ "جناب عالی! "حاجی کارپوریشن" جدید طرز کا ایک منظم دھوکا ہے۔ اس کارپوریشن کی چال بازیوں کا جغرافیہ اور تاریخ میں حسب ضرورت معزز عدالت کے سامنے پیش کروں گا لیکن فی الحال میں اپنے موکل کی پوزیشن واضح کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔" لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک آسودہ سانس خارج کی پھر اپنے بیان کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"یور آنر! اوپن ریکارڈ کے مطابق "حاجی کارپوریشن" دو طرح کا بزنس کرتی ہے۔ میں نے اس کیس کو اپنے ہاتھ میں لینے کے بعد پچھلے پندرہ دن میں اس کارپوریشن کا "پوسٹ مارٹم" کر ڈالا ہے۔ اس سلسلے میں، میں نے بعض سرکاری محکموں سے بھی مدد لی ہے جن کا یہاں پر ذکر کرنا مناسب ہے اور نہ ہی اس کی ضرورت ہے لہٰذا میں اپنے اصل موضوع کی طرف آتا ہوں۔ تو میں معزز عدالت کو بتا رہا تھا کہ "حاجی کارپوریشن" کے بینر تلے دو قسم کا دھندا ہوتا ہے... ہاں، اس کاروبار کے لیے موزوں لفظ "دھندا" ہی ہے۔" میں ایک بار پھر تھما، معاندانہ نظر سے مخالف وکیل کو دیکھا اور اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے مزید کہا۔

"نمبر ایک... اس کارپوریشن کے کرتا دھرتا حاجی صاحبان لوگوں کی بھاری انویسٹمنٹ پر انھیں دس فیصد منافع ماہانہ دیتے ہیں۔ یہ دنیا بھر کی تاریخ کا سب سے زیادہ ماہانہ منافع ہے جس کے اعتماد سے دھوکا دہی کو بڑی آسانی

محسوس کیا جا سکتا ہے۔ نمبر دو... "حاجی کارپوریشن" ضرورت مند افراد کو پانچ فیصد ماہانہ کی شرح سود پر قرضہ بھی فراہم کرتی ہے۔ اب میں آتا ہوں اپنے موکل کی بپتا کی جانب...!" میں نے ایک بار پھر لمحاتی توقف کیا۔ اس کے بعد ڈرامائی انداز میں بولنا شروع کیا۔

"جب میرے موکل اور اس کیس کے ملزم منصور نے اتنے بھاری ماہانہ منافع کے بارے میں سنا تو وہ اپنے آبائی گھر واقع محمود آباد کو فروخت کر کے "حاجی کارپوریشن" میں انویسٹ کرنے کے لیے تیار ہو گیا۔ مذکورہ مکان کی مارکیٹ ویلیو تین لاکھ سے زیادہ نہیں تھی۔ چھوٹے حاجی فضل حسین نے شکیل نامی ایک فرضی شخص کا حوالہ دے کر میرے موکل کو اپنے شیشے میں اتار لیا۔ ملزم سے یہ کہا گیا کہ شکیل کو مکان کی خریداری کے لیے چار لاکھ کا قرضہ چاہیے اور اس کی خواہش ہے کہ مکان محمود آباد یا اس سے کسی قریبی محلے میں ہو۔ چھوٹے حاجی نے ملزم کو مشورہ دیا کہ اگر وہ اپنا آبائی مکان اس کے نام کر دے تو وہ "حاجی کارپوریشن" میں اس کی چار لاکھ کی انویسٹ کا ایگریمنٹ کرے گا اور اس رقم پر اسے ماہانہ چالیس ہزار روپے منافع بھی ملنے لگے گا۔ جب ملزم نے شکیل اور مکان کے حوالے سے استفسار کیا تو حاجی فضل نے جواب دیا کہ شکیل جب تک چار لاکھ روپے مع سود کی رقم آسان اقساط کی صورت "حاجی کارپوریشن" کو لوٹا نہیں دے گا، وہ مکان چھوٹے حاجی ہی کی ملکیت رہے گا۔ تاہم اس دوران میں شکیل کو اس مکان میں بغیر کرایہ ادا کیے رہنے کی اجازت ہوگی۔ میرا موکل چھوٹے حاجی کی اس وضاحت سے مطمئن ہو گیا۔ اس کے اطمینان کا سب سے بڑا سبب یہ بھی تھا کہ "حاجی کارپوریشن" میں کی جانے والی چار لاکھ کی انویسٹمنٹ کا ایگریمنٹ اس کے پاس موجود تھا۔ علاوہ ازیں اسے ہر ماہ چالیس ہزار کا پرافٹ بھی ملنا شروع ہو گیا تھا۔ دو ماہ میں ملزم نے اسی ہزار کا منافع حاصل کر لیا اور اس کے بعد... اس کے بعد وہی ہوا جو اس نوعیت کے "جھانسا منصوبہ جات" میں ہوتا ہے جناب عالی...!" میں سانس ہموار کرنے کی غرض سے متوقف ہوا پھر اپنی بات کو سمیٹتے ہوئے کہا۔

"چھ ماہ سے "حاجی شفیق مرڈر کیس" اس عدالت میں زیر سماعت ہے۔ بڑے حاجی کے قتل سے چھ ماہ قبل "حاجی کارپوریشن" نے یہ اعلان کر کے اپنے انویسٹرز پر آسمانی بجلی گرا دی کہ کارپوریشن کو اپنے بزنس میں تین ارب کا خسارہ ہوا ہے لہٰذا وہ تین ماہ تک اپنے انویسٹرز کو پرافٹ نہیں دے سکیں گے۔ تاہم ان کی لگائی ہوئی رقوم کارپوریشن کے پاس ایک امانت کے طور پر محفوظ ہیں۔ "حاجی کارپوریشن" کے خون آشام جبڑوں میں جکڑے ہوئے انویسٹرز کے پاس سوائے انتظار کے اور کوئی چارۂ کار نہیں تھا لیکن جب تین ماہ کا انتظار چھ ماہ تک طوالت اختیار کر گیا تو بعض انویسٹرز کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا۔ میرا موکل بھی انھی متاثرین میں شامل تھا۔ یہ بے چارہ تو اپنا آبائی گھر چھوٹے حاجی کے نام لکھوا کر کرائے کے مکان میں اس خواب کے ساتھ رہائش پذیر ہو گیا تھا کہ ایک سال کے اندر وہ لوگ "حاجی کارپوریشن" سے چار لاکھ اسی ہزار کا منافع کمانے کے بعد اپنی اصل رقم واپس لے لیں گے اور لگ بھگ نو لاکھ کی خطیر رقم کے ساتھ ایک نئی، آسودہ اور خوشگوار زندگی کا آغاز کریں گے لیکن جب ملزم نے اپنا یہ حسین خواب چکنا چور ہوتے دیکھا تو یہ رقم کے مطالبے کے لیے ہتھول کے، ہٹر بن گیا۔ حاجی صاحبان نے صورت حال کو بگڑتے دیکھا تو چھوٹے حاجی نے ملزم کو ایک پرکشش پیشکش کر دی۔"

یہاں تک پہنچنے کے بعد میں نے ڈرامائی توقف کیا تو جج کی دلچسپی بھری سرسراتی ہوئی سوالیہ آواز کورٹ روم (کمرۂ عدالت) میں سنائی دی۔

"کیسی پیشکش بیگ صاحب؟"

"اس کی وضاحت کے لیے میں براہ راست اپنے موکل سے بات کرنا چاہوں گا۔" میں نے رسانیت بھرے لہجے میں کہا۔ "اگر معزز عدالت کی اجازت ہو تو...!"

"پرمیشن گرانٹڈ!" جج نے توانا آواز میں کہا۔

"جب تم نے اپنے چار لاکھ روپے کی واپسی کا مطالبہ کیا اور دھمکی دی کہ اگر تمہاری رقم نہیں لوٹائی گئی تو تم دوسرے درجن بھر انویسٹرز کو اپنے ساتھ ملا کر "حاجی کارپوریشن" پر فراڈ کا کیس کر دو گے تو اس کے جواب میں ان حاجی صاحبان نے تمہیں کیا آفر دی تھی؟" میں نے اکیوزڈ باکس کے نزدیک جا کر اپنے موکل سے پوچھا۔

"اس سلسلے میں میری چھوٹے حاجی فضل حسین سے بات ہوئی تھی۔" ملزم نے پُر اعتماد انداز میں جواب دیا۔ "حاجی صاحب نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ اگر میں دوسرے انویسٹرز کو بھڑکانے اور بہکانے کی کوشش نہ کروں تو وہ میری رقم لوٹانے کو تیار ہیں مگر چار نہیں، تین لاکھ کیونکہ میرا وہ گھر تین لاکھ سے زیادہ مالیت کا نہیں تھا۔ میں نے دل میں شکر ادا کیا کہ تین لاکھ تو مل رہے ہیں۔ میں نے فضل حسین کی یہ پیشکش قبول کر لی۔ اس نے اگلے روز سہ پہر میں مجھے آفس

کر بچاں، مقررہ بی ہے شہری کی نگاہ سے ہرگز ہرگز اوجھل نہیں رہا ہوگا بشرطیکہ وہ شخص اتفاق سے اندھا نہ ہو۔"

"مجھے سخت اعتراض ہے جناب عالی!" وکیل استغاثہ نے احتجاجی انداز میں کہا۔ "میرے فاضل دوست کہانیاں بنانے اور سنانے میں خاصی مہارت رکھتے ہیں لیکن یہ عدالت کا کمرا ہے، کسی گاؤں کی چوپال نہیں جو یہاں موجود لوگ ان کے من گھڑت قصے سنیں گے۔ میں معزز عدالت کی اجازت سے ڈیفنس سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔"

جج نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "پرمیشن گرانٹڈ!"

وکیل استغاثہ نے جج سے اجازت ملتے ہی اپنا رخ میری جانب پھیرا اور طنزیہ لہجے میں استفسار کیا۔ "میرے فاضل دوست! اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ وقوعہ کی سہ پہر عین حاجی شفیق احمد کی موت کے وقت ویٹنگ روم میں کوئی شخص موجود تھا؟"

"گارنٹی!" میں نے زیر لب مسکراتے ہوئے استہزائیہ انداز میں کہا۔ "ایک سالڈ گارنٹی ہے میرے پاس۔"

"تو معزز عدالت کے سامنے پیش کریں۔" وہ سپاٹ آواز میں بولا۔ "آخر انتظار کس بات کا ہے؟"

"آپ کی گارنٹی کا۔" میں نے ٹھوس انداز میں جواب دیا۔

"اس کا کیا مطلب ہوا؟" وہ ہنہناتے ہوئے لہجے میں مستفسر ہوا۔

"اگر آپ اس بات کی گارنٹی لینے کو تیار ہو جائیں کہ وقوعہ کی سہ پہر "حاجی کارپوریشن" کے آفس واقع حسن اسکوائر کے ویٹنگ ہال میں عین واردات کے وقت کوئی بھی شخص موجود نہیں تھا یا اگر تھا تو وہ ایک دم گونگا، بہرا اور اندھا بھی تھا تو میں معزز عدالت کے روبرو وعدہ کرتا ہوں کہ میں مرد مذکور کو یہاں اسی کورٹ روم میں حاضر کر کے یہ بھی ثابت کر دوں گا کہ وہ بندہ گونگا ہے نہ بہرا اور نہ ہی اندھا۔" میں نے ایک ایک لفظ پر دباؤ ڈالتے ہوئے اپنا جواب مکمل کر دیا۔

"میں بھلا..... اس بات کی..... گارنٹی کیسے..... لے سکتا ہوں....." وہ [illegible] اور بکھری ہوئی آواز میں بولا۔

"ریلیکس مائی ڈیئر کونسلر!" میں نے پچکارنے والے انداز میں کہا۔ "زیادہ ٹینشن لینے کی ضرورت نہیں۔ میں ہوں نا آپ کی مدد کرنے کو۔ آپ نے ابھی معزز عدالت کے سامنے جس کام سے اپنی معذوری کا اظہار کیا ہے، میں ضرورت پڑنے پر اس کام کو بطریق احسن کر کے دکھاؤں گا۔"

وہ ایسی نظر سے مجھے تکنے لگا جیسے میں مہذب الفاظ کا سہارا لے کر اسے بھری عدالت میں بے عزت کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ میں نے اسے اس کے خجالت آمیز حال پر چھوڑا اور روئے سخن جج کی سمت موڑتے ہوئے با آواز بلند کہا۔

"جناب عالی! عدالت کا مقررہ وقت ختم ہونے میں چند منٹ باقی ہیں۔ میں ان چند منٹس میں اس کیس کے تفتیشی افسر سے چند سوالات کرنا چاہتا ہوں۔"

جج نے دیوار گیر کلاک پر نگاہ ڈالنے کے بعد کہا۔ "اجازت ہے۔"

اگلے ہی لمحے انکوائری آفیسر وٹنس باکس میں آ کر کھڑا ہو گیا۔ کسی بھی کیس میں آئی او کی حیثیت استغاثہ کے ایک گواہ ایسی ہوتی ہے اور ہر پیشی پر اسے عدالت میں حاضر رہنا پڑتا ہے۔

"آئی او صاحب!" میں نے وٹنس باکس کے نزدیک پہنچ کر تفتیشی افسر سے سوال کیا۔ "اس واردات کی اطلاع آپ کو کب اور کس نے دی تھی؟"

"حاجی فضل حسین نے تھانے فون کر کے ہمیں حاجی شفیق احمد کے قتل کے بارے میں بتایا تھا۔" انکوائری آفیسر نے جواب دیا۔ "ہمارے روزنامچے کے مطابق یہ اطلاع آٹھ جنوری کی شام چھ بجے دی گئی تھی۔"

"اور اسی رات آپ نے ملزم کو لگ بھگ نو بجے حاجی شفیق کے قتل کے الزام میں اس کے گھر سے گرفتار کر لیا تھا؟"

"جی..... یہی حقیقت ہے۔"

"کیا آپ کو الہام یا کشف وغیرہ کی سائنس تک رسائی حاصل ہے؟" میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

وہ گڑبڑا کر بولا۔ "ایسی تو کوئی بات نہیں۔"

"تو پھر آپ کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ حاجی شفیق کو میرے موکل نے ہی موت کے گھاٹ اتارا ہے؟" میں نے سخت لہجے میں پوچھا۔ "آپ اسے گرفتار کرنے کے لیے سیدھے اس کے گھر کیوں پہنچ گئے تھے؟"

"یہ چھاپا ہم نے حاجی فضل حسین کی فراہم کردہ معلومات کی روشنی میں مارا تھا۔"

"کہیں آپ یہ تو نہیں کہنا چاہ رہے کہ چھوٹے حاجی نے اپنی آنکھوں سے ملزم کو بڑے حاجی کا قتل کرتے دیکھا تھا؟" میں نے تیز لہجے میں دریافت کیا۔ "اسی لیے اس نے آپ کو ملزم کی گرفتاری کے لیے اس کے گھر کی جانب دوڑا دیا تھا؟"

"ایسی کوئی بات نہیں۔" وہ جز بز ہوتے ہوئے بولا۔

میں اتنی آسانی سے اس کی جان چھوڑنے والا نہیں تھا۔ "تو پھر کیسی بات ہے آئی او صاحب؟" میں نے معنی خیز

انداز میں پوچھا۔

"حاجی فضل حسین نے ہمیں بتایا تھا کہ وقوعہ کی سہ پہر میں ملزم، مقتول سے اپنی انویسٹمنٹ کی رقم واپس لینے آیا تھا۔" آئی او وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "حاجی فضل حسین جب آفس پہنچا تو اس نے حاجی شفیق کو اپنے ہی خون میں لت پت پڑے مردہ حالت میں دیکھا۔ اسے یقین ہو گیا کہ یہ گرم دماغ والے انویسٹر مقصود یعنی اس کیس کے ملزم ہی کا کیا دھرا ہے۔ چنانچہ اس نے اس واقعے کی اطلاع دینے کے لیے فوراً تھانے فون کیا پھر جب ہم جائے وقوعہ پر پہنچے تو حاجی فضل حسین نے ہمیں ملزم کے حوالے سے سب کچھ بتا دیا تھا لہٰذا ہم نے ملزم کو اس کے گھر سے گرفتار کر لیا۔"

"آئی او صاحب!" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کڑوے لہجے میں استفسار کیا۔ "کیا پولیس کسی مجرم کی گرفتاری کے لیے اطلاع کنندہ کے یقین اور بیان کو کافی سمجھتی ہے یا تھوڑا بہت اپنا دماغ استعمال کر کے کچھ کارکردگی واقعی بھی دکھاتی ہے۔"

"کیا آپ پولیس ڈیپارٹمنٹ کا مذاق اڑا رہے ہیں؟" وہ خفگی بھرے لہجے میں بولا۔

"ہرگز نہیں۔" میں نے نفی میں گردن ہلائی اور کہا۔ "میں ایسی گستاخی کا تصور بھی نہیں کر سکتا آئی او صاحب۔ اگر آپ کو وضاحت کرنے میں کوئی تردد ہو تو میرے اس سوال کا جواب "ہاں" یا "نہ" میں بھی دے سکتے ہیں۔"

اس نے ناپسندیدہ نظر سے مجھے گھور کر دیکھا۔ مجھے اس کی پسند یا ناپسند سے کوئی غرض نہیں تھی چنانچہ میں نے معتدل انداز میں استفسار کیا۔

"آپ نے کرائم سین (جائے وقوعہ) سے فنگر پرنٹس تو اٹھائے ہوں گے؟"

"جی بالکل..... اٹھائے تھے۔" وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ "جس کرسی کو ملزم نے مقتول کے سر پر توڑا تھا، اس کے ہتھوں پر پائے جانے والے انگلیوں کے نشانات، ملزم کے فنگر پرنٹس سے سو فیصد میچ کرتے ہیں۔ اس کا ایک ہی مطلب ہے....."

"کہ.....؟" آئی او نے جملہ ادھورا چھوڑا تو میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

اس نے بڑے جوشیلے انداز میں جواب دیا۔ "ملزم ہی نے طیش میں آ کر وہ آرم چیئر اٹھا کر مقتول کے سر پر ماری تھی۔"

"اس کا ایک اور بھی مطلب ہے آئی او صاحب!" میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔

"وہ کیا؟" وہ چونکتے ہوئے لہجے میں مستفسر ہوا۔

"وہ یہ کہ....." میں نے گہری سنجیدگی سے جواب دیا۔ "میرا موکل وقوعہ کی سہ پہر مقتول کی میز کی دوسری جانب اسی آرم چیئر پر بیٹھا تھا اس لیے اس کرسی کے ہتھوں پر اس کی انگلیوں کے نشانات ثبت ہو گئے تھے۔ حاجی شفیق کے قاتل نے ملزم کے رخصت ہونے کے بعد دستانے پہنے ہاتھوں سے وہ کرسی اٹھا کر بڑے حاجی کے سر پر اتنی قوت سے ماری کہ وہ موقع پر ہی ہلاک ہو گیا اور اس کے ساتھ ہی وہ آرم چیئر نے بھی جام شہادت نوش فرما لیا تاہم اس کے بکھرے ہوئے اعضا میں سے ہتھوں پر میرے موکل کے فنگر پرنٹس باقی رہ گئے۔ بہرحال....." میں سانس ہموار کرنے کے لیے متوقف ہوا پھر تفتیشی افسر کی طرف دیکھتے ہوئے سلگانے والے انداز میں اضافہ کر دیا۔

"آئی او صاحب! آپ کی وقوعہ جاتی کارکردگی نے مجھے متاثر کیا ہے۔" وہ کچھ بولا نہیں، بس معاندانہ نظر سے مجھے گھور کر رہ گیا۔

اس کے ساتھ ہی عدالت کا وقت ختم ہو گیا۔

جج نے تین ہفتے بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کرنے کا اعلان کر دیا۔ "دی کورٹ از ایڈجارنڈ!"

یہ اکیس دن میرے لیے بڑی اہمیت کے حامل تھے۔ مجھے اس شخص کا کھوج لگانا تھا جو وقوعہ کی سہ پہر "حاجی کارپوریشن" آفس کے ویٹنگ ہال میں مقصود کو دکھا تھا اور وہ بندہ میرے موکل کے لیے قطعی اجنبی تھا۔

☆☆☆

منظر اسی عدالت کا تھا اور گواہوں والے کٹہرے میں چھوٹا حاجی فضل حسین کھڑا تھا۔ فضل حسین کی عمر پچاس سے تجاوز تھی۔ وہ ایک پستہ قامت اور ہٹا کٹا شخص تھا۔ اس نے سب سے زیادہ توجہ اپنی صحت پر دے رکھی تھی جس میں وہ صد فیصد کامیاب بھی نظر آتا تھا۔ اس کی [illegible] توند کو دیکھ کر بخوبی اندازہ ہو جاتا تھا کہ وہ ایک وقت میں سالم بکرا ڈکار جاتا ہوگا۔

جج کرسی انصاف پر براجمان ہو چکا تو عدالتی کارروائی کا آغاز ہوا۔ جج نے وکیل سرکار کی جانب دیکھتے ہوئے معتدل انداز میں کہا۔

"پروسیکیوشن.....!"

وکیل استغاثہ سر کی تعظیمی اثباتی جنبش کے ساتھ وٹنس باکس کے قریب چلا گیا پھر اپنی جرح کی ابتدا کر دی۔

"حاجی صاحب!" اس نے زیرِ سماعت کیس کے مدعی اصل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "مجھے آپ کے بزنس پارٹنر بڑے حاجی صاحب کی ناگہانی موت کا بڑا دکھ ہے۔ اللہ انہیں اپنے جوارِ رحمت میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔"

"آمین....!" چھوٹے حاجی نے مہندی سے رنگی ہوئی داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے حلق سے پُرتاثر آواز خارج کی۔

"آپ نے اپنے تمام انویسٹرز میں ملزم کو سب سے زیادہ اہمیت دی۔" وکیلِ استغاثہ نے کہا۔ "کمینہ اور بے ادب کا خسارہ کوئی معمولی نقصان نہیں ہوتا۔ ان ناسازگار حالات میں تو بعد از آپ کو دوسروں کی مدد کی ضرورت تھی۔ آپ نے ملزم پر احسان کرتے ہوئے مقتول بڑے حاجی صاحب سے اس کی سفارش کی تھی اور اس نے جواب میں کیا کر ڈالا....؟"

"وکیل صاحب! سیانے کہہ گئے ہیں....." وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "اصل سے خطا نہیں اور کم نسل سے وفا نہیں۔ اس دنیا کا یہی دستور ہے جناب والا! آپ جس کے ساتھ بھی بھلائی کریں گے، وہی آپ کو ڈنک مارے گا۔" وہ لمحے بھر کو رکا پھر فلسفیانہ انداز میں اضافہ کر دیا۔ "اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ انسان دوسروں پر احسان کرنا ہی چھوڑ دے۔ جب تک زندگی ہے، دغا اور وفا سے واسطہ پڑتا ہی رہے گا۔ اللہ ہم سب کو اپنی حفظ و امان میں رکھے۔"

"گزشتہ پیشی پر ڈیفنس کی جانب سے ایک نکتہ اٹھایا گیا تھا۔" وکیلِ استغاثہ نے چھوٹے حاجی سے کہا۔ "کہ وقوعہ کی سہ پہر جب ملزم، مقتول سے جھگڑا کر کے آفس سے باہر نکلا تو اس نے ویٹنگ ہال میں ایک شخص کو بیٹھے دیکھا تھا۔ آپ اس بارے میں کیا کہیں گے؟"

"یہ ایک دم بکواس اور جھوٹی بات ہے۔" وہ بُرا سا منہ بناتے ہوئے بولا۔ "وہ جمعے کا دن تھا اور اس روز ہماری کارپوریشن کا آفس بند رہتا تھا۔ ہم نے اس دن کھلے، دو گھنٹے کے لیے آفس کھولنے کا فیصلہ کیا تھا تاکہ ملزم کا حساب چکتا کر دیا جائے۔ عام دنوں میں ہم اسے آفس بلاتے تو یہ بات کھل سکتی تھی کہ ہم نے ملزم کی انویسٹمنٹ والی رقم واپس کر دی ہے۔ جب دوسرے انویسٹرز کو اس کی خبر ہوتی تو وہ بھی اپنی رقم کی واپسی کے لیے ہنگامہ کرتے اور "حاجی کارپوریشن" اس وقت جس مشکل دور سے گزر رہی ہے اس کے پیشِ نظر ہم اپنے خلاف کوئی نیا محاذ کھولنے کی پوزیشن میں ہرگز نہیں ہیں وکیل صاحب!"

"ٹھیک ہو گیا۔" وکیلِ استغاثہ نے سرسری انداز میں کہا۔ "اس کا مطلب ہے جمعے کی نماز کے بعد آفس کھولنے کا فیصلہ ملزم کے ذہن کی اختراع تھی؟"

"جو شخص اپنا ڈھائی لاکھ کا مکان چار لاکھ میں فروخت کرنے کے لیے غلط بیانی سے کام لے سکتا ہے، اس سے کسی بھی درجے کی دروغ گوئی کی توقع کی جا سکتی ہے۔" چھوٹے حاجی نے بات ختم کر کے نفرت بھری نظر سے ملزم کو گھورا۔

وکیلِ استغاثہ نے دو چار ضمنی سوالات کے بعد جرح موقوف کر دی۔

اپنی باری پر میں ڈیفنس باکس کے نزدیک پہنچ گیا اور استغاثہ کے گواہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"حاجی صاحب! میری معلومات کے مطابق آپ نے تین بار حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کر رکھی ہے پھر آپ کے نام کے ساتھ "الحاج" کیوں نہیں لگا ہوا؟"

"میں نمود و نمائش کو پسند نہیں کرتا۔" وہ انکساری کی اداکاری کرتے ہوئے بولا۔ "لوگ تو دوسرے حج کے بعد ہی خود کو "الحاج" کہلوانے لگتے ہیں۔ میں اگر دس بار بھی حج کر آؤں گا تو محض "حاجی" ہی کہلوانا پسند کروں گا۔ اصل عزت تو وہ ہے جو اللہ انسان کو دیتا ہے۔ لوگوں کی دی ہوئی عزت کا کیا بھروسا۔"

"بجا فرمایا آپ نے۔" میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ "بے شک! عزت اور ذلت دینے والی ذات خدا ہی کی ہے....." لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس خارج کی پھر اپنی جرح کو آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔ "آپ اپنے انویسٹرز کی رقوم کو کس قسم کے کاروبار میں لگاتے ہیں؟"

"یہ سوال کچھ عرصہ پہلے آپ کے موکل نے بھی ہم سے کیا تھا۔" وہ طنزیہ انداز میں بولا۔ "جو جواب ہم نے اسے دیا تھا، وہی جواب آپ کے لیے بھی ہے۔" تھوڑی دیر رک کر اس نے اپنی داڑھی کے سرخ بالوں پر ہاتھ پھیرا پھر میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"ہم اس رقم سے اسٹاک خریدتے ہیں۔ پرائز بانڈز کی پوری پوری سیریز خریدتے ہیں۔ رئیل اسٹیٹ کے بزنس میں لگاتے ہیں۔ کروڑوں کی نیلامیوں میں حصہ لیتے ہیں..... وغیرہ وغیرہ!"

"میں جانتا ہوں۔ آپ نے میرے موکل کو بھی یہی جواب دیا تھا لیکن میں یہاں کچھ مختلف کرنے والا ہوں حاجی صاحب!"

"ایسا کیا وکیل صاحب؟" اس نے آنکھیں سکوڑ کر

مجھے دیکھا۔

"میرے موکل نے یہ فراڈ تفصیل سن کر اطمینان بھری خاموشی اختیار کر لی تھی مگر میں چپ بیٹھنے والوں میں سے نہیں ہوں۔ آپ کو بھری عدالت میں میرے ہر سوال کا جواب دینا ہوگا۔"

"آبجیکشن یور آنر!" وکیلِ استغاثہ فوراً اپنے گواہ کی مدد کو لپکا۔ "اس وقت حاجی شفیق مرڈر کیس زیرِ سماعت ہے اور میرے فاضل دوست معزز گواہ کے کاروبار کو فراڈ کہہ کر اس کیس کو کسی اور سمت میں لے جانے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

"بیگ صاحب! آپ کچھ کہنا چاہیں گے؟" جج نے مجھ سے پوچھا۔

"کچھ نہیں..... بہت کچھ جنابِ عالی!" میں نے جذباتی لہجے میں کہا۔

"آبجیکشن اوور رولڈ!" جج نے حتمی لہجے میں کہا۔ "ڈیفنس، پلیز کنٹینیو.....!"

"جنابِ عالی!" میں نے کھنکھار کر گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔ "حاجی کارپوریشن، انویسٹرز اور حاجی صاحبان ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح جڑے ہوئے ہیں کہ انفرادی طور پر کسی ایک کا تذکرہ ممکن نہیں ہے۔ میں نے اگر "حاجی کارپوریشن" کے نام نہاد بزنس کے لیے "فراڈ" کا لفظ استعمال کیا ہے تو ابھی اس بات کو معزز عدالت کے سامنے ثابت بھی کر کے دکھا سکتا ہوں۔ عدالت سے میری اتنی سی استدعا ہے کہ جب تک میں حاجی فضل حسین پر اپنا پوائنٹ آف ویو مکمل نہ کر لوں، وکیلِ سرکار کو "آبجیکشن یور آنر" کا نعرہ لگانے سے باز رہنے کی تلقین کی جائے۔ یہ میرا وعدہ ہے کہ میں کوئی بھی غیر متعلقہ بات کر کے عدالت کا ایک بھی قیمتی لمحہ ضائع نہیں کروں گا۔"

جج نے اثبات میں گردن ہلائی اور کہا۔ "بیگ صاحب! پلیز پروسیڈ۔"

میں نے فاتحانہ نظر سے وکیلِ استغاثہ کی طرف دیکھا پھر رنگی ہوئی داڑھی والے حاجی فضل حسین کی طرف متوجہ ہو گیا۔ میں نے پوچھا۔

"حاجی صاحب! آپ نے ابھی "حاجی کارپوریشن" کے جو نصف درجن کاروبار گنوائے ہیں، وہ عدالت کے ریکارڈ پر محفوظ ہو گئے ہیں۔ ایک چیز کو اچھی طرح ذہن میں بٹھا لیں کہ یہ اپنے انویسٹرز کو ماموں بنانے کے لیے دیا جانے والا کوئی لولی پاپ بھاشن نہیں ہے جس سے آپ جب چاہیں گے منحرف ہو جائیں گے اور آپ کے خون آشام

جبڑوں میں پھنسا ہوا انویسٹر آپ کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکے گا۔ یہ کورٹ روم ہے اور یہاں قانون کی حکمرانی ہے۔ آپ کی زبان سے نکلا ہوا ایک بھی غلط لفظ آپ کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے پہنچا سکتا ہے۔ کچھ سمجھ رہے ہیں نا، میں کیا کہہ رہا ہوں؟"

اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ اس نے تھوک نگل کر حلق تر کیا اور گول مول انداز میں جواب دیا۔ "جانتا ہوں.....!"

"گڈ!" میں نے ایسے کہا جیسے کوئی اسکول ٹیچر کسی بچے کے درست جواب پر ستائشی انداز میں کہتا ہے۔

حاجی فضل حسین سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے کہا۔ "معزز عدالت یہ جاننے میں حد درجہ دلچسپی رکھتی ہے کہ آپ نے "حاجی کارپوریشن" کو باقاعدہ رجسٹر کرا رکھا ہے یا دو نمبری کا یہ دھندا ایسے بے مہار چل رہا ہے؟"

"یہ آپ نے کیسی بات کر دی وکیل صاحب؟" وہ خفگی آمیز لہجے میں غلط بیانی کرتے ہوئے بولا۔ "ہماری یہ فرم باقاعدہ رجسٹرڈ ہے۔"

"یہ تو بہت اچھی بات ہے۔" میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جما کر استہزائیہ لہجے میں۔ "پھر تو آپ کے پاس اس رجسٹریشن کا پکا قانونی ثبوت بھی ہوگا؟"

"جی، بالکل ہے۔" وہ خود کو پُراعتماد ظاہر کرتے ہوئے بولا۔

"اور ان نصف درجن کاروبار کا کیا.....؟"

"میں سمجھا نہیں۔" وہ پلکیں جھپکاتے ہوئے مستفسر ہوا۔

"مطلب یہ کہ آپ کے تمام بزنس جو اس وقت چل رہے ہیں یا ان کے حوالے سے آپ نے لکھت پڑھت بھی کر رکھی ہے؟"

"وکیل صاحب! آپ بھی کیسی بچوں جیسی باتیں کر رہے ہیں۔" وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔

"بچے من کے سچے اور مکر و فریب سے پاک ہوتے ہیں۔" میں نے چھوٹے حاجی کی آنکھوں میں بہت دور تک جھانکتے ہوئے درشت لہجے میں کہا۔ "آپ میرے سوال کا جواب نہ دے کر عدالت کا قیمتی وقت برباد کرنے کے مرتکب ہو رہے ہیں۔"

"انسان اگر دس، بیس ہزار کا لین دین بھی کرتا ہے تو اس کے لیے باقاعدہ لکھت پڑھت کی جاتی ہے یا کم از کم کسی گواہ کو ضرور درمیان میں رکھا جاتا ہے۔" وہ اکڑتے ہوئے انداز میں بولا۔ "ہمارا تو کروڑوں بلکہ اربوں کا بزنس ہے۔ ہم بھلا لیگل ڈاکیومنٹس تیار کیے بغیر یہ کاروبار کیسے چلا سکتے ہیں۔"

"اربوں کے ذکر پر مجھے ایک بات یاد آ گئی ہے لیکن

اس پر میں بعد میں بات کروں گا۔" میں نے سرسری انداز میں کہا۔ "پہلے آپ یہ بتا دیں کہ اگر عدالت ضرورت محسوس کرے تو کیا آپ یہ تمام ثبوت فراہم کر پائیں گے؟"

"کون سے ثبوت؟" بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔

"میں "حاجی کارپوریشن" کی رجسٹریشن اور آپ کے مختلف کاروبار کے ذیل میں کیے جانے والے ایگریمنٹس اور کنٹریکٹس وغیرہ کی بات کر رہا ہوں۔" میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں، ہاں۔" وہ اضطراری لہجے میں بولا۔ "کیوں نہیں... ضرور... عدالت جو بھی ڈاکیومنٹ دیکھنا چاہے گی، میں بہ خوشی پیش کر دوں گا۔"

"آپ کا یہ وعدہ بھی عدالت کے ریکارڈ پر محفوظ ہو چکا ہے حاجی صاحب۔" میں نے سنسنی خیز انداز میں کہا۔ "اب ذرا اربوں کی بات کر لی جائے... میرا اشارہ الف ب کی طرف نہیں ہے بلکہ میں ایک سو کروڑ کے مجموعے والے "ارب" کی بات کر رہا ہوں۔"

چھوٹا حاجی وٹنس باکس میں خاموش کھڑا گھورتی ہوئی نظر سے مجھے دیکھتا چلا گیا۔ میں نے اس کی سماعت نظر کی پروا کیے بغیر ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"میرے موکل نے مجھے بتایا ہے کہ سال بھر پہلے آپ کو یعنی "حاجی کارپوریشن" کو تین ارب کا نقصان پہنچا تھا؟"

"اس خسارے نے تو ہماری کمر توڑ کر رکھ دی ہے وکیل صاحب۔" اس نے ہمدردی سمیٹنے والے انداز میں جواب دیا۔

"اس نقصان کے تذکرے کو دیکھ کر تو یہی لگتا ہے کہ آپ کے ان کاروبار میں فائدہ بھی اسی حساب سے ہوتا ہوگا... ہے نا؟"

"جی بالکل! اگر بزنس میں پرافٹ نہیں ہو رہا ہوتا تو ہم اپنے انویسٹرز کو اتنا بھاری منافع کیسے دے سکتے تھے۔" اس نے کہا۔ "جب سے ہمیں یہ تین ارب کا نقصان ہوا ہے، سارے انویسٹرز ہم سے خفا ہیں کیونکہ پچھلے ایک سال سے ہم انہیں ماہانہ منافع دینے کی پوزیشن میں نہیں رہے۔"

"یہ پوزیشن اب کبھی بھی بحال نہیں ہونے والی حاجی صاحب۔" میں نے دو ٹوک الفاظ میں کہا پھر دھمکی آمیز انداز میں اضافہ کر دیا۔ "آپ کی باقی عمر جیل میں چکی پیستے گزرے گی اور اس "مصروفیت خاص" میں آپ کو ہر دس منٹ کے بعد اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیرنے کا خیال بھی نہیں آئے گا۔"

"مجھے سخت اعتراض ہے جناب عالی!" وکیل استاد کا چہرہ جیسے پھٹ پڑا تھا۔ "میرے فاضل دوست معزز گواہ کی ذات کو تنقید کا نشانہ بنا رہے ہیں۔ یہ بنیادی اخلاقی اصولوں کے منافی ہے لہٰذا موصوف کو ایسی حرکات سے باز رہنے کی تلقین کی جائے۔"

"آبجیکشن سسٹینڈ!" جج نے وکیل استاد کی فریاد پر ایکشن لیتے ہوئے مجھے ہدایت دی۔ "بیگ صاحب! آپ گواہ کے مستقبل میں جھانکنے کے بجائے زیر سماعت معاملات پر فوکس کریں۔ کوئی شخص کورٹ روم سے اپنے گھر جائے گا یا جیل کی سنگلاخ دیواروں کے پیچھے، یہ فیصلہ کرنے کے لیے عدالت موجود ہے۔"

وکیل استاد نے جج کے ریمارکس پر مجھے ایسی نظر سے دیکھا جیسے اس نے کوئی عظیم کارنامہ انجام دے لیا ہو۔ میں آگے اس کے معزز گواہ کے ساتھ کیا کرنے والا تھا اس کا وہم و گمان وہاں تک رسائی حاصل نہیں کر سکتا تھا اس لیے میں نے اسے خوش فہمی میں مبتلا رہنے دیا اور جج کی تاکید کے مطابق، میں نے خود کو چھوٹے حاجی پر فوکس کر لیا۔

"حاجی صاحب!" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "آپ نے معزز عدالت کے سامنے اعتراف کیا ہے کہ "حاجی کارپوریشن" کے کاروبار میں اربوں کا پرافٹ ہوتا رہا ہے۔ جج صاحب نے آپ کے مستقبل میں جھانکنے پر پابندی عائد کر دی ہے لہٰذا میں آپ کے ماضی کے حوالے سے ایک سیدھا اور معصوم سا سوال کرنے کی جسارت کر رہا ہوں۔" میں نے ڈرامائی انداز میں توقف کر کے جج کی طرف دیکھا پھر دوبارہ حاجی فضل حسین کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے سوال کیا۔

"کیا میں ایسا سوچنے میں حق بہ جانب ہوں کہ آپ اپنی اربوں کی انکم پر ہر سال حکومت پاکستان کو ٹیکس ادا کر کے قومی خزانے کا بھلا کرتے ہوں گے؟"

اس کا گندمی چہرہ ایک سیاہ رنگت اختیار کر گیا۔ اس نے مجھ سے ایسے خطرناک سوال کی توقع خواب و خیال میں بھی نہیں کی ہوگی لیکن تھا وہ خاصا کائیاں بندہ۔ اس نے چند لمحات میں خود کو سنبھال لیا۔

"جی بالکل۔" وہ اندرونی بے چینی کو قابو میں لاتے ہوئے بولا۔ "جب ہمارا ہر کاروبار پاکستانی قوانین کے عین مطابق ہے تو پھر ہم اپنی آمدنی کو بھلا چھپا کیسے سکتے ہیں۔"

"یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے حاجی صاحب۔" میں نے سپاٹ آواز میں کہا۔ "آپ ہر سال حکومت پاکستان کو ٹیکس دیتے ہیں یا نہیں؟"

"دیتے ہیں بابا... بالکل دیتے ہیں۔" وہ بڑی

سے بولا۔

"مجھے امید تو نہیں کہ آئندہ آپ کو اس عدالت میں پیش ہونے کا موقع ملے لیکن پھر بھی احتیاطاً مجھے یہ کہنا ہوگا کہ آپ اگلی پیشی پر جب عدالت میں تشریف لائیں تو اپنے ساتھ تمام کاروبار اور انکم ٹیکس کی ادائیگی کا ریکارڈ لانا ہرگز نہیں بھولیے گا ورنہ آپ کے لیے ایک نئی مشکل کھڑی ہو جائے گی۔ جس کے آپ متحمل نہیں ہو سکتے کیونکہ آپ نے پہلے ہی خود کو بہت بڑے عذاب میں ڈال رکھا ہے۔"

"آپ کو میری فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے وکیل صاحب۔" وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔ "میں اپنا اچھا برا خوب سمجھتا ہوں۔"

"آپ نے مجھ سے واسطہ پڑنے سے پہلے جیسا اپنا اچھا ہی سوچا اور سمجھا کیونکہ بُرے سے بھی آپ کا پالا ہی نہیں پڑا تھا لیکن اب وقت بدل چکا ہے حاجی صاحب۔" میں نے سنسنی خیز انداز میں کہا۔ "ویسے "حاجی کارپوریشن" اپنی ایک نئی اور جداگانہ تاریخ مرتب کر رہی تھی کہ..."

میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑا تو وہ اضطراری لہجے میں مستفسر ہوا۔ "آپ کون سی تاریخ کا ذکر کر رہے ہیں... کیا آٹھ جنوری کا... جب بڑے حاجی صاحب کو آپ کے موکل نے قتل کے گھاٹ اتار دیا تھا؟"

"بالکل نہیں۔" میں نے پوری قطعیت سے جواب دیا۔ "میں دیوار پر لٹکے ہوئے کیلنڈر کی تاریخ کی نہیں بلکہ اس دنیا کی بزنس ہسٹری کی بات کر رہا ہوں۔ آج تک اس دنیا کی تاریخ میں کسی بڑے سے بڑے مالیاتی ادارے نے ایسی کوئی اسکیم لانچ نہیں کی جس میں انویسٹمنٹ پر ماہانہ دس فیصد منافع ملتا ہو اور قرض لینے کی صورت میں ماہانہ پانچ فیصد سود دینا پڑتا ہو۔ اس حیرت انگیز اسکیم کا فائدہ اٹھا کر تو کوئی بھی آپ کی کارپوریشن کو بڑی آسانی سے چونا لگا سکتا ہے۔"

"وہ کیسے؟" چھوٹے حاجی کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"حاجی صاحب! سیدھی سی بات ہے۔" میں نے مدلل انداز میں کہا۔ "کوئی میاں بیوی یا کوئی دو دوست یا کوئی بھی دو افراد آپس میں مل جائیں۔ ان میں سے ایک حاجی کارپوریشن سے، مثال کے طور پر دس لاکھ کا لون لے لے، جس پر اسے ماہانہ پانچ فیصد مارک اپ دینا ہوگا۔ دوسرا اسی دس لاکھ کی رقم کو ایک انویسٹر کی حیثیت سے حاجی کارپوریشن کے بزنس میں لگا کر ماہانہ دس فیصد منافع کماتا رہے۔ یعنی رقم آپ کی اور فائدہ کوئی اور اٹھائے لیکن آپ ایسا ہونے تھوڑی دیں گے۔ یہ مایا جال تو آپ نے خود کو امیر اور اپنے کلائنٹس کو غریب بنانے کے لیے پھیلا رکھا ہے لہٰذا ہر سال چھ ماہ کے بعد اربوں کا "خسارہ" تو ظاہر کرنا ہی پڑے گا۔" میں نے چند سیکنڈ کا توقف کر کے ایک بوجھل سانس خارج کی پھر چھوٹے حاجی کو اپنی جرح کے پھندے میں کسنے کی غرض سے ایک اہم سوال کیا۔

"حاجی صاحب! آپ نے میرے موکل کو چار لاکھ کی انویسٹمنٹ کا جھانسا دے کر اس کا جو آبائی مکان اپنے نام کروا لیا تھا وہ ابھی تک آپ ہی کی ملکیت ہے یا آپ نے اسے کسی اور پارٹی کو فروخت کر دیا ہے؟"

"اس گھر میں ہماری کارپوریشن کا ایک قرض دار شکیل نامی شخص رہائش پذیر ہے۔" اس نے بتایا۔ "البتہ جب تک شکیل ہمارا سارا قرضہ واپس نہیں کر دیتا، وہ گھر میرے ہی نام رہے گا۔"

"مطلب چار لاکھ قرض کی اصل رقم اور اس رقم پر ماہانہ پانچ فیصد سود کو شامل کر کے جو اماؤنٹ بنے گا وہ شکیل کو ہر صورت ادا کرنا ہوگا؟"

"ظاہری بات ہے۔" وہ ڈھٹائی سے بولا۔

"کیا آپ کے اس قرض دار کے ایک سے زیادہ نام ہیں؟" میں نے سرسری انداز میں سوال کیا تاکہ اسے کسی قسم کا شبہ نہ ہو۔

"نہیں تو..." وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "اس کا تو ایک ہی نام ہے۔"

"اور وہ شکیل نامی شخص اپنی فیملی کے ساتھ پچھلے لگ بھگ ایک سال سے محمود آباد والے اس گھر میں رہ رہا ہے جو آپ نے میرے موکل سے ہتھیا لیا تھا؟"

"اگر آپ "ہتھیا لیا" کے الفاظ اپنے سوال سے نکال دیں تو میرا جواب "ہاں" میں ہوگا۔" وہ سوچتی ہوئی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ "کیونکہ میں نے ظلم سے وہ مکان ہتھیایا نہیں بلکہ چار لاکھ کی انویسٹمنٹ کے بدلے میں خریدا تھا۔ وہ انویسٹمنٹ جس پر آپ کے موکل نے اسی ہزار کا منافع بھی اٹھایا تھا۔"

"اب وہ انویسٹمنٹ کہاں ہے؟" میں نے کرخت لہجے میں استفسار کیا۔ "اور ماہانہ چالیس ہزار کا منافع ملنا کیوں بند ہو گیا۔ ایک سال کا منافع چار لاکھ اسی ہزار بن جاتا ہے۔ اصل رقم چار لاکھ کو بھی شامل کر لیا جائے تو کل ملا کر آٹھ لاکھ اسی ہزار ہو جائیں گے۔ آپ یہ اماؤنٹ میرے موکل کو کب دے رہے ہیں؟"

"ہماری کارپوریشن کے حالات آپ کے سامنے ہیں۔"

"بچاؤ میں لگی تمہاری فراڈ کارپوریشن۔" میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے جارحانہ لہجے میں کہا۔ "مجھے تم جیسے لوگوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میری تمام تر ہمدردیاں اپنے موکل کے ساتھ ہیں۔ بتاؤ، تم محمود آباد والا وہ مکان کب میرے موکل کے نام پر ٹرانسفر کر رہے ہو؟"

"جیسے ہی ہماری کارپوریشن کے حالات سازگار ہوں گے، ہم اپنے انویسٹرز کی ایک ایک پائی ادا کر دیں گے۔" وہ مسکین سی صورت بنا کر بولا۔

"ایسا دن کبھی نہیں آنے والا فضل حسین....." میں نے زہریلے انداز میں کہا۔ پھر جج کی جانب دیکھتے ہوئے اضافہ کیا۔ "جناب عالی! یہ حاجی جس شخص کو شکیل بتا رہا ہے اس کا اصل نام طفیل ہے اور وہ اپنی فیملی کے ساتھ نہیں بلکہ اکیلا ہی اس گھر میں رہ رہا ہے۔ وہ صرف رات کو وہاں سونے کے لیے جاتا ہے۔ دن بھر وہ گھر بند رہتا ہے۔ میں نے کئی دن کی ریسرچ کے بعد یہ راز پایا ہے۔ معزز عدالت میرے بیان کی تصدیق کے لیے ابھی کسی کو بھیج کر اہل محلہ سے پوچھ تاچھ کروا سکتی ہے۔ مذکورہ مکان گلی نمبر چار محمود آباد میں واقع ہے اور اس مکان کا نمبر..... ہے اور سب سے اہم بات یہ کہ....." میں نے ڈرامائی انداز میں توقف کر کے حاضرین عدالت پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی پھر انکشاف انگیز لہجے میں کہا۔

"طفیل نامی وہ شخص حاجی فضل حسین کا خاص آدمی ہے۔ میرے موکل نے وقوعہ کی سہ پہر اسی طفیل کو "حاجی کارپوریشن" کے ویٹنگ ہال میں بیٹھے دیکھا تھا اور طفیل نے سردی سے بچاؤ کا ڈھونگ رچا کر اپنے ہاتھوں پر اونی دستانے بھی پہن رکھے تھے۔ استغاثہ کے معزز گواہ فضل حسین نے ایک تیر سے دو شکار کرنے کا خونی کھیل کھیلا تھا۔ ایک طرف یہ..... اپنے بزنس پارٹنر کو ٹھکانے لگا کر پورے بزنس پر اکیلا قابض ہونے کا خواہش مند تھا تو دوسری جانب اس چال باز نے میرے موکل کو خاموش کرنے کے لیے اسے حاجی شفیق احمد کے قتل میں ملوث کرنے کا پروگرام بنایا تھا لیکن ملزم کی قسمت اچھی تھی کہ اس کا کیس میرے ہاتھ میں آ گیا۔ [illegible]"

ادھر میرے دلائل اختتام پذیر ہوئے، ادھر..... فضل حسین تیورا کر وٹنس باکس کے چوبی فرش پر "دھڑام" سے گرا۔ میں نے اس انداز میں اس کی گھناؤنی سازش کا پردہ فاش کر دیا تھا کہ اسے کٹہرے کی ریلنگ تھامنے کا بھی موقع نہیں مل سکا تھا۔

☆☆☆

[illegible] پر عدالت نے میرے موکل [illegible] کو باعزت بری کر دیا۔ پچھلی پیشی پر میں نے فضل حسین اور طفیل کو جس کھلے انداز میں بے نقاب کیا تھا اس کے بعد پولیس نے کچھ زیادہ ہی مستعدی دکھاتے ہوئے اسی روز فضل حسین اور طفیل کو اپنی تحویل میں لے لیا تھا۔

وہ دونوں وہائٹ کالر کرمنل تھے۔ پولیس کسٹڈی میں وہ دو گھنٹے تک بھی "تفتیش" کا سامنا نہ کر سکے اور انھوں نے ذہنی اور جسمانی تشدد سے محفوظ رہنے کے لیے بڑی شرافت سے اقبال جرم کر لیا تھا۔

رہائی کے ایک ہفتے بعد مقصود اور نوشابہ مجھ سے ملنے اور میرا شکریہ ادا کرنے آفس آئے۔ ہمارے درمیان آدھے گھنٹے تک باتیں ہوتی رہیں۔ اسی دوران میں نوشابہ نے اچانک مجھ سے پوچھ لیا۔

"بیگ صاحب! کیا آپ کو واقعی کسی سماجی تنظیم نے مقصود کا کیس سونپا تھا؟"

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور دریافت کیا۔ "کیا آپ کو اس میں کسی شک کی گنجائش دکھائی دیتی ہے؟"

"ایسی بات نہیں ہے بیگ صاحب!" مقصود نے جلدی سے کہا۔ "دراصل ہم کئی دن سے اس بارے میں سوچ رہے تھے کیونکہ آج کل سماجی اور فلاحی اداروں کی ساکھ پر عموماً سوال اٹھائے جاتے ہیں۔"

"اور حاجیوں کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟" میں نے پوچھا۔ "کیا تمام حاجی فضل حسین اور شفیق احمد کی طرح سماج دشمن عناصر ہوتے ہیں؟"

"ہرگز نہیں بیگ صاحب!" وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "بات درحقیقت یہ ہے کہ بعض بُرے اور جرائم پیشہ افراد نے معزز انسانوں والے حلیے اختیار کر کے اپنے نام کے ساتھ حاجی یا مولانا لگا لیا ہے اور یہ معاشرتی ناسور اپنے بہروپ سے سادہ لوح انسانوں کو دھوکا دے کر مستند مولانا اور حاجیوں کا نام بدنام کرتے ہیں۔"

"قصہ مختصر.....!" میں نے باری باری ان میاں بیوی کے چہروں کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے معنی خیز انداز میں کہا۔ "یہ راز آپ لوگوں نے پا ہی لیا کہ عقل بادام کھانے سے نہیں، دھوکا کھانے سے آتی ہے۔"

"یس سر!" نوشابہ کھلکھلا کر ہنس دی اور میرے ہی انداز میں دہرایا۔ "قصہ مختصر.....!"

(تحریر: حسام بٹ)

آلو گوشت کا سالن بہت مزیدار تھا۔ ساتھ تنور کی گرم روٹی، دہی کی چٹنی اور سلاد بھی تھا۔ لقمہ بنا کر منہ میں ڈالتے ہوئے ڈرائیور ابرار نے ہوٹل کے ٹی وی اسکرین پر نظر ڈالی۔ سامنے بہت ہی شاندار ملی نغمہ چل رہا تھا۔

''معلوم نہیں کیسے آزاد ہیں ہم۔ اسے کہتے ہیں آزادی؟'' کھانے کا ذائقہ نظر انداز کر کے اس نے حالات کی کڑواہٹ اپنے اندر اتارنا شروع کر دی۔

آج 14 اگست کا دن تھا۔ پوری قوم ملی جوش و

دیارِ غیر میں دھوپ چھاؤں کا کھیل کھیلنے والے ایک حساس مسافر کی روداد

امیدِ صبحِ جمال

عتیق بخاری

یہ مٹی... نہ جانے کتنے رازوں کی امین ہے... جانے کتنے اسرار چھپائے مختلف حیلوں سے انسانوں کے امتحان لیتی آئی ہے... کسی کو خود میں ملا کر خوش ہوتی ہے اور کسی کے دل میں خوشبو بن کر بس جاتی ہے... کہیں پرانے رستوں کی یادوں میں ڈھل جاتی ہے اور کہیں نئے رستے بن کر پیروں تلے بچھ جاتی ہے مگر... اس میں پوشیدہ درد اور چبھن کا بھید آج تک کوئی نہ پا سکا... وہ بھی وطن کی مٹی کی خوشبو کا اسیر ہو چکا تھا... جس سے دوری کا درد وہ برداشت نہ کر سکا۔

جذبے کے ساتھ یوم آزادی منا رہی تھی اور ابرار سوچ رہا تھا کہ اسے حقیقی معنوں میں آزادی نہیں ملی۔ تین بھائیوں میں ابرار کا تیسرا یعنی آخری نمبر تھا۔ بڑے دونوں بھائی شادی شدہ تھے۔ بڑا بھائی شادی کے کچھ عرصے بعد بیوی کے ساتھ الگ ہو گیا تھا۔ دوسرے نمبر والا اسرار، اس کی بیوی، تین بچے، ابرار اور بیوہ ماں اکٹھے رہتے تھے۔ بڑا بھائی اقرار کلرک تھا۔ اسرار کی پنساری کی چھوٹی سی دکان تھی۔ ابرار ماں کی شدید خواہش کے باوجود زیادہ نہ پڑھا اور تعلیم ادھوری چھوڑ کر ڈرائیوری کرنے لگا۔ زیادہ تنخواہ کے لیے یا حالات بدلنے کے لیے وہ اکثر نوکری بدلتا رہتا لیکن پھر جلد ہی اسے لگتا کہ نیا مالک بھی اسے کچھ زیادہ رقم نہیں دے رہا اور وہ اپنے مالک کا غلام بن کر حالات میں جکڑا ہوا ہے۔ اسے اپنی مرضی سے زندگی جینے کا حق نہیں ملا۔

14 اگست کا دن تھا اور رات بھر کام کرنے کے بعد اس نے ناشتا بھی ڈھنگ کا نہیں کیا تھا کیونکہ صبح ہی اسے اچانک مالک نے کہیں اور جانے کا حکم دے دیا تھا۔ اس نے راستے میں ٹھیلے سے چنا چاول کھائے تھے اور چائے کا کپ گھڑی پر ٹائم دیکھتے ہوئے ادھورا چھوڑ دیا تھا۔ اب کچھ دیر پہلے وہ فارغ ہوا تھا اور دوپہر کا کھانا کھانے کے لیے ہوٹل میں آ گیا اور کھانا کھاتے ہوئے ٹی وی دیکھ کر کڑھنا شروع کر دیا۔

”معلوم نہیں کیسے آزاد ہیں ہم؟ اسے کہتے ہیں آزادی؟ سارا دن اور کبھی کبھی چوبیس گھنٹے دھوپ چھاؤں، نیند آرام، بھوک پیاس کی پروا کیے بغیر کام کرو اور اس پر بھی معلوم نہیں کہ محنت کا پورا معاوضہ ملے گا کہ نہیں۔ گھٹے بندھے کاموں میں جکڑے ہم اب بھی حالات کے ہاتھوں غلام بنے ہوئے ہیں۔ منائیں بھی منائیں جشنِ آزادی، وہ لوگ جو واقعی آزاد ہیں اور جن کے پاس دولت کی ریل پیل ہے۔“ پانی کا گلاس پی کر میز پر رکھتے ہوئے وہ بڑبڑایا اور ویٹر کو بل کے لیے اشارہ کیا۔

☆☆☆

اقرار، اسرار اور ابرار کے بعد صابرہ بی بی نے بیٹی کی بڑی خواہش کی۔ بڑی دعائیں مانگیں لیکن وہ اس خوشی سے محروم رہیں۔ اللہ نے اسے جو تین نعمتیں عطا کی تھیں، وہ دن میں کئی بار اس پر شکر بجا لاتیں اور ساتھ ساتھ بیٹی کا شوق کرتے ہوئے کہتیں۔ ”اقرار کی شادی کروں گی اور اس کی پہلی بیٹی میں لے لوں گی۔“

ابرار آٹھویں کلاس میں تھا کہ والد کا انتقال ہو گیا۔ تینوں بھائی ابھی پڑھ رہے تھے۔ بیوہ صابرہ بی بی پر بڑا بوجھ پڑ گیا تھا۔ انہوں نے سلائی مشین رکھی اور دن رات ایک کر کے سلائی کرنے لگیں۔ اقرار ایف اے کر کے ایک دکان پر ملازمت کرنے لگا۔ تھوڑے سے پیسے وہ بھی لے آتا۔ یوں چار زندگیاں چلنے لگیں۔ صابرہ بی بی کے لیے وہ بہت بڑا دن تھا جب اقرار نے انہیں پرائیویٹ طور پر بی اے کرنے کی خوشخبری سنائی اور وہ دن تو گویا عید کا دن تھا جب اقرار کلرک بن گیا۔ اس خوددار عورت نے پھر بھی سلائی کرنا جاری رکھا۔ انہوں نے کہا۔ ”چلو، اب راتوں کو جاگ جاگ کر کام نہیں کروں گی لیکن دن میں ضرور کروں گی۔ بیٹے پر چار جانوں کا بوجھ ڈالنا مناسب نہیں۔“

صابرہ، اقرار کے لیے اپنے ہی جیسے متوسط گھرانے سے لڑکی لے آئیں لیکن وہ چند ہی دن میں اقرار کے لیے اتنی خاص ہو گئی کہ پہلے بچے کی پیدائش سے پہلے ہی صابرہ کے بیٹے کو اس سے الگ کر کے لے گئی۔ صابرہ بی بی نے اپنے تھوڑے سے زیور جو انہوں نے آج تک سنبھال کر رکھے تھے، بیچ کر اسرار کو پنساری کی دکان کھلوا دی۔ وہ گزارے لائق کمانے لگا۔ ابرار کے لیے ماں کے دل میں ارمان تھا کہ وہ پڑھائی پوری کرے۔ کوئی بڑا افسر بنے لیکن کچھ اس کی اپنی پڑھائی میں عدم دلچسپی اور کچھ گھریلو حالات نے اس کا دل پڑھائی سے اچاٹ کر دیا۔ اس نے ڈرائیوری سیکھنا شروع کر دی۔ صابرہ بیگم نے اسرار کی بھی شادی کر دی۔ بڑی بہو کی ستائی ہوئی صابرہ کافی ڈری ہوئی تھیں لیکن ان کے خدشات غلط ثابت ہوئے اور اسرار کی دلہن سعدیہ بہت اچھی بہو ثابت ہوئی۔ وہ ابرار کو بھائیوں کی طرح چاہنے لگی۔ شادی کے بعد چند ہی دنوں میں اس نے اندازہ لگا لیا کہ اس کے شوہر کی کمائی اتنی خاص نہیں اور ابرار بھی ابھی کماتا نہیں اس لیے ساس سلائی کا کام کرتی ہے۔ وہ فوراً ساس کے ساتھ مشین پر آ بیٹھی۔ شادی کو تقریباً دو ماہ ہوئے تھے کہ سعدیہ نے جہیز کی سلائی مشین نکالی اور برآمدے میں چٹائی پر موجود ساس کی مشین کے ساتھ اپنی سلائی مشین لا کر رکھ دی۔

”تم کیا سینے لگی ہو سعدیہ؟ تمہارے کپڑے تو ابھی کافی سلے ہیں۔“ صابرہ نے حیرانی سے بہو سے سوال کیا۔

”امی! میں نے سوچا ہے کہ آپ اکیلی نہیں بلکہ اب ہم دونوں مل کر سلائی کریں گے۔“ سعدیہ نے بڑے ادب اور لاڈ بھرے انداز میں کہا۔

”نہیں، نہیں۔ تمہاری ابھی نئی نئی شادی ہوئی ہے۔ تم

کھاؤ پیو، اوڑھو پہنو۔ یہ تو میں بس فارغ ہوتی ہوں، کیا کرتا ہے سارا دن اس لیے......“ صابرہ جلدی جلدی بولنے لگیں لیکن سعدیہ نے مسکراتے ہوئے بات کاٹ دی۔

”امی جی! میں اس گھر کی فرد ہوں۔ اس کا، یہاں کے رہنے والوں کا خیال رکھنا، یہاں کے مسائل کو سمجھنا میرا فرض ہے۔ میں طے کر چکی ہوں کہ مل کر کام کرنا ہے اس لیے اب وقت ضائع نہ کریں۔ جن کے سوٹ سلائی کرنے ہیں، انہوں نے لینے کے لیے آ جانا ہے۔ پکڑائیں ادھر کپڑے۔“ یہ کہہ کر سعدیہ نے سلائی شروع کر دی۔

صابرہ بیگم نے خوشی و تشکر سے بہو کی جانب دیکھا۔ اب صابرہ کی زندگی میں رونق سی آ گئی تھی۔ دونوں ساس بہو مل کر صفائی کرتیں اور ناشتا وغیرہ بناتیں۔ سعدیہ ناشتے کی روٹیوں کے ساتھ ہی دوپہر کی روٹی پکا کر ہاٹ پاٹ میں رکھ لیتی اور صابرہ بیگم سالن پکا کر فریج میں رکھ دیتیں پھر دونوں چٹائی پر آمنے سامنے بیٹھ کر خوب باتیں بھی کرتیں اور سلائی بھی۔ صابرہ بیگم اسے اپنی زندگی کی کہانیاں سناتیں اور سعدیہ اپنی، اپنی سہیلیوں اور محلے کی مزاحیہ باتیں سنا کر ساس کو بار بار ہنسا دیتی۔

اسرار روزانہ اور ابرار کبھی کبھی دوپہر کا کھانا کھانے گھر آتا تھا۔ سعدیہ اٹھ کر دونوں کو کھانا دیتی۔ وہ دونوں بھی اسی وقت لنچ کر لیتیں۔ یہی ان کا بریک ٹائم ہوتا۔ لنچ کے بعد سعدیہ ساس کو آرام کرنے کا کہہ دیتی اور خود ”میں بھی ابھی لیٹتی ہوں“ کہتے کہتے کافی کام کر لیتی پھر ذرا جھپکی لینے کو لیٹ جاتی تو صابرہ بیگم اس کے اٹھنے سے پہلے ہانڈی پکنے کو رکھ دیتیں اور چائے بنا کر کہتیں۔ ”اٹھ کر چائے پی لو۔ کئی بار کہا ہے پورا آرام کر لیا کرو مگر میری سنے تو پھر ہے نا۔ لو بڑی کڑک چائے بنائی ہے۔ اللہ بخشے تمہارے سسر کو، انہیں ایسی چائے بہت پسند تھی۔ کہتے تھے ایک دم ساری تھکن اتر جاتی ہے۔“

سعدیہ آنکھیں ملتے ہوئے اٹھ بیٹھتی اور چائے کے گھونٹ لیتے ہوئے ساس کی تعریف کرتی اور پھر انہیں آٹا گوندھ کر دیتی اور خود مغرب تک سلائی کرتی۔ وہ جوان تھی اس لیے زیادہ کام کر لیتی تھی۔ بیٹوں کے آنے پر صابرہ بیگم روٹیاں پکاتیں۔

دن یونہی گزر رہے تھے کہ صابرہ بیگم کو ایک اور خوشی ملی۔ بڑی بہو کے دو بیٹے تھے۔ اسرار کو خدا نے لڑکی سے نوازا۔ گھر میں تین بیٹوں اور دو پوتوں کے بعد لڑکی کے جنم نے صابرہ بیگم کی آنکھوں سے آنسو جاری کر دیے۔ ابرار بھی بہت خوش تھا۔ بچی کا نام نورالعین رکھا۔

”امی نے اسے بیٹی بنا لیا اس لیے میرے اس سے دو دو رشتے ہیں۔ میری بہن بھی ہے اور بھتیجی بھی، کیوں اسرار بھائی! ٹھیک کہا نا میں نے؟“ ابرار نے مسکراتے ہوئے نور العین کو بھائی کو تھماتے ہوئے کہا۔

”بھئی تمہاری بھتیجی ہے، جو مرضی کہو، جو مرضی کرو۔ میں کون ہوتا ہوں دخل اندازی کرنے والا۔“ اسرار کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔ وہ خوشی سے سرشار تھا۔ اس نے واضح محسوس کیا کہ بڑے بھائی کی بیوی کے رویے کی وجہ سے اس کے دونوں بیٹوں کی پیدائش نے اس کی ماں کو اتنی خوشی نہیں دی جتنی اس کی بیٹی کے آنے نے دی ہے۔ اسے بیٹی کا باپ ہونے پر بڑا فخر محسوس ہوا۔

ابرار نے محلے بھر میں اور جاننے والوں میں مٹھائی بانٹی۔ اپنے دوستوں کو بریانی کھلائی۔ ”بھئی میں بیک وقت بھائی اور چچا بنا ہوں، کھانا کھلانا تو بنتا ہے۔“ وہ خوشی سے نہال کہتا پھر رہا تھا۔ چند ہی دنوں میں ابرار کو ڈرائیور کی ملازمت مل گئی۔ ماں کو اب اس کے بیاہ کی فکر ہوئی۔

”نہیں امی جی! میرے بچے ایسے حالات میں پیدا نہیں ہوں گے جن میں میرے دونوں بھائیوں کے ہوئے ہیں۔ میں خوب کمائی کر کے حالات بدلوں گا پھر شادی کروں گا۔“

”کیوں، کیا ہوا ہے حالات کو؟ پیٹ بھر کھانا، چھت ہے سر پہ۔ چاہنے والے رشتے دار بھی ہیں اور کیا چاہیے؟“ صابرہ بولیں۔

”مجھے اس سے زیادہ چاہیے۔“ ابرار نے کہا اور اٹھ کر چلا گیا۔ جوں جوں دن گزر رہے تھے، ابرار کے کڑھنے میں اضافہ ہو رہا تھا۔ جب وہ گھر آتا تو ماں اور بھابی کو سلائی مشین پر بیٹھا دیکھ کر کوفت زدہ ہو جاتا۔

”لوگوں کی عورتیں رنگ برنگے فیشن کے کپڑے پہن کر لاکھوں کی شاپنگ کر رہی ہیں اور ہماری عورتیں چند سو روپوں کے لیے لوگوں کی مزدوری کر رہی ہیں۔“ بھائی کی دکان پر جاتا تو افسردہ ہو جاتا۔ ”بحث کر کر کے قیمت کم کروا کر چند روپوں کی چیزیں خریدنے والی عورتیں بھلا کیا منافع دے کر جاتی ہوں گی؟ بھلا یہ بھی کوئی زندگی ہے۔“

دن گزرتے گئے۔ اماں اسے شادی کا کہہ کہہ کر چپ ہو گئی تھیں۔ نور العین تیسری جماعت میں آ گئی تھی۔ اس کے دو بھائی بھی اس دنیا میں آ چکے تھے۔ ابرار نے بھابی اور ماں کو بڑھتے خرچوں کے باوجود سلائی سے روک دیا تھا۔ وہ ماں کو الگ پیسے دیتا اور بھابی کو بچوں کے لیے الگ دے کر ڈھیروں دعائیں لیتا لیکن اس کی زندگی اسے پھر بھی اچھی نہ

تھی اور پھر وہ دن آ گیا جس نے ابرار کی زندگی اس کی خواہش کے مطابق بدل دی۔

وہ ٹرک لے کر شہر سے باہر جا رہا تھا۔ ایک موڑ سے گزرتے ہوئے اس کی نظر ایک ٹیڑھی میڑھی گاڑی پر پڑی۔ واضح لگ رہا تھا کہ کوئی ایکسیڈنٹ ہوا ہے۔ اس نے تیزی سے بریک لگائے۔ یہ سوچ کر کہ شاید کوئی شخص زخمی حالت میں مدد کا منتظر ہو۔ اس نے نیچے اتر کر دیکھا تو واقعی وہاں دو آدمی زخمی حالت میں بے ہوش پڑے تھے۔ ان میں سے ایک جو کافی مہنگے لباس میں تھا، وہ تو تقریباً ساکت تھا۔ اس کی حالت کچھ زیادہ ہی تشویشناک تھی۔ ابرار نے دیکھا گاڑی میں دو تین بیگ اور بریف کیس تھے۔ اس نے جلدی سے موبائل نکالا کہ ایمبولینس کے لیے فون کرے لیکن بدقسمتی سے سگنل نہیں آ رہے تھے اور اتنی سنسان جگہ تھی کہ کوئی آدمی بھی مدد کرنے کے لیے موجود نہ تھا۔ ابرار نے مایوس ہونے کے بجائے ہمت کی اور دونوں آدمیوں کو اٹھا کر ٹرک میں ڈالا اور تیزی سے ڈرائیو کرتے ہوئے انہیں اسپتال پہنچایا۔ وہاں کی ضروری کارروائی سے فارغ ہو کر وہ دوبارہ اسی جگہ پہنچا جہاں سے وہ زخمی ملے تھے۔ دراصل اسے یہ بھی خیال تھا کہ اگر وہ ان لوگوں کا سامان بھی بچا لے تو مزید نیکی کا کام ہو جائے گا۔ اس نے گاڑی کے ٹوٹے دروازوں میں سے سامان نکالا اور احتیاط سے لا کر ٹرک میں رکھنے لگا۔ اچانک ایک بریف کیس چھوٹ کر گر گیا۔ اس کی حالت خراب تو ایکسیڈنٹ کے وقت ہی ہو گئی تھی۔ اب جب ابرار کے ہاتھ سے گرا تو بریف کیس آدھے سے زیادہ ٹوٹ گیا۔ ابرار کی آنکھیں کھل گئیں۔ اس میں زیورات کے ڈبے اور ایک نوٹوں بھرا لفافہ تھا۔ پھولا لفافہ دیکھ کر ہی پتا چل رہا تھا کہ اس میں کافی رقم ہے۔ ابرار نے لفافہ کھولا۔ واقعی بہت بڑی رقم تھی۔ ساری زندگی حلال کی کمائی کھانے اور ماں کی تربیت پانے والے نے کسی بھی قسم کا لالچ یا نیت خراب نہ کی حالانکہ وہ چاہتا تو جس زندگی سے ناخوش تھا، اسے بدل سکتا تھا لیکن اس کے بجائے اس نے اس بریف کیس کو جوڑا اور سارے بیگز اور دیگر بریف کیس ...... دو تین بڑے بوروں میں ڈال کر رکھ دیے۔ یہ بورے اس کے ٹرک میں پڑے رہتے تھے اور مختلف چیزوں کے لانے لے جانے میں استعمال ہوتے تھے۔ گھر لا کر اس نے وہ سامان ماں کے کمرے میں یہ کہہ کر رکھ دیا کہ کسی دوست کا ضروری سامان ہے۔ دو چار دن میں اٹھا لے جائے گا۔

اگر وہ لوگ زندہ بچ گئے تو انہیں دے دوں گا۔

خدانخواستہ دوسری صورت میں ان کے گھر کا پتا ڈھونڈ کر وہاں پہنچا دوں گا۔ ابرار نے سوچا تھا۔ دو دن گزرے تھے کہ اسے اسپتال سے فون آ گیا۔ جہاں اس نے دونوں زخمی پہنچائے تھے، اس نے وہاں اپنا نمبر دیا ہوا تھا کہ ان کے ہوش میں آتے ہی اسے اطلاع دی جائے۔ دونوں زخمی ہوش میں آنے کے بعد اب یہ چاہ رہے تھے کہ اپنے محسن سے ملیں۔ ابرار اسپتال گیا تو اس کی ملاقات اس شخص سے کروائی گئی جس نے حادثے کے روز زیادہ مہنگا لباس پہنا ہوا تھا۔

احسان علی نامی وہ آدمی ابرار سے بڑی محبت سے ملے۔ بستر پر لیٹے لیٹے اپنے دونوں ہاتھوں سے ابرار کا ہاتھ گرمجوشی سے تھام لیا۔

”بیٹا! کن خوش نصیب والدین کے بیٹے ہو جو یہ نیک کام کیا، وہ بھی اس وقت جب ایک ظالم ٹکر مار کر بجائے بچانے کے بھاگ گیا تھا اور میرا اپنے ہی وطن کے لوگوں سے اعتبار اٹھ گیا تھا۔ تم نے اپنا خوبصورت کردار نبھا کر میری رائے بدل دی۔“ احسان علی کہہ رہے تھے۔ جواب میں ابرار مسکرایا۔

”سر! بطور انسان اور مسلمان یہ میرا فرض تھا۔“ اس نے سادگی و سچائی سے کہا پھر پوچھا۔ ”دوسرے بھائی صاحب کیسے ہیں؟“

”وہ میرا ڈرائیور ہے شوکت علی۔ ماشاءاللہ وہ تو مجھ سے زیادہ بہتر حالت میں ہے۔ ڈاکٹرز ہم دونوں بالخصوص میرا بچ جانا معجزہ قرار دے رہے ہیں۔ بیٹا! تم بتاؤ میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں۔ کیسے تمہارا شکریہ ادا کروں؟“ احسان علی کا لہجہ جذباتی ہو گیا۔

”ارے چھوڑیں سر شکریے کو۔ یہ خدا کا کرم ہے۔ وہ زندگی دینے...... والا ہے۔ آپ ذرا میری بات غور سے سنیں۔“ یہ کہہ کر ابرار ان کے قریب ہوا اور آہستگی سے انہیں ان کے سامان کے ملنے اور سنبھالنے کے متعلق بتایا تو احسان علی کی آنکھوں سے شکر گزاری کے آنسو جاری ہو گئے۔ انہوں نے ابرار کو اپنے بارے میں تفصیلاً بتایا۔

”میں امریکا میں رہتا ہوں۔ وہاں بڑا اچھا کام چل رہا ہے۔ دس دن بعد بیٹی کی شادی ہے۔ میں پاکستان آ کر شاپنگ کرنے اپنے ڈرائیور کے ساتھ گیا۔ گھر والوں کو فون کیا تھا کہ ہم دونوں تھوڑی ہی دیر میں دوپہر کا کھانا گھر آ کر کھائیں گے۔ بیٹی کے لیے جی بھر کر خریداری کی لیکن بدقسمتی سے حادثہ پیش آ گیا لیکن کرم اس رب کا کہ تمہیں میری جان اور مال بچانے کے لیے بھیج دیا۔“

چند دنوں بعد ابرار نے ان کا سامان ان کے گھر جا کر ان کے بیٹے کے حوالے کر دیا۔ احسان علی ابھی اسپتال میں ہی تھے۔ ان کے گھر والوں کو بھی ابرار کے بارے میں سب پتا چل گیا تھا۔ انہوں نے اس کی خوب آؤ بھگت کی اور احسان علی کی بیوی نے ابرار کو کچھ رقم بطور انعام دینا چاہی۔

”فرض ادا کرنے کی کوئی قیمت نہیں ہوتی آنٹی جان! بس دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔“ کہہ کر ابرار انہیں مزید حیران و خوش کر کے چلا آیا۔

تقریباً مہینا گزرا تھا کہ ابرار کو احسان علی کا فون آیا۔

”بیٹا! چند دنوں تک امریکا واپس جا رہا ہوں۔ تمہاری آنٹی بھی ساتھ جا رہی ہیں۔ سو چا اپنے محسن بیٹے سے ایک ضروری بات کر لوں۔“

”جی سر! کریں ضروری بات، میں سن رہا ہوں۔“ ابرار نے ادب سے کہا۔

”اگر تمہیں کوئی اعتراض نہ ہو تو میں تمہیں اپنے ساتھ امریکا لے جانا چاہتا ہوں۔ دراصل میں تمہیں، تمہاری اتنی بڑی نیکی، اتنا بڑا احسان، جان بچانا اور بے تحاشا دولت لوٹا دینا، اس سب کے شکریے کے طور پر اپنے خرچ پر وہاں لے جا کر تمہاری قسمت بدلنا چاہتا ہوں۔ اگر منظور ہے تو ضروری کاغذات لے کر کل ہی مجھ سے ملو۔“

ابرار کی آنکھیں حیرت و خوشی سے کھل گئیں۔ وہ اس آفر پر فوراً سجدہ ریز ہونا چاہتا تھا۔ کیسے اس کی دل کی مراد بر آئی۔ وہ زیادہ کمائی کرنے بیرون ملک جا رہا تھا، وہ بھی امریکا۔

”جی سر! میں چلوں گا۔“ اس نے فوراً ہاں کر دی۔

☆☆☆

نور العین بہت غصے میں تھی۔ ”چاچو! اتنی دور کیوں جا رہے ہیں؟ مجھے اسکول چھوڑنے کون جائے گا؟ اور میرے لیے اچھی چیزیں خرید کر کون لائے گا؟“ نور کا خیال تھا اس کے لیے اس کا چاچا بہت اچھی خریداری کرتا ہے۔

”ارے میری نور گڑیا! چند سال کی تو بات ہے پھر میں تمہارے لیے اتنا کچھ لے کر آؤں گا کہ تمہاری سہیلیاں اور پورا محلہ حیران رہ جائے گا۔“ وہ بہت خوشی سے بول رہا تھا۔ حالات بدل جانے کا سوچ جو لیا تھا۔

”نہیں، مجھے چیزیں نہیں، چاچو اپنے پاس چاہئیں۔“ کچھ ہی دن پہلے چوتھی کلاس میں آنے والی نور بڑی سمجھداری سے بولی۔

”مجھے تو یہ سمجھ نہیں آ رہی کہ یہ اپنوں کو چھوڑ کر دور کیوں جا رہا ہے؟“ ماں افسردہ سی کہہ رہی تھی۔

”امی جی! اپنوں کو چھوڑ کر کہاں جا رہا ہوں۔ میں تو اپنوں کی بہتر زندگی کے لیے کچھ عرصے کے لیے کام کرنا چاہتا ہوں۔ آپ کو وڈیو کال کیا کروں......“

”وڈیو کال تمہاری اس موجودگی کا نعم البدل ہے جس کی بنا پر میں باہر بیٹھا ماں، بیوی، بچوں کی طرف سے بےفکر رہتا ہوں کہ میرا شیر بھائی ان کے پاس ہے؟“ اسرار نے بات کاٹ کر بڑے جذباتی انداز میں کہا۔

”بھائی! سمجھو نا، ہم بھی بڑا سا بنگلا، گاڑی لیں گے۔ اپنے گھر والوں کو مہنگی شاپنگ کروائیں گے۔ اپنے بچوں کی ہر ضرورت پوری کریں گے۔“ ابرار اپنی بات پر اڑا ہوا تھا۔

”ابرار بچے! یہ تم سے کس نے کہہ دیا کہ بنگلا، گاڑی، مہنگے کپڑے ہی انسان کو خوشی دیتے ہیں۔ خوشی اپنوں میں ہوتی ہے اور ویسے بھی اب تو چند سال پہلے جیسا کچھ بھی نہیں۔ کمائی بڑھ گئی ہے اور اگر تم پاکستان میں ہی ذرا سی محنت مزید کر لو تو اور بھی بہتری آ جائے گی۔ تم خوامخواہ اس امریکی کی باتوں میں آ گئے ہو۔ اسے کہو بس زبان سے تمہارا شکریہ ادا کرے اور جائے یہاں سے۔“ بھابی نے اپنے لیے چھوٹے دیور کو ”بچے“ کہہ کر سمجھایا لیکن ابرار پر جو دھن سوار تھی، اسے اتارنا کسی کے بس میں نہ تھا۔ سب اپنے جو قناعت کی دولت سے مالا مال تھے، اسے روکتے رہ گئے اور ابرار، احسان علی پر کیے گئے احسان کے انعام کے طور پر امریکا پہنچ گیا۔

☆☆☆

لہسن کے تڑکے والی مسور کی دال اور ابلے چاول کی پلیٹ سامنے رکھے صابرہ بیگم خاموش بیٹھی تھیں۔ رات کا کھانا کھانے کے لیے سب بیٹھے تھے۔ سعدیہ شوہر کو کھانا دے کر خود بھی کھا رہی تھی اور ساتھ ساتھ دونوں بیٹوں کو ڈانٹ رہی تھی کہ اپنی پلیٹ پوری ختم نہ کی تو پٹائی کروں گی۔ دادی کے پاس بیٹھی نور چاولوں کے چمچ منہ میں ڈالتے ہوئے دادی کو غور سے دیکھ رہی تھی۔

”کیا بات ہے دادو! کھانا کیوں نہیں کھا رہیں؟“ اس نے پوچھ ہی لیا۔ سعدیہ اور اسرار بھی ادھر متوجہ ہو گئے۔

”کیا بات ہے امی؟ بھوک نہیں لگی، طبیعت تو ٹھیک ہے آپ کی؟“ اسرار تو ذرا پریشان ہو گیا۔

”ابرار کو مسور کی دال اور چاول بہت پسند ہیں۔ اکثر فرمائش کر کے بنواتا تھا۔“ صابرہ بیگم کھوئے کھوئے انداز میں بول رہی تھیں۔ لہجہ بھیگا ہوا تھا۔ سب چپ سے ہو گئے۔ سعدیہ پاس آ بیٹھی۔

"چلیں کھا لیں کھانا۔ ایسے ہی بیٹھی پریشان ہو رہی ہیں۔ وہ ماشاءاللہ وہاں سروس کر رہا ہوگا۔" وہ ساس کو کھانا کھانے پر آمادہ کر رہی تھی۔ اسرار چپ چاپ بیٹھا رہا۔

☆☆☆

ابرار ڈرائیوری کرنے لگا۔ احسان صاحب نے اس کے لیے ملازمت کے ساتھ مناسب رہائش کا بھی بندوبست کر دیا تھا۔ وہاں اور بھی پاکستانی تھے جن میں سے ایک پاکستانی شاہد سے اس کی کافی دوستی ہو گئی۔ دونوں ایک ہی کمرے میں رہتے تھے۔ شاہد وہاں پر کسی پاکستانی ہوٹل میں لگا تھا۔ چند ہی دنوں میں ابرار نے محسوس کیا کہ شاہد زیادہ خوش نہیں ہے۔

"کیا بات ہے یار؟ تم بجھے بجھے سے رہتے ہو حالانکہ تم تو پچھلے چار سال سے یہاں ہو۔ اتنی زیادہ کمائی پاکستان میں گھر والوں کو بھیج چکے ہو مزید کار ہے ہو۔ امریکا جیسے ملک میں رہتے ہو۔ تمہیں تو ہر وقت خوش رہنا چاہیے۔" اس نے ایک رات سونے سے پہلے گپ شپ لگاتے ہوئے کہا۔ جواباً شاہد دھیرے سے ہنس دیا۔

"یعنی تمہارے خیال میں بہت سا پیسا اور ترقی یافتہ ملک میں رہنا انسان کو سچی خوشی اور مسکراہٹ دیتا ہے؟" شاہد نے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سوال کیا تو ابرار بولا۔

"ہاں تو کیا ایسا نہیں ہے؟ بھئی میرا تو یہی خیال ہے۔"

"اچھا سو جاؤ، چھوڑو اس ذکر کو۔ تم خوش ہو یہ بڑی اچھی بات ہے۔" کہہ کر شاہد نے بات ختم کر دی۔

معاشی حالات سدھارنے کے خواہش مندوں کا یہ بہت بڑا مسئلہ ہوتا ہے کہ بیرون ملک جا کر پہلے کچھ عرصہ وہ قرض اتارتے ہیں جو ویزا وغیرہ بنانے کے لیے سر پر چڑھا ہوتا ہے۔ ابرار خوش قسمت تھا کہ اس کے ساتھ یہ پرابلم نہیں تھی۔ احسان صاحب اسے اپنے خرچ پر لائے تھے اس لیے اس نے پہلے ہی ماہ سے پیسے گھر بھیج کر کہا کہ گھر کی حالت درست کی جائے اور بہنوں کی فکر نہ کریں۔ اس کی ڈیوٹی دن کی تھی۔ اس نے شاہد سے کہہ کر اس کے ہوٹل میں رات کے چند گھنٹوں کی ملازمت بھی حاصل کر لی۔ وہاں برتن دھو کر اور چھوٹے موٹے کام کر کے مزید پیسے جمع کرنے لگا۔ وقتاً فوقتاً پاکستان کال کرتا رہتا۔ یونہی چار ماہ گزر گئے کہ ابرار کو کچھ عجیب سے احساسات ہونے لگے۔ کبھی اسے لگتا کہ وہ کھل کر ہنس نہیں پا رہا۔ کبھی لگتا اسے کھانا ڈھنگ سے نہیں مل رہا۔ کبھی نیند پوری نہ ہونے کی شکایت ہوتی، کبھی اردگرد کا پرایا پرایا ماحول اسے تنہا سا کر دیتا۔ پہلے پہل تو اس نے غور نہیں کیا لیکن پھر وہ واضح طور پر ان باتوں کو محسوس کرنے لگا۔

رات کا وقت تھا۔ ابرار کھانا کھا رہا تھا۔ شاہد سے بولا۔ "یار! میں کھانا کھا کر کام پر جا رہا ہوں۔ پلیز! میرے کپڑے تو استری کر دینا جو صبح پہنوں گا۔"

شاہد نے جماہی لی اور بولا۔ "اچھا یار! کر دوں گا، تم ڈھنگ سے کھانا تو کھاؤ۔"

"کیا ڈھنگ سے..... کون سا یہاں میری ماں یا بھابی بیٹھی ہے جو مجھے پلیٹ میں سجا کر روٹی سالن دے گی۔ بس اب تو پیٹ بھرنے کا کام بھی ڈیوٹی کی طرح کرتے ہیں۔" ابرار کا لہجہ بجھا بجھا سا تھا۔ شاہد نے حیران ہو کر اسے دیکھا۔ ابرار پلیٹ ادھوری چھوڑ کر اٹھ گیا۔

☆☆☆

"سعدیہ! ذرا ابرار سے بات تو کرواؤ۔" دو دن شدید طبیعت کی خرابی کے بعد صابرہ بیگم ذرا اٹھنے بیٹھنے کے قابل ہوئیں تو فوراً پردیسی بیٹے سے بات کرنے کی ٹھانی۔ سعدیہ نے نمبر ملایا تو ادھر سے شاہد نے بات کرتے ہوئے بتایا کہ تین چار گھنٹے بعد ہی ابرار کام سے فارغ ہوگا پھر وہ اس سے بات کروا دے گا۔ شاہد بھی ان کے فیملی ممبر جیسا ہی ہو گیا تھا۔

"اچھا، اسے بتا دینا کہ امی کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی لیکن پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ اب وہ بہتر ہیں۔" سعدیہ نے پیغام دے کر فون بند کر دیا۔

☆☆☆

"ابرار! تم آ گئے..... شکر ہے۔" شاہد نے ابرار کو کمرے میں داخل ہوتا دیکھ کر کہا۔

"کیوں بھئی، کس لیے میرا انتظار ہو رہا تھا؟" ابرار جیکٹ اتارتے ہوئے بولا۔

"تمہارے گھر سے فون آیا تھا۔ خالہ جان تم سے بات کرنا چاہتی ہیں۔ دراصل پچھلے دو دن سے وہ بیمار تھیں لیکن....." شاہد بتا رہا تھا کہ ابرار نے گھبرا کر بات کاٹی۔

"کیا ہوا امی کو؟ خیریت تو ہے نا شاہد؟ تم سے کس نے بات کی؟" اس کے ماتھے پر پسینا آ گیا تھا۔

"ارے گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ بھابی سے بات ہوئی تھی۔" پھر شاہد نے پوری بات بتائی۔ اس دوران ابرار نے گھر کا نمبر ملا لیا تھا۔ ادھر صابرہ بیگم جیسے سیل فون ہاتھ میں ہی لیے بیٹھی تھیں۔ فوراً کال اٹینڈ کر لی گئی۔

"ہیلو ابرار بیٹے! کیسے ہو؟" لہجہ تھکا ہوا تھا۔

"امی! آپ بیمار تھیں۔ مجھے کیوں نہیں بتایا؟" ابرار

بھائی اور بھابی کے علاوہ تو ربی بھی مجھے بتا سکتی تھی لیکن آپ نے سب کو منع کر دیا ہوگا، نہیں، ہے نا؟" وہ بھیگے لہجے میں شکایت کر رہا تھا۔ اسے تو ویسے ہی آج کل امی اور گھر والے بہت یاد آ رہے تھے اور اب امی کی بیماری کا سنا تو اس کا دل بھر آیا۔

"ہاں بیٹا! میں نے ہی منع کر دیا تھا کہ پردیس میں میرا بچہ پریشان ہوگا۔ چلو اب ٹھیک ہو کر بتا تو دیا ہے۔" صابرہ بولیں۔

"میڈیسن لیں باقاعدگی سے اور کھایا پیا کریں۔ میں پیسے بھجوا رہا ہوں آپ کے لیے..... اچھا۔"

"بیٹا! کھانے پینے کی تو کوئی کمی نہیں اور دوا بھی لے رہی ہوں۔ تم پریشان نہ ہو۔"

"اور ہاں امی! ذرا یہ سعدیہ بھابی سے بات تو کروائیں۔ بڑا کرتی ہیں بھابی ہے، بھابی ہے اور بھابی سے بات چھپائی ہیں۔ آپ سے چھپ کر بھی تو بتا سکتی تھیں مجھے۔" ابرار ابھی تک ناراض سا تھا۔

"اچھا ان کیا تمہیں پریشان نہیں کیا۔ ویسے میں نے ان دونوں سے ایک وعدہ لے لیا ہے۔" صابرہ بیگم کا لہجہ عجیب سا تھا۔

"وعدہ؟ کون سا وعدہ؟" ابرار حیران ہوا۔

"میں نے اسرار اور سعدیہ سے وعدہ لیا ہے کہ اگر میں مر جاؤں تو میری میت سرد خانے میں رکھوا کر میرے ابرار کا انتظار ضرور کرنا۔ اس سے قبر پر مٹی ضرور ڈلوانا۔ یہ تو ایک ماں کا حق ہے نا؟" صابرہ بیگم اداسی سے بول رہی تھیں۔

"امی.....!" وہ بے اختیار رو دیا۔ "کیوں ایسی غلط باتیں کرتی ہیں؟"

"غلط کیا بیٹا، مرنا تو برحق ہے تو پھر....."

"چپ کر جائیں امی جی! اللہ کا واسطہ چپ کر جائیں ورنہ میرا دل پھٹ جائے گا۔" ابرار رو رہا تھا۔ ادھر صابرہ بیگم کی آنکھوں سے بھی جھڑی لگ گئی تھی۔ چھوٹے لاڈلے بیٹے کی جدائی نے ان کی حالت خراب کر دی تھی۔ چند منٹ کی مزید..... گفتگو کے بعد ابرار نے فون بند کر دیا۔ وہ امی سے مزید بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔

شاہد نہا کر باہر نکلا تو ابرار کی سوجی آنکھیں دیکھ کر پریشان ہو گیا۔ "کیا ہوا ابرار؟ گھر میں سب خیریت تو ہے نا؟"

"ہاں، اللہ کا شکر ہے۔ سب ٹھیک ہے۔" ابرار دھیرے سے بولا۔

"تو یہ آنکھیں کیوں ایسی ہو رہی ہیں؟" شاہد تولیا رکھتے ہوئے بولا۔

"بس امی سے بات کرتے ہوئے ذرا جذباتی ہو گیا تھا۔" ابرار کا لہجہ بھرا گیا۔ شاہد کی آنکھوں میں بھی کچھ نمی سے آ گئی۔ اسے یہ کہنے کی ضرورت نہیں آ رہی تھی کہ وہ ابرار کے دکھ میں شامل ہو رہا ہے یا اس کو اپنے گھر والے بھی یاد آنے لگے ہیں۔

☆☆☆

اسرار تینوں بچوں کو اسکول سے لے کر گھر کی طرف آ رہا تھا۔ پہلے یہ ابرار کی ڈیوٹی تھی یا کبھی کبھی صابرہ بیگم یہ کام کرتی تھیں لیکن ابرار کے جانے کے بعد اور ماں کی طبیعت گری گری رہنے کی وجہ سے اسرار کو دوپہر کو دکان سے کچھ دیر کے لیے اٹھنا پڑتا۔ ویسے تو گرمیوں کی چھٹیاں تھیں لیکن اسکول والوں نے سمر کیمپ لگایا ہوا تھا اور ساتھ ہی جشن آزادی کی بھی تیاری کروا رہے تھے۔

"پاپا! 14 اگست کے لیے کچھ چیزیں چاہئیں جو میں لی لسٹ اور ٹیلور کرتے ہوئے چاہوں گی۔" نور نے کہا تو اسرار نے بائیک روک دی اور بچوں کو خریداری کے لیے سامنے دکان پر لے گیا۔

"لے لو جو کچھ چاہیے اور ہاں، اپنی دکان پر بھی سجاوٹ کی بڑی اچھی چیزیں منگوائی ہیں میں نے۔ کچھ سامان ادھر سے لے لینا۔" کہہ کر اسرار جھنڈیوں کا پیکٹ اٹھا کر یونہی دیکھنے لگا اور دیکھتے دیکھتے اچانک کہیں گم سا ہو گیا۔ اسے وہ وقت یاد آ گیا جب وہ تینوں بھائی مل کر بڑے سے صحن میں جھنڈیاں لگاتے، بانس پر لگا کر چھت پر پرچم لہراتے۔ اسے یاد آیا کہ تھوڑا سا خرچ کر کے وہ بہت زیادہ خوشیاں حاصل کرتے تھے۔ اب تو وہ ہو چکے تھے ابرار کو گئے ہوئے اور چھ ماہ باقاعدگی سے رقم بھیجتے ہوئے۔ پورے گھر میں نیا پن آ گیا تھا اور ہاتھ بھی پہلے کی طرح تنگ نہ رہا تھا لیکن نہ جانے کیوں وہ خوشیاں کہیں روٹھ گئی تھیں جو ہاتھ تنگ ہونے میں بھی مل جایا کرتی تھیں۔ پہلے بڑے بھائی کو اس کی بیوی اور پھر چھوٹے بھائی کو معاشی حالت مستحکم کرنے کا شوق مشترکہ جھنڈیوں والے صحن سے دور لے گئے۔ "اور میں درمیان والا بھائی درمیان میں بیٹھا ادھر ادھر دیکھتا رہ گیا۔" اس نے ٹھنڈی آہ بھری۔ بچوں کی شاپنگ مکمل ہو چکی تھی۔

☆☆☆

"14 اگست آ رہی ہے۔ میں نے سوچا ہے ہم سب جو یہاں پر پاکستانی ہیں یعنی ہماری بلڈنگ میں تقریباً سولہ افراد مل کر جشن منائیں گے۔ کیا خیال ہے شاہد؟" ابرار نے بستر پر لیٹے ہی اچانک اٹھ کر کہا۔

"دیار غیر میں 14 اگست؟ ابرار یار! یہ خوشیاں تو اپنے وطن میں ہی مناؤ تو مزہ آتا ہے۔" شاہد نے اداسی سے کہا۔

"ہم اپنا کمرا خوب اچھی طرح سجائیں گے۔ ایک لائیں گے سبز و سفید رنگ والا اور سب کو ادھر آنے کی دعوت دیں گے۔ خوب ہلا گلا کریں گے پاکستان کی سالگرہ پر۔" ابرار نے جان بوجھ کر اس کی اداسی کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔

"اچھا بھئی، ابھی تو دن پڑے ہیں جشن میں۔ دیکھتے ہیں کیا کرتا ہے۔" کہہ کر شاہد نے آنکھیں بند کرلیں۔

"امی جی! میں نے بس ایک فیصلہ کرلیا ہے۔" سعدیہ نے کڑاہی میں پکوڑے تلتے ہوئے کچن کی کھڑکی سے صابرہ بیگم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ دوسرے چولہے پر کڑھی ابل رہی تھی۔

"کیسا فیصلہ!" تسبیح پڑھتے ہوئے صابرہ بیگم چونک گئیں۔

"آپ کے سامنے میں پکوڑے رکھ کر گئی ہوں کہ چکھ کر بتائیں کیسے بنے ہیں لیکن آپ خاموشی سے پلیٹ کو دیکھے جا رہی ہیں۔ آپ کو خیال نہیں کہ بہو گرمی میں آپ کی پسندیدہ چیز پکا رہی ہے۔ بس خیال ہے تو ابرار کا کہ فلاں فلاں کھانا اس کا پسندیدہ ہے تو... آج سے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ آئندہ کبھی بھی گھر میں وہ ڈش نہیں بناؤں گی جو آپ کے لاڈلے کو پسند ہے اور جسے دیکھ کر آپ اداس ہو جاتی ہیں۔ ابرار یہاں ہوتا تو کتنا خوش ہوتا، سوچ سوچ کر خود بھی پریشان ہوتی ہیں اور ہمیں بھی کرتی ہیں۔ میرا تھوڑا سا کام رہ گیا ہے۔ میں آتی ہوں پھر کاپی پین لے کر لسٹ بنا لیتے ہیں ان چیزوں کی جو میری ساس کو اداس کر دیتی ہیں۔" سعدیہ پیار بھرے انداز میں شکوہ کر رہی تھی۔

"بہت مزیدار ہیں پکوڑے۔ فریج میں چٹنی بنی پڑی ہے تو لاؤ تھوڑی سی اور تم بھی کھاؤ۔ اتنی محنت سے گرمی میں بنائے ہیں۔" صابرہ بیگم نے پکوڑے کھاتے ہوئے بڑی خوشدلی سے پاس بیٹھی سعدیہ سے کہا۔ ائرکولر کے سامنے بیٹھی ٹھنڈے پانی کے گھونٹ حلق سے اتارتی سعدیہ مسکرا دی۔ اس کے شکوے نے خاطر خواہ اثر کیا تھا۔

'اب کڑھی کے ساتھ کھانا سکون سے کھایا جائے گا۔' فریج کھولتے ہوئے وہ اطمینان سے سوچ رہی تھی۔

☆☆☆

"نیند نہیں آ رہی ہے، کوئی بات سناؤ۔" شاہد، ابرار سے کہہ رہا تھا۔ ابرار نے اٹھ کر لائٹ جلائی۔

"ہاں یار! میرا بھی سونے کو دل نہیں کر رہا۔ چلو گپ شپ کرتے ہیں۔" ابرار فوراً اٹھ بیٹھا۔

"چلو تم اپنے بارے میں سب بتاؤ۔ میں سنتا ہوں۔" شاہد چائے کے دو کپ بنا لایا اور ایک کپ اسے تھماتے ہوئے کہا۔ ابرار نے چائے پکڑی اور شروع ہو گیا۔

"جب ابو جی کا انتقال ہوا، ہم پر بڑی مشکل آ گئی۔ ماں نے کپڑے سلائی کر کر کے بڑے جتنوں سے ضرورت پوری کی اور پھر اقرار بھائی کی کمائی آنے لگی۔ دن پھرنے لگے کیونکہ چار افراد ہی تھے۔ زیادہ بڑا کنبہ تو تھا نہیں۔ امی اور اقرار بھائی کے کمائے پیسوں سے زندگی میں آسانی ہو گئی پھر میں اور اسرار بھائی، دونوں برسر روزگار ہو گئے۔ بھابی سعدیہ بڑی بھابی کے برعکس بڑی اچھی بہو ثابت ہوئیں۔ وہ امی کے ساتھ مل کر بڑی اچھی سلائی کر کے کافی پیسے کمانے لگیں حالانکہ ہم دونوں بھائی منع کرتے تھے کہ مرد، دو عورتوں کی روٹی کپڑا تو لا ہی سکتے ہیں لیکن آفرین ہے ان دونوں خواتین پر کہ پھر بھی محنت کر کے کبھی گھر کی کوئی چیز، کبھی سودا سلف خرید کر ہمارے ساتھ تعاون کرتی رہیں۔ تمہیں مزے کی بات بتاؤں شاہد! سعدیہ بھابی کی صورت میں امی کو ایک سہیلی مل گئی تھی۔ ایک دو بار دن کے وقت میں گھر میں تھا تو میں نے نوٹ کیا کہ وہ دونوں جتنا کام کرتی ہیں، اس سے کہیں زیادہ ایک دوسرے کو اپنی اپنی دلچسپ باتیں سناتی ہیں۔ امی بڑے عرصے بعد ہنسی مسکرائی تھیں تو اسرار بھائی کی دلہن آنے کے بعد۔ دونوں نے گھر میں کیاری بنائی ہوئی تھی اور نہ جانے کیسے سلائی اور گھر کے کاموں سے وقت نکال کر وہاں ٹماٹر، پیاز، دھنیا، پودینا اور توری کی بیل لگا لی۔ سردیوں کے موسم میں گاجر، مولی گھر کے صحن میں لگی ہوئی بڑی بھلی لگتی۔ گھر نیم پختہ تھا۔ کمرے، برآمدے پکے اور صحن کچا تھا۔ اتنا خوبصورت نہیں تھا لیکن بڑے سے صحن میں بڑی سی کیاری مجھے بہت پسند تھی۔"

شاہد بڑی دلچسپی سے اس کی باتیں سن رہا تھا۔ ابرار کو جیسے عرصے سے اس وقت کا انتظار تھا۔ بولنا شروع کیا تو رکا ہی نہیں۔

"نور العین آئی تو میں نے فوراً اس پر قبضہ جما لیا۔ میں اسے بہن اور بھتیجی دونوں رشتوں میں ماننے لگا۔ جوں جوں وہ بڑی ہو رہی تھی، مجھے لگتا تھا میرے دن خوبصورت ہوتے جا رہے ہیں۔ اس کے لیے فراک، چھوٹی چھوٹی چوڑیاں، آئس کریم لینا، اسے جھولا دلانا مجھے اتنا اہم لگتا تھا کہ میں ان کاموں کے لیے کبھی بھی اٹھ کر کھڑا ہو جاتا تھا۔ بھتیجے ہوئے، وہ بھی بہت پیارے لگے لیکن میری زندگی میں میری بیٹی نے جو مقام بنا لیا ہے وہ سب سے بڑھ کر ہے۔

شاہد! تمہیں یقین نہیں آئے گا، وہ تو خود کو میری بہن سمجھنے لگی ہے۔ ابھی سے مجھے ڈانٹنے بھی لگی تھی۔" ابرار کے لہجے میں بھتیجی کے لیے پیار ہی پیار تھا۔

"اور 14 اگست کیسے مناتے تھے؟" شاہد کو اس کی باتوں میں بڑا مزہ آ رہا تھا۔

"میں اپنے اور سب بچوں کے لیے ٹوپیاں، بیج، جھنڈیاں خریدتا۔ ہم ہر سال گھر سجاتے اور بڑے اچھے انداز میں جشن آزادی مناتے تھے۔ اب پچھلے سال کا ہی سن لو۔ 14 اگست کو میں گھر میں نہیں تھا پھر بھی یہ دن بھرپور مناتا رہا۔ ناشتے سے پہلے گھر سے چلا تھا۔ راستے میں رک کر ایک ریڑھی والے سے چنا چاول لے کر کھائے۔ یقین کرو، شدید بھوک میں اتنے مزے کے لگے کہ میں نے دوسری پلیٹ بھی بنوالی۔ اسی لیے چائے کا کپ ادھورا چھوڑنا پڑا کہ پیٹ خوب بھر گیا تھا اور دو گھونٹ چائے کی گنجائش نہ رہی تھی پھر دوپہر کو ایک ہوٹل میں اپنا پسندیدہ کھانا کھایا۔ میں ٹرک میں مختلف ملی نغمے سنتا رہا تھا۔ ہوٹل میں بھی ٹی وی پر جشن آزادی کا پروگرام دیکھتا رہا۔" بڑے پیار سے یہ بتاتے ہوئے ابرار یہ بالکل بھول بیٹھا تھا کہ اس نے اپنے ٹرک میں پچھلے سال کی نغمے لگائے ضرور تھے لیکن غور بالکل نہیں کیا تھا اور ہوٹل پر بیٹھے ہوئے تو مسلسل کو ستا رہا تھا کہ میں تو شاید آزاد ہوں ہی نہیں۔

"رات کو دیر سے گھر آیا تو سعدیہ بھابی نے بریانی گرم کر کے دی۔ ویسے یار! امی اور بھابی نے گھر کو جنت بنا رکھا ہے۔" ابرار نے کہا تو شاہد یکدم اٹھ بیٹھا اور بولا۔

"یار ابرار! تمہاری باتوں سے تو لگتا ہے کہ تم پاکستان میں بہت خوش اور سکون سے رہتے تھے پھر کس لیے دھکے کھانے، پرایوں کی نوکری کرنے یہاں آ گئے؟"

"آں... ہاں..." ابرار جیسے چونکا۔ وہ کچھ دیر شاہد کی طرف دیکھتا رہا پھر بولا۔ "شاہد! تم ٹھیک ہی کہہ رہے ہو۔ واقعی میں پاکستان میں ماں کے پاس، بھائی کے ساتھ بہت خوش تھا۔ تھکن ہوتی تو ماں کی انگلیاں ساری تھکن سمیٹ لیتیں۔ دکھی ہوتا تو بھائی درد بانٹ لیتا اور... اور اب تو نور اور بھتیجوں نے زندگی حسین کر دی تھی۔ ہاں شاہد ہاں... میں پاکستان میں خوش تھا۔" وہ رک رک کر بول رہا تھا۔

شاہد سوال کر کے کب کا سو چکا تھا۔ ابرار کو اس کے خراٹے کب سے سنائی دے رہے تھے لیکن وہ بولے جا رہا تھا کیونکہ اسے معلوم ہو چکا تھا کہ اسے یہ ساری باتیں کسی اور کو نہیں، خود کو ہی سنانا ہیں۔ دراصل وہ خود کو ہی کچھ سمجھا رہا تھا۔

☆☆☆

سعدیہ سبزی بنا رہی تھی کہ سیل فون پر ابرار کا نمبر جگمگانے لگا۔ صابرہ بیگم پاس ہی سو رہی تھیں۔ "ہیلو ابرار! کیسے ہو بھئی... ہاں سب ٹھیک... امی؟ امی سو رہی ہیں۔ کہو تو اٹھا دوں؟" سعدیہ بات کر رہی تھی۔

"نہیں، نہیں۔ انہیں آرام کرنے دیں۔ میں پھر کال کروں گا۔" ابرار نے کہا، ادھر صابرہ بیگم کی آنکھ کھل گئی۔

"کس کا فون ہے سعدیہ؟ ابرار کا ہی ہوگا۔ لاؤ دو مجھے۔" خود ہی سوال کرتی خود ہی جواب دیتی صابرہ بے تابی سے فون کان سے لگا رہی تھیں۔

"بیٹے! کیسے ہو؟ کیسے یاد کرلیا؟"

"امی جی! آپ لوگوں کی بہت یاد آ رہی تھی۔ آپ کے ہاتھ کا کھانا کھانے کو دل کر رہا ہے۔" ابرار کا نم آلود لہجہ صابرہ بیگم کو تڑپا گیا۔

"تو بیٹا آجاؤ نا ماں کے پاس۔ کیوں پردیس میں دھکے کھا رہے ہو۔ بیٹا! یاد ہے میں بازار سبزی لینے جاتی تو تمہارے لیے راستے میں موجود ٹھیلے والے سے قلفی لے کر آتی تھی۔ میں جتنا بھی تیز چلتی، گھر سے تھوڑا ہی فاصلہ ہونے کے باوجود وہ آدھی پگھل جاتی اور تمہارے پاس تھوڑی سی قلفی آتی لیکن تم اسے پکڑ کر جس خوشی سے مجھے دیکھتے تھے، لگتا تھا زمانے بھر کی مٹھاس تمہیں مل گئی ہے اور مجھے بھی لگتا کہ میں نے اپنے لاڈلے بچے کو نہ جانے کیا کچھ لا کر دے دیا ہے...... ابرار! میرا آدھی قلفی کھا کر بہل کر خوش ہو جانے والا بچہ اتنا ناشکرا کیسے ہو گیا کہ اپنوں کو چھوڑ کر پرائے دیس چلا گیا۔" صابرہ بیگم بات کرتے ہوئے آنکھیں صاف کر رہی تھیں۔ سعدیہ کا بھی دل بھر آیا۔

"چلیں امی آرام کریں۔ میں نے ابرار سے ضروری بات کرنا ہے۔" کہہ کر سعدیہ ان سے موبائل تقریباً چھین کر کمرے میں چلی گئی۔ وہ ابرار کو ڈانٹ رہی تھی کہ اپنی پسند کے فیصلے کر لینے کے بعد اب وہ امی سے ایسی باتیں کیوں کرتا ہے جو انہیں اس عمر میں شدید اذیت دیتی ہیں۔

☆☆☆

14 اگست کا دن تھا۔ ابرار اور شاہد کو ایک لمحہ بھی نہ ملا تھا کہ یہ دن مناتے۔ سارا دن اور آدھی رات تک ہوٹل میں کام کر کے وہ تھکے ہارے واپس آ رہے تھے کہ راستے میں شاہد اچانک رک گیا۔

"کیا ہوا، کیوں رک گئے؟" چند قدم آگے جاتے

ہوئے ابرار نے پیچھے مڑ کر پوچھا۔ شاہد نے اسے چپ
رہنے کا اشارہ کیا اور وہیں کھڑا ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگا جیسے
کسی کا انتظار کر رہا ہو۔ ابرار حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا۔
چند منٹ بعد شاہد اس کے قریب آیا اور چپ چاپ چلنے لگا۔
”ابرار! جہاں میں کھڑا تھا، وہاں تم نے دیکھا تھا
کہ چار امریکی بیٹھے تھے؟“
”ہاں، دیکھا تھا۔ کوئی واقف کار تھے تمہارے؟“
ابرار نے جواباً پوچھا۔
”نہیں، واقف کار نہیں تھے۔ میں اس لیے رک گیا
تھا کیونکہ میں نے انہیں پاکستان اور پاکستانیوں کے بارے
میں بات کرتے سنا تھا۔“ شاہد کے لہجے میں غصہ تھا۔
”کیسی باتیں؟ کیا کچھ غلط کہا انہوں نے؟“ ابرار کو
فکر ہو گئی تھی۔
”انہیں لگا ہوگا کہ شاید میں ان کی زبان نہیں سمجھ رہا
اس لیے انہوں نے جو باتیں ہم دونوں کو دیکھ کر شروع کی
تھیں، وہ جاری رکھیں۔ میں بھی کوئی تاثر دیے بغیر ادھر ادھر
دیکھتا رہا۔ وہ کہہ رہے تھے کہ پاکستان ایک دہشت گرد
ملک ہے اور وہاں کے لوگوں کو دیکھتے ہی خطرہ محسوس ہونے
لگتا ہے۔ ایک کہہ رہا تھا مجھے پاکستانیوں سے، مسلمانوں
سے بڑی نفرت ہے۔ میرا بس چلے تو انہیں ملک سے باہر
نکال دوں.....“
”بس کرو شاہد! مجھ سے اپنے اور اپنی دھرتی کے
بارے میں مزید غلط نہیں سنا جائے گا۔“ ابرار نے تڑپ کر
شاہد کو منع کر دیا۔ وہ دونوں اپنے کمرے میں پہنچ چکے تھے۔
آج 14 اگست کا دن تھا اور اسی دن بجائے خوشی، بے کلی
کے، انہیں ایسی جلی کٹی سننے کو ملی تھیں۔
ابرار نہا کر باہر نکلا تو دیکھا شاہد بستر پر ٹیک لگا کر
خاموش بیٹھا تھا۔ ”نہا لو تم بھی۔ تھکن اتر جائے گی۔“ ابرار
نے اس سے کہا۔
”نہا تو لیتا ہوں لیکن جو تھکن ہے، مجھے نہیں لگتا وہ اتنی
آسانی سے اترے گی۔“ اداس لہجے میں کہتا شاہد اٹھ گیا۔
تھوڑی دیر بعد بیٹھے دونوں امریکیوں کے رویے کے بارے
میں بات کر رہے تھے۔
”شاہد یار! انہیں دہشت گرد کہنے والے یہ کیوں نہیں
دیکھتے کہ ہم نے دہشت گردی کے خاتمے کے لیے کتنی
قربانیاں دی ہیں۔ پاکستان میں جو آگ لگی تھی، وہ ہماری
فوج کے بہادر سپوتوں نے اپنی کاوشوں سے اور ہمارے
شہیدوں نے اپنے معصوم و پاک لہو سے بجھائی۔ کتنی جانیں
ہم نے گنوائیں۔ ہمارے محلے، گلیاں، بازار یہاں تک کہ
مساجد و مزارات سب میں دھماکے گونجتے رہے، خون بہتا
رہا۔ ہم نے اسکولز سے ننھے پھولوں کی لاشیں اٹھائیں،
ہماری معیشت کو نقصان پہنچا پھر بھی ہمارا حوصلہ اور دل دیکھو
کہ نہ ہم ڈرے اور جھکے اور نہ ہی کسی کو اپنے ملک میں پنپنے دیا۔
ہونے کی بنا پر برا بھلا کہتے ہیں۔ شاہد! دنیا ہماری لازوال
قربانیوں کو جو ہم نے دہشت گردی کو ہرانے کے لیے دیں،
کیسے بھلا سکتی ہے۔ بجائے اس کے کہ ہمیں اچھا کہا جائے،
ہمارے حوصلے کی داد دی جائے، پاکستان کے ساتھ معاشی
تعاون کیا جائے کہ اس نے اقوام عالم کو ایک مصیبت سے
جان چھڑانے میں مدد کی۔ لوگ ہمیں ہی انتہا پسند کہتے ہیں۔
آخر ایسا کیوں ہے؟“ ابرار بے حد جذباتی ہو کر بول رہا تھا۔
”اور یہ جو ہمیں پیسے دے رہے ہیں، ہم پر کوئی احسان نہیں
کر رہے۔ سارا دن اور رات گدھوں کی طرح مشقت
کرتے ہیں ان پیسوں کے بدلے۔“ اب لہجے میں غصہ اور
توہین کا احساس بھی نظر آ رہا تھا۔
”یہ لو چاکلیٹ کھاؤ۔ میں نے یہ سوچ کر لی تھی کہ یوم
آزادی منانا تو نصیب میں نہیں۔ اس خوشی میں منہ تو میٹھا
کر لیں۔“ شاہد جو خاموشی سے اسے سن رہا تھا، یکدم
موضوع بدل کر بولا۔
”ہونہہ...... پرائے لوگوں کی غلامی سے آزادی ملے تو
ہی آزادی سے جشن آزادی منایا جا سکتا ہے...... لو یہ دن بھی
گزر گیا۔ ہماری آج کی خوشیاں بھی کاموں کی نذر ہو گئیں۔“
ابرار جلے کٹے انداز میں بولا۔ چاکلیٹ اس نے ہاتھ میں
پکڑی ہوئی تھی۔ اسی دوران دروازے پر دستک ہوئی۔ شاہد
دروازے پر گیا اور واپسی پر ایک پیکٹ لے کر آیا۔
”یہ تمہارے نام کچھ آیا ہے پاکستان سے۔ وہ لڑکا
سوری کر رہا تھا کہ دو دن پہلے کا آیا ہوا ہے لیکن بے وجہ
مصروفیت یہاں نہ پہنچا سکا۔“ کہتے ہوئے شاہد نے ابرار کو
پیکٹ تھما دیا اور خود آنکھیں بند کر کے لیٹ گیا۔ وہ چاہتا تھا
اس ایک کمرے میں ابرار کو پرائیویسی دے دے تاکہ وہ
اپنوں کی بھیجی چیز یا پیغام تنہائی میں دیکھ سکے۔ ابرار نے بے
تابی سے لفافہ کھولا۔ ایک خط اور اس کے نیچے کچھ اور بھی
تھا۔ اس نے تہ شدہ پرچی کھولی۔ اسرار کی جانب سے لکھا
گیا خط وہ پڑھنے لگا۔ سب کی خیریت اور معمول کی باتوں
کے علاوہ کچھ ایسا لکھا تھا کہ ابرار جو پہلے ہی جذباتی ہو بیٹھا
تھا، اس کی کیفیت عجیب سی ہو گئی۔
”ابرار! میں اور تم ہر سال شاندار یوم آزادی مناتے تھے۔

ممکن نہیں، ہاں لیکن میرے لیے ایک چیز ممکن تھی وہ کر رہا
ہوں۔ اب تمہیں سفید سوٹ اور پرچم بھیج رہا ہوں۔ 14 اگست کو
پہن لینا اور دھرتی کو، اپنے آپ کو پرچم تھام کر مبارک باد
دے لینا۔ مجھے یقین ہے پاکستان کی مٹی کو تمہارے جذبات
ضرور محسوس ہو جائیں گے کیونکہ تم اس کے بیٹے ہو۔“
ابرار نے سوٹ سائڈ پر رکھا اور کانپتے ہاتھوں سے سبز
ہلالی پرچم لفافے سے باہر نکالا۔ چھوٹا سا پرچم ہاتھ میں پکڑا تو
دل کی کیفیت کچھ سے کچھ ہونے لگی۔ لگا عرصے بعد کوئی اپنا
پاس آیا ہے۔ مٹی کی خوشبو انتہائی قریب محسوس ہوئی۔ اپنائیت
کی مہک سے اس کا دل جھوم اٹھا۔ وہ پرچم کو تھامے آہستگی
سے اٹھا اور دبے قدموں چلتا کمرے کی پچھلی طرف بنی مختصر
سی گیلری میں آ گیا۔ دروازہ احتیاط سے بند کر کے وہ پیچھے پلٹا
کیا۔ پرچم کو دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر چوما پھر ایک ہاتھ میں
لہرا کر دوسرے ہاتھ سے سیلوٹ کیا۔ اچانک اسے
احساس ہوا کہ وہ رو رہا ہے۔ اس کا چہرہ بھیگا ہوا تھا۔ اس نے
پرچم کو سینے سے لپٹایا اور اس طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا
جیسے ماں کو درد سناتے ہوئے کوئی اولاد روتی ہے۔ ماں،
بھائی، دوست، پاکستان کی گلیاں، محلے، سب اس سبز اور سفید
رنگ کے کپڑے میں سمٹ آئے تھے اور وہ سب اپنوں کے
گلے لگ کر بری طرح رو رہا تھا۔ جیسے دلوں کی گھٹن اور غیروں
کی نفرت و توہین بھرے رویے کی کڑواہٹ جیسے آنسوؤں
میں بہتی جا رہی تھی۔ اس کی ہچکی بندھ گئی۔ آہستہ آہستہ وہ
پرسکون ہونے لگا۔ اپنوں کو دکھ سنا کر اور رو کر اس کے دل کا
بوجھ ہلکا ہو گیا تھا۔ وہ کمرے میں آ گیا۔ بری طرح تھکا ہوا۔
شاہد بے سدھ سو رہا تھا۔

☆☆☆

”ابرار کا فون نہیں آیا حالانکہ کہہ رہا تھا 14 اگست پر
سب سے خوب باتیں کروں گا۔“ سعدیہ نے شوہر سے کہا۔
”مصروف ہوگا کام میں۔“ موبائل پر کسی کو کال
ملاتے اسرار نے جواب دیا۔
”ممّا! چاچو نے سفید سوٹ اور پرچم لگایا ہوگا جو پاپا
نے بھیجا تھا؟“ نور نے ماں سے سوال کیا۔
”ہاں، پہنا ہی ہوگا۔ آہستہ بولو، دادو نہ سن لیں۔ بیٹا
چاچو کو یاد کر کے رونے لگتی ہیں۔“ سعدیہ نے آہستہ
سے سمجھایا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہوئے رک کر بات
سنتی صابرہ بیگم کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

☆☆☆

”کیا بات ہے، تمہاری آنکھیں بہت سرخ ہو رہی
ہیں۔ روئے تھے کیا؟“ شاہد ناشتے پر بڑی تشویش سے
ابرار کو دیکھ کر بولا۔
”ہاں، رویا تھا۔“ ابرار نے کھوئے کھوئے انداز
میں کہا۔
”کیوں؟ گھر میں سب ٹھیک ہے؟ خالہ جان کی
طبیعت کیسی ہے؟ کیا لکھا تھا خط میں؟“ شاہد پریشان لہجے
میں اپنے ہم وطن سے ایک ہی سانس میں کئی سوال کر گیا۔
”دونوں مائیں یاد آ رہی تھیں۔ آنسوؤں پر قابو نہیں
رہا۔“ ابرار دھیرے سے بولا۔
”چاچا جی کی دو شادیاں تھیں؟“ شاہد حیران ہوا کہ
ابرار نے پہلے نہیں بتایا۔
”ہاں..... اور دھرتی ماں..... شاہد! میں کتنا برا
ہوں، جس ماں نے جنم دیا، پالا، اسے..... اور جس ماں نے
نام دیا، پہچان دی، قدموں کے نیچے زمین، سر پر آسمان دیا،
اسے بھی، دونوں کو چھوڑ آیا۔ ہم بہتر مستقبل کے نام کیا کیا
کر لیتے ہیں۔ مجھے اب احساس ہوا ہے۔ مجھے بھیجے گئے
پیکٹ میں ایک پاکستانی پرچم بھی ہے۔ اسے دیکھ کر جو میری
حالت ہوئی، میں لفظوں میں نہیں بتا سکتا۔ اس حالت سے
ہی میں نے اندازہ لگایا کہ اپنا گھر، اپنی مٹی، اپنے لوگ کیا
چیز ہیں۔“
”تو تمہیں اب زیادہ کون یاد آ رہا ہے؟ امی یا گلیاں جن
میں تم گھوما پھرا کرتے تھے؟“ شاہد نے ہلکا سا مسکرا کر پوچھا۔
”امی، اقرار بھائی، اسرار بھائی، بچے، بھابی تو پہلے ہی
دن سے بہت یاد آتے رہے لیکن شاہد اب تو مجھے اور بھی
بہت کچھ یاد آنے لگا ہے۔“ اس کی آواز بھرا گئی۔ ”مجھے وہ
گلیاں یاد آ رہی ہیں جن میں، میں پھرا کرتا تھا۔ وہ آلو
چھولے کی ریڑھی جہاں میں ہمیشہ کہتا زیادہ ڈلواتا تھا اور
ریڑھی والا چاچا ہمیشہ ”ارے زیادہ کہتا تو لوکیاں ڈالتا
تھا“ کہہ کر ہنستے ہوئے میری فرمائش پوری کر دیتا۔ وہ چنے
چاول والا جو مجھے دیکھتے ہی پلیٹ بنانا شروع کر دیتا کہ
ابرار یہاں کھانا ضرور کھائے گا۔ گنڈیری والا،
گولے والا، اخبار والا، گلی میں کھڑا وہ درخت جو سڑک کے
میں بدل گیا تھا۔ وہ شور، وہ رونق جو کبھی مجھے اچھی نہیں لگتی تھی
سب..... سب کے سب مجھے بری طرح یاد آ رہے ہیں۔“
اس پر پھر جذباتی پن کا دورہ پڑ گیا۔
”شاہد! وہاں میرے کوئی ایک دو رشتے دار تھوڑی
ہیں۔ ارے وہاں تو سارے میرے اپنے ہیں۔ میرا اپنا
پاکستان، میرا ہنستا مسکراتا لاہور، میرا جگمگاتا کراچی، میری

وادی مہران، میرا اچانی، کہراں، میرا تھل، روہی، میرا قصہ
خوانی بازار...... یہ سارے میرے ہیں۔ سب میرے
ہیں۔ میں وہاں جس شہر، جس گلی میں کھڑا ہو جاؤں کوئی یہ نہیں
کہہ سکتا کہ یہ تمہاری نہیں ہے۔ وہاں جتنے بھی مسائل ہیں،
کوئی وہاں سے نکالنے کی دھمکی تو نہیں دیتا اور دیکھو جو نکالا
نہیں، میں اسے خود چھوڑ آیا اور جو بے عزت کر کے نکل
جانے کا کہتے ہیں، ہم انہی کے دروازے پر پڑے ہیں۔"
ابرار پاگلوں کی طرح بولتے ہوئے یہ بالکل بھول
گیا تھا کہ اس جیسے کئی نوجوانوں کو پاکستان میں معاشی
مسائل درپیش ہیں اور وہ خود اس بات پر کتنا کڑھتا تھا۔ اس
وقت وطن ایک محبوب کی حیثیت اختیار کر گیا تھا اور محبت میں
محبوب کی خامیاں دیکھنا عاشق کی صفت ہو ہی نہیں سکتی۔
"تمہیں دیر ہو رہی ہے ابرار! کوئی بات نہیں، ہم پھر
گپ شپ کرلیں گے۔ مجھے بھی اب تمہاری باتیں سننے کی
عادت پڑ گئی ہے۔ روز رات کو جب تک تمہیں پاگل پن کا
دورہ پڑتے نہ دیکھ لوں، نیند نہیں آتی۔" شاہد بات کرتے
کرتے آفس چلا۔ اس نے کام پر کچھ دیر بعد جانا تھا۔ ابرار
خاموشی سے اٹھ کر باہر جانے لگا تو شاہد نے آواز دی۔
"ابرار! وہ پرچم جو تمہارے پاس ہے، ذرا مجھے
دکھانا۔" وہ جھجک کر کہہ رہا تھا۔
ابرار نے پرچم نکال کر اسے تھمایا اور خود تیزی سے
باہر نکل آیا۔ وہ شاہد کو اپنوں سے بات کرنے کا اکیلے میں
موقع دینا چاہتا تھا۔

☆☆☆

سعدیہ مٹھائی اور جیٹھ کے لیے شربت بنا رہی تھی۔
اب اقرار بیوی بچوں کے ساتھ تھوڑے تھوڑے دنوں بعد
ملنے آنے لگا تھا۔ صابرہ بیگم بڑے دل والی تھیں۔ بڑے
کھلے دل کے ساتھ بیٹے کو گلے لگا لیا اور کوئی بھی شکوہ نہ کیا۔
"میری ساس، شوہر اور دیور نے کبھی بھی اقرار بھائی
جان سے کوئی مدد نہیں مانگی اس کے باوجود انہیں شاید ڈر رہتا
تھا کہ مجھ سے کچھ مانگ نہ لیں اسی لیے ملنا چھوڑ دیا ہے۔
اب ابرار کے امریکا جانے کے بعد یہ خدشہ ختم ہو گیا اور یہ
آنے لگے روز ملنے، ہونہہ...... لیکن چلو اچھی بات ہے۔
امی اور اسرار تو خوش ہو گئے ہیں نا۔" سعدیہ اچھے دل والی
تھی۔ فوراً اچھا سوچنے لگی۔ اسی دوران پاس پڑے موبائل
کی بیل بج اٹھی۔ ابرار کا فون تھا۔
"ابرار بیٹے! ہم یوم آزادی 14 اگست کو مناتے
ہیں۔ آج تو یہ تاریخ نہیں ہے۔" سعدیہ نے مسکراتے
ہوئے دیور سے فون نہ کرنے کا شکوہ کیا۔
"بس بھابی! دیارِ غیر میں کیا یومِ آزادی۔ میں نے
بڑی کوشش کی فون کرنے کی لیکن وقت نہیں نکال پایا۔
اور سنائیں کیا ہو رہا ہے؟ امی کیسی ہیں؟ بات کروائیں
نا۔" ابرار نے کال نہ کرنے کی وجہ بتاتے ہوئے کہا تو
جواباً سعدیہ نے اقرار اور اس کی فیملی کے آنے کا بتایا۔
"امی ان سے باتیں کر رہی ہیں۔" سعدیہ سے کہا تو
ابرار تیزی سے بولا۔
"اوہ! اقرار بھائی بھی موجود ہیں۔ ان سے بھی بات
کروائیں۔ بڑا مس کر رہا تھا انہیں۔" وہ کافی دیر امی،
اقرار، بھابیوں اور نور سے بات کرتا رہا۔
"امی! جب فون بند کرنے لگیں تو ذرا میری بات
کروائیے گا۔ کچھ کہنا ہے ابرار کو۔" سعدیہ نے صابرہ بیگم
سے کہا۔ وہ مسلسل سوچ رہی تھی کہ آج ابرار بالکل بھی اداس
نہیں لگ رہا۔ بڑے آرام سے بات کر رہا تھا۔
"ہاں بھئی، دل لگ گیا ہوگا وہاں۔ آخر اتنا عرصہ ہو گیا
ہے رہتے ہوئے اور وہاں کچھ پاکستانی اس کے دوست بھی تو
بن گئے ہیں۔" اس نے سوچا۔ "کیا بات ہے ابرار! آج
اداس کے بجائے خوش لگ رہے ہو۔ آج تمہارے لہجے میں
تھکن نہیں ہے۔ دل لگ گیا ہے وہاں؟" سعدیہ جو سوچ رہی
تھی وہ زبان پر لے آئی۔
"واہ بھابی! بڑا غور کرتی ہیں۔ اچھا میں پھر بات کرتا
ہوں، ذرا کام ہے۔" ہنستے ہوئے ابرار نے جواب گول
کر کے کال ختم کر دی۔

☆☆☆

"سر! میں واپس جانا چاہتا ہوں۔" ابرار نہایت
احترام سے احسان صاحب سے مخاطب تھا۔
"کیوں؟ اچھا بھلا کام لگ گیا ہے اور تم بتا رہے
تھے کہ گھر پیسے بھیجنے لگے ہو۔ کیا ہوا؟" احسان علی شدید
حیران تھے۔
"معاف کیجیے گا احسان صاحب! دراصل مجھے کچھ بھی
اچھا نہیں لگ رہا۔ آپ شاید مجھے پاگل کہیں...... میں تو خود یہ
اعتراف کر رہا ہوں کہ میں پاگل ہو چکا ہوں۔" ابرار نے کہا۔
"گھر والے یاد آنے لگے ہیں؟" احسان صاحب
نرمی سے بولے۔
ابرار کچھ نہیں بولا۔ اس سے بولا نہیں جا رہا تھا۔
بڑی مشکل سے ہمت مجتمع کی اور کہنے لگا۔ "سر! میں یہاں
خود کو ابرار پاکستانی کہتا ہوں تو یہاں کے لوگوں کو پسند

نہیں آتا۔ انہیں مجھ سے خوف آتا ہے۔ مجھے دہشت گرد
سمجھتے ہیں اور...... ابرار امریکی تو میں ہوں ہی نہیں...... تو
پھر کون ہوں میں؟ سر! مجھے لگتا ہے میری شناخت کھوتی
جا رہی ہے۔ اپنے وطن، اپنی ماں کے پاس جانا چاہتا
ہوں۔ ان سب کے پاس جن کے دم سے میری شناخت،
میرا نام، میری پہچان ہے۔"
احسان صاحب دم بخود اس کے الفاظ سن رہے تھے۔
"سر! جتنی جلدی ہو سکے، میرے پاکستان جانے کا
بندوبست کر دیں۔ آپ کی مہربانی ہوگی۔" کہہ کر اور ہاتھ ملا
کر ابرار کمرے سے باہر نکل آیا۔ احسان صاحب گنگ سے
پنجابی نوجوان کے بارے میں سوچ رہے تھے جسے کچھ ہی
عرصے میں اپنی شناخت کا ادراک اور اپنے پرائے کا فرق
معلوم ہو گیا تھا۔
"میں برسوں سے یہاں رہ رہا ہوں۔ میں کیوں نہیں
آج تک سمجھ [illegible] پڑا ہے۔"

☆☆☆

"ابرار! تم نے بتا دیا گھر والوں کو کہ تم واپس آ رہے
ہو؟" شاہد نے پوچھا۔
"نہیں، میں اچانک ان کے گلے لگ کر انہیں خوشی
دینا چاہتا ہوں۔" ابرار مسکرایا۔
احسان صاحب نے کہا تھا کہ چند ہی دن میں وہ اسے
واپس بھجوا دیں گے۔ وہ بڑا خوش تھا اور گن گن کر دن
گزار رہا تھا۔
"اچھا...... لیکن...... میں نے تو بتا دیا ہے۔" شاہد
نے عام سے لہجے میں بتایا۔
"کیا کہا تم نے......؟ تم...... تم بھی پاکستان جا رہے
ہو؟" حیرت آمیز خوشی سے ابرار اچھل پڑا۔
"ہاں یار! تمہاری پاگل پن کی باتوں اور پاکستان
کے بارے میں طویل گفتگو نے مجھے بھی جگا دیا ہے۔ سچ
کہوں تو تم ایک خوش بختی بن کر آئے ہو میرے لیے۔
تمہارے امریکا آنے کے لیے قدرت نے اس لیے فیصلہ کیا
کہ مجھے، میرے گھر جانے کا راستہ دکھایا جائے۔" شاہد
مسکرا رہا تھا اور آنکھیں نم تھیں۔
"شکر ہے تم نے اچھا فیصلہ کیا ورنہ میں تو یہ خیال
کر کے دکھی ہو رہا تھا کہ پہلے پاکستان والے یاد آتے تھے،
اب وہاں جا کر امریکا والا دوست یاد آیا کرے گا۔" ابرار
کی خوشی دیدنی تھی۔

☆☆☆

شاہد اور ابرار ایک ہی فلائٹ سے وطن واپس آ رہے
تھے۔ احسان صاحب دونوں کو سی آف کرنے آئے تھے۔
وہ ابرار کو بڑی عقیدت سے دیکھ رہے تھے۔ "تم نے میری
جان بچا کر بہت بڑا احسان کیا تھا اور اب وطن کے بارے
میں تمہارے جذبات نے مجھے بہت خوش کیا ہے۔ اللہ تمہیں
خوش رکھے ابرار!"
"آمین! ویسے سر! آپ نے مجھے وطن واپس بھجوانے
کا انتظام کر کے اس احسان کا بدلہ اتار دیا ہے۔ بلکہ مجھے
آپ کی وجہ سے نئی زندگی ملی ہے۔" ابرار نے سر جھکا کر کہا۔
"کیا کرنے کا ارادہ ہے اب؟ یعنی ملازمت تو شاید
ہی ملے۔ کوئی کاروبار یا وہی...... ذرا تیاری کی؟"
"تھوڑے سے پیسے جمع ہوئے ہیں۔ اسرار بھائی کی
دکان کو وسعت دے کر اسی کاروبار کو بڑھائیں گے۔ مجھے
یقین ہے بہت اچھا رہے گا اور اگر زیادہ اچھا نہ بھی ہوا تو کوئی
بات نہیں سر! اگر گھر کی چھت اکھڑ جائے یا ٹپکنا شروع ہو
جائے تو اس کی مرمت کرواتے ہیں یا اسی حالت میں گزارہ
کرتے ہیں۔ اپنا گھر چھوڑ کر دوسرے کے گھر جا کر تو نہیں
بیٹھ جاتے نا؟" ابرار نے بڑی سچی بات کی تھی۔
احسان صاحب نے دونوں کو گلے لگا کر رخصت کیا۔
وہ چند قدم چلے۔ ابرار رک گیا اور ایک بار پھر "خدا حافظ اور
شکریہ سر" کہا تو احسان صاحب ہنس دیے۔
"ارے بھئی بار بار پیچھے مڑنے اور جذباتی ہونے کی
ضرورت نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ دو ماہ کے بعد میں بھی
پاکستان میں ہوں گا پھر جتنی مرضی باتیں کر لینا میرے گھر آ کر۔"
"آپ بھی......؟" شاہد نے خوشی سے پوچھا۔
"کیوں، کیا میرا گھر نہیں ہے وہ؟ ٹھیک ہے، میں
ذرا دیر سے واپس جا رہا ہوں لیکن یاد رکھو، بیٹا دیر سے
گھر آئے تو بھی بیٹا، بیٹا ہی رہتا ہے اور ماں، ماں ہی رہتی
ہے۔" احسان صاحب نے جذباتی ہو کر کہا۔
"تم نے سب کو پاگل کر دیا ہے ابرار!" شاہد آہستگی
سے بولا۔
"جلد ملیں گے، ان شاء اللہ!"
"ان شاء اللہ!" دھرتی بانہیں پھیلائے بیٹوں کی منتظر
تھی۔ بیٹے اس کی بانہوں میں سمانے کے لیے جا رہے تھے۔

☆☆☆

طیارہ پاکستان کی حدود میں داخل ہو چکا تھا۔ سیٹ
بیلٹس باندھنے سے لے کر سرزمین پر قدم رکھنے تک ان
کا حال ایسا ہو رہا تھا جیسا 47ء میں ہجرت کر کے آنے

والے قافلے پہلی بار آزاد دھرتی پر قدم رکھ کر محسوس کر رہے تھے۔ شاہد ٹیکسی میں بیٹھ کر اپنے شہر کے لیے روانہ ہو چکا تھا۔ اس کے گھر والے ابھی اس کے ساتھ تھے۔ وہ اسے لینے آئے ہوئے تھے۔ ابرار نے ابھی تک ٹیکسی نہیں لی تھی۔ وہ بیگ گھسیٹتے ہوئے پیدل چل رہا تھا۔ اس کے پاس سے مٹی کی بھری ٹرالی گزرتے ہوئے رک گئی۔ اس نے آگے بڑھ کر مٹھی بھر کر مٹی اٹھائی اور اسے سونگھنے لگا۔ بڑا خوش کن احساس تھا۔

"ارے، اب تو میں وطن واپس آ گیا ہوں۔ اب تو میرے چاروں طرف میری مٹی ہے۔" اسے اچانک یاد آیا۔ اس نے مٹی ایک طرف اچھالی اور مسکراتے ہوئے ٹیکسی ڈرائیور کو اشارہ کیا۔

گھر میں داخل ہوتے ہی نور نظر آئی۔ وہ شاید کہیں باہر جانے کے لیے گیٹ کے قریب کھڑی تھی۔ اس نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے اپنے ساتھ لپٹا لیا۔ حیران سی نور بھی چچا کے ساتھ لپٹ گئی۔

"دادو کہاں ہیں؟" اس نے ابھی تک حیران اور بے یقینی کی کیفیت چہرے پر سجائے نکی سے سرگوشی میں پوچھا۔

"عصر کی نماز پڑھ رہی ہیں۔" نور نے بتایا۔

"اور ماما؟"

"وہ کچن میں ہیں۔"

ابرار نے سامان وہیں صحن میں چھوڑا اور کچن کی جانب بڑھ گیا۔

"کیا پک رہا ہے آج بھابی؟" اس نے کچن کے دروازے پر ہاتھ رکھ کر یوں پوچھا جیسے وہ یہاں جانے سے پہلے پوچھا کرتا تھا۔ سعدیہ کے پیاز کاٹتے ہاتھ وہیں رک گئے۔ وہ پیچھے مڑی۔

"ابرار! واقعی تم ہو یا میں خواب دیکھ رہی ہوں؟" سعدیہ نے دونوں ہاتھوں سے اس کا چہرہ بڑے پیار سے تھامتے ہوئے کہا۔ وہ ہنس دیا لیکن آنکھوں میں آنسو تھے۔

"کون ہے؟ سعدیہ! کس کے ساتھ بات کر رہی ہو؟" صابرہ بیگم جائے نماز سے اٹھنے والی تھیں کہ انہیں آوازیں سنائی دیں۔

"امی جی! آپ سے کوئی ملنے آیا ہے۔" سعدیہ کی چہکتی آواز آئی۔

صابرہ نے جلدی سے جائے نماز کا کونا الٹا اور اٹھنے ہی والی تھیں کہ انہیں اچانک ٹھٹھکنا پڑا۔ سامنے ان کا چھوٹا بیٹا، ان کا لاڈلا، ان کا پردیسی بچہ (بقول ان کے) کھڑا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ اٹھنے لگیں جیسے ڈر ہو کہ زیادہ تیزی کی تو وہ حسین ترین سپنا جو دیکھ رہی ہیں، ٹوٹ جائے گا۔

"ابرار... آ گئے تم؟" ان کے منہ سے نکلا۔ انہوں نے اپنی جانب والہانہ انداز میں بڑھتے ابرار کو دیکھا۔ انہیں یوں لگا جیسے وہ تین سال کا ابرار ان کی جانب بڑھ رہا ہے اور ان کی گود میں آنا چاہتا ہے۔ انہوں نے بانہیں پھیلائیں اور ان کا ننھا سا بچہ ان کی آغوش میں آ گیا۔ ان کے چہرے سے آنسو صاف کرتے ہوئے ابرار انہیں برآمدے میں لے آیا۔

"بھابی! پانی لائیں۔" کہہ کر وہ انہیں بٹھا کر ان کی گود میں لیٹ گیا۔

"کتنے دنوں کے لیے آئے ہو؟" صابرہ بیگم اس کے ماتھے پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے بولیں۔ ان کے انداز میں حسرت تھی۔

"امی جی... ہمیشہ کے لیے آ گیا ہوں۔ اب کہیں نہیں جاؤں گا، آپ سب کو، اس ملک کو چھوڑ کر۔" ابرار نے ان کا ہاتھ تھام کر کہا تو صابرہ بیگم کی روح سرشار ہو گئی۔

"سنا تم نے سعدیہ! ابرار کیا کہہ رہا ہے۔ ارے نور کہاں گئی، اسے بھی بتاؤ۔" وہ خوشی میں اونچا اونچا بول رہی تھیں۔

"امی! نور دونوں بھائیوں کو بلانے گئی ہے۔ بچے گلی میں کھیل رہے ہیں اور میں نے سن بھی لیا ہے کہ ابرار اب یہیں رہے گا۔ مبارک ہو آپ کو۔" سعدیہ کچن سے مسکراتے ہوئے باہر آ رہی تھی۔ "تمہارے بھائی کو میں نے نہیں بتایا۔ ٹھیک کیا نا؟" دونوں کو شربت کے گلاس تھماتے ہوئے سعدیہ نے پوچھا۔

"ہاں بھابی! ٹھیک کیا۔ میں ابھی جا رہا ہوں انہیں سرپرائز دینے اور افراز بھائی کے گھر سے بھی ہو کر آؤں گا۔"

"جلدی آ جانا بیٹے!" صابرہ بیگم بولیں۔

"بس امی تھوڑی دیر میں آ رہا ہوں اور اب اطمینان رکھیں۔ یہیں ہوں میں۔"

"یہ تو بتاتے جاؤ کہ کیا پکاؤں رات کو تمہاری پسند کا۔ کوفتے، بھنڈی کی دال چاول، بھنڈی یا چکن بریانی؟" سعدیہ بولی۔

"سب کچھ پکا لیں۔ میں تھوڑا تھوڑا کھا لوں گا۔"

"پاگل!" سعدیہ مصنوعی پریشان ہو کر چلائی۔

ابرار، بھائی کی دکان کے لیے نکل چکا تھا۔ اگلے روز وہ ابو کی قبر پر حاضری دینے گیا۔ فاتحہ پڑھ کر قبر کے پاس بیٹھ گیا اور باتیں کرنے لگا۔

"ابو جی! معاف کر دیں۔ آپ کا نالائق بیٹا بہت دنوں کی غیر حاضری کے بعد آیا ہے۔ میں نے آپ کے بعد بہت کم عرصہ گزارا ہے۔ آپ تو خدا کی رضا سے مجھے چھوڑ کر گئے تھے۔ میں احمق اپنی من مرضی کر کے یہاں سے دور چلا گیا تھا۔ سوری ابو!"

اسے لگا، ابو اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہہ رہے ہیں۔ "مگر بیٹے! تم ہو ہی ایسے۔"

☆☆☆

"میں بڑا حیران تھی اس کے لہجے پر کہ بڑا خوش اور پرسکون ہے۔ میں نے وجہ پوچھی تو جواب گول کر گیا۔ اب پتا چلا کہ یہ ادھر آنے کا ارادہ کر چکا تھا اس لیے اداس رہتا تھا۔" سعدیہ سب کو بتا رہی تھی۔ ابرار کو آئے تیسرا دن تھا۔ اتوار کی وجہ سے بچوں کی بھی چھٹی تھی اس لیے صابرہ بیگم نے بیٹے کے آنے کی خوشی میں دعوت رکھ لی کہ ساری فیملی شرکت کرے۔ افراز، اس کے بیوی بچے، اسرار، سعدیہ، بچے، صابرہ بیگم سب ابرار کے گرد جمع تھے۔ کھانے سے فارغ ہو کر باتیں ہو رہی تھیں۔ اسی دوران سعدیہ نے اس دن کی کال کا بتایا۔

"جی سعدیہ بھابی! واپس آنے کا فیصلہ کر کے ہی میں نے وہ کال کی تھی۔ مجھے بس یہ ڈر تھا کہ آپ کو شک نہ ہو جائے اور میرا سرپرائز خراب نہ ہو جائے۔" ابرار ہنستے ہوئے کہہ رہا تھا۔ اپنوں کے درمیان بیٹھے اس کی ہنسی کی کھنک بڑھ گئی تھی۔

☆☆☆

وقت پلک جھپکتے گزرا اور اسلامی جمہوریہ پاکستان کا 75 واں جشن آزادی آ گیا۔ دہشت گردی کے خلاف جنگ میں تقریباً کامیابی اور کورونا وبا سے نمٹنے کے بعد یہ یوم آزادی خوب دھوم دھام سے منایا جا رہا تھا۔ 75 واں جشن ہونے کی وجہ سے قوم خصوصی دلچسپی اور جوش و خروش دکھا رہی تھی۔ آج کوئی چیز نہیں تھی جو ابرار کو سفید سوٹ پہننے، بیج لگانے اور کیک کاٹنے سے روک سکے۔ وہ بازار جا رہا تھا۔ کچھ ہی دیر پہلے فون پر اس کی شاہد اور احسان صاحب سے بھی بات ہوئی۔ وہ دونوں بھی پاکستان میں یہ دن منانے پر بہت خوش تھے۔ ابرار بازار پہنچا تو وہاں اس کا دوست بلال مل گیا۔ دونوں باتیں کرنے لگے۔ اردگرد مختلف ملی نغمے سنائی دے رہے تھے۔ جیوے جیوے پاکستان، سوہنی دھرتی اللہ رکھے قدم قدم آباد تجھے، تیرا پاکستان ہے یہ میرا پاکستان ہے، کو گانے بہت مزہ آ رہا تھا۔

"واہ! یہ ہوتا ہے آزاد شہری کا آزاد ملک میں یوم آزادی۔" ابرار نے خودکلامی کی۔

"کیا کہا؟" بلال نے پوچھا۔

"یار بلال! میں کہہ رہا ہوں کہ نشیب و فراز تو زندگی کا حصہ ہیں۔ کبھی دن ہے، کبھی رات۔ ہمیں گلے شکوے کرنے کے بجائے جو انمول خوشیاں ملی ہیں، انہیں دل سے منانا چاہیے۔"

"ہاں ہاں بالکل... اور اب پاکستان کی سالگرہ کی خوشی میں بریانی کھلاؤ۔" بلال نے تائید کرتے ہوئے فرمائش کر دی۔ دونوں بریانی کھانے لگے۔ اسی جگہ سے لے کر جو ابرار کو امریکا میں شدت سے یاد آتی تھی۔ بلال جا چکا تھا۔ ابرار نے بریانی اور کیک پیک کروائے اور گھر جانے کے لیے بائیک اسٹارٹ کی۔ اس کی بائیک پر لگا چھوٹا سا ہلالی پرچم ہوا کے ساتھ لہرا رہا تھا۔ اسے کہیں سے ملی نغمہ سنائی دیا... "یہ فضا تمہاری ہے، بحر و بر تمہارے ہیں، کہکشاں کے یہ..." ابرار کا سینہ فخر و خوشی سے چوڑا ہو گیا۔ اسے لگا پوری کائنات........ اسے مبارک باد دے رہی ہے۔ اپنی گلی سے کچھ پہلے اسے ایک اسکول کے بچوں کی آواز سنائی دی۔ "امید صبح جمال رکھنا... خیال رکھنا، خیال رکھنا۔"

"ہاں، ان شاء اللہ! ایک دن سب ٹھیک ہو جائے گا۔ نوجوان امید پوری ہونے پر خوش ہوں گے۔ تعلیم و صحت سب کے لیے ہو گی۔ پوری قوم امن کے دائمی قائم ہونے پر جھوم اٹھے گی۔ ہاں... مجھے یقین ہے اس دھرتی پر صبح جمال طلوع ہو گی۔ اپنے گھر میں رہ کر اپنے صحن میں سورج کی کرنوں کے اترنے کا انتظار کرنا ہے۔ وہ دن دور نہیں جب سب ہم وطن، اپنی تمام ضروریات وطن میں ہی پوری کر لیں گے۔

"میرے پاکستان! تو زندہ باد، پائندہ باد، جشن جوبلیاں مناتا ہوا ابد تک سلامت رہے۔ 75 واں یوم آزادی میرے پاکستان کو، مجھے اور میری قوم کو مبارک ہو۔" اس نے اسکول کی عمارت پر لہراتے سبز ہلالی پرچم کو مسلسل دیکھتے ہوئے وطن کو دعا اور مبارک باد دی۔

گھر آ گیا تھا۔ اس نے گھر والوں کے لیے پیک کروائی ہوئی بریانی اور سبز و سفید بنے کیک کا شاپر اتارا اور "امید صبح جمال رکھنا" گنگناتا ہوا گھر کے اندر داخل ہو گیا۔

☆☆☆

محفلِ شعر و سخن

❁ حرا اطہر..... کراچی

بزاں ہے کس عیاری سے او جابر انسان
پورب پچھم تم کیسے نہ تم کیسے اذہان

❁ ناہید یوسف..... اسلام آباد

ساری عمر گزاری ہم نے کرب و بلا کے رستے میں
تم اشکوں سے پیاس بجھانا ہم کو کیا سکھلاتے ہو
اب کیا لینے آئے ہو تم اپنے وعدے یاد کر
خود کو سمیٹا ہے مشکل سے کیوں پھر سے بکھراتے ہو

❁ آمنہ شیخ..... ملتان

عنوان میری زیست کا مبہم ہے یہ کیسا
احوال شب و روز کا برہم ہے یہ کیسا

❁ فریدہ بخاری..... ٹنڈو الہیار

موسم کی سازش ہے یا پھر مٹی بانجھ ہوئی
پیڑ زیادہ ہوتے جائیں، گھٹتا جائے پھل

❁ عبداللہ جواد..... سرائے عالمگیر

تم نے تو شک کے دشت میں خیمے لگا لیے
تنہا کٹے کسی کا سفر تم کو اس سے کیا

❁ محمد احمد..... لاڑکانہ

وہ تو میرے سامنے بیٹھا تھا ..... پھر
کس کا چہرہ نقش تھا مہتاب میں

❁ سائرہ شاہد..... کراچی

پھر دشتِ جنوں مجھے اس در سے کھینچ لائی
نقشہ کھنچا ہوا تھا جہاں میرے خواب کا

❁ اویس خان..... مری

تو شریکِ سخن نہیں ہے تو کیا
ہم سخن تیری خامشی ہے ابھی

❁ ثاقب کمال..... کراچی

اب رات بھی سرد ہوئی ہے
ہم اوڑھیں گے کیا بچھائیں گے کیا

❁ حافظ عاصم..... مظفر گڑھ

تو دوست کسی کا بھی ستمگر نہ ہوا تھا
اوروں پہ ہے وہ ظلم کہ مجھ پہ نہ ہوا تھا

❁ شوکت علی..... بہاولپور

صدائیں آتی ہیں اجڑے ہوئے جزیروں سے
کہ آج رات نہ کوئی رہے کنارے پر

❁ خرم نقوی..... سرگودھا

کیسے زعم میں رہتے تھے وہ لیکن اب پچھتاتے ہیں
دل کو روند کے بیٹھے تھے وہ دے دی ملت ہزاروں کو
وہ سمجھے ہم ان کے رنگ میں گم ہو کر من ہاریں گے
ہم ایسے نادان نہیں جو دل دے دیں بنجاروں کو

❁ منیر احمد..... مانسہرہ

ڈوبتا بھی ہے، ابھرتا بھی ہے، ہر سانس کے ساتھ
چاند کا اس کے گریبان سے ناتا کیا ہے

❁ عتیق ناز..... جہلم

مجھے وہ دن کہ نادانستہ غیروں کی وفاداری
کیا کرتے تھے تم تقریر ہم خاموش رہتے تھے

❁ صدف افضل..... ساہیوال

ہنر ہے ہم میں دریا کا نکل جاتے ہیں ہر جانب
کہ لہروں کی طرح ساحل سے ٹکرایا نہیں کرتے
جو موسم کے تغیر کے لیے تیار رہتے ہیں
وہ پنچھی تو کبھی اڑنے سے گھبرایا نہیں کرتے

❁ عنایت علی..... خیرپور

منافق ذرا سا کر لیتے تو کوئی بدلہ لینا تھا
میں پھول بچھا کے رہ دیکھوں تم پتھر مارے جاتے ہو
وہ گانے والے اچھے تھے، من ان کے اجلے اجلے تھے
اب تنہا تنہا رستوں پہ تم کسے پکارے جاتے ہو

❁ فیاض ملک..... اوکاڑہ

کوئی اور نشہ ہے وہ بے خبر جو شراب سے بھی ہے تیز تر
مرا میکدہ کہیں اور ہے مرا ہم سبو کوئی اور ہے

❁ مجتبیٰ علی..... راولپنڈی

مسافرانِ شبِ غم، اسیرِ دار ہوئے
جو رہنما تھے، بکے اور شہریار ہوئے

❁ عادل شاہ..... منڈی بہاء الدین

ملے ہے گریزاں، ایسا نہ ملنے پہ خفا بھی
دم توڑتی چاہت ہے کس انداز کا رشتہ

❁ گل نسیم..... لاہور

لگی ہے جلتی شمع بھی بجھنے میں کچھ تو وقت
ہے آدمی سا کوئی کہاں ہے ثبات اور!
سیلاب جیسے لیتا ہے دیوار کے قدم
کرتا ہے تم بھی دل سے کوئی واردات اور

❁ نیلوفر..... سکھر

وہ دیکھ کر نہ رکا اور گزر گئے ہم بھی
دعائے شب کی طرح بے اثر گئے ہم بھی

❁ ہما انصاری..... اسلام آباد

آرزوئیں رنج چن کر دل پہ لوٹیں عمر بھر
بے طلب تو کوئی ایسے زخم کھا سکتا نہیں

❁ لبنیٰ صادق..... کراچی

ہم عکسِ خونِ دل ہی مٹاتے پھرے مگر
وہ نقش آنسوؤں کی دھنک میں نکھر گیا

❁ سرور صبیح..... فتح جنگ

آباد کر کے شہرِ خموشاں ہر ایک سو
کس کھوج میں ہے تیغِ ستمگر لگی ہوئی

❁ فریدہ اعوان..... شکارپور

پوچھ کر اپنی نگاہوں سے بتادے مجھ کو
میری راتوں کے مقدر میں سحر ہے کہ نہیں

❁ عزا انجم..... گوجرانوالہ

تیری گلی میں آتے تھے بس تجھ کو دیکھنے
اس کے سوا ہمارا کوئی مدعا نہ تھا
اک سمت بابِ عشق تھا، اک سمت اپنا مان
کیسے گریز کرتے کوئی راستہ نہ تھا

❁ انصار حسین..... صادق آباد

سمٹے گی ہزار ہو تم سے مگر نہیں
دریا اس میں بند ہے جو آنکھ تر نہیں

❁ یوسف قادری..... کراچی

آنکھیں وہی ہیں آئینہ خانہ وہی مگر
حیرت یہ ہے کہ اب کوئی حیرت نہیں رہی

❁ عاصم خان..... کراچی

اڑنے دو پرندوں کو ابھی شوخ ہوا میں
پھر لوٹ کے بچپن کے زمانے نہیں آتے

❁ فرحانہ ممتاز..... کوئٹہ

ہمیں آج ساحل پہ رونے بھی دو
کہ طوفان میں مسکرانا بھی ہے

❁ پروین افضل..... [illegible]

وہ میری رسائی میں نہیں ہے تو عجب کیا
حسرت بھی تو ہے عشق کا حصہ اسے کہنا

❁ محمود احمد..... آزاد کشمیر

اجنبیوں سے دھوکا کھانا پھر بھی سمجھ میں آتا ہے
اس کے لیے کیا کہتے ہو؟ وہ شخص تو دیکھا بھالا تھا

❁ نبیلہ ثاقب..... کراچی

جس جا مکیں بننے کے دیکھے تھے میں نے خواب
اس گھر میں ایک رات کی مہمان بھی نہ تھی

❁ ریاض خان..... کراچی

اس کو سینے سے اپنے لگائے پھرتا ہوں
وہ ایک غم جو غمِ رفتگاں سے دور نہیں

❁ یسریٰ یوسف..... اسلام آباد

محبت کرنے والے لوگ خود کو توڑ لیتے ہیں
محبت کرنے والے دل مگر توڑا نہیں کرتے

❁ مہتاب احمد..... حیدرآباد

سکھا دیتی ہیں چلنا ٹھوکریں بھی راہ گیروں کو
کوئی رستہ سدا دشوار ہو ایسا نہیں ہوتا

❁ مجیب علی..... چنیوٹ

میں رات ایسے جزیرے میں تھا جہاں مجھ کو
ہر ایک خواب حقیقت لگا گماں کی طرح

❁ راحیل اختر ..... کراچی
تلاشِ منزل کے مرحلوں میں یہ حادثہ بھی عجیب دیکھا
فریب راہوں میں بیٹھ جاتا ہے صورتِ اعتبار بن کر

❁ شاہد حسین ..... لاہور
لوگ کہتے ہیں کہ ہونٹوں پہ ہے مسکان میرے
کون جانے کہ تصویر میں ہنسایا کس نے

❁ بابر علی ..... نواب شاہ
ہمارے جذبۂ خوددار نے کھائی شکست آخر
بہت چاہا نہ آئیں یاد وہ ہم کو مگر آئے

❁ یٰسین ..... جیکب آباد
لکھی جاتی ہے خونِ دل سے صفحاتِ دوعالم پر
محبت کی حکایت اس لیے رنگین ہوتی ہے

❁ عبدالجبار ..... گھوٹکی
اک ایسی بارش ہو میرے شہر پہ جو
سارے دل اور سارے دریچے دھو جائے

❁ محمد عدیل ..... پشاور
میں اپنی ذات تیرے نام میں تلاش کروں
تجھے گر تو نہیں، مگر میں خود کو پا جاؤں

❁ سنبل جاوید ..... خیرپور میرس
یہاں شوق بھی تماشا یہاں عشق بھی ملامت
نہ تو وصل خوب صورت نہ فراق ہی قیامت

❁ محب شاہ ..... مردان
جہاں پھولوں کو کھلنا تھا وہیں کھلتے تو اچھا تھا
تمہی کو ہم نے چاہا تھا تمہی ملتے تو اچھا تھا

❁ خالد چیمہ ..... پنڈی بھٹیاں
نہ جانے کون سی منزل پہ جاکے رک جائیں
نظر کے قافلے دیوار و در سے گزرے ہیں

❁ اسرار احمد ..... لاڑکانہ
غریب شہر کے خون کا حساب کیا لیں گے
لہک رہا ہے لہو جن کی آستینوں سے

❁ نوشین ..... کراچی
خوشی کی رُت ہو کہ غم کا موسم نظر اسے ڈھونڈتی ہے ہر دم
وہ بوئے گل تھا کہ نغمۂ جاں مرے تو دل میں اتر گیا وہ

❁ عمران شیروانی ..... لاہور
میرے گھر کی حسین فضاؤ! کہیں جو ان کا نشان پاؤ
تو پوچھنا یہ کہاں بسے وہ، کہاں ہے ان کا قیام کہنا

❁ فراز بٹ ..... لودھراں
وہ مزہ دیا تڑپ نے کہ یہ آرزو ہے یارب
میرے دونوں پہلوؤں میں دلِ بے قرار ہوتا

❁ احمد یار ..... قلات
یوں تو میرے خلوص کی قیمت بھی کم نہ تھی
کچھ بے شناس لوگ تھے دولت پہ مر گئے

❁ محمد شاہد ..... فیصل آباد
خزاں عزیز ہے ہم کو کہ اور اس کے سوا
بچا ہی کیا ہے ہمارے لیے تمہارے بعد

❁ انیس الرحمان ..... بھکر
آنکھوں سے نہ پڑھ لے کوئی چہرے کی اداسی
اس ڈر سے کبھی ذکر وہ میرا نہیں کرتے

❁ عباس علوی ..... ڈیرہ اسماعیل خان
ہم ایک مرگِ مسلسل میں زیست کرتے ہیں
اور اس کے بعد بھی ڈرتے ہیں مر نہ جائیں کہیں

❁ ممتاز حسین ..... سیالکوٹ
میں اس کی آنکھ کے رستے سے دل میں اترا ہوں
نکال دے وہ مجھے دل سے اس کے بس میں نہیں

❁ ماہین اویس ..... کراچی
کیا جانے کیا رُت بدلے حالات کا کوئی ٹھیک نہیں
اب کے سفر میں تم بھی ہمارے ساتھ چلو تو بہتر ہے

❁ عینی حسین ..... ٹنڈو آدم
کاش وہ اپنے غم مجھے دے دیں تو کچھ سکون ملے
وہ کتنا بدنصیب ہے غم بھی جسے ملا نہیں

❁ عاشق علی ..... ٹوڈیرو
چپ چاپ اپنی آگ میں جلتے رہو فراز
دنیا تو عرضِ حال سے بے آبرو کرے

❁ صفدر عباس ..... ڈسکہ
دنیا میں دو ہی آدمی باذوق ہیں عدم
اک میں ہوں اور دوسرا میرا رقیب ہے

معمّا موت

فاطمہ حسام

انسان کتنا عاقبت نا اندیش ہے... اصل دولت یعنی گھر کے سکون کو چھوڑ کر غلط ذرائع سے دولت کمانے والوں پر نگاہ ٹکا کر بیٹھ جاتا ہے اور جہاں ذرا نگاہ چوکی وہاں دولت نے اپنا رستہ اور لوگوں نے اپنا چولا بدلا... بس نگاہ کی اسی چوک اسے بھی انتقام میں سلگا گئی... پھر دغا بازی کا بانس تو فنا ہوا مگر بانسری ہمیشہ کے لیے بجتی چھوڑ گیا کیونکہ اس کی زندگی عاقبت کے تمام دروازے بند کرکے محض اندیشوں کی قبر میں اتر گئی تھی جہاں صرف پچھتاوئوں کے سانپ اسے ڈسنے کے لیے کافی تھے۔

محبت کے بھیس میں چھپے لالچ و طمع اور ہوس کے ہاتھوں قتل کا قصہ

پارٹی نے اپنا رنگ جمالیا تھا۔ تیز بیٹ نے جب نئی دھن چھیڑی تو بال روم میں موجود لوگوں کے رگ و پے میں مستی سی دوڑ گئی۔ سیکسو فون (دھات کا بنا ہوا ایک باجا نما آلۂ موسیقی) کی ساحرانہ جیسی آواز سماعت کے راستے سیدھی دلوں میں اتر رہی تھی۔ میریون کیلر ڈانس اور میوزک کی دلدادہ تھی۔ تیز بیٹ نے بال روم میں ڈانس کے حوالوں کے لیے جو ماحول بنا رکھا تھا، وہ کیف آور اور سرور آگیں تھا۔ میریون کے پاؤں میں عجیب سی سنسناہٹ ہو رہی تھی۔

اٹل بال روم کی جانب جانے کے لیے بے چین ہو رہے تھے لیکن میریون کو اس پارٹی کی میزبان مسز ڈیلر مپل نے گھیر رکھا تھا۔

"تمہیں جراثیم کش ادویات کے حوالے سے بہت زیادہ احتیاط کرنا ہوگی۔" مسز ڈیلر مپل نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "خاص طور پر محدود جگہ پر جیسا کہ گرین ہاؤس.....!"

"گرین ہاؤس" باغبانی کا جدید اور مفید طریقہ ہے۔ ایک خاص قسم کی سبز چادر نما شیٹ سے اپنی ضرورت کے مطابق، دیواریں اور چھت بنا کر اس کے اندر مختلف اقسام کے پودے رکھے جاتے ہیں۔ اس گرین شیٹ کی خاصیت یہ ہے کہ باہر سے روشنی، دھوپ، آکسیجن، کاربن ڈائی آکسائیڈ اور دیگر مفید گیسیں بہ آسانی اندر داخل ہو جاتی ہیں لیکن اندر موجود آبی بخارات، کاربن ڈائی آکسائیڈ، میتھین، نائٹرس ایسڈ اور اوزون جیسی چیزوں کو باہر جانے کا راستہ نہیں ملتا۔

"گرین ہاؤس" بنانا مسز ڈیلر مپل کا خاص شوق تھا لیکن میریون کو باغبانی سے کبھی دلچسپی نہیں رہی تھی مگر وہ اپنے جذبات کو مسز ڈیلر مپل پر ظاہر نہیں ہونے دے رہی تھی تاکہ میزبان کو اس کی کوئی بات بری نہ لگ جائے۔

"کیوں نہیں..... ضرور!" میریون نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ "میں تمہاری ہدایات کو یاد رکھوں گی۔"

میریون ہیومن رائٹس ایکٹیوسٹ (سماجی کارکن) تھی۔ اس کا پیشہ انسانی نفسیات کی جانکاری کا تقاضا کرتا تھا۔ کلیرنس کیلر سے کسی پیچیدگی کے بغیر اس کی شادی ہوگئی تھی جو تاحال خوش اسلوبی سے چل رہی تھی۔

"ہم نے پچھلے سال کے تجربے سے بہت کچھ سیکھا ہے۔" مسز ڈیلر مپل اپنی ہی دھن میں بولتی چلی گئی۔ "کیر فیومیگیشن کے حق میں نہیں تھا۔ میں نے اس کی مانتے ہوئے اپنے گرین ہاؤس کے پودوں پر جراثیم کش ادویات کا چھڑکاؤ نہیں کروایا اور ہمیں بہت زیادہ نقصان اٹھانا پڑا لیکن اس سال کیر نے مخالفت نہیں کی اسی لیے ہمارے گرین ہاؤس کے تمام پودے صحت مند اور ہرے بھرے ہیں۔"

مسز ڈیلر مپل کی گفتگو نے اب میریون کو بور کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ اپنی میزبان سے بات کرتے ہوئے گرد و نواح میں بھی جھانک رہی تھی۔ اس کی متلاشی نظر اپنے شوہر کو ڈھونڈ رہی تھی۔ میریون اور کلیرنس ایک ساتھ اس پارٹی میں آئے تھے۔

وہ دونوں اس وقت بالائی منزل کی جانب جانے والے زینے کے نزدیک کھڑی تھیں۔ مسز ڈیلر مپل کے گھر میں ہونے والی پارٹیز شاندار اور یادگار ہوا کرتی تھیں۔ اس سال پارٹی میں مسز ڈیلر مپل نے لگ بھگ پچاس مہمانوں کو مدعو کر رکھا تھا۔ اہلِ خانہ کی رہائش "ڈیلر مپل ہاؤس" کی بالائی منزل پر تھی۔

"تم کسی روز سہ پہر میں آنا۔" مسز ڈیلر مپل نے اصراری لہجے میں کہا۔ "پھر میں فرصت اور تسلی سے تمہیں اپنا گرین ہاؤس دکھاؤں گی۔"

"میرا دماغ خراب نہیں ہوا جو تمہاری باتوں میں آجاؤں۔" میریون نے بزبانِ خاموشی اکتاہٹ بھرے انداز میں کہا پھر زبان سے اضافہ کر دیا۔ "ضرور..... بالکل مسز ڈیلر مپل!"

اچانک گولی چلنے جیسی آواز سنائی دی۔ مسز ڈیلر مپل نے گھبرائی ہوئی نظر سے میریون کی طرف دیکھا۔ "یہ..... یہ کیسی آواز تھی؟"

میریون اس آواز کے ماخذ تک پہنچ گئی تھی۔ اس نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے اطمینان بھرے لہجے میں جواب دیا۔

"مسز ڈیلر مپل! یہ گن فائر نہیں تھا۔"

"پھر کیا تھا؟" میزبان کے استفسار سے وحشت جھلکتی محسوس ہو رہی تھی۔

وہ آواز ڈرائیو وے کی طرف سے آئی تھی۔ میریون اس آواز سے واقف تھی۔ پچھلے دو روز سے وہ اس آواز کو کئی بار سن چکی تھی۔

"کلیرنس نے حال ہی میں ایک نئی کار خریدی ہے۔" میریون نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا۔ "یہ "مارمن اسپیڈسٹر" کی مخصوص آواز ہے۔ میرے خیال میں وہ اپنے دوستوں کو اپنی نئی کار سے متعارف کرا رہا ہے۔ وہ اپنی اس کار کو لے کر بہت زیادہ پُرجوش اور خوش ہے۔"

"اوہ..... اچھا!" مسز ڈیلر مپل نے بددلی سے کہا۔

قبل اس کے کہ مسز ڈیلر مپل دوبارہ اپنے گرین ہاؤس کا قصہ چھیڑ دیتی، میریون اسے اپنے شوہر کی نئی کار "مارمن اسپیڈسٹر" کی خوبیوں کے بارے میں بتانے لگی پھر ایک آواز نے ان دونوں کو گہری تشویش میں مبتلا کر دیا۔ چیخ سے مشابہ یہ آواز بالائی منزل سے آئی تھی۔ کوئی عورت دہشت ناک انداز میں چلائی تھی۔ اس چیخ کے فوراً بعد

دوڑتے ہوئے قدموں کی مخصوص آواز بھی ابھری تھی۔

"ایکسکیوزمی میریون!" مسز ڈیلر مپل نے اضطراری لہجے میں کہا۔ "مجھے اوپر جا کر دیکھنا ہوگا۔" پھر وہ میریون کا جواب سنے بغیر تیزی سے زینہ چڑھنے لگی۔

میریون کو اندرونی تجسس نے اوپر جانے پر مجبور کر دیا۔ زینہ طے کرتے ہوئے وہ اس نسوانی چیخ ہی کے بارے میں سوچ رہی تھی۔

وہ دونوں آگے پیچھے ہی بالائی منزل پر پہنچی تھیں۔ سامنے سے مسز ڈیلر مپل کی سب سے چھوٹی بیٹی آتی دکھائی دی۔ ماریا بہت زیادہ گھبرائی ہوئی نظر آتی تھی۔ ماں پر نگاہ پڑتے ہی ماریا پھٹ پڑی۔

"مام..... مام.....!" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ "مجھے لگتا ہے آنٹی میری زندہ نہیں رہیں.....!"

"کیا بکواس کر رہی ہو ماریا.....!" مسز ڈیلر مپل نے ڈانٹنے والے انداز میں کہا۔ "کلارا کہاں ہے؟"

"ماریا!" میریون نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے دریافت کیا۔ "کیا وہ دہشت ناک چیخ تمہاری ہی تھی؟"

ماریا نے اثبات میں سر ہلایا۔ "میں بہت زیادہ گھبرا گئی تھی مسز کیلر.....!" اس نے میریون کو بتایا۔

"ظاہری بات ہے۔" میریون نے کہا۔

"کلارا..... کلارا.....!" مسز ڈیلر مپل انہیں وہیں چھوڑ کر آگے بڑھ گئی۔ "کلارا! تم کہاں ہو؟"

جب مسز ڈیلر مپل دائیں جانب ایک کھلے ہوئے دروازے میں داخل ہوئی تو میریون بھی اس کی پیروی میں اندر چلی گئی۔

وہ ایک نہایت ہی آرام دہ بیڈروم تھا۔ اس کی متلاشی نگاہ ہر شے کا باریک بینی سے جائزہ لے رہی تھی۔ بیڈروم میں موجود تمام کا تمام فرنیچر ہلکے نیلے رنگ کا تھا۔ کمرے کے پردے، ڈریسنگ ٹیبل کا میز پوش، بیڈ شیٹ اور تکیوں کے غلاف قیمتی اور خوشنما پھول دار کپڑے کے تھے۔ کمرے کے فرش پر ایک دبیز قالین بچھا ہوا تھا۔

میریون نے پلک جھپکتے میں یہ اندازہ لگا لیا کہ اس عالیشان بیڈ پر لیٹی ہوئی اس عورت کو زندوں میں شمار نہیں کیا جا سکتا۔

میری اس وقت نائٹ ڈریس میں تھی جو ایک سائز سے تھوڑا بے ترتیب دکھائی دیتا تھا۔ ظاہر یہی ہو رہا تھا کہ وہ سونے کے لیے لیٹ چکی تھی۔ ایک ناول اس کی گود میں کھلا رکھا تھا جو اس بات کی جانب اشارہ کرتا تھا کہ میری سونے سے پہلے مطالعے کی عادی تھی۔

میریون نے بیڈ سائیڈ ٹیبل کا جائزہ لیا تو اسے وہاں دودھ والا ایک خالی کپ اور ڈوکوروین فرز کی ایک نیلی بوتل رکھی دکھائی دی۔ مذکورہ نیلی بوتل میں سونگھنے والے حیات بخش نمکیات تھے۔ ان نمکیات کو پابندی سے سونگھنے والا شخص ہمیشہ تندرست و توانا رہتا ہے۔ ایک بڑے سائز کا لیس لگا ہوا رومال کسی نیپکن کے مانند اس کے پیٹ کے اوپر پھیلایا گیا تھا جیسے وہ کچھ کھانے والی ہو۔

جب وہ لوگ میری کے بیڈروم میں داخل ہوئے تھے تو انہوں نے لگ بھگ چالیس سال عمر کی ایک عورت کو بے حس و حرکت میری کے اوپر جھکا ہوا دیکھا تھا۔ اس عورت نے گہرے رنگ کا سادہ سا لباس پہن رکھا تھا جس کے کالر اور کف سفید تھے۔

میریون نے اپنی یادداشت کو زحمت دی تو وہ اس عورت کو پہچان گئی۔ پارٹی کے آغاز ہی میں جب وہ مسز میری کولسن سے بات کر رہی تھی تو یہ سادہ لباس عورت وہاں قریب ہی موجود تھی۔ وہ مسز میری کی دیکھ بھال کرنے والی کلارا تھی۔

"کلارا..... آنٹی میری کو کیا ہوا ہے؟" مسز ڈیلر مپل نے تیز آواز میں پوچھا۔ "ماریا نے مجھے بتایا ہے کہ وہ اب ہم میں نہیں رہیں۔"

مسز ڈیلر مپل کے استفسار پر کلارا سیدھی کھڑی ہوگئی پھر مسز ڈیلر مپل کی طرف دیکھا۔ "میں بہت زیادہ پریشان ہوں۔" اس نے بتایا۔ "مسز کولسن پہلے بھی کئی بار بے ہوش ہو چکی ہیں لیکن اس بار کچھ زیادہ ہی خطرناک ہو گیا ہے۔ ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے یہ واقعی ہمیں چھوڑ گئی ہوں۔" بات کے اختتام پر کلارا نے ایک جھرجھری لی۔

کلارا ایک طرف ہٹ گئی۔ مسز ڈیلر مپل نے آنٹی میری کولسن کا جائزہ لیا اور تشویش بھرے لہجے میں بولی۔ "آنٹی گہری غنودگی میں ہیں۔ یہ پہلے بھی کئی بار اس حالت میں جا چکی ہیں..... بالکل مُردوں والی کیفیت میں۔"

میریون کے ذہن نے کہا۔ "یہ غنودگی نہیں غشی والی کیفیت ہے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ آنٹی میری گزر چکی ہیں۔" مگر وہ زبان سے چپ رہی۔

کلارا، مسز ڈیلر مپل کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "میں کئی بار کوشش کر چکی ہوں مگر مسز کولسن کی نبض نہیں مل رہی۔ میں سمجھتی ہوں، ہمیں فوراً ڈاکٹر کو بلانا چاہیے۔"

"ڈاکٹر بیک مور نیچے موجود ہیں۔" مسز ڈیلر مپل نے

کیا اور مسز میری کے کمرے کو چھوڑ کر اسے جگانے کی کوشش کرنے لگی۔

مسز ڈیلرمپل کو اپنی اس کوشش میں مکمل ناکامی ہوئی۔ وہ جھنجلا کر سیدھی کھڑی ہوگئی اور فکرمندی سے میریان کی طرف دیکھنے لگی۔

"میں ڈاکٹر کو لے کر آتی ہوں۔" میریان نے رضاکارانہ طور پر کہا اور وہاں سے کھسک لی۔

زینہ اترتے ہوئے آدرے ڈیلرمپل سے اس کی ملاقات ہوئی۔ مسز ڈیلرمپل کی بہو آدرے ادھر ہی آرہی تھی۔

"ہیلو میریان!" اس نے کہا پھر ہال وے کے پار مسز میری کولسن کے بیڈروم کے دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے مضطربانہ لہجے میں استفسار کیا۔ "وہاں کیا چل رہا ہے؟"

"تمہاری آنٹی کو ایک بار پھر غشی کا دورہ پڑا ہے۔" میریان نے لفظ غشی کا استعمال کرتے ہوئے بتایا۔ "میں ڈاکٹر بلیک مور کو لینے جارہی ہوں۔"

"اوہ، اچھا.....!" آدرے نے سرسری انداز میں کہا۔ "تم جاؤ۔ میں آنٹی کو دیکھتی ہوں۔"

میریان تیزی سے زینے طے کرتے ہوئے زیریں منزل پر پہنچی۔ ڈاکٹر بلیک مور بال روم (رقص گاہ) میں تھا۔ ڈرائنگ روم میں اور شاہی لائبریری میں۔ وہاں پر کئی ایک معزز افراد سگریٹ نوشی میں مصروف تھے۔ میریان دروازے سے باہر آئی تو ڈاکٹر بلیک مور نے لوگوں کے جھگمٹے میں نظر آگیا۔ وہ تیزی سے ڈاکٹر کی جانب بڑھی۔

وہ موسم گرما کی ایک سہانی شام تھی۔ لانگ آئی لینڈ کے شمالی ساحل سے آنے والی ہواؤں نے فضا میں ایک طلسم سا گھول دیا تھا۔ "ڈیلرمپل ہاؤس" کے سامنے جو لوگ جمع تھے، ان میں زیادہ تعداد مہمانوں کی تھی جن کے شوفرز بھی وہاں موجود تھے۔ وہ تمام افراد ایک کار کو دلچسپی سے دیکھ رہے تھے اور...... وہ کار کلیرنس کیلر کی "ماڈرن اسپیڈسٹر" تھی۔ چمکدار پینٹ رنگ کی وہ کار سب کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی تھی اور کلیرنس انہیں اپنی کار کی خوبیوں کے بارے میں بتا رہا تھا۔

"ہیلو ڈارلنگ!" میریان کو اپنی جانب بڑھتا دیکھ کر کلیرنس نے خوش دلی سے کہا۔ "میں بس ان لوگوں کو اپنی گاڑی سے متعارف کرا رہا تھا۔"

"جانتی ہوں لیکن اس وقت میں تمہارا ساتھ نہیں دے سکتی۔" میریان نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "میں ڈاکٹر بلیک مور کو لینے آئی ہوں۔ انہیں میرے ساتھ اوپر جانا ہوگا۔"

اس دوران میں ڈاکٹر بلیک مور، میریان کی جانب متوجہ ہو چکا تھا۔ وہ پچاس کے قریب عمر کا ایک چست اور فربہ شخص تھا۔ اس نے اپنی انگلی کی مدد سے نظر کے چشمے کو ناک کے اوپر درست کیا پھر میریان کی جانب دیکھتے ہوئے سرسری انداز میں بولا۔

"کیوں نہیں..... ضرور مسز کیلر! میں آپ کے ساتھ چل رہا ہوں۔"

ڈاکٹر بلیک مور کے انداز سے کسی قسم کا اضطراب یا پریشانی نہیں جھلک رہی تھی۔ وہ بڑا پراعتماد اور مضبوط اعصاب کا مالک دکھائی دیتا تھا لیکن میریان کے انداز نے اس کے شوہر کلیرنس کیلر کو تشویش میں مبتلا کر دیا تھا۔

"آخر ہوا کیا ہے؟" اس نے میریان سے پوچھا۔ "کوئی کسی طرح کی ایمرجنسی ہوگئی ہے؟ سب خیریت تو ہے نا؟"

"آنٹی میری کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔" میریان نے گہری سنجیدگی سے جواب دیا پھر وہ ڈاکٹر بلیک مور کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "ڈاکٹر! آپ میرے ساتھ آئیں..... جلدی۔"

جب میریان، ڈاکٹر بلیک مور کے ساتھ مرحومہ مسز میری کولسن کے بیڈروم میں پہنچی تو اس کے ذہن کو ایک جھٹکا لگا۔ اس کا مشاہدہ بہت قوی تھا۔ وہ چھوٹی سے چھوٹی چیز کو بھی اپنی یادداشت میں محفوظ کر لیتی تھی۔ اس وقت میریان کی حیرت بلکہ الجھن کا سبب یہ تھا کہ بیڈروم کا منظر کسی حد تک تبدیل ہو چکا تھا۔

جب وہ ڈاکٹر کو بلانے گئی تھی تو مسز ڈیلرمپل، مسز میری کو ہلا جلا کر بیدار کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اب وہ مرحومہ میری کے بیڈ کے پائنتی کھڑی تھی۔ جبکہ اس کی بہو آدرے، میری کولسن کے بیڈ کی سائڈ پر کھڑی بے حس و حرکت میری کو تک رہی تھی۔ مرحومہ میری کی خدمت گار کلارا کھڑکی والی دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے چپ چاپ کھڑی تھی۔ اس کے چہرے اور آنکھوں میں حزن و ملال اور افسردگی کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ بیڈ سائڈ ٹیبل پر وکٹورین طرز کی سونگھنے والے حیات بخش نمکیات کی نیلی بوتل کی جگہ ایک سبز بوتل نے لے لی تھی۔ بڑے سائز کا لیس لگا رومال اب پہلی والی جگہ پر نہیں تھا اور اب وہ رومال سمٹا ہوا مرحومہ خاتون کے پہلو میں بستر پر پڑا ہوا تھا۔

اور کسی نے ان معمولی تبدیلیوں کا نوٹس لیا ہو یا نہ لیا ہو لیکن میریان کے ذہن میں کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ اس کے اندر

کی جستجو اور بیدار مغز عورت چیخ چیخ کر اسے بتارہی تھی کہ مسز میری کولسن کی موت کسی سنسنی خیز معمے سے کم نہیں ہے۔

ڈاکٹر بلیک مور نے جھک کر میری کولسن کی نبض ٹٹولی۔ جب کلائی کے مقام پر زندگی کے آثار نہ ملے تو اس نے گردن کو دو انگلیوں سے بہ آہستگی دبا کر دل کی دھڑکن کو ظاہر کرنے والی رگ کو چیک کیا۔ وہاں پر بھی نبض کی مخصوص "دھک دھک" ندارد تھی۔

ڈاکٹر سیدھا کھڑا ہوگیا پھر مسز ڈیلرمپل کی جانب دیکھتے ہوئے افسوسناک انداز میں بولا۔

"آئی ایم سوری میم! معزز خاتون اس دنیا سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہوگئی ہیں۔ ان کا شمار زندوں میں نہیں کیا جاسکتا۔"

ڈاکٹر بلیک مور کے دو ٹوک جواب نے مارتھا کو سسکنے پر مجبور کر دیا جبکہ مسز ڈیلرمپل اثبات میں گردن ہلا کر رہ گئی۔ کلارا کا چہرہ بے نور تھا۔ اس کی آنکھوں سے گہرا غم اور دکھ جھلک رہا تھا۔ ڈاکٹر کے حتمی اعلان نے وہاں موجود تمام افراد کو گہرے صدمے سے دوچار کر دیا تھا۔ مسز ڈیلرمپل نے خفگی بھرے انداز میں کہا۔ "خدارا..... کوئی اس بے ہودہ میوزک کو بند کروائے۔"

میریان نے ہال وے کی جانب بڑھتے ہوئے کہا۔ "مسز ڈیلرمپل! آپ فکر نہ کریں۔ میں جا کر اس معاملے کو دیکھتی ہوں۔" پھر قبل اس کے کہ وہاں موجود دیگر افراد میں سے کوئی کچھ کہتا، وہ چپ چاپ کھسک لی۔

میریان جیسے ہی زینے سے نیچے اتری، سامنے سے اس کا شوہر آتا ہوا دکھائی دیا۔ کلیرنس اسی کی تلاش میں ادھر آیا تھا۔ دونوں کی نگاہیں ملیں تو میریان مسکرا دی۔ سچویشن چاہے کیسی بھی ہو، کلیرنس کو دیکھتے ہی میریان کی آنکھیں مسکرا اٹھتی تھیں۔ یہ اس کی محبت کا ایک انداز تھا۔

"میری.....!" وہ اسے پیار سے مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ "اوپر کیا چل رہا ہے؟ آنٹی میری کی طبیعت کیسی ہے؟"

میریان جانتی تھی کہ کلیرنس "ڈیلرمپل فیملی" سے بہت قریب تھا۔ وہ اسی فیملی کے بچوں کے ساتھ کھیل کود کر بڑا ہوا تھا۔ مسز ڈیلرمپل کے بیٹے جارج سے اس کی گہری دوستی بھی تھی۔ اسی دیرینہ تعلق کی بنا پر وہ اسے یہ بری خبر سناتے ہوئے ہچکچاہٹ کا شکار ہوگئی تھی۔

"ڈارلنگ!" آخر اس نے کہہ ہی دیا۔ "مسز میری چل بسی ہیں۔"

کلیرنس چپ سکتے میں آگیا۔ "آنٹی میری... نہیں رہیں.....؟" وہ بے یقینی سے اسے دیکھتے ہوئے بولا۔ "کیا تم ٹھیک کہہ رہی ہو؟"

"ہاں میں ٹھیک کہہ رہی ہوں کلیر.....!" وہ متحمل انداز میں بولی۔ "ڈاکٹر بلیک مور نے مسز میری کی موت کی تصدیق کر دی ہے۔"

"اوہ، اچھا۔" کلیرنس نے افسردہ لہجے میں کہا۔

"میں بینڈ والوں کو روکنے جارہی ہوں۔" میریان نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "اس گھر میں ایک موت واقع ہو چکی ہے لہٰذا یہاں طرب انگیز اور ہیجان خیز موسیقی کی گنجائش نہیں نکلتی۔ تم ایک کام کرو......" وہ لمحے بھر کو متوقف ہوئی پھر ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔

"تم کسی طرح کرنل ڈیلرمپل کو تلاش کرو اور اسے مسز ڈیلرمپل کے پاس بھیج دو۔"

"میں تمہیں اس لیے ڈھونڈ رہا تھا تاکہ ہم دونوں جا کر بال روم میں ڈانس کر سکیں۔ خیر......" وہ ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ "ڈونٹ وری میری! میں ابھی کرنل ڈیلرمپل کو تلاش کر کے اس کی بیوی کے پاس بھیجتا ہوں۔"

میریان نے اثبات میں گردن ہلادی۔

☆☆☆

اس واقعے کے دو روز بعد میریان اور کلیرنس اپنے گھر کے لاؤنج میں بیٹھے لیٹ بریک فاسٹ (تاخیری ناشتا) کر رہے تھے۔ وہ موسم گرما کی ایک گرم صبح تھی۔ کلیرنس نے اپنی کافی کے مگ میں دودھ اور چینی ڈالی پھر اخبار کھول کر اس کے مطالعے میں مصروف ہوگیا۔ کلیرنس پیشے کے اعتبار سے ایک اسٹاک بروکر تھا اس لیے اخبارات کا مطالعہ خصوصاً کامرس سے متعلق صفحات کو باریک بینی سے دیکھنا اس کے روزمرہ معمولات میں شامل تھا۔ کلیرنس کی جاب وال اسٹریٹ کے ایک بروکنگ ہاؤس میں تھی۔ وہ فری لانس کام کرتا تھا لہٰذا وہ اپنی ضرورت اور مرضی کے مطابق ہی بروکنگ ہاؤس جایا کرتا تھا۔

میریان نے اپنی چھوٹی سی چمڑے کی جلد والی نوٹ بک کھول رکھی تھی اور اس میں گزشتہ روز کے واقعات کے اہم پوائنٹس نوٹ کر رہی تھی۔ وہ بڑی پابندی سے ڈائری لکھنے کی عادی تھی۔ وہ لوگ ناشتا شروع کر چکے تھے کہ ان کا شیف ابراہام ایک نقرئی ٹرے اٹھائے لاؤنج میں داخل ہوا۔ ابراہام نے متحمل انداز میں کہا۔ "میں آپ کو بتانا

چاہوں گا کہ کوئی آپ سے ملنے آیا ہے۔"

"ہاہاہا ...!" میریون نے گردن اٹھا کر حیرت بھرے لہجے میں کہا۔ "وہ وہ بھی اتنی صبح۔"

کلیرنس نے اخبار کے اوپر سے دیکھا اور اپنے شیف سے دریافت کیا۔ "کون آیا ہے ایوانز؟"

"مس ماریا ڈیریمپل!" ایوانز نے بتایا۔ "وہ اکیلی آئی ہے اور اس نے مجھے بتایا ہے کہ وہ آپ سے کوئی ضروری بات کرنا چاہتی ہے۔"

"یہ تو عجیب سی بات ہے۔" کلیرنس اخبار کو ایک طرف رکھتے ہوئے اپنی بیوی سے مخاطب ہوا۔ "میریو! تم ماریا کے ساتھ اتنی کلوز تو کبھی بھی نہیں رہیں کہ وہ اکیلی تم سے ملنے چلی آئے اور وہ بھی دن کے آغاز ہی میں ..."

"تم غلط نہیں سوچ رہے ہو کلیر!" میریون نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "ایک ماریا ہی کیا، میں ڈیریمپل فیملی کے کسی ایک ممبر سے بھی کلوز نہیں ہوں۔" پھر وہ ایوانز کی طرف دیکھتے ہوئے مستفسر ہوئی۔ "کیا ماریا نے تمہیں بتایا کہ وہ مجھ سے کیوں ملنا چاہتی ہے؟"

"نہیں میڈم! اس نے اپنی آمد کا مقصد تو نہیں بتایا۔" ایوانز نے سنسنی خیز انداز میں جواب دیا۔ "لیکن اگر آپ مجھ سے گیس لگانے کو کہیں گی تو میرا اندازہ یہ ہے کہ ادھر "ڈیریمپل اسٹیٹ" میں کوئی گڑبڑ چل رہی ہے۔"

ان کا یہ ملازم ایوانز خاصی پہنچی ہوئی "شے" تھا۔ وہ دونوں اس کی ذہانت کے قائل تھے۔ میریون نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

"تو بتاؤ ... وہاں کیسی گڑبڑ چل رہی ہے؟"

"میں سمجھتا ہوں، مسز کولسون کی موت نے ادھر کئی طرح کی پیچیدگیاں پیدا کر دی ہیں۔" ایوانز سپاٹ آواز میں بولا۔

"میری آنٹی ...!" کلیرنس نے حیرت بھری نظر سے اپنی بیوی کو دیکھا اور اسے میریون کی آنکھوں میں اس حوالے سے خاصی تشویش نظر آئی۔

"جیسا کہ میں سمجھ پایا ہوں سر!" ایوانز نے کلیرنس سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ "یہ سب ڈاکٹر بلیک مور نے شروع کیا ہے۔ آپ بھی جانتے ہیں ڈاکٹر بلیک مور نے اس شام پہلی مرتبہ مسز کولسون کو اٹینڈ کیا تھا۔ مسز کولسون کی لاش کو دیکھ کر ڈاکٹر کے ذہن میں چند شبہات پیدا ہوئے لہٰذا اس نے مرحومہ کے ریگولر ڈاکٹر سے رابطہ کر لیا۔ میرا مطلب ہے ڈاکٹر فارلے سے۔"

کلیرنس نے معتدل انداز میں کہا۔ "میرا خیال ہے یہ مسئلہ مسز میری کولسون کے ڈیتھ سرٹیفکیٹ کے لیے پیدا ہوا تھا؟"

"بالکل سر! ایسی ہی بات ہے۔" ایوانز نے اثبات میں گردن ہلائی۔ "ڈاکٹر بلیک مور کی خواہش تھی کہ مرحومہ مسز میری کا پوسٹ مارٹم نہ ہو، تاوقتیکہ ایسا کرنا بہت ضروری ہو جائے۔"

"ظاہر ہے ..." میریون نے خیال آرائی کی۔ "مسز میری کی فیملی بھی ایسا نہیں چاہتی ہوگی۔"

"نہیں میڈم!" ایوانز نے دوٹوک انداز میں کہا پھر بتانے لگا۔ "جب ڈاکٹر بلیک مور نے ڈاکٹر فارلے سے بات کی تو وہ مسز کولسون کی ایسی اچانک اور پراسرار موت پر حیرت زدہ رہ گیا۔ ڈاکٹر فارلے کا کہنا ہے کہ مسز کولسون کی صحت بہت اچھی تھی۔"

"مسٹر ایوانز! اتنا زیادہ سسپنس پیدا نہ کرو۔ تمہاری یہ سنسنی خیز باتیں ہماری جان لے لیں گی۔" میریون نے اپنے شیف کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا پھر پوچھا۔ "کیا ڈاکٹر فارلے کے دعوے کی روشنی میں ڈیریمپل فیملی نے مسز میری کولسون کی لاش کا پوسٹ مارٹم کرایا ہے؟"

"یس میڈم!" ایوانز نے بتایا۔ "گزشتہ روز ہی یہ کام ہو چکا ہے۔"

"تم کسی شیطان سے کم نہیں ہو ایوانز۔" کلیرنس نے چہک کر کہا۔ "میں جاننا چاہوں گا، مسز میری کے پوسٹ مارٹم سے کیا سامنے آیا ہے؟"

"یہ تو مجھے معلوم نہیں سر!" وہ معذرت خواہانہ انداز میں بولا۔ "لیکن میرا خیال ہے ماریا ڈیریمپل اس بارے میں زیادہ بہتر جانتی ہے۔"

"ہمیں اس سلسلے میں براہ راست ماریا ہی سے بات کرنا چاہیے۔" میریون نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "ایوانز! تم ماریا کو یہاں بھیج دو اور اس کے ناشتے کے لیے برتن بھی لے آؤ۔"

"اوکے میڈم!" وہ فرمانبرداری سے بولا۔ "میں ابھی آپ کے حکم کی تعمیل کرتا ہوں۔"

ایوانز جیسے ہی ان کی نگاہوں سے اوجھل ہوا، کلیرنس نے اپنی بیوی سے پوچھا۔ "میریو! کیا یہ سب سن کر تمہیں کوئی حیرت نہیں ہوئی؟"

"نہیں ... بالکل نہیں۔" میریون نے نفی میں گردن ہلا دی۔ "اور ... میں اس حوالے سے کچھ کہہ بھی نہیں سکتی۔"

کلیرنس اپنی بیوی کو گہری نظر سے تکنے لگا۔ اسے

عرصے کے ساتھ نے اسے اچھی طرح باور کرا دیا تھا کہ میریون عام انسانوں سے بالکل مختلف انداز میں سوچتی ہے۔ اس وقت وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔

"تمہارے خوبصورت ہونٹوں کی خاموش سرگوشیاں کسی رونگٹے کھڑے کر دینے والی کہانی کو بیان کر رہی ہیں میریو!" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کریدنے والے انداز میں بولا۔

"میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ وہاں مسز میری کے بیڈروم میں کچھ چیزیں بہت عجیب سی تھیں۔" میریون نے پُرخیال انداز میں کہا۔ "جن سے میرا ذہن یہ سوچنے پر مجبور ہے کہ مسز میری کی موت طبعی نہیں تھی۔ یہ ممکن ہے کہ انہیں قتل کیا گیا ہو۔"

"تم کن عجیب چیزوں کی بات کر رہی ہو میریو؟" کلیرنس نے شاکی نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ "یہ بات تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتائی؟"

قبل اس کے کہ میریون اس کے شکوے کے جواب میں کچھ کہتی، ایوانز نے ماریا کو ان کے پاس پہنچا دیا۔ ماریا کی حالت خاصی ابتر ہو رہی تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ تھوڑی دیر پہلے وہ روتی رہی ہو۔ وہ حد درجہ پریشان دکھائی دیتی تھی۔ وہ اٹھارہ سال کی تھی لیکن اپنے قد کاٹھ اور نقوش سے وہ کہیں کم عمر لگتی تھی۔

"اوہ ... تم لوگ ناشتا کر رہے تھے۔" ماریا نے میز کی جانب دیکھتے ہوئے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ "ایوانز نے مجھے بتایا ہی نہیں ... میں آپ کو ڈسٹرب نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ ...!"

"معذرت کی ضرورت نہیں ماریا!" کلیرنس کھڑے ہوتے ہوئے بولا پھر ایک کرسی، میز کے ساتھ لگا دی۔ "تم آرام سے بیٹھو یہاں اور ناشتے میں ہمارا ساتھ دو۔ یہ ہمارے لیے خوشی کی بات ہوگی ... ہیں نا میریو!"

آخری جملہ اس نے اپنی بیوی کی جانب دیکھتے ہوئے ادا کیا تھا۔ "بالکل ...!" میریون نے تصدیقی انداز میں کہا۔ "ہمیں بہت اچھا لگتا ہے اگر کوئی ہمارے ساتھ بیٹھ کر ناشتا کرے۔ پلیز، کم آن!"

لمحاتی ہچکچاہٹ کے بعد ماریا کرسی پر براجمان ہو گئی اور تشکرانہ انداز میں کہا۔

"بہت بہت شکریہ آپ دونوں کا۔ اگر معاملہ خطرناک حد تک نہ گیا ہوتا تو میں کبھی آپ کو تنگ کرنے اتنی صبح نہ چلی آتی۔"

ایوانز کی زبانی کلیرنس اور میریون کو اس معاملے کے حوالے سے کافی کچھ معلوم ہو چکا تھا جس کا ذکر ماریا نے کیا تھا۔

"فضول باتیں نہیں کرو ماریا!" میریون نے معتدل انداز میں کہا۔ "تم آگئی، ہمیں خوشی ہوئی۔ اب جلدی سے بتاؤ وہ مسئلہ کیا ہے؟ اب تمہارے گھر والوں کا کیا حال ہے؟"

ماریا کو جیسے سانپ سونگھ گیا اور اس کے حلق سے ایک عجیب سی آواز خارج ہوئی۔ کلیرنس اور میریون ہمدردی بھری نظر سے اسے تکنے لگے۔

"معافی چاہتی ہوں۔" ماریا نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ "میں ٹھیک ہوں۔" اس نے دو چار گہری سانسیں لیں پھر باری باری ان دونوں کو دیکھنے کے بعد رنجیدہ لہجے میں بولی۔ "آپ لوگوں نے آنٹی میری کولسون کو دیے جانے والے زہر کے بارے میں تو سن لیا ہوگا؟"

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو ماریا؟" میریون نے مصنوعی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا جیسے کچھ جانتی ہی نہ ہو۔ "کیسے پتا چلا کہ آنٹی میری کی موت زہر خورانی سے ہوئی ہے؟"

کلیرنس نے پوچھا۔ "کیا آنٹی کی لاش کا پوسٹ مارٹم کرایا گیا ہے؟"

ماریا نے اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

"آنٹی کو کون سا زہر دیا گیا ہے؟" میریون نے دریافت کیا۔

"سائنائیڈ۔" ماریا نے انکشاف انگیز لہجے میں جواب دیا پھر بھرائی ہوئی آواز میں اضافہ کیا۔ "پولیس کلارا ویلر کو لے گئی ہے۔" بات کے اختتام پر وہ سسک پڑی۔

"کلارا کو کیوں؟" کلیرنس نے حیرت بھرے لہجے میں استفسار کیا۔

"میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ پولیس نے کلارا کو آنٹی کے قاتل کی حیثیت سے کیوں گرفتار کیا؟" میریون نے پُرخیال انداز میں کہا۔ "وہ تو اب آنٹی میری کی ملازمہ بھی نہیں رہی۔"

"جب آنٹی میری کی موت واقع ہوئی، کلارا ان کی اٹینڈنٹ کی حیثیت سے کام کر رہی تھی۔" کلیرنس نے معتدل انداز میں کہا۔ "پولیس اگر اس پر شک کر رہی ہے تو یہ ایک نارمل بات ہے۔ وہ لوگ اپنی تفتیش کا آغاز کلارا ہی سے کریں گے۔"

ان میاں بیوی کی آپس کی گفتگو نے ماریا کو اعصاب کشیدہ کر دیا تھا۔ وہ میریون کلیر کو مخاطب کرتے ہوئے اضطراری لہجے میں بولی۔

"مسز کیلرا میں سمجھتی ہوں کہ کلارا، آنٹی میری کی موت کی ذمے دار نہیں ہے۔ وہ آنٹی کی جان لینے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی۔"

"کیا واقعی؟" میریون نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

"یقیناً مسز کیلرا!" وہ پُروثوق انداز میں بولی۔

"لیکن کیوں نہیں؟" میریون نے زور دے کر پوچھا۔ "کلارا ایسا کیوں نہیں کر سکتی؟"

چند لمحات کے لیے ماریا نے بے بسی سے انہیں دیکھا پھر بولی۔ "کیونکہ کلارا آنٹی کو بہت زیادہ چاہتی تھی اور پارٹی کی شام میں نے کلارا سے کافی باتیں کی تھیں۔ اس کے لب و لہجے میں مجھے ایسی کوئی بات محسوس نہیں ہوئی کہ وہ میری آنٹی کو زہر دینے کا ارادہ رکھتی ہو لیکن گھر میں کوئی میری بات سننے کو تیار نہیں اسی لیے......" لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک افسردہ سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولی۔ "اسی لیے میں آپ کے پاس آئی ہوں مسز کیلرا!"

"ہوں......" میریون نے سوچتی ہوئی نظر سے اسے دیکھا اور کہا۔ "تو پھر بتاؤ، میں اس سلسلے میں کیا کر سکتی ہوں؟"

"آپ ایک سوشل ورکر ہیں۔ آپ کے تعلقات ہر ڈیپارٹمنٹ سے ہیں۔" ماریا امید بھری نظر سے میریون کو تکتے ہوئے بولی۔ "پچھلے سال آپ نے ایک غریب بچے کے قتل کے کیس میں پولیس کی بہت معاونت کی تھی اور ایک بے گناہ شخص کو جیل جانے سے بچالیا تھا۔ میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ کلارا بے قصور ہے۔ آپ اسے بھی اس جھمیلے سے نکال لیں۔ پلیز......!"

"ٹھیک ہے۔ ہم دونوں سے جو بھی ہو سکا، ہم ضرور کلارا کی مدد کریں گے۔" کلیرنس نے تسلی بھرے انداز میں کہا۔ "پہلے کچھ اہم باتیں ہو جائیں۔ پارٹی کی رات میں نے آنٹی میری کو وقت سے پہلے اپنے بیڈ روم کی طرف جاتے دیکھا تھا۔ میں جانتا ہوں وہ اتنی جلدی سونے کی عادی نہیں تھیں۔ کیا ان کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی جو وہ سرِ شام سونے چلی گئی تھیں؟"

"نہیں، نہیں...... ایسی کوئی بات نہیں۔" ماریا نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ "آنٹی میری ایک دم ٹھیک تھیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ آنٹی کو تیز میوزک بالکل پسند نہیں تھا لہٰذا جب تیز تیز دھنوں نے بال روم کی فضا میں اپنے ہیجان خیز سُر بکھیرنا شروع کیے تو آنٹی بے چین ہو گئیں اور آرام کرنے اپنے بیڈ روم میں چلی گئی تھیں۔"

میریون نئے زمانے کی لڑکی تھی۔ پاپ میوزک ہر دم اس کے رگ و پے میں دوڑتا تھا۔ تیز میوزک سے آنٹی میری کی ناپسندیدگی نے اسے قہقہہ لگانے پر مجبور کر دیا تاہم یہ قہقہہ بے آواز تھا۔ اس نے محض سوچ کے ذریعے ہی اپنے جذبات کا اظہار خود سے کر لیا تھا۔

"کلارا، آنٹی میری کے ساتھ ہی ان کے بیڈ روم تک گئی تھی تاکہ اگر انہیں کسی شے کی ضرورت ہو تو وہ اس کا بندوبست کر سکے۔" ماریا بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ "میں اس بات کی گواہ ہوں کہ وہ آنٹی کو ان کے روم پر پہنچا کر فوراً ہی واپس آگئی تھی اور ہم ڈائننگ روم میں بیٹھ کر گپ شپ کرنے لگی تھیں۔"

"میں جب تمہاری ماں کے ساتھ زینے کے نچلے حصے پر کھڑی بات کر رہی تھی تو تمہارے چیخنے کی آواز نے ہمیں اوپر جانے پر مجبور کر دیا تھا۔ تم کلارا سے باتیں کرنے کے کتنی دیر بعد بالائی منزل پر گئی تھیں؟" میریون نے دریافت کیا۔ "اور تم کس کام سے آنٹی میری کے کمرے میں داخل ہوئی تھیں؟"

"میں ٹھیک سے وضاحت نہیں کر سکتی مسز کیلرا!" وہ بے بسی سے بولی۔ "دراصل اس وقت میرا ڈانس کوئی نہیں کر رہا تھا اور کوئی میرا ساتھ دینے کو تیار نہیں تھا۔ میرا دوست پرسلی، مسٹر کلیرنس کی نئی گاڑی دیکھنے چلا گیا تھا۔ بس، میں نے سوچا کہ آنٹی میری کو دیکھ آتی ہوں۔ اس کے علاوہ میرے وہاں جانے کی اور کوئی بھی وجہ نہیں تھی۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ میں آنٹی میری سے بہت زیادہ محبت کرتی تھی؟"

ماریا نے آخری سوالیہ جملہ میریون کی جانب دیکھتے ہوئے ادا کیا تھا لیکن اس کا جواب کلیرنس نے دیا۔ "ہاں، میں یہ بات جانتا ہوں۔" وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "میں ذاتی طور پر بھی آنٹی کو بہت زیادہ پسند کرتا تھا۔"

ماریا نے اثبات میں گردن ہلائی اور بولی۔ "آنٹی میری بہت دلچسپ باتیں کرتی تھیں۔ بالکل پُرجوش جوانوں کی طرح۔ وہ کسی کو ایک لمحے کے لیے بھی بور نہیں ہونے دیتی تھیں۔"

"تو......" میریون نے ماریا کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ "جب تم آنٹی میری کی طرف گئیں تو اس وقت کلارا کیا زیریں منزل پر ہی تھی؟"

"میں اس بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتی۔" ماریا نے جواب دیا۔ "درحقیقت اس وقت مجھے پرسلی کی تلاش تھی تاکہ بال روم میں جا کر میں اس کے ساتھ ڈانس کر سکوں لیکن وہ مسٹر کلیرنس کی نئی کار کو دیکھنے میں اس قدر محو تھا کہ اس نے مجھ پر توجہ نہیں دی۔ بس پھر میں وقت گزاری کے لیے آنٹی میری کے کمرے میں چلی گئی تھی۔ میں نہیں جانتی اس وقت کلارا کہاں تھی۔"

میریون نے بدستور اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے استفسار کیا۔ "کیا دودھ سے بھرا ہوا کپ تم نے ہی مسز میری کے بیڈ روم میں پہنچایا تھا؟"

ماریا کے چہرے پر اُلجھن کے آثار پیدا ہوئے۔

"دودھ......؟" اس نے بے یقینی سے پوچھا۔

"ہاں...... میں دودھ ہی کی بات کر رہی ہوں۔" میریون نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "میں نے مسز میری کی بیڈ سائڈ ٹیبل پر ایک دودھ والا کپ رکھا دیکھا تھا جو اس وقت خالی تھا۔"

"دودھ والا کپ میں اوپر لے کر نہیں گئی تھی۔" ماریا نے پُراعتماد انداز میں بتایا۔ "میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتی مسز کیلرا!"

"تم آنٹی میری کے اوپر جانے کے بعد فوراً ہی بالائی منزل پر چلی گئی تھیں؟" کلیرنس نے سوال کیا۔ "یا کافی دیر کے بعد......؟"

"کیا اس سے کوئی فرق پڑتا ہے؟" ماریا نے عام سے لہجے میں پوچھا۔

میریون، کلیرنس کو بتا چکی تھی کہ اس نے مسز میری کے بیڈ روم میں کیا تبدیلیاں دیکھی تھیں۔ اس نے کہا۔

"ہاں...... وقت سے فرق پڑتا ہے۔ بہت سی چیزیں اپنی جگہ پر موجود نہیں رہتیں۔ عین ممکن ہے کہ تم سے پہلے بھی کوئی مسز میری کے بیڈ روم میں گیا ہو اور اسی نے آنٹی میری کو زہر دے دیا ہو۔"

"مجھے بالکل درست اندازہ تو نہیں۔" ماریا نے سوچتے ہوئے کہا۔ "میرا خیال ہے شاید میں ایک گھنٹے کے بعد بالائی منزل پر آنٹی میری کے کمرے میں گئی تھی۔"

"اور تمہارا اندازہ کیا کہتا ہے ماریا؟" میریون نے پوچھا۔ "مسز میری کو کس نے زہر دیا ہوگا؟"

"کیا آپ یہ پوچھ رہی ہیں کہ مجھے کس پر شک ہے؟"

"ہاں، میرا یہی مطلب ہے۔" میریون نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے رسان بھرے لہجے میں کہا۔ "تمہاری نظر میں کلارا ویلز معصوم اور بے گناہ ہے اور پوسٹ مارٹم رپورٹ بتاتی ہے کہ آنٹی میری کی موت سائنائیڈ کی وجہ سے واقع ہوئی ہے۔ اگر یہ کام کلارا کا نہیں ہے تو پھر کسی نہ کسی نے تو مسز میری کو زہر دیا ہوگا۔ تمہارا ذہن کس کی طرف جاتا ہے ماریا؟"

ماریا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ سکتے کی سی کیفیت میں ان دونوں کو تکتی چلی گئی۔

"خیر...... پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ماریا!" کلیرنس نے نہایت ہی نرمی سے کہا۔ "ہم اس موضوع پر بعد میں بھی بات کر سکتے ہیں۔"

ماریا کی ذہنی حالت کو دیکھ کر کلیرنس ڈر گیا تھا۔ اسے ایسا محسوس ہوا تھا کہ اگر انہوں نے مزید کریدا تو وہ رو پڑے گی۔ اسی لیے اس نے تسلی بھرے انداز میں گفتگو کا موضوع بدل دیا تھا۔ میریون بھی ماریا کی کیفیت کو بھانپ چکی تھی۔ اس نے کہا۔

"ہم اس شخص کو جلد ہی ڈھونڈ نکالیں گے اور یہ پتا بھی چلا لیں گے کہ قاتل نے کس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے مسز میری کو موت کے گھاٹ اتارا ہے۔ تمہیں اس حوالے سے فکرمند ہونے کی بالکل ضرورت نہیں ہے۔"

سوالاً جواباً

☆ ڈاکٹر نے تمہیں مرغن اور پُرتکلف کھانا کھانے، شراب اور سگریٹ پینے سے منع کیا تھا۔ اس سے کچھ فائدہ ہوا؟

✿ ہاں۔ اسی طرح تو اتنے پیسے بچے کہ میں ڈاکٹر کا بل ادا کرنے کے قابل ہو سکا۔

☆ ماں اپنی جوان بیٹیوں کے ساتھ سیر کے لیے جائے تو بھلا کون اعتراض کر سکتا ہے؟

✿ جوان پڑوسیاں۔

☆ شبنم کس قسم کی فلموں میں کام کریں تو زیادہ اچھی لگتیں؟

✿ خاموش فلموں میں۔

انتظار

ایک صاحب تین ماہ تک ایک پرائیویٹ اسپتال میں ایک ڈاکٹر صاحب کے زیر علاج رہے لیکن مرض میں کوئی افاقہ نہ ہوا۔ آخر ایک دن اپنا سامان سمیٹتے ہوئے بولے۔ "ڈاکٹر صاحب! میرا خیال ہے اب میں گھر جا کر طبعی موت مرنے کا ہی انتظار کر لوں تو بہتر ہے۔"

(مرسلہ: ناصر ملک، لاہور)

کام) کس کا ہے؟"
"اس گھر میں رہنے والوں کی تعداد نو ہے۔" مسز کلیرنس نے انگلیوں پر حساب لگاتے ہوئے کہا۔ "ماریا ڈیلرمپل یعنی کرنل بیکر، مسز ڈیلرمپل، جارج، آڈرے، ماریا اور آنٹی میری۔ کرنل بیکر کا چھوٹا بیٹا جیری ڈیلرمپل اپنے بیوی بچوں کے ساتھ فرانس میں سیٹل ہے۔ آنٹی میری تو مقتول ہیں۔ اگر ان کو نکال دیا جائے تو باقی پانچ افراد رہ جاتے ہیں اور میں یہ تصور بھی نہیں کرسکتا کہ ان میں سے کسی نے آنٹی کی جان لی ہوگی۔ یہ سب آنٹی سے بہت زیادہ محبت کرنے والے لوگ ہیں۔ قاتل ڈیلرمپل فیملی سے باہر ہی کا کوئی شخص ہوسکتا ہے۔"
"باہر کا کوئی شخص....!" میریون نے پُرسوچ انداز میں دہرایا۔ "تو تمہارا اشارہ مہمانوں کی جانب ہے؟"
"مجھے نہیں یقین کہ ان میں سے بھی کوئی ہو۔" کلیرنس نے معتدل انداز میں کہا۔
"پھر تو فیملی سے باہر کا ایک ہی انسان باقی بچتا ہے کلیرا!" میریون نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "مسز میری کی خدمت گار کلارا ولیم!"
"اور تم اس سے ملنے جارہی ہو؟" کلیرنس نے سوالیہ نظر سے اسے دیکھا۔
"ہاں!" میریون نے کہا۔
کلیرنس اثبات میں سر ہلا کر رہ گیا۔

☆☆☆

کلارا لاک اپ میں ایک چوبی بنچ پر گم صم بیٹھی تھی۔ وہ اپنے چہرے اور حلیے سے اجڑا ہوا چمن دکھائی دیتی تھی۔ اس کی آنکھوں سے ناامیدی اور ویرانی جھلکتی تھی۔ جب میریون وہاں پہنچی تو کلارا نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔
"میں تم سے ہی ملنے آئی ہوں۔" میریون نے نرم لہجے میں کہا۔ "آج صبح ماریا میرے گھر آئی تھی۔ اس نے مجھے تمہاری بے گناہی کے بارے میں بتایا ہے۔ میں اسی سلسلے میں تم سے بات کرنا چاہتی ہوں۔"
کلارا نے حیرت بھری نظر سے میریون کو دیکھا۔
"ماریا.....!" وہ بے یقینی سے بولی۔ "مجھے ماریا سے ایسی جرأت کی توقع نہیں تھی۔ وہ بہت ہی تمیزدار اور پیاری بچی ہے۔"
"کیا واقعی؟" میریون نے سرسری انداز میں کہا۔ "دراصل میں ماریا بلکہ ڈیلرمپل فیملی کے بارے میں زیادہ نہیں جانتی ہوں۔"
کلارا کے ہونٹوں پر ہلکی تلخ مسکراہٹ نمودار ہوئی۔
"وہ آپ کو اپنا آئیڈیل سمجھتی ہے۔" وہ میریون کے چہرے پر نگاہ جما کر بولی۔ "اس نے میرے سامنے کئی بار آپ کی تعریف کی ہے۔"
"مجھے اس کا بالکل اندازہ نہیں ہے کہ ماریا میرے لیے اپنے دل میں کس نوعیت کے جذبات رکھتی ہے۔" میریون نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ "بہرحال ہم دونوں میاں بیوی کو اس کا آئیڈیا نہیں ہے۔ خیر، ہم اصل کی طرف آتے ہیں۔" لمحاتی توقف کرکے اس نے ایک گہری سانس خارج کی پھر کلارا کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سپاٹ آواز میں استفسار کیا۔
"کیا تم نے ہی مسز میری کی جان لی ہے؟"
"نہیں!" وہ تلخی لہجے میں بولی۔ "میں بھلا اتنا گھٹیا کام کیسے کرسکتی ہوں؟ میں تو میری کولسون سے بہت زیادہ محبت کرتی تھی۔ وہ بھی میرا بہت خیال رکھتی تھیں۔ اگر آپ کو میری بات کا یقین نہیں آرہا تو آپ شیف، شوفر، گارڈ حتیٰ کہ کسی بھی گھریلو ملازم سے تصدیق کرسکتی ہیں۔ ہم میں سے کوئی بھی میری کولسون کے سر کے ایک بال کو بھی کوئی نقصان پہنچانے کے بارے میں نہیں سوچ سکتا۔"
آج صبح ناشتے کی ٹیبل پر جب ان میاں بیوی میں ڈیلرمپل ہاؤس میں رہائش پذیر افراد پر بات ہورہی تھی تو کلارا کے علاوہ اس گھر کے ملازمین میں سے کسی کا ذکر نہیں آیا تھا۔ میریون نے اس نکتے کو اپنے ذہن میں محفوظ کرلیا کہ کسی بھی گھریلو ملازم کو شک کے دائرے سے باہر کھڑا نہیں کیا جاسکتا۔ یہ کوئی چھوٹی موٹی چوری کا معاملہ نہیں بلکہ قتل کی ایک سنگین واردات کا قصہ ہے۔
"میں مرحومہ مسز میری سے زیادہ کلوز کبھی نہیں رہی۔" میریون نے تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ "لیکن میں نے دیکھا اور سنا ہے کہ میرے شوہر سمیت ہر کوئی مسز میری کے نام کا کلمہ پڑھتا ہے۔ تم ان کی خدمت گار تھیں اور ان کی تنہائی کی ساتھی بھی۔ اچھی طرح سوچ کر مجھے بتاؤ کہ مسز میری اور فیملی کے دیگر کسی ممبر کے درمیان کسی قسم کا کوئی تناؤ یا کوئی تنازع تو نہیں تھا۔ ایسی باتیں یقیناً تم سے چھپی نہیں رہ سکتی ہیں۔"
"نہیں۔" کلارا نے نفی میں گردن ہلائی۔ "ایسی کوئی چیز میرے علم میں نہیں ہے۔ میں نے ہمیشہ سب کو مسز کولسون کی عزت کرتے دیکھا ہے۔"
"اور انہیں کوئی بیماری بھی نہیں تھی؟" میریون نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ "مطلب ایسی کوئی بھی

جسمانی عارضہ یا بیماری جو ان کی موت کا سبب بن سکتی ہو؟"
"بالکل نہیں۔ وہ ہر لحاظ سے صحت مند تھیں۔"
"لیکن پارٹی والی شام وہ بہت جلدی اپنے بیڈروم میں چلی گئی تھیں۔ اس کا کوئی خاص سبب تھا؟" میریون نے پوچھا۔ "میں جانتی ہوں کہ وہ اتنی جلدی سونے کی عادی نہیں تھیں۔"
"وہ کوئی اتنا جلدی بھی نہیں تھا۔" کلارا نے کہا۔ "میرے خیال میں اس وقت نو بج رہے تھے۔ دراصل مسز کولسون پرانے خیالات کی مالک تھیں اور تیز میوزک انہیں بالکل پسند نہیں تھا۔" اس کے بعد کلارا نے وہی تفصیل بیان کی جو ماریا تیز میوزک کے حوالے سے انہیں بتا چکی تھی۔ آخر میں اس نے کہا۔ "میں خود انہیں ان کے بیڈروم تک چھوڑنے گئی تھی۔ میں نے انہیں ڈائجسٹو بسکٹ کھانے کو دیے تھے پھر میں انہیں بیڈ پر لٹانے کے بعد واپس آگئی تھی۔"
"تم نے انہیں صرف ڈائجسٹو بسکٹ ہی کھلائے تھے یا اس کے علاوہ کچھ اور بھی دیا تھا؟" میریون نے سرسراتی ہوئی آواز میں استفسار کیا۔ "میں نے اس شام ان کی بیڈ سائڈ ٹیبل پر دودھ کا ایک خالی کپ رکھا بھی دیکھا تھا۔"
"ہاں بالکل۔" وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ "وہ دودھ میں نے ہی انہیں پلایا تھا۔ وہ سونے سے پہلے مطالعے کی بھی عادی تھیں اس لیے جب وہ بستر پر دراز ہوگئیں تو میں نے انہیں ایک ناول بھی تھما دیا تھا۔"
"اوہ.....تو وہ تم تھیں۔" میریون ایک بوجھل سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔ "جو دودھ سے بھرا ہوا وہ کپ اوپر لے کر گئی تھیں؟"
میریون کے آخری جملے میں ایک سوال تھا۔ "میں نے کچن والوں کو وہ دودھ اوپر پہنچانے کے لیے کہا تھا۔" کلارا نے جواب دیا۔ "دراصل میں نہیں، ایک گھریلو ملازمہ ایلسی دودھ سے بھرا ہوا کپ اوپر لے کر آئی تھی۔"
"ڈائجسٹو بسکٹس کے ساتھ؟" میریون نے سوالیہ نظر سے اسے دیکھا۔
"نہیں۔" کلارا نے نفی میں گردن ہلائی۔ "وہ بسکٹس پہلے سے بیڈروم میں موجود تھے۔ مسز کولسون کو ڈائجسٹو بسکٹس کا ایک مخصوص برانڈ "مسکوویٹی" بہت پسند تھا اس لیے میں ان بسکٹس کے دو تین پیک ہمیشہ ان کے قریب رکھتی تھی۔"
"سمجھ گئی۔" میریون اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی پھر سرسری انداز میں اضافہ کردیا۔ "سو، تم نے مسز میری کو ان کے بیڈروم میں سیٹل کیا اور نیچے پارٹی میں آگئی تھیں؟"
"ہاں، بالکل۔" وہ سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولی۔ "اس وقت میرا کچھ اچھا اور مختلف کھانے کو جی چاہ رہا تھا۔ درحقیقت ہم لوگ گھر میں نہایت ہی سادہ کھانا کھاتے ہیں اور پارٹی میں طرح طرح کے پکوان موجود تھے اسی لیے میں نے ڈائننگ ہال کا رخ کیا تھا۔ مسز ڈیلرمپل بھی ڈائننگ ہال میں موجود تھیں۔"
"کیا تم نے وہاں کسی سے گپ شپ بھی کی تھی؟" میریون نے یہ سوال ماریا کے بیان کی تصدیق کے لیے کیا تھا۔
"وہیں پر مجھے ماریا مل گئی تھی۔" وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ "ہم دونوں کو مطالعے کا بہت شوق ہے لہٰذا ہماری گفتگو کا محور و مرکز کتابیں ہی تھیں۔ ہم کافی دیر تک تبادلۂ خیال کرتے رہے تھے۔"
"اس کے بعد کیا ہوا تھا؟"
"میں اپنے روم میں جانے کے لیے واپس بالائی منزل پر پہنچ گئی تھی۔" کلارا نے بتایا۔
"سو تم بھی کافی جلدی سونے کے لیے اپنے کمرے میں چلی گئی تھیں۔" میریون نے کریدنے والے انداز میں کہا۔ "کیا مسز میری کی طرح تمہیں بھی تیز میوزک پسند نہیں ہے؟"
"ایسی بات نہیں ہے۔" وہ جلدی سے بولی۔ "میں تیز میوزک کو نہ تو دیوانگی کی حد تک پسند کرتی ہوں اور نہ ہی مسز کولسون کی طرح بالکل ناپسند۔ دراصل تیز میوزک آپ کے لہو میں کرنٹ بھر دیتا ہے اور آپ کا انگ انگ ناچنے کے لیے مچلنے لگتا ہے اور...... آپ تو جانتی ہی ہیں کہ بال روم میں ڈانس کرنے کے لیے ایک پارٹنر کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس وقت پارٹی میں ہر کوئی اپنے آپ میں مگن تھا۔ مجھے کوئی ڈانس پارٹنر میسر نہیں تھا اور میں بہت زیادہ تھکی ہوئی بھی تھی اس لیے میں آرام کرنے کے لیے اپنے کمرے میں چلی آئی تھی۔"
"ہاں۔ میں سمجھ سکتی ہوں۔" میریون نے رسان بھرے لہجے میں کہا پھر پوچھا۔ "کیا تم نے اپنے روم میں داخل ہونے سے پہلے مسز میری کو چیک کیا تھا۔ مطلب، کیا یہ دیکھا تھا کہ وہ اب تک جاگ رہی تھیں یا سو چکی تھیں؟"
کلارا نے نفی میں گردن ہلائی اور بتایا۔ "مسز کولسون بیڈ پر لیٹنے کے بعد عموماً دس پندرہ منٹ میں سو جایا کرتی تھیں اور میں لگ بھگ تیس منٹ نیچے گزار کر آئی تھی۔ ان کے بیڈروم میں خاموشی اور سکون تھا۔ ایسا اسی وقت ہوتا تھا جب وہ گہری نیند میں جاچکی ہوں لہٰذا میں نے انہیں چیک کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔" لمحاتی توقف کرکے اس نے

اپنی سانس ہموار کی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''یہی بات تو یہ ہے کہ مجھے اس بات کا اطمینان تھا کہ میں نے اپنی اس دن کی اپوائی اجالی ذمے داری سے پوری کر دی تھی۔''

میریون چند لمحات تک سوچتی ہوئی نظر سے اسے تکتی رہی۔ ''میں سمجھتی ہوں کہ ضروری معلومات مجھے حاصل ہو چکی ہیں۔'' اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا پھر کلارا سے سوال کیا۔ ''کیا تم نے اپنے بچاؤ کے لیے کسی وکیل کا بندوبست کر لیا ہے؟''

''پولیس نے مجھے ایک وکیل دیا تو ہے اور ساتھ یہ بھی کہا ہے کہ میں اپنی مرضی سے بھی کسی اور وکیل کا انتظام کر سکتی ہوں۔'' کلارا نے جواب دیا۔ ''سو اس سلسلے میں کنکٹی کٹ میں مسز کولسون کے بزنس ایڈوائزر سے رابطہ کیا گیا ہے۔ وہ میرے لیے ایک قابل وکیل کو یہاں بھیجنے والا ہے۔''

''یہ تو بہت اچھا ہو جائے گا۔'' میریون نے کہا۔

''مسز کیلر..... !''

''یس!'' میریون نے سوالیہ نظر سے اسے دیکھا۔

''میں آپ کی بے حد شکر گزار ہوں جو آپ میرے کیس میں دلچسپی لے رہی ہیں۔'' کلارا نے ممنونیت بھرے لہجے میں کہا۔

میریون نے اثبات میں گردن ہلانے پر اکتفا کیا۔

☆☆☆

وہ دونوں ایک بار پھر ناشتے کی ٹیبل پر آمنے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ موسم گرما کی ایک گرم صبح تھی تاہم مغربی افق پر سیاہ بادل جمع ہونا شروع ہو گئے تھے۔ ایسی گھٹائیں جب بھی اکٹھا ہوتی تھیں تو اس کے نتیجے میں گرج چمک کے ساتھ بارش ضرور ہوا کرتی تھی۔ پچھلی رات ماریا نے ایوانز کے ساتھ کیا تھا جس کے نتیجے میں ان کی معلومات میں اچھا خاصا اضافہ ہوا تھا۔ اس وقت وہ اپنی اپنی معلومات ایک دوسرے سے شیئر کرتے ہوئے مسز میری کولسون کے قتل پر تبادلۂ خیال کر رہے تھے۔

''میری خواہش ہے کہ ہم جلد از جلد مسز میری کے قاتل تک پہنچ جائیں۔'' میریون نے دھیمی آواز میں کہا۔

''بڑی زبردست خواہش ہے۔ میں بھی ایسا ہی چاہتا ہوں۔'' کلیرنس نے تائیدی انداز میں کہا۔ ''رات تم نے بہت زیادہ پی لی تھی۔ اس وقت مجھے یاد نہیں آ رہا مگر تم کہہ رہی تھیں کہ تم نے کہیں کچھ ایسا دیکھا تھا جو اس کیس میں ہمارے لیے مددگار ثابت ہو سکتا ہے۔''

''کیا میں نے ایسا کچھ کہا تھا؟'' میریون نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔ ''لیکن مجھے تو کچھ بھی یاد نہیں۔''

''بتایا تو ہے کہ تم نشے میں خور تھیں۔'' کلیرنس نے زور دے کر کہا۔ ''میں بھی سمجھا تھا کہ صبح تمہیں یاد آ جائے گا۔''

وہ اپنی کنپٹیوں کو سہلاتے ہوئے بولی۔ ''کلیرا! مجھے کچھ بھی آئیڈیا نہیں ہے کہ میں نے گزشتہ رات تم سے کیا کہہ دیا تھا۔''

''خیر چھوڑو۔ دماغ پر زیادہ زور دینے کی ضرورت نہیں ہے۔'' کلیرنس نے ہمدردی بھرے لہجے میں کہا۔ ''جب یاد آ جائے تو بتا دینا۔''

قبل اس کے کہ میریون کچھ کہتی، ایوانز اس کے لیے کافی کی نئی چینک لے کر وہاں پہنچ گیا۔ فریش کافی کی خوشگوار خوشبو نے کلیرنس کو یہ کہنے پر مجبور کر دیا۔

''ایوانز! تم کمال کے شیف ہو۔ تمہارے ہاتھوں میں جیسے کوئی جادو سا ہے۔''

''تھینک یو سر!'' ایوانز کافی پاٹ کو میز پر رکھتے ہوئے تشکرانہ انداز میں بولا۔ ''بس، یہ تو سب آپ کی تعریفوں کا اثر ہے۔''

بات کے اختتام پر اس نے کھنکھار کر گلا صاف کرنے کی مصنوعی کوشش کی تھی۔ یہ ایوانز کا مخصوص انداز تھا۔ جب اس کے پاس کوئی پھڑکتی ہوئی خبر ہوتی تھی تو وہ اسی طرح کھنکھار کر اسٹارٹ لیتا تھا۔ دونوں نے چونک کر اپنے شیف کی طرف دیکھا۔

میریون نے کہا۔ ''میں سمجھتی ہوں، ماریا دوبارہ ہم سے ملنے نہیں آئی ہوگی۔ میں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا؟''

''بالکل۔ آپ نے بجا فرمایا میڈم!'' وہ زیرِ لب مسکراتے ہوئے بولا۔ ''میرا خیال ہے آپ کو یہ جاننے میں ضرور دلچسپی ہوگی کہ مسز کولسون کے بزنس ایڈوائزر کا بھیجا ہوا وکیل کنکٹی کٹ سے نیویارک پہنچ گیا ہے۔ آج صبح اس نے ڈیلرمپل فیملی سے ملاقات کی ہے اور مسز کولسون کی وصیت کا بغور جائزہ بھی لیا ہے۔''

''بہت خوب!'' میریون نے تعریفی نظر سے اسے دیکھا اور کہا۔ ''تھینک یو ایوانز۔ تم بہت اہم خبر لائے ہو۔''

ایوانز نے رکوع کے بل جھک کر میریون کو تعظیم دی پھر اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''میں نے تو ہمیشہ آپ کو سنسنی خیز خبریں ہی دی ہیں میڈم!''

''ہاں، میں جانتی ہوں۔'' میریون نے تائیدی انداز میں کہا۔ ''مجھے یقین ہے کہ آج کسی وقت وہ وکیل کلارا

سے بھی ملاقات کرے گا۔ میں دعوے سے تو نہیں کہہ سکتی لیکن میرا تجربہ یہی کہتا ہے کہ وہ وکیل کلارا کے حق میں کیس دے گا۔''

''مجھے تو یہ بہت عجیب سا لگ رہا ہے کہ مسز میری کا وکیل اس کے قاتل کے حق میں فائٹ کرے گا۔'' کلیرنس نے بیزاری سے کہا۔ ''میریو! میں تمہاری بات سے اتفاق نہیں کرتا۔''

''تم مجھ سے اختلاف کا پورا حق رکھتے ہو کلیرا!'' میریون نے معتدل انداز میں کہا۔ ''لیکن تمہیں یہ پوائنٹ بھی ذہن میں رکھنا چاہیے کہ کلارا پر قتل کا الزام ہے۔ وہ ابھی قاتل ثابت نہیں ہوئی۔''

''تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔'' وہ تائیدی انداز میں بولا پھر چونکے ہوئے لہجے میں اضافہ کیا۔ ''مجھے یاد آ گیا..... تم پچھلی رات نشے میں کس جانب اشارہ کر رہی تھیں..... تم نے کہا تھا کہ اگر ہم یہ معلوم کرنے میں کامیاب ہو جائیں کہ سائنائیڈ آنٹی میری کے بیڈ روم میں کیسے پہنچا ہوگا تو ہمیں قاتل تک رسائی حاصل کرنے میں آسانی ہو جائے گی۔ تم نے گرین ہاؤس اور فیومیگیشن کا ذکر کیا تھا..... !''

''اوہ مائی گاڈ..... !'' میریون نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''پارٹی والی شام مسز ڈیلرمپل نے مجھے گرین ہاؤس اور جراثیم کش ادویات پر ایک لیکچر دیتے ہوئے بتایا تھا کہ حال ہی میں اس نے اپنے گرین ہاؤس میں فیومیگیشن کرائی تھی۔ مطلب یہ کہ ''ڈیلرمپل ہاؤس'' میں کیڑے مار زہریلی ادویات لائی گئی تھیں۔''

ایوانز انہیں آپس میں بات کرتے دیکھ کر وہاں سے کھسک لیا۔

''ایسی زہریلی ادویہ میں عموماً سائنائیڈ بھی شامل ہوتا ہے۔'' کلیرنس نے پُرخیال انداز میں کہا۔ ''اگر ہم محتاط انداز میں گرین ہاؤس کا نظام سنبھالنے والے مالی پر تھوڑی ''محنت'' کریں تو ہمیں پتا چل سکتا ہے کہ وہاں سے وہ مہلک زہر کون چرا سکتا ہے۔''

''صرف مالی ہی نہیں، ہمیں ڈیلرمپل ہاؤس میں کام کرنے والے تمام ملازمین کو چیک کرنا ہوگا۔'' میریون اپنی بات پر زور دیتے ہوئے بولی۔ ''مجھے کلارا نے بتایا ہے کہ دودھ والا کپ کچن سے ایلسی نامی ایک ملازمہ نے اوپر پہنچایا تھا۔ اغلب امکان اسی بات کا ہے کہ سائنائیڈ اسی دودھ میں ملا کر آنٹی میری کو دیا گیا ہوگا۔''

''میں تم سے مکمل اتفاق کرتا ہوں میریو!'' کلیرنس نے کہا۔ ''اور بیچاری کلارا اس سازش سے بے خبر ہوگی۔''

''ایک دوسرا راستہ بھی ہو سکتا ہے۔'' میریون نے معتدل انداز میں کہا۔ ''مسز میری رات کو سونے سے پہلے حیات بخش نمکیات سونگھنے کی بھی عادی تھی۔ اگر ان اسمیلنگ سالٹس میں سائنائیڈ شامل ہو تو گہری سانس لینے سے اس زہر کے بخارات سونگھنے والوں کے پھیپھڑوں تک رسائی حاصل کر کے اسے موت کے منہ میں دھکیل سکتے ہیں۔'' وہ لمحے بھر کے لیے تھمی پھر کلیرنس سے پوچھا۔

''کیا تم مجھے بتانا پسند کرو گے کہ تم نے جارج کے اندر سے کوئی کام کی بات نکالی یا نہیں؟''

''جارج نے جوئے میں اپنی ساری جمع پونجی ہار دی ہے اور وہ اس دولت کے زیاں کو لے کر بہت زیادہ پریشان ہے۔'' کلیرنس نے بتایا۔ ''ڈیلرمپل فیملی میں کسی کو بھی جارج کی اس حرکت کا علم نہیں ہے حتیٰ کہ اس نے اپنی بیوی آڈرے کو بھی اس خطرناک راز میں شریک نہیں کیا۔ وہ جب بھی جارج سے اس کے چڑچڑے پن کا سبب پوچھتی ہے تو وہ آڈرے کو بری طرح جھڑک دیتا ہے۔ آڈرے نے مجھ سے یہ درخواست کی ہے کہ میں جارج کی پریشانی کی وجہ معلوم کروں۔ میں نے آڈرے سے ایسا کرنے کا وعدہ تو کر لیا ہے لیکن اسے حقائق سے آگاہ نہیں کیا کیونکہ جارج نے اپنا یہ راز شیئر کرتے ہوئے مجھے قسم دی تھی کہ میں اس بارے میں فیملی کے کسی ممبر کو کچھ نہیں بتاؤں گا۔ جارج باتونی اور پیٹ کا ہلکا ضرور ہے مگر اپنے اہم رازوں کو اندر دبا کر رکھنا اسے آتا ہے۔''

''تو جارج کو پیسوں کی اشد ضرورت تھی اور وہ مسز میری کی دولت پر ہاتھ صاف کرنے کے بارے میں بھی سوچ سکتا تھا۔'' میریون نے انکشاف انگیز انداز میں کہا۔

''لیکن میں ایسا نہیں سمجھتا اور اس کی ایک ٹھوس وجہ بھی ہے۔'' کلیرنس نے کہا۔ ''اس شام جارج کا زیادہ وقت میرے ساتھ گزر رہا تھا۔ جب آنٹی میری کی موت واقع ہوئی، اس وقت بھی وہ میری نئی کار کی خوبیوں کو اپنے ذہن میں بٹھانے کی کوشش کر رہا تھا بلکہ ایک موقع پر تو اس نے حسرت بھرے انداز میں یہ بھی کہا تھا..... ''کاش! میں بھی ایسی کار خرید سکتا.....'' مجھے اس کی بات پر حیرت ہوئی تھی کیونکہ مارمن اسپیڈسٹر خریدنا اس کے لیے کوئی مشکل کام نہیں تھا لیکن اس وقت تک مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ اپنا سب کچھ جوئے میں لٹا چکا ہے۔''

میریون نے اپنے لیے کافی کا ایک اور کپ تیار

کرتے ہوئے جذباتی انداز میں کہا۔ "مجھے امید...... بلکہ یقین ہے کہ اگر جارج کی طرح تم بھی خدانخواستہ اپنی ساری دولت ضائع کر بیٹھو تو بھی تم مجھ سے اتنی ہی محبت کرتے رہو گے جتنی کہ ابھی کرتے ہو۔"

"ڈارلنگ!" کلیرنس نے ٹھوس انداز میں کہا۔ "ایک دولت ہی کیا، دنیا کی کوئی بھی طاقت ہماری محبت کے راستے میں دیوار بن کر کھڑی نہیں ہو سکتی۔"

"آئی لو یو کلیر!" میریون وجد کے عالم میں بولی۔

"آئی لو یو ٹو میریو!" کلیرنس نے بھی اسی انداز میں کہا۔

چند منٹ تک وہ دونوں طوطا مینا کی کہانی کے کردار بنے رہے پھر ایک فوری خیال کے تحت میریون نے پوچھ لیا۔

"بیکر ڈیلر میل کے ساتھ تمہاری ملاقات کیسی رہی؟"

"کرنل بیکر بہت زیادہ غصے میں ہے۔" کلیرنس نے بتایا۔ "وہ کہتا ہے، جب تک وہ اپنی بہن کے قاتل کو عبرتناک سزا نہیں دلوا دے گا، اسے سکون نہیں آئے گا۔"

"ڈیلر میل فیملی نیو یارک شفٹ ہونے سے پہلے کنکٹی کٹ میں رہتی تھی۔ میری ڈیلر میل کی شادی جب کولسون سے ہوئی تو وہ "مسز کولسون" بن گئی تھی۔ کولسون ایک کروڑ پتی بزنس مین تھا۔ میری سے شادی کے چند ماہ بعد ہی کولسون چل بسا اور سب کچھ میری کے نام چھوڑ گیا تھا۔ بعد ازاں کرنل بیکر میری کولسون کو اپنے پاس نیو یارک لے آیا تھا تاہم میری کا بزنس کنکٹی کٹ ہی میں تھا جو ایک قابلِ بھروسا آدمی کی زیرِ نگرانی بخوبی چل رہا تھا اور میری کولسون سالہا سال سے اپنے بھائی کرنل بیکر ڈیلر میل کے گھر میں مقیم تھی جہاں اسے ہر قسم کا آرام اور سکون میسر تھا۔"

☆☆☆

اسی سہ پہر ماریا ایک مرتبہ پھر ان کے گھر میں موجود تھی۔ وہ حواس باختہ وہاں پہنچی تھی۔ اب کی بار اس نے انٹرکام کے ذریعے اپنی آمد کی اطلاع دینا بھی ضروری نہیں سمجھا تھا۔ ایلانزو اسے روکنے کے بجائے ساتھ ہی وہاں چلا آیا تھا۔

"مجھے تو بالکل یقین نہیں آ رہا۔" ماریا نے اضطراری انداز میں کہا۔ "میں پرسنلی کے ساتھ پولیس اسٹیشن گئی تھی اور وہیں سے مجھے یہ حیرت انگیز اور ناقابلِ یقین خبر ملی ہے۔"

"ماریا! آرام سے بیٹھ جاؤ۔" میریون نے تسلی آمیز انداز میں کہا۔ "اور اطمینان سے ہمیں اس خبر کے بارے میں بتاؤ۔" بات کے اختتام پر اس نے ایلانزو کو ماریا کے لیے فریش فروٹ جوس لانے کا آرڈر دے دیا۔

ماریا ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔ میریون اور کلیرنس کی استفساریہ نگاہیں اسی پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ بڑی بے تابی سے ماریا کے بولنے کا انتظار کر رہے تھے۔ ماریا نے چند لمحے اپنے حواس کو مجتمع کرنے میں لگائے پھر سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔

"آنٹی میری اپنا سب کچھ کلارا وٹلر کے نام کر گئی ہیں۔"

میریون اور کلیرنس سکتے کی سی کیفیت میں ماریا کو دیکھنے لگے۔ چند لمحات اسی حالت میں گزر گئے پھر کلیرنس کی حیرت بھری آواز ابھری۔

"سب کچھ......؟"

"اور وہ بھی ایک ملازمہ کے نام......؟" کلیرنس نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ "میں اس بات پر یقین کرنے کو تیار نہیں ہوں۔"

"آنٹی میری کی وصیت میں ایسا ہی لکھا ہوا ہے۔" ماریا نے بتایا۔ "آنٹی کی ایک ایک چیز کا تفصیلاً ذکر کیا گیا ہے جیسا کہ ان کی تمام جیولری مجھے ملے گی۔ ان کی جائداد اور بزنس کا دس فیصد ان کے کنکٹی کٹ والے اسٹاف کے لیے ہے اور باقی سب کچھ کلارا وٹلر کو ملے گا۔"

"او مائی گاڈ!" کلیرنس نے بےچینی سے اپنی بیوی کی طرف دیکھا۔ "اس کا مطلب ہے ہم شروع ہی سے غلط ٹریک پر جا رہے تھے۔ ہم آنٹی میری کے قتل کا محرک تلاش کرنے میں لگے رہے اور ان کی وصیت نے سب کچھ بدل کر رکھ دیا ہے بلکہ...... سب کچھ الٹا دیا ہے۔"

"اس وصیت کی روشنی میں کلارا کی شخصیت اور زیادہ شک کے دائرے میں آ جاتی ہے۔" میریون نے ماریا کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "مسز میری کی موت سے سب سے زیادہ فائدہ کلارا ہی کو پہنچنے والا ہے۔ کیا تم سمجھتی ہو اب بھی وہ وکیل کلارا کی حمایت میں یہ کیس لڑے گا؟"

"میں اس بارے میں کچھ بھی نہیں کہہ سکتی۔" ماریا بےبسی سے بولی۔ "مجھے جو پتا چلا وہ میں نے آپ لوگوں کو بتا دیا۔ میرا دماغ بالکل کام نہیں کر رہا۔ میں زیادہ دیر یہاں نہیں رک سکتی۔ مجھے ابھی واپس جانا ہوگا۔ میں نہیں چاہتی کہ رام کو پتا چلے کہ میں یہاں ہوں۔"

"آل رائٹ۔" میریون نے کہا۔ "تم جاؤ۔ ہم اس موضوع پر بعد میں بات کریں گے۔ تمہیں بالکل پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ تم نے ہمیں جو کچھ بتایا، ہم اس پر غور کریں گے۔ کوئی نہ کوئی حل نکل ہی آئے گا۔"

ماریا ان دونوں کا شکریہ ادا کرنے کے بعد وہاں سے رخصت ہو گئی تو کلیرنس نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

"اب دیکھنا یہ ہوگا کہ کنکٹی کٹ سے آنے والا وکیل

ان حالات میں بھی کلارا کے ساتھ کھڑا رہتا ہے یا نہیں۔"

"اس سے بھی زیادہ اہم یہ دیکھنا ہوگا کہ شہر میں کہاں، کیا ہو رہا ہے۔" میریون نے معنی خیز انداز میں کہا۔ "گھر کے اندر بیٹھ کر اندازے لگانے سے بہتر ہوگا کہ ہم باہر نکل کر حالات کا جائزہ لیں۔ تم اس بارے میں کیا کہتے ہو؟"

"ایگزیکٹلی مائی ڈارلنگ!" وہ مضبوط لہجے میں بولا۔ "ہاتھ پاؤں کھولنے کا وقت آ گیا ہے۔"

ٹھیک پندرہ منٹ کے بعد وہ دونوں مارسن اسپیڈسٹر میں بیٹھ کر اپنے مشن پر روانہ ہو چکے تھے۔ وہ موسم گرما کی ایک سہانی شام تھی۔ مغربی افق پر سورج کا جھکاؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ سمندر کی جانب سے آنے والی مرطوب ہواؤں نے فضا کو بھگو دیا تھا۔ آسمان پر کالی گھٹائیں پوری طرح قابض ہو چکی تھیں۔ اب تب میں...... بارش شروع ہونے ہی والی تھی۔

"اب تو میں پورے وثوق سے کہہ سکتی ہوں کہ مسز میری کی موت کی ذمے دار کلارا نہیں ہو سکتی اسی لیے جب میں لاک اپ میں اس سے ملی تھی تو مجھے اس کے چہرے یا آنکھوں میں احساسِ جرم کا شائبہ تک نظر نہیں آیا تھا۔" میریون کار سے باہر، گھٹاؤں سے گھرے ہوئے آسمان کو دیکھتے ہوئے بولی۔ "قاتل کوئی ایسا شخص ہے جو مسز میری کے مال و جائداد پر نگاہ لگائے بیٹھا تھا۔ اسے توقع تھی کہ مسز میری کے ترکے میں سے اسے بہت کچھ ملے گا اور ایسا شخص کوئی فیملی ممبر ہی ہو سکتا ہے اور اس بندے کو کسی طرح مسز میری کی وصیت کا پتا چل گیا ہوگا۔ جب اس نے دیکھا کہ سب کچھ تو ایک معمولی سی خادمہ کو جا رہا ہے تو اس کے دل و دماغ میں مسز میری کے لیے شدید نفرت کا طوفان اٹھا ہوگا۔ انہی انتقامی جذبات سے مغلوب ہو کر اس نے مسز میری کو موت کی نیند سلا دیا ہوگا۔ اگرچہ......" سانس ہموار کرنے کی غرض سے وہ رکی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولی۔

"اگر ہم ڈیلر میل فیملی کے ان ممبرز پر کڑی نگاہ ڈالیں جو مسز میری کی وصیت کے مطابق ان کے ترکے سے یکسر محروم رہ گئے ہیں تو ہمیں قاتل تک رسائی حاصل کرنے میں بہت آسانی ہو جائے گی۔"

"میری! اگرچہ تمہاری اس تھیوری میں مفروضوں کی بھرمار ہے لیکن ماننا پڑے گا کہ تم بہت دور کی کوڑی لائی ہو۔" کلیرنس نے توصیفی نظر سے اپنی بیوی کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "ہم تمہاری تجویز پر ضرور عمل کریں گے لیکن میں ذاتی طور پر کلارا کو شک کے دائرے سے باہر کھڑا نہیں دیکھ رہا۔ کلارا اپنے ہاتھوں سے آنٹی میری کے کھانے پینے کا بندوبست کرتی تھی لہٰذا انہیں سائنائیڈ دینے کے لیے اس سے زیادہ موزوں اور کوئی شخص ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ اب دو ہی باتیں ہیں......" وہ لمحے بھر کو متوقف ہوا پھر ڈرائیونگ پر توجہ مرکوز رکھتے ہوئے بولا۔

"کلارا، آنٹی میری کی وصیت سے واقف ہو گئی تھی اور اسے ڈر محسوس ہوا تھا کہ اگر فیملی کے کسی ممبر کو اس وصیت کی بھنک بھی پڑ گئی تو گھر میں ایک ہنگامہ اٹھ کھڑا ہوگا اور عین ممکن ہے مسز میری کو اپنی وصیت تبدیل کرنے پر مجبور ہونا پڑے جس کے بعد اس کے ہاتھ سے سب کچھ نکل جائے گا لہٰذا ایسی نوبت آنے سے پہلے ہی اس نے آنٹی میری کی زندگی کا چراغ گل کر دیا۔ یہ تو ہو گئی پہلی بات، دوسری بات یہ ہے کہ عین ممکن ہے کلارا، فیملی کے کسی ممبر کے ہاتھوں کا کھلونا بن گئی ہو۔ اسے سرے سے یہ معلوم ہی نہ ہو کہ وہ مسز میری کی موت کے بعد ان کی ہر شے کی مالک بننے والی ہے۔"

"تمہاری بات بھی خاصی وزنی ہے کلیر!" وہ پُرسوچ انداز میں بولی۔ "چلیں دیکھتے ہیں۔ اس جھمیلے سے کیا برآمد ہوتا ہے۔"

"فی الحال ہم اس پوائنٹ کو لے کر چلتے ہیں کہ آنٹی میری نے کسی کو بھی اپنی وصیت کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔" کلیرنس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "قاتل کو کسی

انتظار

ریستوران میں ایک صاحب نے کھانا منگوا کر کھانا شروع کیا تو انہیں احساس ہوا کہ اردگرد کی میزوں پر بیٹھی ہوئی بہت سی لڑکیاں یک ٹک ان کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ انہوں نے قدرے پریشان ہو کر ویٹر کو بلایا اور ان کے بارے میں پوچھا تو ویٹر کچھ ہچکچاتے ہوئے بولا۔ "سر! دراصل بات یہ ہے کہ اس ریستوران کے برابر میں ہی ایک کیٹرنگ ہال ہے جہاں کھانے پکانے کی کلاسیں ہوتی ہیں۔ یہ کھانا وہاں سے آیا ہے۔ اگر آپ نے کھانا پورا ختم نہ کیا یا آپ کھانا کھا کر لیٹ گئے تو یہ لڑکیاں امتحان میں فیل ہو جائیں گی۔"

(مرسلہ: محمد اسلم، بکھر)

طرح یہ معلوم ہو گیا کہ آنٹی میری نے اسے اپنے ترکے سے یکسر محروم کر دیا ہے لہٰذا اس نے طیش میں آ کر خود یا کلارا کی مدد سے آنٹی میری کا کام تمام کر دیا۔"

"ٹھیک ہو گیا۔" میریون تائیدی انداز میں بولی۔

"ہم شہر کے اندرونی حصے میں پہنچ گئے ہیں۔" کلیرنس نے معتدل انداز میں کہا۔ "میں چاہتا ہوں تم ایک بار پھر کلارا سے جا کر ملو اور میں اس کے وکیل سے ملاقات کرتا ہوں۔ ہم نے اس سانحے کے حوالے سے کافی معلومات جمع کر لی ہیں لہٰذا امید ہے کہ کوئی مفید شے ضرور ہمارے ہاتھ لگے گی۔"

میریون نے اپنے شوہر کی تجویز سے اتفاق کر لیا۔

جب میریون پولیس اسٹیشن میں داخل ہوئی تو یہ سن کر اس کے دماغ کو ایک جھٹکا سا لگا کہ کلارا وہاں موجود نہیں ہے۔

"اس کی ضمانت ہو گئی ہے۔" سارجنٹ نے اسے بتایا۔ "اس کا وکیل آج دن میں تمام انتظامات کے ساتھ یہاں آیا تھا اور اسے چھڑا کر اپنے ساتھ لے گیا ہے۔"

"اوہ......!" میریون نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے سارجنٹ سے استفسار کیا۔ "اس وکیل کا نام کیا ہے اور وہ کلارا کو اپنے ساتھ کہاں لے گیا ہے...... کیا کنفی کٹ؟"

"اس بارے میں، میں وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا میڈم!" سارجنٹ نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ "وکیل کا نام ہے ہربرٹ بوتھم اور میری معلومات کے مطابق وہ ہوٹل ایمبیسیڈر میں ٹھہرا ہوا ہے۔ وہ کلارا کو اپنے ساتھ ہوٹل ایمبیسیڈر ہی لے کر گیا ہے یا کہیں کسی اور جگہ، یہ آپ کو خود ہی پتا لگانا ہوگا۔"

"اوکے...... تھینک یو۔" میریون نے سارجنٹ کا شکریہ ادا کیا اور پولیس اسٹیشن سے باہر نکل آئی۔

ہوٹل ایمبیسیڈر اس کا دیکھا بھالا تھا اور وہ وہاں سے زیادہ دور بھی نہیں تھا۔ کلیرنس اپنی مارمن اسپیڈسٹر اس کے لیے چھوڑ گیا تھا۔ وہ کلارا کے وکیل سے ملنے گیا تھا اور یقیناً وہ بھی اس وقت اسی ہوٹل میں ہربرٹ بوتھم کے ساتھ موجود ہوگا۔ اسی خیال کے تحت وہ گاڑی کو ڈرائیو کرتے ہوئے ہوٹل ایمبیسیڈر پہنچ گئی۔

ریسپشن سے اس نے کلارا وبلر کے بارے میں استفسار کیا۔ ڈیسک کلرک نے چیک کرنے کے بعد اسے بتایا کہ کلارا وبلر اس وقت اپنے روم میں موجود نہیں ہیں۔

"اس کے ساتھ ایک وکیل صاحب بھی تھے؟" میریون نے سوالیہ نظر سے ڈیسک کلرک کی طرف دیکھا۔

"اس وکیل کا نام ہربرٹ بوتھم ہے۔"

"مسٹر ہربرٹ بوتھم ابھی تھوڑی دیر پہلے ایک معزز شخص کے ساتھ اسموکنگ لاؤنج کی طرف گئے ہیں۔" کلرک نے بتایا۔ "میں معذرت خواہ ہوں کہ آپ کو اسموکنگ لاؤنج کی طرف جانے کی اجازت نہیں ہے۔"

"جانتی ہوں۔" میریون نے ڈیسک کلرک کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پُراعتماد انداز میں کہا پھر اسے کلیرنس کے قد کاٹھ اور نقش و نگار سے آگاہ کرنے کے بعد پوچھا۔ "کیا مسٹر ہربرٹ بوتھم اسی معزز شخص کے ساتھ اسموکنگ لاؤنج کی طرف گئے ہیں؟"

ڈیسک کلرک نے فوراً تصدیق کر دی۔

میریون نے اس کا شکریہ ادا کیا اور تیزی سے باہر آ کر گاڑی کی پسنجر سیٹ پر بیٹھ گئی۔ ان لمحات میں اس کا ذہن روشنی کی رفتار سے بھی زیادہ تیز کام کر رہا تھا۔ وہ ان لمحات کو یاد کر رہی تھی جب وہ پہلی مرتبہ مسز میری کے بیڈروم میں داخل ہوئی تھی۔ اس منظر کی جزئیات اس کے حافظے میں نقش تھیں لیکن جب وہ ڈاکٹر بلیک مور کو اپنے ساتھ لے کر دوبارہ وہاں آئی تو بیڈروم کا منظر تبدیل ہو چکا تھا۔ یہ تبدیلیاں غیر محسوس انداز میں اسے پریشان کر رہی تھیں۔ اچانک ایک سنسنی خیز خیال کسی زہریلی ناگن کے مانند اس کی سوچ میں رینگنے لگا۔

"اگر کلیرنس کا کلارا پر شک درست ہے تو پھر وہ ضمانت پر رہا ہوتے ہی سیدھی ڈیلرمپل ہاؤس گئی ہوگی تاکہ اپنے جرم کے آثار کو مٹا سکے اور عین ممکن ہے کہ میں نے وقوعہ کی شام مسز میری کے بیڈروم میں جو تبدیلیاں دیکھی تھیں، وہ بھی کلارا ہی کا کیا دھرا ہو۔"

میریون پسنجر سیٹ سے ڈرائیونگ سیٹ پر منتقل ہوئی اور کار کو ڈیلرمپل ہاؤس کی سمت بڑھا دیا۔ اس کا خیال تھا کہ جب تک کلیرنس، ہربرٹ بوتھم کے ساتھ اپنی میٹنگ ختم کرتا، وہ واپس ہوٹل ایمبیسیڈر لوٹ آئے گی۔

کلارا ڈیلرمپل ہاؤس گئی تھی یا کہیں اور، یہ ایک الگ مسئلہ تھا۔ اس کے ساتھ ہی میریون کے دماغ میں ایک اور معاملہ بھی چل رہا تھا۔ وہ اس لمحے کو بھول نہیں سکتی تھی جب ماریا کی زبانی اس نے مسز میری کی موت کی خبر سنی تھی۔ اسی خبر سے جڑا ہوا کچھ ایسا بھی تھا جو اس کے ذہن کے کسی گوشے میں پڑا ہوا تھا اور مسلسل اس کی سوچ میں ایک نامعلوم سی بے چینی پیدا کرتا رہتا تھا۔ وہ اسی "کچھ" کو ماریا کی مدد سے "چیک" کرنے کا ارادہ رکھتی تھی۔

راستے بھر گرجتے ہوئے بادلوں کی ہیبت ناک آواز

اس کی سماعت پر تواتر کے ساتھ دستک دیتی رہی تھی لیکن وہ بغیر کسی شے کی پروا کیے اپنی منزل پر پہنچ گئی۔

گھر کے دروازے پر موجود ملازم نے اسے بتایا کہ مسز ڈیلرمپل اس وقت موجود نہیں ہیں۔ وہ اپنے گرین ہاؤس کی طرف گئی ہیں۔

"میں مسز ڈیلرمپل کو پریشان کرنے نہیں آئی ہوں۔" میریون نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ "میں دراصل مس ماریا ڈیلرمپل سے ملنا چاہتی ہوں۔"

"اوکے میڈم!" ملازم نے شائستگی سے کہا۔ "میں مس ماریا کو آپ کی آمد کے بارے میں آگاہ کرتا ہوں۔"

"تھینک یو۔" میریون نے کہا۔

ملازم اسے سٹنگ روم میں بٹھا کر ماریا کو اطلاع دینے چلا گیا۔ میریون اپنے دماغ میں وہ تمام پوائنٹس تازہ کرنے لگی جن کی تحریک نے اسے یہاں آنے پر مجبور کر دیا تھا۔

دو منٹ کے بعد ماریا سٹنگ روم میں داخل ہوئی۔

"مسز کیلر! آپ یہاں؟" اس نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔ "سب خیریت تو ہے نا؟"

"ابھی تک تو خیریت ہی ہے۔ آگے کا کچھ پتا نہیں۔" میریون نے سرسری انداز میں جواب دیا پھر پوچھا۔ "کیا کلارا یہاں آئی تھی؟ مجھے پتا چلا ہے آج دوپہر میں اس کے وکیل ہربرٹ بوتھم نے اسے ضمانت پر رہا کرا لیا ہے۔"

"ہاں، کلارا کی ضمانت کا میں نے بھی سنا ہے مگر وہ یہاں نہیں آئی۔" ماریا نے جواب دیا۔ "جب تک وہ اس کیس سے باعزت بری نہیں ہو جاتی، وہ اپنے وکیل کی نگرانی میں رہے گی۔ ہربرٹ بوتھم نے کسی ہوٹل میں اس کے قیام کا بندوبست کیا ہے۔"

"ہوٹل ایمبیسیڈر میں......" میریون نے جلدی سے کہا۔ "میں مسز میری کے بیڈروم کو ایک نظر دیکھنا چاہتی ہوں۔" وہ ماریا کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔ "کیا تم مجھے وہاں لے جا سکتی ہو؟"

"ہاں، کیوں نہیں۔" ایک لمحے کے تذبذب کے بعد ماریا نے جواب دیا۔ "آپ میرے ساتھ آ جائیں مگر آپ کو یہ کام بہت جلدی کرنا ہوگا۔ مام کے آنے سے پہلے ورنہ بعد میں وہ میری کھنچائی کریں گی۔"

"تم فکر نہیں کرو۔" میریون نے تسلی بھرے انداز میں کہا۔ "میں دس منٹ سے زیادہ نہیں لوں گی۔"

"آپ آئیں میرے ساتھ۔" ماریا نے معتدل انداز میں کہا۔

ماریا کی تقلید میں میریون زینہ طے کر کے بالائی منزل پر پہنچ گئی۔ ماریا نے کمرے کا دروازہ کھولا تو میریون کو وہاں "شفٹنگ" کے آثار دکھائی دیے۔ فرنیچر وغیرہ، بیڈ اور فرش والے قالین کے سوا باقی سب سامان نہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ڈریسنگ ٹیبل اور بیڈ سائڈ ٹیبل کی سطح بھی خالی نظر آ رہی تھی۔

"تم لوگوں نے مسز میری کے سامان کے ساتھ کیا کیا ہے؟" میریون نے ماریا سے پوچھا۔ "یہاں تو سب کچھ غائب ہے۔"

"آنٹی میری کے استعمال کی چیزیں تو پولیس لیبارٹری ٹیسٹ کے لیے اپنے ساتھ لے گئی تھی۔" ماریا نے بتایا۔ "باقی کا سامان مام نے ایک ٹرنک میں رکھوا دیا تھا۔" پھر وہ بیڈروم کے کونے میں پڑے ٹرنک کی جانب اشارہ

کرتے ہوئے بولی۔ "اس میں....!"
"کیا تم مجھے یہ ٹرنک کھول کر دکھا سکتی ہو؟" اس نے سوالیہ نظر سے ماریا کو دیکھا۔
"یس مسز کیلر!" ماریا نے فرمانبرداری سے کہا۔
مذکورہ ٹرنک کے اندر کافی کچھ بھرا ہوا تھا لیکن میریون کو جس شے کی تلاش تھی، وہ کہیں نظر نہیں آرہی تھی۔ وکٹورین طرز کی ایک نیلی بوتل جس کے اندر اسمیلنگ سالٹس (سونگھنے والے حیات بخش نمکیات) تھے۔ اس نیلی بوتل نے میریون کے دماغ میں کھلبلی مچا رکھی تھی۔
"جب تمہاری چیخ کی آواز سن کر میں بالائی منزل پر آئی تھی تو میں نے مسز میری کلارک کی بیڈ سائڈ ٹیبل پر اسمیلنگ سالٹس کی ایک نیلی بوتل رکھی دیکھی تھی۔" میریون نے ماریا کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "لیکن جب میں دوبارہ ڈاکٹر بلیک مور کے ساتھ مسز میری کے بیڈروم میں داخل ہوئی تو وہ نیلی بوتل بیڈ سائڈ ٹیبل پر سے غائب ہو چکی تھی اور اس کی جگہ ایک گرین بوتل رکھی نظر آرہی تھی۔ مجھے اس وکٹورین طرز کی نیلی بوتل کی تلاش ہے۔ کیا تم اس سلسلے میں میری مدد کر سکتی ہو؟"
"وہ نیلی بوتل میں نے بھی بیڈ سائڈ ٹیبل پر رکھی دیکھی تھی اور اسے دیکھ کر مجھے حیرت بھی ہوئی تھی۔" ماریا نے معصومیت بھرے لہجے میں کہا۔
"حیرت کیوں؟" میریون نے سرسراتی ہوئی آواز میں استفسار کیا۔ "کیا اس نیلی بوتل کے ساتھ کوئی سنسنی خیز کہانی بھی جڑی ہوئی ہے؟"
"کہانی کا تو مجھے پتا نہیں مسز کیلر....!" ماریا نے بے بسی سے کہا۔ "لیکن میں یہ جانتی ہوں کہ آنٹی میری ہمیشہ سبز بوتل استعمال کیا کرتی تھیں اور یہی میری حیرت کا سبب بھی تھا۔"
"اچھی طرح سوچ کر بتاؤ۔" میریون نے ایک ایک لفظ پر دباؤ ڈالتے ہوئے دریافت کیا۔ "قتل کی شام مسز میری کی بیڈ سائڈ ٹیبل پر کس نے وہ نیلی بوتل رکھی تھی.... یہ بہت اہم ہے....؟"
"میرے سامنے تو کسی نے نہیں رکھی البتہ میں یہ جانتی ہوں کہ نیلی بوتل کو وہاں سے اٹھا کر اس کی جگہ سبز بوتل کس نے رکھی تھی۔"
"کس نے؟" میریون نے قدرے بلند آواز میں سوال کیا۔
"بھابی آڈرے نے....!"
"اوہ....!" میریون ایک طویل اور گہری سانس لے کر رہ گئی۔ یکایک اس کے دماغ کا بوجھ ہلکا ہو گیا تھا۔ "آڈرے نے اس نیلی بوتل کا کیا کیا، کیا میرا مطلب ہے کہ بیڈ سائڈ ٹیبل سے اٹھانے کے بعد اس نے نیلی بوتل کو کہاں رکھا تھا؟ ٹرنک والے سامان میں وہ بوتل موجود کیوں نہیں ہے؟"
"اس لیے کہ آڈرے اس بوتل کو اپنے ساتھ لے گئی تھی۔"
"کہاں....؟"
"اپنے کمرے میں۔"
"کیا آڈرے اس وقت گھر میں موجود ہے؟"
"نہیں۔" ماریا نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ "وہ دونوں میاں بیوی سمندر کی سیر کو گئے ہیں۔ بھائی جارج آنٹی میری سے بہت زیادہ محبت کرتا تھا۔ آنٹی کی موت نے اسے بہت ڈسٹرب کر رکھا ہے اسی لیے بھابی آڈرے اس کا دل بہلانے کے لیے سمندر کی سیر کو لے گئی ہیں۔"
"یہ تو اور بھی اچھا ہے کہ وہ دونوں اس وقت گھر میں موجود نہیں ہیں۔" میریون نے بے ساختہ کہا پھر ماریا سے پوچھا۔ "کیا تم جانتی ہو آڈرے اپنی اہم چیزوں کو کہاں چھپا کر رکھتی ہے؟"
"مجھے صحیح اندازہ نہیں ہے۔"
"میں آڈرے کے کمرے کو چیک کرنا چاہتی ہوں۔" میریون نے کہا۔
"مسز کیلر!" ماریا نے تشویش بھرا سوال کیا۔ "کیا آنٹی میری کی موت کے حوالے سے آپ آڈرے کو شک کی نظر سے دیکھ رہی ہیں؟"
"سچ جاننا چاہتی ہو تو.... ہاں!" میریون نے دوٹوک انداز میں جواب دیا۔ "اور اگر وہ وکٹورین طرز کی نیلی بوتل آڈرے کے کمرے سے برآمد ہو جاتی ہے تو میرا یہ شک یقین میں بدل جائے گا۔"
"اوہ.... تو.... وہ سب.... اس لیے تھا....!" ماریا نے متوحش انداز میں کہا پھر خوفزدگی کے عالم میں اس نے اپنی آواز روکنے کے لیے منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔
"وہ سب کیا....؟" میریون نے اضطراری لہجے میں پوچھا۔ "تم کون سے راز کو چھپانے کے لیے اپنے منہ پر ہاتھ کا تالا لگا رہی ہو؟"
"بتاتی ہوں.... بتاتی ہوں....!" وہ اپنے منہ پر سے ہاتھ ہٹا کر خوفزدہ انداز میں بولی۔ "ابھی میرا دماغ کام نہیں کر رہا۔ آپ پہلے بھابی کا کمرا چیک کر لیں پھر بات

کرتے ہیں۔"
میریون نے ماریا پر زیادہ زور نہیں دیا اور اس کی معیت میں وہ آڈرے کے کمرے میں داخل ہو گئی۔
میریون کی متلاشی نگاہوں نے کمرے کا جائزہ لیا اور ماریا کی مدد سے تلاش کا کام شروع کر دیا۔ ڈریسنگ، وارڈروب وغیرہ کو چیک کرنے کے بعد جب وہ آڈرے کی رائٹنگ ٹیبل تک پہنچی تو گوہر مقصود اس کے ہاتھ لگ گیا۔ ایک دراز کے آخری حصے میں اسٹیشنری وغیرہ کے پیچھے شیفون کے سرخ اسکارف میں اسے کچھ لپٹا ہوا مل گیا۔ اس نے بہ آہستگی اس پیکٹ کو باہر نکال کر چیک کیا تو اندر سے وہی نیلی بوتل برآمد ہوئی جس کی میریون کو تلاش تھی۔
میریون نے نہایت ہی احتیاط کے ساتھ مذکورہ وکٹورین طرز کی نیلی بوتل کا ڈھکنا کھولا تو کمرے کی فضا میں تیز کڑوے باداموں کی ناگوار بو پھیل گئی۔ اس نے فوراً بوتل کا ڈھکنا بند کر دیا اور سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔
"تو آڈرے نے مسز میری کی موت کے سامان کو اپنی دراز میں چھپا رکھا ہے۔"
"جب آپ ڈاکٹر بلیک مور کو لینے گئی تھیں تو آڈرے نے یہ کہہ کر اس بوتل کو بیڈ سائڈ ٹیبل سے ہٹا دیا تھا کہ یہ صحیح طور پر کام نہیں کر رہی پھر اس نے اس جگہ پر گرین بوتل رکھ دی تھی۔" ماریا نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا۔ "میں سمجھتی ہوں، آڈرے میری آمد سے پہلے ہی اس بوتل کے زہریلے اثر سے آنٹی میری کو موت کے گھاٹ اتار چکی تھی لیکن غلطی سے وہ نیلی بوتل کو بیڈ سائڈ ٹیبل پر ہی چھوڑ گئی تھی جس کے بعد میں اس نے بوتل کے سسٹم کی خرابی کا بہانہ کر کے اسے وہاں سے ہٹا کر اس کی جگہ اسمیلنگ سالٹس والی سبز بوتل رکھ دی تھی۔" لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک جھرجھری لی پھر روہانسی آواز میں بولی۔
"میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ آڈرے، آنٹی میری کی جان بھی لے سکتی ہے۔ وہ تو ہمیشہ آنٹی سے اپنی محبت کا اظہار کیا کرتی تھی۔" بات کے اختتام پر وہ سسک پڑی۔
"دنیا کی سب سے بڑی حقیقت یہی ہے کہ جیسا دکھتا ہے، ویسا ہوتا نہیں ہے۔" میریون نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "خود کو سنبھالو ماریا یہ وقت رونے دھونے کا نہیں۔ ایک اہم کام کرنے کا ہے۔"
"کون سا اہم کام؟" ماریا نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ "میں کچھ سمجھی نہیں مسز کیلر!"
میریون ٹیلی فون کی جانب بڑھتے ہوئے اسے سمجھانے لگی۔

☆☆☆

میریون کی بروقت کارروائی نے اس معمائے موت کا راز افشا کر دیا تھا۔ اس نے پہلا فون پولیس اسٹیشن کیا تھا اور دوسرا فون ہوٹل ایمبیسڈر لہٰذا چند ہی منٹ میں پولیس، ہربرٹ بوتھم اور کلیرنس ڈیلرمپل ہاؤس میں موجود تھے۔ اس دوران میں مسز ڈیلرمپل اور کرنل بیکر بھی گرین ہاؤس سے واپس آگئے تھے۔ میریون نے نیلی بوتل کا ڈھکنا کھولتے وقت بہت زیادہ احتیاط سے کام لیا تھا تاکہ شیفون کے اسکارف میں لپٹی ہوئی اس وکٹورین طرز کی بوتل پر اس کی انگلیوں کے نشانات ثبت نہ ہوں۔
میریون نے پولیس کو تمام حقائق سے آگاہ کر دیا۔ پولیس کے ساتھ آئی ہوئی فرانزک ٹیم نے نیلی بوتل پر سے آڈرے کے فنگر پرنٹس اٹھا کر اپنے پاس محفوظ کر لیے تھے چنانچہ جب آڈرے اور جارج سمندر کی سیر سے واپس آئے تو پولیس آڈرے کو جیل کی سیر کرانے کے لیے تیار بیٹھی تھی۔
آڈرے نے اس موقع پر بہت شور مچایا کہ کسی نے نیلی بوتل اس کی دراز میں رکھ کر اسے مسز میری کے قتل میں پھنسانے کی سازش کی ہے لیکن مذکورہ بوتل پر پائے جانے والے فنگر پرنٹس آڈرے کی انگلیوں کے نشانات سے صد فیصد میچ کر گئے تھے لہٰذا اس کے پاس فرار کا کوئی راستہ باقی نہیں رہا تھا۔ اپنی گرفتاری کے وقت آڈرے نے نفرت بھرے انداز میں بہ آواز بلند کہا تھا۔
"اس کمینی بڑھیا کی ساری دولت اور جائیداد پر صرف اور صرف ڈیلرمپل فیملی کا حق تھا اور اس نے اپنا سب کچھ ایک دو کوڑی کی ملازمہ کو سونپ دیا.... مجھے اپنے کیے پر کوئی افسوس نہیں ہے۔ وہ خبیث بڑھیا اسی سلوک کی مستحق تھی۔"
آڈرے کا یہ جذباتی بیان ایک طرح سے اس کا اقبالِ جرم تھا لہٰذا پولیس اور عدالت کا کام انتہائی سہل ہو گیا۔ جارج اس گھناؤنی سازش میں شامل نہیں تھا چنانچہ اس پر کوئی گرفت نہیں ہوئی۔
زن، زر اور زمین کو فساد کی جڑ کہا جاتا ہے۔ مسز میری کولسن کی پراسرار معمائے موت نے اس قول پر مہر تصدیق ثبت کر دی تھی۔

XXX

جنگ باز

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

قسط: 6

مقدر کا عروج ہو یا نصیب کا زوال... جانے کن خاموش لمحوں میں زندگی میں شامل ہوجاتے ہیں... لیکن کچھ لوگ تقدیر سے زیادہ تدبیر پر بھروسا کرتے ہیں... وہ جو حالات کی زنجیر میں قید بوسیدہ در و دیوار تک محدود تھا تمام تر معصومیت کے ساتھ شب و روز کی ہنگامہ خیزیوں میں مصروف تھا کہ اچانک حرص و طمع اور لالچ کے مارے... چہروں پر شرفا کا نقاب ڈالے عیرت و مکر کے تمام حربے آزمانے اس کے راستے میں چلے آئے... وہ جو رنگین شاموں... سنگین ہنگاموں اور تحیر انگیز چالوں سے ناآشنا تھا... ایسا بازی گر بن گیا کہ تمام پردہ داروں کی ڈوریاں الجھ کر رہ گئیں... اس کے ذہن میں قید ناآسودہ خواہشوں کا بھنور اسے کسی کل چین سے بیٹھنے نہیں دیتا تھا۔ تقدیر کے سہارے چلنے والا... کچھ اس انداز سے تدبیروں سے اپنی کایا پلٹتا چلا گیا کہ چال بازوں کی تمام چالیں لڑکھڑا گئیں۔

معاشرتی ناسوروں اور درندوں کی خوں ریز سازشوں اور دحشم

دحشم ہونے والے ایک جنگ باز کی دلدوز داستان

لمحے بہ لمحے مجھے یوں لگا، جیسے میرے اندر بھیانک چیخیں گونج رہی ہوں۔ جیسے کوئی اندھیری کالی قبر میں زندہ دفن ہوا اور مدد کے لیے چلا رہا ہو۔ میری سانسیں تیز تیز چلنے لگیں۔ میرے وجود کا رواں رواں کپکپا رہا تھا۔ میں چند لمحوں کے لیے ساکت ہو گیا تھا۔

میں ہی نہیں، جیسے اس قبرستانی جھونپڑے کا ماحول بھی ساکت ہو گیا ہو۔ نادرہ بھی بت بن گئی تھی۔ زرد آنکھوں والا خبیث بڈھا گورکن اپنی منحوس آواز میں بولتے بولتے ٹھٹک رہا تھا۔ اب پتا نہیں اس کا ضمیر جاگ اٹھا تھا یا یہ معصوم بن کر مجھ سے کسی رعایت کی امید لگائے ہوئے تھا۔

ایسے میں اس قبرستانی جھونپڑی کے باہر گرم دوپہر کا عجیب سا دم بخود سناٹا طاری تھا۔ اردگرد پھیلی ہوئی قبروں کے درمیان موجود ملگجے سے درختوں پر بیٹھے پرندوں کی بھی کبھی کبھی ابھرتی چہکار بھی ناگوار محسوس ہوتی۔

جھونپڑی کے باہر عجیب سناٹوں کی سی فضا طاری تھی۔ یوں جیسے ان میں ایک سناٹی سنسناہٹ دینے والی پراسرار گونج کی سی کیفیت ہو۔

"اوئے مرن جوگیا! بتا تو سہی آخر تو نے اس معصوم لڑکی کے ساتھ ایسا کیا کیا ہے؟ بول، تیری یہ خاموشی اس سسرے کی جان ہی نہ نکال دے۔" معاً نادرہ ہی اس منحوس گورکن سے مخاطب ہونے کی ہمت کر پائی تھی۔ آخری اشارہ میری جانب تھا جبکہ یہ حقیقت ہی تھی کہ میں تو اندیشوں تلے بت سا بن کر رہ گیا تھا۔

یوں جیسے مجھے فوزیہ کے بارے میں مزید کچھ سننے کی تاب نہ ہو۔ جیسے میں کچھ آگے سننا ہی نہ چاہتا ہوں۔ جیسے..... جیسے کسی خوفزدہ بچے کی طرح میں ڈر گیا ہوں۔ نہ جانے اس ظالم بدبخت گورکن نے فوزیہ کے ساتھ ایسا کیا کر ڈالا تھا؟

نادرہ کے گھرکنے پر بڈھا گورکن اسی طرح رودینے لہجے میں فوزیہ کے بارے میں بتانے لگا تو میرا جی چاہا میں اس منحوس جھونپڑی سے ہی نہیں، اس منحوس ماحول سے ہی دور بھاگ جاؤں۔ میرے کانوں میں فوزیہ سے متعلق کوئی سنگین الفاظ ہی نہ پڑ سکیں کہ جنہیں میں برداشت ہی نہ کر پاؤں۔

"م..... میں نے لاش..... میں آ کر..... دونوں سے ہی ٹکڑے کیے تھے۔ ڈاڈے نے بھی اور..... اور کلّو نے بھی....."

"یہ سسری ماری کلّو کیا بلا ہے؟" نادرہ نے پوچھا۔ وہ کن انکھیوں سے میری جانب بھی دیکھ رہی تھی۔ میں بھی اس کے پاس ہی کھڑا بڈھے گورکن کو غضب ناک نظروں سے گھورے جا رہا تھا۔ میرے ہونٹ آپس میں سختی سے بھنچے ہوئے تھے۔

"یہ..... کلّو..... ایک خطرناک بلا ہے۔ میں تو اس مردود کو بلا ہی کہوں گا۔ ایک بے رحم اور بھوکا [illegible]" کہتے ہوئے اسے اچانک کھانسی کا ٹھسکا لگا۔ اس کے [illegible] اپنے اکھڑوانی سینے پر ہاتھ رکھ کر کھانستا چلا گیا۔ [illegible] آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔ کوئی [illegible] لگا کہ میں ابھی بے دم ہو کر گر پڑوں گا اور میری [illegible] پرواز کر جائے گی لیکن میرے بجائے بڈھا گورکن [illegible] پڑے کھانستا ہوا چارپائی سے نیچے آن پڑا۔

اس مردود کی سانسیں اکھڑنے لگی تھیں۔ اس کی گندی دیکھ کر واقعی لگتا تھا جیسے اس کا ضمیر کی [illegible] ہی اس پر پڑا ہو لیکن میں تب بھی اسی طرح سا بت بنا کھڑا رہا۔

نادرہ نے ہی اسے سنبھالنے کی کوشش کی اور [illegible] بیٹھ کر اس کی پشت پر زور زور سے تھپڑ مارنے لگی تا کہ اس کی سانسیں بحال ہوں لیکن بڈھے کی حالت نہ سنبھل سکی۔ جھونپڑی کے کچے ناہموار فرش پر اوندھے منہ گرا پڑا اور بے دم سا ہو گیا۔ میری دم بخود سی پتھرائی ہوئی آنکھوں نے اسے ایک جھٹکا لیتے بھی دیکھا۔

نادرہ اسے گالیوں پر گالیاں دیے جاتی اور ہوش میں لانے کی کوشش کرتی رہی۔ مجھے لگا بڈھا مر چکا تھا۔ جیسے اس کی حرکتِ قلب ایک دم ہی بند ہو گئی ہو۔

"اوئے بیڑا غرق ہو تیرا۔ مر تو نہیں گیا؟" نادرہ پریشان ہو کر پھر بڈھے گورکن کو کوسنے دینے لگی۔ اب وہ اس کی تھپکیاں سی کمر کے بجائے اس کے سینے اور منہ پر تھپڑ رسید کرنے لگی۔

"بدذات آدھی بات بتا کر ہماری آدھی جان نکالے دے رہا ہے۔"

"یہ مر چکا ہے۔" دفعتاً ہی میرے ساکت اور بھنچے ہوئے لب متحرک ہوئے۔ یوں جیسے کسی زندہ لاش کے لب ہلے ہوں۔ مجھے یہی لگا تھا کہ بڈھے گورکن کا ہارٹ فیل ہو گیا ہے۔

"ہائے ربا! کیا واقعی یہ مردود مر گیا ہے؟" نادرہ نے اس بار اپنے سینے پر تھپڑ مارا تھا۔

میں اپنی پتھرائی ہوئی کیفیات سے نکلا اور جھک کر بڈھے گورکن کے سینے اور پھر گردن پر ہاتھ رکھا۔ زندگی رواں رکھنے والی اس کی ساری دھڑکنیں مفقود ہو چکی تھیں۔

"اسے دل کا دورہ پڑا ہے۔ یہ ختم ہو چکا ہے۔" میں

نے پھر کہا۔ نادرہ اس کے پاس سے یک دم اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ خاصی متوحش ہو رہی تھی۔ میری طرح فوزیہ کے سلسلے میں وہ بھی خاصی پریشان اور متفکر دکھائی دے رہی تھی۔

"اب ہمیں کون فوزیہ کے بارے میں بتائے گا؟" وہ پریشانی سے بولی۔ "اور..... اور یہ کم بخت کلّو کس بلا کا نام ہے؟"

"یہ سب کچھ اب ڈاڈا ہمیں بتائے گا۔" میں نے کہا اور کونے میں رسن بستہ حالت میں بے سدھ پڑے ڈاڈے کی طرف نفرت سے گھورنے لگا۔ اس ہڑبونگ میں اسے بھی ہوش آنے لگا تھا۔

میں کڑوی نظروں سے اسے گھورتے ہوئے اس کی جانب بڑھا اور اسے اٹھا کر جھلنگا چارپائی پر پھینکا۔ اس کے منہ پر زور زور سے دو تین تھپڑ رسید کیے۔ وہ ہڑبڑا کر پوری طرح ہوش میں آ گیا۔

اس نے سر گھما کر مٹی والے فرش پر مرے پڑے گورکن کو دیکھا اور ہماری طرف نظریں اٹھا کر چلایا۔

"تت..... تم لوگوں نے اسے مار ڈالا.....؟" اس کی مکاری پر میں آپے سے باہر ہو گیا۔ وہ ہمیں مرعوب کرنے کے لیے ایسا ہولناک لہجہ اپنا رہا تھا تا کہ ہم قتل کے دباؤ میں آ کر اس سے کنی کترانے کی کوشش کریں۔

میں نے جھک کر اس کی گردن دبوچ لی اور غضب ناک لہجے میں غرا کر بولا۔

"ہاں، ہم نے ہی اسے مارا ہے اور اب تیری باری ہے۔" اس کی آنکھوں میں خوف کی ایک لہر ابھری تھی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ ہمیں قتل کے الزام کے دباؤ میں رکھ کر اپنی خلاصی کی راہ ہموار کرے گا لیکن میرے خونخوار اقرار نے اس کی ساری چالاکی پانی کی طرح بہا دی پھر بھی وہ ڈھٹائی سے بولا۔

"پولیس تم دونوں کو نہیں چھوڑے گی اور..... اور..... آہ....." اس کی چالاکی اور مکاری پر میں نے ایک زوردار گھونسا اس کے جبڑے پر رسید کر دیا۔

میں بہت بری طرح اندر سے بھرا ہوا تھا یہی وجہ تھی کہ میرے گھونسے کی ضرب خاصی زوردار ثابت ہوئی جس کے نتیجے میں اس کے منہ سے خون بہہ نکلا۔ شاید اس کی زبان یا گال کا اندرونی حصہ دانتوں تلے دب کر بری طرح زخمی ہو گیا تھا۔ وہ تکلیف کے مارے جکڑ بندوں میں ہی تڑپنے لگا اور شور مچانے لگا۔

"اس مردود کا منہ بند کر دو جانا.....!" نادرہ تنفر سے بولی اور پھر کچھ سوچ کر جھونپڑی سے باہر چلی گئی۔ میں نے ایک بار پھر پرطیش انداز میں ڈاڈے کی گردن دبوچ لی۔ اس کی آنکھیں ابل آئیں۔ آواز حلق میں گھٹ گئی۔

میں نے خوفناک لہجے میں کہا۔ "تو خود کتنا بڑا مجرم ہے، یہ میں بھی جان چکا ہوں۔ زیادہ چالاکی دکھائے گا تو تیرا اس بڈھے گورکن سے زیادہ برا حشر کروں گا۔"

کہتے ہوئے میں نے اس کی گردن چھوڑ دی۔ وہ جھلنگا چارپائی پر پڑے پڑے خون تھوکتے ہوئے بولا۔

"کک..... کیا چاہتے ہو تم لوگ.....؟" اب وہ لائن پر آ گیا تھا۔ اسی وقت نادرہ اندر آئی۔ مجھے اس کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔ میں نے کہا۔

"تو باہر کیا کرنے گئی تھی؟"

"یہ دیکھنے کہ کوئی باہر تو موجود نہیں۔" اس نے جواب دیا پھر ڈاڈے کا خون آلود چہرہ دیکھ کر تفکر سے میری طرف دیکھ کر بولی۔

"ذرا ہاتھ ہولا رکھ۔ کیا اسے بھی مار ڈالے گا؟"

"ہاں، میں کسی کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ تو خاموش رہ اب۔ میرے سر پر خون سوار ہے اس وقت....." میں نے غراتے ہوئے نادرہ کو بھی دوبارہ جھڑک دیا۔

اس کے بعد میں پھر ڈاڈے کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ بری طرح ہانپ رہا تھا اور اب خاصا دہشت زدہ بھی ہو رہا تھا۔ شاید صورت حال کی سنگینی ہی نہیں بلکہ خطرناکی بھی اس پر واضح ہو چلی تھی۔

"تو نے اس معصوم لڑکی کے ساتھ کیا کیا تھا؟ بول۔ اسے تو نے اس گورکن کے حوالے کیوں کیا؟" میں نے پرغیظ لہجے میں پوچھا۔

"کک..... کون سی لڑکی.....؟ م..... آہ..... ہائے....." ایک بار پھر اس کی مکاری پر غضب ناک ہو کر میں نے دوسرا گھونسا اس کے مضروب جبڑے پر رسید کر دیا اور یہی نہیں، اسے رسن بستہ حالت میں ہی دونوں ہاتھوں سے دبوچ کر چارپائی سے اٹھا کر کچے فرش پر لاش کی صورت پڑے گورکن کے قریب لا پھینکا۔ وہ اس کے بالکل قریب گرا تھا۔

ایسے میں گورکن کی لاش کے چہرے کی کھلی زرد آنکھیں اسے گھورنے لگیں تو وہ بری طرح دہشت زدہ ہو کر پھر چیخنے کے لیے منہ کھولنے ہی والا تھا کہ میں نے اپنے ایک پاؤں کا جوتا اس کے منہ پر رکھ دیا۔ وہ ایک بار پھر مچھلی کی طرح تڑپنے لگا۔

"آواز نہیں نکالنا... صرف مجھے جواب دینا ہے۔ تو نے رذیل انسان—!" میں غرایا۔ میرے پاؤں کا جوتا اس کی گردن پر جس آ رہا تھا۔ وہ کراہنے لگا۔ میں نے پاؤں ہٹا دیا۔ وہ لمبے لمبے سانس لینے لگا۔

"اوئے مردن جوگیا! تو نے کیا ہمیں اتنا ہی بے وقوف سمجھ لیا ہے؟ ہمیں ساری حقیقت کا علم ہو چکا ہے۔" نادو نے بھی اسے درشت لہجے میں سمجھانے کی کوشش کی اور آگے بولی۔

"ہم تو اس وقت ہی تیرا سارا کھیل سمجھ چکے تھے جب باہر تیری اور اس بڈھے کی لڑائی ہو رہی تھی۔ اس کے بعد بڈھے نے ہمیں سب بتا دیا تھا۔" کہتے ہوئے نادو نے اسے تھوڑی تفصیل بتائی۔

"چل اب اس کے سوالوں کے شرافت سے جواب دے اور شہر۔ یہ تجھے بھی زندہ نہیں چھوڑے گا۔ وہ لڑکی اس کی منگ اور محبوبہ تھی۔ وہ اسے مل جائے گی تو معاملہ ختم......" میں نے نادو کو بولنے کا موقع دیا تھا اور پھر قہر آلود نظروں سے ڈاڈے کو گھورنے لگا۔

"پپ...... پانی پلا دو ذرا......" وہ کراہا۔

"مرا ابھی لوٹ بھی ہے۔ پانی نہیں ہے۔" نادو بولی۔

"ہم...... مجھے معاف کر دو۔" وہ کراہتے ہوئے بولا۔ "میری نیت میں فتور آ گیا تھا۔ میں اسے ملتان یا لاہور لے جا کر فروخت کرنے کا ارادہ کیے ہوئے تھا۔ اسی لیے کچھ دنوں کے لیے اس گورکن کی جھونپڑی میں چھوڑ گیا تھا۔ باقی تو تم لوگوں کو بھی پتا ہی ہے کہ اس نے بعد میں اس لڑکی کے ساتھ کیا کیا؟ یہ تو مجھے بھی نہیں پتا۔"

"شروع سے بتا مجھے رذیل انسان!" میں غیظ سے لرز کر بولا۔ "وہ کن حالوں میں تمہارے گھر میں پناہ لینے آئی تھی اور اس نے اپنے بارے میں کیا بتایا تھا تجھے اور تیری ماں کو؟ کیونکہ ہماری معلومات کے مطابق اس رات تیرا باپ بھلاں وتی سے باہر گیا ہوا تھا؟"

اس نے ذرا رک کے تھوک نگلا اور بتانے لگا۔

"رات کے آدھے پہر میں اس لڑکی نے جس نے اپنا نام فوزیہ بتایا تھا، ہمارے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا تھا۔ اس وقت میں اور میری ماں صحن میں چارپائی ڈالے سو رہے تھے۔ ہم دونوں کی ہی آنکھ کھل گئی تھی۔ دروازہ میں نے ہی کھولا تھا۔ لڑکی بہت خوفزدہ تھی۔ کہنے لگی اسے مدد اور پناہ کی ضرورت ہے۔ اس کے پیچھے بہت خطرناک لوگ ہیں۔ ہم نے اسے پناہ دے دی تھی۔

اس کمینے کی بات پر میرا دل فوزیہ سے حق [illegible] سن کر دکھ سے بھر گیا۔ خود پر قابو پاتے ہوئے [illegible]

"کیا اس لڑکی فوزیہ نے تم ماں بیٹے کو [illegible] لڑکی کے بارے میں بھی کچھ بتایا تھا؟ کیونکہ [illegible] تھی۔ اس کے ساتھ ایک اور راحیلہ نامی لڑکی بھی تھی [illegible] بہن تھی۔"

میں راحیلہ کے سلسلے میں بھی بہت زیادہ فکرمند [illegible] لیکن چونکہ فوزیہ کا سراغ پہلے مل رہا تھا اس لیے [illegible] دھیان میں یہ بات تھی کہ فوزیہ کا پہلے سراغ ملے [illegible] راحیلہ کے بارے میں بھی اس سے پتا چل جائے گا۔

میرے اس سوال پر ڈاڈا بولا۔ "نہیں، اس نے [illegible] تو کچھ نہیں بتایا تھا۔ بس یہی کہا تھا کہ اس کے پیچھے کچھ خطرناک لوگ ہیں اور اسے ہم سے مدد اور پناہ چاہیے۔ وہ بہت پریشان اور دکھی تھی۔ ہو سکتا ہے بعد میں اسے اپنے بارے میں زیادہ کچھ بتانے کا وقت نہ ملا ہو کیونکہ [illegible] ہی میں اسے بہلا پھسلا کر یہاں لے آیا تھا۔"

"لیکن لڑکی کے بارے میں رحیم نامی ایک آدمی کو یہ بات معلوم تھی کہ کوئی لڑکی رات میں تمہارے گھر پناہ لینے آئی تھی؟ یہ کیا قصہ ہے؟"

"جب میں اگلے دن لڑکی کو اپنے ساتھ لے کر یہاں آیا تو مجھ سے یہ غلطی ہو گئی تھی کہ میں نے اپنی ماں کو بھی بتا دیا کہ میں اسے اس کی مدد کے لیے لے جا رہا ہوں۔ میرے اور لڑکی کے گھر سے نکلنے کے بعد رحیم آیا تھا۔ اس کے سر پر سخت پھوڑا نکل آیا تھا۔ وہ میرے باپ کا پوچھنے آیا تھا۔ بھلاں وتی کا مشہور جراح ہے۔ میری ماں نے یونہی اس سے لڑکی کا تذکرہ کر ڈالا تھا۔ جب میں گھر آیا تو ماں نے لڑکی کے بارے میں مجھ سے سوال کیا اور بتا بھی دیا کہ اس نے رحیم کو لڑکی کے بارے میں بتا دیا ہے۔ مجھے اپنی ماں کی بے وقوفی پر غصہ تو آیا تاہم مجھے پھر سچ بتانا پڑا کہ میں اس لڑکی کے دام کھرے کرنا چاہتا ہوں۔ اب کسی سے اس کا ذکر مت کرے۔ ماں نے مجھے کوسنے تو دیے پر وہ اولاد کی محبت میں چپ رہی اور پھر لڑکی کے بارے میں زبان نہ کھولی۔"

یہ سب سن کر میرے اندر ایک بار پھر لاوا سا بھرنے لگا۔ اس سے پہلے کہ میں دوبارہ طیش اور غیظ و غضب کی آگ میں جل کر ڈاڈے پر پل پڑتا، درمیان میں اچانک نادو نے اس سے پوچھ لیا۔

"اب مجھے یہ بتا کہ یہ بجلی کون ہے؟"

"بب...... بجلی؟ بی بی... یہ کون ہے؟" ڈاڈا ہکلائے

ہوئے بولا۔ "مجھے اس کا بالکل بھی نہیں پتا۔"

میں بری طرح جھلا گیا اور چاہتا تھا کہ ڈاڈے کا ادھری خاتمہ کر ڈالوں کہ نادو پھر درمیان میں آ گئی اور مجھ سے بولی۔

"ہوش کر اور حوصلہ کر نوجوانا...... اپنے آپ کو ذرا سنبھال اور اب ذرا مجھے اس سے بات کرنے دے۔ ہم زیادہ دیر یہاں نہیں ٹھہر سکتے۔" یہ اچھا ہی تھا کہ وہ میرا نام لینے کے بجائے "نوجوانا" کہہ رہی تھی۔ میں خاموش ہو گیا تو وہ ڈاڈے سے مخاطب ہو کر بولی۔

"دیکھ، اس مردود گورکن نے ہمیں یہ بتایا تھا کہ اس نے پیسوں کے لالچ میں آ کر وہ لڑکی کسی بجلی نامی شخص کے حوالے کر دی تھی پر آگے بتانے کے بجائے اس رذیل کا اچانک ہارٹ فیل ہو گیا اور وہ آگے ہمیں کچھ نہیں بتا سکا۔ ہم تیرے باپ جراح شکور کو بھی جانتے ہیں جو بستی کے لوگوں کے پھوڑے پھنسیوں اور گھاؤں کا علاج اپنے زنگ آلود آلات سے کرتا ہے۔ تیری حرافہ ماں حنیفاں کو بھی جانتے ہیں جو تیرے اس گندے کام میں برابر کی شریک ہے۔ اب اگر بجلی کو جانتا ہے تو سچ سچ بتا دے۔ اس دیوانے کی حالت تو تو دیکھ ہی رہا ہے نا......؟ اگر اسے اس کی محبوبہ نہ ملی تو وہ تجھے کیا، تیرے پورے خاندان کو گھر سمیت آگ لگا دینے کا ارادہ کیے ہوئے ہے۔"

نادو اتنا کہہ کر چپ ہوئی تو ڈاڈے نے ایک خوفزدہ سی نظر مجھ پر ڈالی اور بولا۔

"میں نے اس لڑکی کو بری نیت سے گورکن کے حوالے کر کے بے شک ظلم کیا ہے۔ میں مانتا ہوں لیکن مجھے اللہ کی قسم...... میری ماں کی قسم ہے مجھے، میں کسی بجلی نامی شخص سے بالکل بھی واقف نہیں ہوں۔ یہ ہو سکتا ہے کہ جیسا تم نے بھی سن ہی لیا تھا، اس مردود بڈھے گورکن نے اسے اسی کے ہاتھوں آگے فروخت کر دیا ہو۔"

"چل ٹھیک ہے۔ اب یہ بتا اس بڈھے کے اور کن خراب لوگوں سے واسطے تھے؟ یہ تو جانتا ہی ہوگا کیونکہ یہ تیرا پرانا ساتھی تھا۔" نادو نے اگلا سوال کیا تو ڈاڈا کچھ سوچتا بن گیا۔ ایسے میں نادو پھر بولی۔

"دیکھ، تجھے بتا چکی ہوں اس لڑکی کا پتا لیے بغیر تیری جان نہیں چھوٹ سکتی۔"

ڈاڈا بولا۔ "مجھے تم لوگ مہلت اور موقع دو گے تب ہی میں تمہاری اس سلسلے میں کوئی مدد کر سکتا ہوں۔"

"مثلاً......؟" نادو نے تیوری پر بل چڑھا کر اس سے پوچھا۔

"میں تمہیں ایک جگہ لے جا سکتا ہوں۔ مرادے کے ساتھ میں بھی صرف ایک بار ہی وہاں گیا تھا۔ ایک ڈیرا ہے، محمد پور کے قریب۔ یوں تو وہ اینٹوں کے بھٹے والی بستی کہلاتی ہے جو محمد پور اور فیض پور کے درمیان میں واقع ہے۔ وہاں کچھ لوگ آباد ہیں جو مجھے بڑے خطرناک لگے تھے۔ دوبارہ مجھے وہاں جانے کی ہمت نہ ہوئی تھی۔"

"کون اور کیسے لوگ تھے وہ؟ کیا کرتے تھے؟" نادو نے پوچھا۔ مجھے ایک بار پھر تفکرات اور وسوسوں نے آن گھیرا تاہم میں خاموشی اور تحمل سے ان کی باتیں سننے پر مجبور تھا۔ نادو اپنے طور پر اس سے سوال جواب کر رہی تھی۔

"میں کیا بتاؤں جی......!" ڈاڈا کترانے لگا اور خوفزدہ سی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ اسے ڈر تھا کہیں پھر ایسی ویسی بات پر میں جتے سے نہ اکھڑ جاؤں۔

"تجھے بتانا تو پڑے گا ہی اور یہ مرادا کون ہے؟ یہ گورکن......" نادو بولی۔

"ہاں، اسی گورکن کا نام مرادا ہے۔"

"یہ نامراد تو اب مر گیا پر تو آگے بول۔ تجھے ان پر کیا شک ہے؟"

"وہ...... وہ لوگ بڑے خطرناک لوگ لگے تھے۔ مرادے کے ان سے تعلقات تھے۔ بس، اس سے آگے کچھ نہیں جانتا۔" ڈاڈا خاموش ہو گیا۔

"تیرا خیال ہے لڑکی کو مرادے نے ان کے حوالے کیا ہوگا؟ کیا وہ عورتوں کی سوداگری کرتے ہیں؟" نادو نے پوچھا۔

"وہ اور بھی بہت کچھ کرتے ہیں۔ ان کا اصل پیشہ...... گداگری ہے پر وہ خوب صورت اور جوان لڑکیوں کو اغوا یا خرید کر بھیک منگواتے ہیں۔ ان کے خیال میں خوب صورت عورتیں......" اسی وقت ڈاڈے کی نظر مجھ پر پڑی۔

اس نے شاید ایک بار پھر میری آنکھوں میں خون اترتے بھانپ لیا تھا۔ گھگیاتے ہوئے اپنی بات روک کر نادو سے میری جانب آنکھوں کا اشارہ کرتے ہوئے لرزہ زدہ لہجے میں بولا۔

"بی بی...... یہ تمہارا آدمی پھر طیش میں آ رہا ہے......"

نادو نے میری جانب دیکھا۔ میرا وجود جوش غیظ سے واقعی کپکپانے لگا تھا۔ فوزیہ سے متعلق عجیب عجیب خوف ناک سے ہول میرے اندر اٹھ رہے تھے۔

"نوجوانا! خدا کے لیے خود پر قابو پا۔ اس طرح جوش اور باؤلے پن سے مسئلہ حل کبھی نہیں ہوگا۔"

نادو کو مجبوراً میرے لیے سخت الفاظ استعمال کرنا

پڑے تھے اور جانے کیا ہوا۔ میں مارے طیش کے زمین پر پاؤں پٹختا ہوا جھونپڑی سے باہر نکل گیا۔

مجھ میں فوزیہ سے متعلق آگے سننے کی تاب نہیں رہی تھی لیکن باہر بھی مجھے چین نصیب نہ ہوا۔ میرے اندر کی بے چینی شدید الجھن کا شکار ہونے لگی تو میں دوبارہ اندر آگیا۔

نادو کی بات غلط نہ تھی۔ میں واقعی پاگل سا ہو رہا تھا۔ میں نے خود کو بڑی مشکل سے سنبھالے رکھا۔ ان دونوں کے سوال جواب جاری تھے۔

نادو پوچھ رہی تھی۔ ''میرے خیال میں اس بڈھے گورکن مرادے نے فوزیہ نامی اس لڑکی کو انہی لوگوں کے ہاتھ فروخت کیا ہوگا؟''

''میں کیا جانوں، پر ہوسکتا ہے کیونکہ مرادے کے انہی تعلقات کی وجہ سے میں نے فوزیہ کو ایک دو روز کے لیے اس کے پاس یرغمال رکھا ہوا تھا۔ اسی لیے مجھے شک تھا کہ اس نے ہی لالچ میں آکر یہ کام کیا ہوگا اور مجھ سے جھوٹ بول رہا ہے کہ لڑکی بھاگ گئی ہے۔''

نادو نے پُرسوچ انداز میں ہونٹ بھینچ لیے اور میری جانب تکنے لگی۔ میری اپنی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ وہ مجھ سے بولی۔

''میرا خیال ہے ہمیں ایناں والی (اینٹوں والی) بستی چلنا چاہیے۔''

''لیکن اس سے پہلے میں اس کا ادھر ہی خاتمہ کر کے جاؤں گا۔ یہ سب اسی مردود کی وجہ سے ہوا ہے۔'' میں نے بپھرے ہوئے لہجے میں کہا تو اس بار نادو بھی سفاکی سے ڈاڈے کو گھور کر بولی۔

''اس جیسے رذیل کم کمینوں کو بالکل بھی نہیں چھوڑنا چاہیے جو معصوم اور دکھیاری زنانیوں کی مدد کرنے کے بجائے ان کی سوداگری کرتے ہیں۔ پر تو اس کے گندے خون سے اپنے ہاتھ کیوں خراب کرے گا؟''

نادو کے یہ الفاظ میرے کانوں میں پڑ رہے تھے اور میری متلاشی نظروں نے وہاں ایک ایک دلچسپ منظر دیکھا۔

ایک کونے میں جو مٹی کے مٹکا کو لات مار کر توڑا تھا اور اس میں سے پانی نکل کر کچی زمین میں جذب ہو رہا تھا، اس طرف سیاہی مائل سرخ رنگ کے موٹے چیونٹے رینگنے لگے تھے۔ پہلے تو میں یہی سمجھا کہ گرمی کے مارے یہ چیونٹے گیلی زمین پر پانی گرنے کی ٹھنڈک کی وجہ سے یہاں جمع ہوئے تھے مگر ایک وجہ اور بھی تھی۔

جیسا کہ ذکر ہوا، قریب میں تین چار اینٹیں رکھ کر لکڑی چولہے کا بندوبست کیا گیا تھا اور دو اینٹیں کچھ سیاہ پڑی ہوئی تھیں۔ ان کے پاس ہی ایک چھوٹی تھالی رکھی ہوئی تھی قریب میں اخباری ٹکڑے میں بندھی ہوئی چینی اور کچھ مسالے رکھے تھے۔ پانی وہاں تک پھیل جانے کے سبب کاغذی ٹکڑے گیلے ہو کر گل گئے تھے۔

ان میں جو چینی والا پڑا تھا، اس پر لاتعداد چیونٹے آنے لگے تھے اور وہ جھونپڑے کے دروازے سے پورے نظم و ضبط کے ساتھ ایک قطار سی بنائے اندر چلے آرہے تھے۔ یہ شاید قبروں میں پڑے مردے کھانے والے چیونٹے تھے اور گوشت خوری کے سبب ان کے رنگ سیاہی مائل سرخ سے ہو رہے تھے۔

میں نے جھلنگا سی چارپائی کی ادوائن کھولی کر اس سے ڈاڈے کو مزید اچھی طرح مضبوطی سے جکڑا۔

''کک.... کیا کرنے لگے ہو تم میرے ساتھ؟'' وہ خوف سے ہکلا کر بولا۔

''کچھ نہیں، بس ذرا کسی کو تمہاری ضیافت کا موقع دینا چاہتا ہوں۔'' میں نے زہرخندی سے کہا۔ نادو خاموشی سے میری حرکت کو تکے جارہی تھی۔ اب ڈاڈا بالکل بھی ہلنے جلنے سے قاصر تھا۔ میں نے اسے فرش پر ہی پڑے رہنے دیا تھا۔

یہ رحم کا بالکل بھی مستحق نہ تھا کیونکہ اس نے اس سے پہلے بھی نہ جانے کتنی ایسی مدد کی طلب گار مجبور لڑکیوں کو اپنے لالچ کی بھینٹ چڑھایا ہوگا اور آئندہ بھی اس کا یہی ارادہ ہوگا۔ اب اسے زندہ رہنے کا کوئی حق نہ تھا لیکن بقول نادو کے، میں اس کے ناپاک خون سے اپنے ہاتھ کیوں گندے کرتا۔ اسی لیے میں نے ڈاڈے کو اس کے لرزہ خیز انجام تک پہنچانے کا فریضہ چیونٹوں کے سپرد کر دیا تھا۔

تھوڑی سی چینی کی قطار بنا کر میں نے کچھ ڈاڈے کے سینے اور گردن سے لے کر منہ پر اچھی طرح پھیلا دی پھر اس پر گیلی مٹی بھی کھرچ کر ڈال دی تاکہ چیونٹوں کو پوری طرح اور بہ آسانی ایک زندہ انسان کی ضیافت اڑانے کا موقع مل سکے۔

''یی یی.... یہ تم کیا کر رہے ہو.... خ.... خدا کے لیے ایسا مت کرو۔'' ڈاڈے پر لرزہ طاری ہوگیا۔ وہ میری حرکات و سکنات کو فوراً بھانپ چکا تھا۔

میں نے اس پر کوئی توجہ نہ دی اور سیدھے کھڑے ہو کر چیونٹوں کا معائنہ کیا۔

ان کی ملکہ نے شاید یہاں ''ضیافت'' کی موجودگی کا اعلان کر دیا تھا یہی وجہ تھی کہ جوق در جوق چیونٹوں کی فوج ظفر موج جھونپڑی کے دروازے کے فرش سے اندر چلی

آرہی تھی۔ اب ان کا رخ چینی کی قطار کے ساتھ ساتھ ڈاڈے کی طرف ہونے لگا تھا۔

ڈاڈے کو اپنا ہولناک انجام سامنے نظر آنے لگا تو اس نے مدد کے لیے اپنا گلا پھاڑ کر چلانے کی کوشش کی جس کا مجھے پہلے ہی سے ادراک تھا۔ لہٰذا میں نے اسی کی قمیص پھاڑ کر اس کا گولا بنا کر اس کے کھلے منہ میں ٹھونس دیا اور کچھ چینی اور گیلی مٹی وہاں بھی پھیلا دی۔

نادو آنکھیں پھیلائے یہ سارا منظر دیکھ رہی تھی۔ تب ہی میں نے اسے ساتھ آنے کا اشارہ کیا اور جھونپڑی سے باہر نکل آیا۔

ڈاڈے کی آنکھوں میں مردنی اور ایک کربناک خوف کے آخری تاثرات سے میں حظ اٹھاتے ایک طرف کو چل پڑا۔ نادو میرے پیچھے پیچھے تھی۔ بولی۔ ''بالکل ٹھیک کیا تُو نے۔ ایسے مردودوں کا یہی انجام ہونا چاہیے۔''

میں نے اس کی بات پر کوئی تبصرہ نہیں کیا اور ایک قبر کے پاس بنے درخت کے قریب جا کر کھڑا ہوگیا۔

''یہ اینٹوں والی بستی یہاں سے کتنی دور ہوگی؟'' میں نے اس سے پوچھا۔ وہ جواب میں بولی۔

''کوئی تیس میل کا تو فاصلہ ہوگا، پر اس کے لیے ہمیں مین روڈ تک جانا ہوگا۔ کوئی لاری پکڑنا پڑے گی۔'' وہ کچھ مبہم سے لہجے میں بولی تو میں نے کہا۔

''سڑک تک جانا ہمارے لیے خطرے سے خالی نہ ہوگا۔''

''یہی میں بھی سوچ رہی تھی، پر ایک ترکیب ذہن میں آئی ہے۔ بس ذرا ہمیں پیدل پیدل چک بھورا تک جانا ہوگا۔ موسی کے گھر پہنچنے کے بعد بابو سے کوئی اسکوٹر وغیرہ لے کر ایناں والی بستی کی طرف اندر ہی اندر کچے راستوں سے نکل جائیں گے۔''

مجھے اس کی یہ تجویز نسبتاً بہتر لگی۔ اس کے بعد ہم پیدل ہی آگے روانہ ہوگئے۔

قبرستان سے نکلنے کے بعد ہم دونوں ایک کچے بل کھاتے راستے پر آگئے جس کے اردگرد درخت اور خودرو جھاڑیوں کی بہتات تھی۔ ایک کچی منڈیر بھی ساتھ ساتھ چلی جارہی تھی۔ جب بھی ہم کسی کو سامنے یا پیچھے سے بیل گاڑی یا موٹر سائیکل پر آتے جاتے دیکھتے تو فوراً منڈیر تاپ کر دوسری طرف جھاڑیوں میں جا چھپتے۔

میرے سینے میں ایک ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔ دل و دماغ پریشانیوں اور تشویش زدہ خیالات کی آماجگاہ بنے ہوئے تھے۔ حالات بالکل بھی ٹھیک نہیں تھے بلکہ وہ موافقت میں آنے کے بجائے مزید خراب ہوئے جارہے تھے۔ اب نہ جانے یہ نکی کیا بلا تھی جس کے بارے میں اس زرد آنکھوں والے بڈھے گورکن مرادے نے فقط اتنا ہی بتایا تھا کہ وہ ایک بلا تھی.... ایک عفریت تھا۔ وہ اس بلا کے بارے میں مزید کچھ بتانے سے قاصر رہا تھا کیونکہ اس کے بعد اس کو ہارٹ اٹیک ہوگیا تھا۔ وہ خود ہی واصل جہنم ہوگیا تھا۔ کہیں وہ بدبخت گورکن یہ تو نہیں بتانا چاہ رہا تھا کہ اس نے فوزیہ کو اسی نکی نامی بلا کے حوالے کر دیا تھا؟ ورنہ وہ کرفوزیہ کے متعلق میرے اندر ہول سے اٹھ رہے تھے۔

پولیس اب پوری شد و مد کے ساتھ ہمارے پیچھے لگ چکی تھی۔ جیسا کہ اس بات کا مجھے پہلے ہی خدشہ تھا۔ ادھر چیرا وسان کے گماشتے خونی بھیڑیوں کی طرح میرے خون کی بُو سونگھتے پھر رہے تھے۔ تیسری جانب فوزیہ نہ جانے کن خطرناک لوگوں کے ہتھے چڑھ چکی تھی اور وہ اس کا کیا بنا تھا؟ اس بے چاری کے لیے تو میں ابھی تک بالکل ہی اندھیرے میں تھا۔ اب خدا ہی میری یہ ان گنت مشکلیں آسان کرسکتا تھا۔ اسی لیے میں نے خود کو تن بہ تقدیر کر دیا تھا۔

مجھے بظاہر یوں گم صم اور چپ چاپ اپنے ساتھ چلتا پا کر نادو کو میرے اندر کی ہونے والی زبردست اتھل پتھل کا اندازہ ہوگیا۔

''نوجوانا! پریشان نہ ہو۔ رب سوہنا سب ٹھیک کر دے گا۔ شکر کر کہ فوزیہ کا تو پتا چل ہی گیا ہے نا۔ حوصلہ رکھ اور خود کو مضبوط رکھ۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

''خود کو ابھی تک مضبوط ہی رکھا ہے تو فوزیہ کے متعلق اتنا کچھ سننے کے بعد بھی کھڑا ہوں ورنہ تو کب کا ڈھے چکا ہوتا۔'' میں نے چلتے چلتے جواب دیا۔

''شاوا شے نوجوانا! پروا نہ کر، میں تیرے ساتھ ہوں۔ بے شک میں ایک عورت ذات ہوں پر تیرا حوصلہ کم نہیں ہونے دوں گی نہ ہی تجھے....'' وہ مضبوط لہجے میں بولی۔ میں اس کی بات اور اس کے خلوص سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا اور مردانہ انا کو ایک طرف رکھتے ہوئے بولا۔

''نادو! اس میں کوئی شک نہیں کہ تیرے ساتھ ہونے پر مجھے واقعی بڑا حوصلہ اور ہمت ملتی ہے۔ اکیلا ہوتا تو نہ جانے دیوانگی اور طیش میں کیا کر جاتا۔'' پھر ایک لمحے بعد میں نے یونہی اس سے بھولے مرحوم کا تذکرہ کر دیا جس کے بارے میں مجھے نادو کی طرف سے ایک پُراسرار سا تجسس تھا۔ بولا۔

"نادو! اس معاملے میں، میں نے تجھے واقعی بہت حوصلے والا پایا ہے۔ تو بھی تو بے چارے بھولے سے محبت کرتی تھی۔ اس نے تیری آنکھوں کے سامنے دم توڑا اور آج تک میں نے تیری آنکھوں اور تیرے چہرے پر ایک ذرا غم کی پرچھائیں تک نہ دیکھی، نہ ہی تو نے اسے دوبارہ یاد بھی کیا۔"

میری بات پر اس نے بے تاثر سے لہجے میں جواب دیا۔ "میں دل کی فطری طور پر مضبوط ہوں۔ ڈرتی کسی سے نہیں ہوں ورنہ بھولے کا ساتھ کیوں دیتی؟ تجھ جیسے بااثر لوگوں سے پنگا بھی کیوں لیتی۔ بس، میری آزادی پر حرف آئے، یہ مجھے قبول نہیں۔ بھولا مر گیا، سو مر گیا، اب جانے والا آ تو نہیں سکتا۔ کیا غم کرے انسان۔ مُردے کے ساتھ زندہ تو مُردہ نہیں بن سکتا۔"

اس کی بات سن کر میں نے اپنا سر جھٹک دیا۔ میرا تجسس اب بھی دور نہیں ہوا تھا۔ بس اتنا ہی سوچ سکا کہ نادو ایک گہرا پانی تھی۔ اس کے اندر، اس کی تہ میں کیا تھا، یہ ظاہر ہی نہیں ہونے دیتی تھی۔ وہ ایک عجیب لڑکی تھی۔ اس پر مجھے ترس بھی آتا اور غصہ بھی۔

ہم چلتے رہے اور کہیں رکتے سستاتے ہوئے بالآخر چک جھورا پہنچ ہی گئے۔ تب تک سہ پہر ہو چلی تھی اور شام بھی جھکتی محسوس ہونے لگی تھی۔

موسی گھر میں تھی۔ بابو کہیں گیا ہوا تھا لیکن تھوڑی دیر بعد وہ بھی واپس لوٹ آیا۔ اس کے ہمراہ وہی کھٹارا سا ویسپا اسکوٹر تھا پر اب شاید اس نے اس کی مرمت کر لی تھی اور وہ بالکل درست حالت میں تھا۔

بابو کا چہرہ اترا اترا سا تھا۔ نادو نے اس سے پوچھا۔
"کیا ہوا بابے؟ یہ تیرے چہرے پر بارہ کیوں بج رہے ہیں؟"

"کچھ نہیں۔ اتنی محنت کی تھی اسکوٹر پر...... سوچا تھا اچھے دام کھرے کر لوں گا پر اب تو کیا، اسے کوئی خریدنے کو ہی تیار نہیں ہے۔" اس نے جواب دیا۔
"چوری کی ہے؟" نادو نے سوال کیا۔ "کاغذات ہیں؟"
"بس اِدھر اُدھر سے پرزے لا کر اس کی مرمت کی ہے۔ کاغذات کہاں ہوں گے بھلا۔"
"کتنی قیمت ہے؟"
"دس ہزار......"
"پاگل ہوا ہے۔ جبھی تو کوئی خرید نہیں رہا ہے۔" نادو بولی۔ "ایک تو چوری کی، اوپر سے اتنا پرانا ماڈل۔ تیل بھی بہت پیتی ہوگی؟"

نادو اس سے سودے بازی کر رہی تھی اور [illegible] تھا۔ مجھے حیرت تھی کہ نادو آخر تھی کیا شے؟ [illegible] تھی مجھے۔

"پانچ ہزار دوں گی، ابھی اسی وقت۔" بات کرتے ہوئے [illegible] نے کہا۔ میں نے دیکھا بابو کی آنکھوں میں چمک سی ابھری لیکن پھر فوراً ہی سودے بازی والی ہوشیاری سے بولا۔
"پانچ ہزار تو بہت کم ہیں، مائی! چار ہزار تو میرے پرزے خریدنے میں لگ گئے اور محنت الگ۔"
"پتا ہے مجھے تو نے پرزے کن پیسوں سے لیے ہیں یا پہلے ہی تیرے پاس چوری کا سامان موجود رہتا ہے۔ [illegible] ہزار سے ایک پائی زیادہ نہ دوں گی۔" نادو اس کی [illegible] میں آئے بغیر تڑ سے بولی۔ "ہم تو ویسے ہی [illegible] کی سیر کے لیے [illegible] رہے تھے...... تیری مرضی۔"

بابو نے ایک نظر مجھ پر ڈالی۔ میں اور نادو پسینے میں بھیگے ہوئے تھے۔ اتنی گرمی میں پیدل چل چل کر پہنچے تھے، حال تک آتے ہوئے ہمیں تھوڑی دیر ہو چکی تھی۔
"پر تمہارے پاس تو ایک زبردست [illegible] بائیک تھی...... وہ کہاں گئی؟" بابو نے اچانک پوچھ لیا۔
"وہ کسی کی تھی۔ اسے پہنچا دی ہم نے۔ تو اپنی بات کر۔ پانچ ہزار میں دے رہا ہے؟ [illegible] شہر [illegible] ہمیں کوئی اور اچھی بائیک مل جائے گی۔" کہتے ہوئے وہ سوچتی بن گئی پھر میری طرف دیکھ کر بولی۔
"کیا خیال ہے؟ شہر تو جا ہی رہے ہیں۔ کوئی اور اچھی سی موٹر سائیکل خرید لیں گے؟"

یہ اس کی بابو کو رام کرنے کی چال تھی جس کا خاطر خواہ نتیجہ نکلا۔ بابو کی اسکوٹر بقول اس کے کوئی خریدنے کو تیار نہ تھا۔ نادو نے اس کی یہی کمزوری پکڑی تھی۔ وہ یک دم بولا۔
"اچھا مائی! پانچ ہزار ہی دے دو۔"
"ٹھیک ہے۔ اس کی ٹینکی فل کر دے۔"

اس نے اپنے کباڑ خانے میں جا کر، جدھر اس نے چوری کے پیٹرول کی چند بوتلیں بھر رکھی تھیں، ان میں سے ایک اٹھا کر اس نے اسکوٹر کا ٹینک فل کر دیا۔ بقول اس کے ٹینکی میں پہلے بھی نصف پیٹرول تھا۔

نادو نے اسے پانچ ہزار کے علاوہ دو سو روپے مزید دینے کا وعدہ کر لیا۔ وہ خوش ہو گیا۔
"چل اب اپنا کام کر۔ ہمیں ذرا ضروری باتیں کرنا ہیں اور دیکھ، اب بھی جو تھوڑی بہت خرابی ہے دیکھ لے۔

خاص اس کی آگے والی بتی (ہیڈ لائٹ)۔ ہمیں اسی وقت شاید نکلنا پڑے اسکوٹر پر۔" نادو نے اس سے کہا۔ وہ خوشی سے سر ہلاتا ہوا باہر چلا گیا۔
"کیا خیال ہے تو جو اتنا کام تو بن گیا روانگی کا۔ کل چلیں یا ابھی؟"

نادو نے بلاشبہ تیزی دکھائی تھی۔ بابو کے جانے کے بعد اس نے مجھ سے پوچھا۔ میں تو خود فوراً ہی [illegible] کی تلاش میں ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ فوراً کہا۔
"میں تو تیار ہوں۔"

نادو کی موسی نے اس کی امانت سنبھالے رکھی تھی یعنی وہ چھوٹا سوٹ کیس۔ نادو نے اس میں سے پانچ ہزار کے علاوہ کچھ مزید پیسے اور بھی نکال لیے۔ اس کے بعد بابو کو پانچ ہزار اور پانچ سو روپے اضافی تھما دیے۔ وہ خوش ہو گیا۔ موسی سے نادو نے یہی کہا کہ ہم ابھی شہر تک جا رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے رات گئے یا پھر صبح ہی واپس آ سکیں۔

ہم نے تھوڑا بہت کھانا زہر مار کیا۔ پانی کی بوتل نادو نے بھر لی۔ ایک سوٹی بھی اٹھا لی۔ بقول اس کے کچے دیہاتی راستوں اور کھیتوں کھلیانوں سے گزرتے ہوئے کتے تنگ کر سکتے ہیں۔

ہم جب روانہ ہوئے تو شام جھکنے لگی تھی۔ میں اسکوٹر چلا رہا تھا۔ نادو میرے پیچھے سوٹی پکڑے بیٹھی تھی۔

ویسپا اسکوٹر چلانے کا یہ میرا پہلا تجربہ تھا۔ بنیادی طور پر یہ "چیز" سیدھی اور رواں سڑک پر چلنے کے لائق تھی کیونکہ اسکوٹر کے ٹائر موٹر سائیکل کے مقابلے میں بہت چھوٹے ہوتے ہیں۔ کچے اور ناہموار راستوں پر اسے بہت احتیاط سے چلایا جاتا ہے۔ تاہم لمبے روٹ کے لیے یہ ایک زبردست چھوٹی سواری تھی۔

اس بار نادو نے چک جھورا کے بہت اندرونی شمال مشرقی راستے کا انتخاب کیا تھا۔ ایک بغیر پھاٹک کے ریلوے لائن عبور کرنے کے بعد نہر آ گئی۔ اس پر بانسوں اور پھونس کا جگاڑی پل بنا ہوا تھا۔ اس پر سے اسکوٹر گزار کر ہم دوسری سمت آ گئے۔ یہ خاصا نشیبی علاقہ تھا۔

نادو نے مجھے راستہ بدلنے کا کہا۔ اس کے مطابق یہ کھاری زمین تھی۔ یہاں اسکوٹر کے پھسلنے یا دھنسنے کا خطرہ تھا۔ میں نے راستہ بدل لیا۔

دائیں جانب جنگل تھا اور اس کے پار کچے کچے گارے مٹی والے گھروں کے آثار نظر آئے۔ اس کے قریب سے گزرے تو وہاں ایک بڑے گھر کے پاس ہی ڈھارا تھا جس کے سامنے چنگڑی بچھائے ایک لنگی اور قمیص پہنے شخص ٹانگ لٹکائے بیٹھا لسی پی رہا تھا۔ اس نے ہماری طرف ایک اچٹتی سی نظر ڈالی۔

نادو نے مجھے کان میں بتایا کہ یہ مجوں کا رکھوالا ہے۔
کیا خیال ہے، لسی پینی ہے؟ میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔
آگے خودرو جھاڑیوں کا سلسلہ آ گیا۔ اسی جگہ پر نیم اندھیرے میں گیدڑوں کا ایک غول چیختا چلاتا ہوا نکلا۔ کمبخت میرے اسکوٹر سے بھی ٹکرائے۔ شکر تھا کہ میں خبردار ہو گیا تھا۔ اسکوٹر کو میں نے سنبھال لیا۔

شکر تھا کہ ابھی تک کتوں سے مڈبھیڑ نہیں ہوئی تھی۔ حقیقت یہی تھی کہ میں تو شہری آدمی تھا۔ کتوں سے بڑا ڈرتا تھا۔ البتہ نادو ان کتوں سے بالکل بھی خائف نہیں ہوتی تھی بلکہ کسی شیرنی کی طرح ان پر پل پڑتی تھی اور انہیں مار بھگاتی۔

ایک جگہ نادو نے مجھے اسکوٹر روکنے کا کہا اور پیاس کا اظہار کیا۔ ہم نے پہلے باری باری بوتل سے منہ لگا کر چند گھونٹ پانی پیا اس کے بعد میں نے نادو سے کہا۔
"آگے چلیں اب؟"
"ٹھہر ذرا...... میں نے صرف پانی پینے کے لیے ہی تھوڑی اسکوٹر رکوایا تھا۔" میں اس کا چہرہ تکنے لگا۔ وہ مجھ سے چند قدم اِدھر اُدھر سرک کر ارد گرد کا جائزہ لینے لگی۔

میں خاموشی سے اسکوٹر پر ہی بیٹھا تھا۔ میں نے اس کے چہرے پر کچھ الجھن کے آثار محسوس کیے۔
چند ایک بار تو وہ میری نظروں سے اوجھل بھی ہو گئی پھر واپس آ گئی۔ اب اس کے چہرے سے الجھن غائب تھی اور اس کی جگہ جوش نے لے لی تھی، بولی۔
"چل اب، میں ذرا راستہ جانچ رہی تھی۔ مجھے ڈر ہونے لگا تھا کہ بھول رہی ہوں۔"

میں نے اسکوٹر اسٹارٹ کیا اور ہم پھر روانہ ہو گئے۔ اب شام خاصی جھک آئی تھی۔ میں نے اسکوٹر کی ہیڈ لائٹ روشن کی تو یوں لگا جیسے کوئی لالٹین جلا دی ہو۔ بہت کم روشنی تھی اس کی۔ یہ بھی شاید ٹھیک ہی تھا۔ زیادہ روشنی یوں بھی ہمارے لیے ٹھیک نہیں ہوتی۔

چند میل آگے بڑھنے کے بعد نادو نے یہاں مجھے پھر رکنے کا کہا۔ میں نے اسکوٹر روک دیا اور انجن بند کر دیا۔
اب یہاں ہر سو سناٹے کا راج تھا اور دیہاتی جنگل پر ہُو کا عالم۔ ایسے میں یونہی دل و دماغ پر ہیبت سی طاری ہونے لگی۔
نادو اسکوٹر سے اتر کر پھر اِدھر اُدھر جانے لگی۔ تیسری

بارہ دو درختوں کے ایک جھنڈ میں غائب ہوئی تو کافی دیر بعد برآمد ہوئی۔ میرے قریب آ کے بولی۔

"خدا کا شکر ہے کہ ہم بالکل صحیح سمت پر جا رہے تھے۔ بس آگے ایک مسئلہ ہوگا۔"

"وہ کیا؟" میں نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"آگے مین روڈ آ رہا ہے۔ اسے پار کرنا ہوگا۔"

"تو کیا ہوا۔ کر لیں گے پار۔ کون سا اس پر سفر کرنا ہوگا۔"

"وہ تو ٹھیک ہے پر اس طرف تھانہ محمد پور کی حد ہے اور پولیس سے سامنا ہونے کا ڈر ہوگا۔"

"ہم کوئی لمبا موڑ کاٹ کر مین روڈ پار کر لیں گے۔"

میں نے اسے تجویز سمجھائی تو وہ بولی۔

"اس کے لیے پھر ہمیں ایک لمبا چکر کاٹنا پڑ جائے گا۔"

"ایک بڑے رسک سے بچنے کے لیے یہ تو کرنا ہی پڑے گا۔" میں نے کہا۔ "اور پھر ہم کون سا پیدل ہیں۔ سواری ہے ہمارے پاس۔"

"چل پھر اگے کر (آگے بڑھو)۔" کہتے ہوئے وہ اچھل کر اسکوٹر پر بیٹھ گئی۔

"نیچے اتر، کک مارنی ہے مجھے۔" میں نے کہا۔ وہ مسکراتے ہوئے نیچے اتر گئی۔ دیسا اسکوٹر کا یہی مسئلہ تھا۔ پہلے کک مارنی پڑتی تھی، اس کے بعد سوار ہوا جاتا۔

ہم ایک بار پھر آگے بڑھ گئے۔ ابھی تھوڑا ہی فاصلہ طے کیا ہوگا کہ اچانک مجھے یوں لگا جیسے اسکوٹر کے انجن میں سے دو آوازیں آ رہی ہوں۔ میں پہلے یہی سمجھا شاید کوئی خرابی واقع ہونے لگی ہے۔ جب غور کیا تو ایک دم میرا دل دھک سے رہ گیا۔ یہ میرے اسکوٹر کے انجن کی ڈبل آواز نہیں تھی بلکہ کسی دوسری گاڑی کے انجن کی آواز تھی۔

میں نے یک دم رفتار آہستہ کر لی۔

"کیا ہوا؟" نادو نے چونک کر پوچھا۔

"کوئی اور گاڑی بھی ہمارے پیچھے آ رہی ہے۔" میں نے سرسراتے لہجے میں کہا۔ تب ہی نادو نے بھی کان لگائے۔ دوسری گاڑی کے انجن کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ وہ یک دم گھبرا کر بولی۔

"کوئی گڈی شڈی اس طرف آ رہی ہے۔ چل اس طرف لکتے (چھپتے) ہیں۔"

اس نے سامنے والے درختوں کے جھنڈ کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

میں اسکوٹر کا انجن بند کر چکا تھا۔ ہم نیچے اتر آئے۔ میں اسکوٹر کو ہینڈل سے کھینچتا ہوا تیزی سے اس طرف بڑھا۔

ہم دونوں اسکوٹر سمیت جھنڈ میں دبک گئے اور پھر تھوڑ جھاڑیوں سے کچے راستے کی طرف تکنے لگے۔

میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ کچا راستہ جو ہم سامنے تنگ سا کچا راستہ پیچھے اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ ہمارے عقب سے ایک تیز ہیڈ لائٹ ابھری۔ یہ کوئی گاڑی ہی تھی۔

میں نے اس کے "آہنگ" پر غور کیا۔ تب تک وہ بھی اندازہ کر چکی تھی۔ سرگوشی میں میرے کان میں بولی۔

"کوئی موٹر سائیکل ہی لگتی ہے۔" میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ذرا دیر بعد ہی آواز قریب آ گئی اور میری نظروں نے اس طرف دیکھا تو یکلخت جیسے میرا دل اچھل کر حلق میں آن اٹکا۔

تبھی شام کے نیم اندھیرے میں ایک بائیک کی تیز ہیڈ لائٹ نظر آئی۔ بائیک کی آواز بھاری سائلنسر کی تھی۔ وہ درمیانی رفتار سے کچے راستے پر ہچکولے کھاتی ہوئی پاس سے گزرنے لگی۔ میری دم بخود سی نظریں تب تک بدستور اس کا احاطہ کیے رہی تھیں جب تک وہ ہمارے بالکل قریب سے آگے نہ گزر گئی۔ اب اس کی عقبی سرخ بتی دکھائی دینے لگی اور کچھ دیر بعد وہ بھی غائب ہو گئی۔

"بی بی ...... یہ دونوں تو وہی مردود تھے۔ گنگل اور اس کا ساتھی منیرا...... جس سے ہماری سودے کی کھاد والی دکان میں مڈبھیڑ ہوئی تھی۔" معاً ہی نادو نے سرسراتی سرگوشی میں کہا۔

اس کی آواز میں واضح طور پر لرزش تھی۔ خود میں بھی ششدر تھا کیونکہ قریب سے ان دونوں کو گزرتے ہوئے میں نے بھی دیکھ لیا تھا۔ وہ بس ہم سے دو تین فٹ کے فاصلے ہی تو گزر رہے تھے۔

"ہاں، بائیک بھی مجھے وہی لگتی ہے۔ شاید پولیس سے ان لوگوں نے اپنی بائیک حاصل کر لی ہے۔" میں نے کہا۔

"بہت اتاولے ہو رہے ہیں یہ دونوں مردودے ہماری تلاش میں۔" نادو نے خالص دیہاتی لہجے میں کہا۔

"ہاں، دونوں برابر ہمارے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔" میں نے بھی خیال ظاہر کرتے ہوئے دھیمی آواز میں کہا۔ "لگتا ہے پھلاں وتی میں چاچا وسایا کی دکان پر اچانک نازل ہونے والی پولیس نے انہیں ان کی چوری کی بائیک کے بارے میں بتا دیا ہوگا اور یہ دونوں فوراً ان کے پاس پہنچے ہوں گے، اپنی بائیک لی اور...... ہمارے تعاقب میں......"

"لیکن انہیں ہمارے راستے کا علم کیسے ہوا؟ ہم پکڑے تو نہیں گئے تھے؟" نادو نے درمیان میں بات کاٹ کر متوحش سے لہجے میں کہا۔

"ہم نہیں تو ان کی بائیک تو ان کے ہتھے چڑھ گئی تھی نا...... اس سے ہی ان دونوں نے اندازہ لگا لیا ہوگا اور پوچھتے پاچھتے فوراً ہی ہماری تلاش میں نکل کھڑے ہوئے ہوں گے۔ بہت تیز ہیں دونوں۔"

"لیکن......"

"شش......" نادو مزید کچھ کہنا چاہتی تھی کہ اچانک میں نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ میرے کان ایک بار پھر کھڑے ہو گئے تھے۔

"کیا ہوا؟" اس نے بہت نیچی آواز میں گھبرا کر پوچھا۔

"بائیک کی آواز ابھی تک آ رہی ہے۔" میرے ساتھ فضا میں کان کھڑے کر کے وہ بھی کچھ سننے کی کوشش کرنے لگی۔

"سنتا نا؟ اب یہ دونوں تو آگے جا کر رک گئے ہیں۔" نادو کو بھی ٹھہری ہوئی بائیک کے انجن کی آواز آ گئی لیکن چند لمحوں کے بعد ہی ایکسلریٹر دینے کی آواز ابھری اور پھر یوں لگا جیسے آگے تھوڑی دیر رکنے کے بعد وہ پھر روانہ ہو گئے ہوں۔

"گئے ... نکل گئے آگے دونوں......" میں نے سرسراتے لہجے میں کہا۔

"اب کیا کریں؟" نادو پریشانی سے بولی۔

"ہمیں اب کچھ دیر ادھر ہی رکنا پڑے گا۔" میں نے کہا۔ "تاکہ یہ دونوں بہت آگے نکل جائیں۔"

"میرا خیال ہے تھوڑا پیدل آگے جا کر تسلی نہ کر لی جائے؟" نادو بولی۔ اس کا خیال برا نہیں تھا۔ میں نے کہا۔

"تو ادھر ہی رک، میں ذرا دیکھ کے آتا ہوں۔" کہتے ہوئے میں جھاڑیوں سے سرکا۔

"میں بھی چلوں گی تیرے ساتھ۔" نادو بھی چل دی۔ ہمارا اسکوٹر جھاڑیوں کی آڑ میں ہی رہا۔ ہم دونوں کچے راستے پر آ گئے اور محتاط روی کے ساتھ پیدل ہی آگے چل دیے۔

چند قدم آگے تک جانے کے بعد ہم رک گئے۔ تاریکی میں مجھے یہاں سگریٹ کے دو ٹوٹے پڑے نظر آئے جن کے سرے ابھی تک سلگ رہے تھے۔

"ہم...... ان لوگوں نے یہاں ذرا دیر ٹھہر کر سگریٹ پیے ہیں۔" میں نے پرخیال لہجے میں کہا۔ نادو تھوڑی دیر خاموش رہی پھر بولی۔

"وہ اب آگے نکل گئے ہیں۔ ہمیں چلنا چاہیے۔"

میں نے اس کی بات پر اپنے سر کو اثباتی جنبش دی۔

ہمیں ان دونوں کی تسلی ہو گئی کہ وہ بہت آگے نکل چکے ہیں تو ہم پھر واپس اپنی جگہ پلٹ آئے۔

"اب ہمیں اس راستے کو چھوڑ کر دوسرا راستہ اختیار کرنا پڑے گا نادو!" میں نے اپنے کسی "کھٹکے" ہوئے خیال سے کہا۔

"وہ کیوں؟ وہ تو اگے گار (آگے نکل) چکے۔"

"پتا نہیں کیوں میرا دل اندر سے کھٹک رہا ہے کہ ان کا یہاں تھوڑی دیر ٹھہرنا بے معنی نہیں تھا۔" بالآخر میں نے اپنے شبہے کا اظہار کر ڈالا۔

"ایسے حالات میں یہ وسوسے آتے ہی ہیں ذہن میں۔"

"لیکن پھر بھی اگر ہم دوسرا راستہ اختیار کر لیں تو اچھا ہی ہے۔" میں نے کہا۔

"دوسرا راستہ تو بہت لمبا پڑ جائے گا۔" وہ بولی۔

"یہ راستہ بھی تو طویل تھا۔"

"پر وہ اس سے بھی زیادہ طویل ہے اور میرا دیکھا بھالا بھی نہیں۔ ہم بھٹک بھی سکتے ہیں۔" نادو کے لہجے میں تشویش در آئی تھی۔

اس کی بات سن کر میں نے پرسوچ انداز میں اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔ وہ از راہ تسلی دوبارہ مجھ سے بولی۔

"تو پریشان نہ ہو۔ اللہ کا نام لے کر اسی راستے پر چلتے ہیں، پر ذرا ہوشیاری سے۔ وہ دونوں مرن جوگے، گنگل اور منیرا...... بہت آگے نکل گئے ہوں گے۔"

چار و ناچار مجھے اس کی بات پر صاد کرنا ہی پڑا۔ میں نے اسکوٹر کو کک ماری۔ اس کا انجن شام اور رات کے سناٹے میں ہولے ہولے غرانے لگا۔

ایک بار پھر ہم روانہ ہو گئے۔ رات پوری طرح اتر چکی تھی۔ کتوں سے ابھی مڈبھیڑ نہیں ہوئی تھی۔ ہمارے ارد گرد اجاڑ بنجر ویرانہ تھا۔ گنگل اور منیرے کو اپنی بائیک پر روانہ ہوئے کچھ ہی دیر ہوئی تھی اسی لیے ہم محتاط تھے۔

یوں میرا ارادہ تھا کہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد رک کر اور اسکوٹر کا انجن بند کر کے گرد و پیش کی سن گن لینے کے بعد ہی آگے بڑھا جاتا۔ مبادا وہ دونوں کہیں قریب ہی موجود ہوں۔

اس عمل سے بے شک تاخیر تو ہوتی لیکن عقل مندی اور احتیاط کا تقاضا یہی تھا کہ جلد بازی سے کام نہیں لیا جائے جبکہ یہ بات واضح ہو چکی تھی کہ گنگل اور منیرے کو ہماری

بھنک پڑ چکی تھی بلکہ کوئی بعید نہ تھا کہ جب مجھے اپنے اسکوٹر کے انجن میں "ڈبل آواز" کا شبہ ہوا تھا اور عقدہ کھلا کہ ہمارے عقب میں بھی ایک موٹر سائیکل چلی آرہی ہے تو ضرور ان دونوں نے بھی ہمارے اسکوٹر کے انجن کی آواز سن لی ہوگی۔ مجھے یہی تشویش تھی کہ گگل اور منیرے کو ہم پر یقین کی حد تک شبہ ہو چکا تھا کہ ہم ان کے آگے چلے جا رہے تھے پھر ان دونوں کا ایک مقام پر رک کر سگریٹ پینا اور پھر آگے چل دینا۔

رات کے پہر سناٹے میں ہماری اسکوٹر سواری جاری تھی۔ آسمان صاف اور روشن تھا۔ چاندنی جوبن پر تھی اور تاروں کی روشنی اکناف کے ماحول کو کسی قدر منور کیے ہوئے تھی۔ ابھی ہم تھوڑی ہی دور نکلے تھے کہ سامنے مدھم روشنی میں ایک تنگ سے موڑ پر جیسے ہی میں نے اسکوٹر کا ہینڈل موڑا تو دو افراد دائیں بائیں کی جھاڑیوں سے نمودار ہوئے۔ ان دونوں کے ہاتھوں میں سونٹے تھے۔ انہوں نے وہ گھما کر مجھ پر رسید کیے۔ میں نے ان کے وار سے بچنے کے لیے یک دم اپنے آپ کو پورا آگے اور پیچھے کی جانب جھکا لیا پھر بھی ایک سونٹا میرے لگا اور دوسرا میرے پیچھے بیٹھی نادو کے کہیں لگا تھا۔

اس بے چاری کو پڑنے والے سونٹے کی ضرب زوردار ثابت ہوئی جبکہ بروقت جھک جانے کی وجہ سے ایک کا سونٹا جیسے میرے سر کو مس کرتا گزرا تھا مگر وہ بھی خاصا زوردار ہی محسوس ہوا تھا مجھے۔ نتیجے میں نادو کی کربناک سی چیخ ابھری اور اس اچانک حملے سے اسکوٹر مجھ سے سنبھل نہ سکا۔ نادو تو سونٹے کی ضرب لگتے ہی گر چکی تھی۔ میں بعد میں اسکوٹر سمیت لہراتا ہوا قریب کی جھاڑیوں میں جا گرا۔ چند لمحے کے لیے میرے حواس مختل ضرور ہوئے تھے مگر دو تین بار سر کو جھٹکا دینے کے بعد میں نے ابھی ذرا سنبھالا لیا ہی تھا کہ میں نے گگل کو سونٹا تولے پھر اپنی جانب بڑھتے پایا۔ وہ اس نے تول کر مجھے پھر رسید کیا ہی تھا کہ میں نے ایک دم جھاڑیوں میں لیٹے لیٹے پلٹی کھائی۔ سونٹا خالی جگہ پر پڑا اور میں بجلی کی سی پھرتی سے حرکت کرتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھا اور اس پر جست لگائی۔

میں اسے اپنے ساتھ ہی لیتا ہوا دوبارہ پیچھے آرہا۔ جیسا کہ مذکور ہو چکا، گگل بھی میری طرح جسمانی صحت اور ڈیل ڈول میں کم نہ تھا۔ اس نے بجلی کی طرح تڑپ کر میری آہنی گرفت سے نکلنے کی کوشش کی اور کسی حد تک کامیاب بھی ہوا مگر میرے اندر کا جنگ باز پوری طرح بیدار ہو چکا تھا۔

میں نے اس کی گرفت سے نکلتے نکلتے بھی اپنے دو گھونسے اس کے بھاری جبڑے پر رسید کر ڈالے۔ اس کے حلق سے اوغ کی کراہتی ہوئی آواز بلند ہوئی اور وہ ایک لمحے کے لیے جھنجلایا مگر فوراً ہی خود کو سنبھال کر اپنی ایک لات چلا دی جو میرے پیٹ پر پڑی۔ یہ لات کھاتے ہی چند قدم پیچھے کی جانب لڑکھڑا گیا۔ گگل نے سونٹا چھوڑ دیا تھا اور اب اپنی قمیص کے نیچے شاید بندھے ہوئے ہولسٹر سے پستول نکالنے کے لیے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ میں نے اس پر دوبارہ چھلانگ ماری۔ وہ ایک طرف ہو گیا۔ میں سیدھا جھاڑیوں میں جا پڑا۔

مجھے یقین تھا کہ وہ اب اپنا پستول نکال چکا ہوگا اور پلٹنا میرے لیے خطرے سے خالی نہ تھا جبکہ اس کا ساتھی منیرا شاید نادو کی طرف "مصروف" تھا۔ میں نے بسرعت وہی سونٹا اٹھایا جو جھاڑیوں میں ہی پڑا تھا۔

"خبردار! اب کوئی حرکت مت کرنا۔ تم میرے نشانے پر ہو۔"

وہی ہوا۔ اچانک ہی گگل کی بھیڑیے جیسی غراہٹ ابھری۔ میں وہیں جام ہو گیا۔

"سونٹا پھینک کر کھڑے ہو جاؤ۔" اس نے دوسرا حکم دیا۔ میں نے یہی کیا۔

منیرا بھی قریب آچکا تھا اور اس کے ہاتھ میں بھی ایک پستول چمک رہا تھا۔ میرے اندر سائیں سائیں ہونے لگی۔ مجھے نادو کی فکر ہوئی۔ اس کی طرف دیکھا تو وہ ہنوز بے سدھ بھربھری مٹی والی زمین پر پڑی تھی۔

پتا نہیں وہ بے چاری بے ہوش تھی یا پھر منیرے نے اس کا گلا دبا کر ہلاک کر ڈالا تھا لیکن مجھے اپنا یہ خیال غلط لگا کیونکہ ان دونوں کا مقصد شاید ہم پر زندہ ہی قابو پانا تھا ورنہ جس طرح یہ پہلے ہی ہماری گھات لگائے بیٹھے تھے، ہم پر بےدریغ فائرنگ کر سکتے تھے۔

"وہ حرام زادی...... کیا مرگئی ہے؟" گگل نے اپنے ساتھی منیرے سے پوچھا۔ اس کا اشارہ قریب بے سدھ پڑی نادو کی ہی طرف تھا۔

"نہیں استاد! بے ہوش ہے۔" منیرے نے جواب میں کہا۔

"رسی نکال۔ پہلے اس حرام کے جنے کے ہاتھ پاؤں باندھ۔" گگل نے مجھے خونخوار نظروں سے گھورتے ہوئے منیرے سے تحکمانہ کہا۔ اس بدبخت کے منہ سے اپنے لیے "حرام کے جنے" کی گالی سن کر میرا دماغ الٹ گیا۔

"حرام کا جنا ہوگا تو اور تیرا خاندان جو اپنے داتا ڈالنے والوں کے آگے کتے کی طرح دم ہلاتے ہیں۔"

موت کے نشانے پر ہونے کے باوجود میں نے جوش کے لپیٹ تھے اس کی گندی گالی اس کی جانب لوٹا دی۔ یہ سن کر اس کے چہرے پر ہی نہیں بلکہ آنکھوں میں بھی سرخی گہری ہو گئی۔ اسی لہجے میں دانت پیس کر غرا کے بولا۔

"اگر چودھری صاحب کا تمہیں زندہ پکڑنے کا حکم نہ ہوتا تو ادھر ہی اپنا پستول تجھ پر خالی کر دیتا، پر خبردار! کسی خوش فہمی میں مت رہنا۔ ہمیں گولی مار دینے کا بھی حکم ملا ہوا ہے۔"

اتنی ڈوز اس کے لیے کافی تھی اسی لیے میں نے مزید اسے طیش دلانا مناسب نہیں سمجھا اور اسے گھورتا رہ گیا۔

منیرا پلٹا اور اپنی موٹر سائیکل کے پیچھے بندھی ہوئی رسی کھول لایا۔ یہ وہی ون ٹو فائیو موٹر سائیکل تھی جس پر میں اور نادو سواری کر چکے تھے۔

منیرے نے اب اپنا پستول لباس کے اندر رکھ لیا تھا اور دونوں ہاتھوں سے رسی لیے میری جانب بڑھا۔ میں اسی تاک میں تھا کہ منیرا میرے اور پستول بدست گگل کے درمیان میں آجائے تو میں اپنی کوئی "کارروائی" دکھا سکوں لیکن گگل بھی ایک کائیاں تھا۔ اس نے فوراً اپنی پوزیشن بدل ڈالی اور اس رخ پر آگیا کہ منیرا بآسانی میرے ہاتھ باندھ سکے اور میں بھی گگل کے نشانے پر رہوں۔

"دونوں ہاتھ پیچھے کر اپنے۔" منیرا میرے عقب میں آکر درشتی سے بولا۔ ناچار میں نے اپنے دونوں ہاتھ پیچھے گھما لیے۔

میرے اندر جیسے گھمسان کا رن پڑا ہوا تھا۔ دل و دماغ ایک زبردست ابال کی کیفیات سے دوچار تھے۔ میں جانتا تھا کہ ایک بار ان کی گرفت میں چلا گیا تو شاید پھر دوبارہ نہ نکل پاؤں گا اور میری اب تک کی ساری تگ و تاز بیکار جائے گی پھر جیسے سب برباد ہو جائے گا۔ فوزیہ کی تلاش اور راحیلہ کی گمشدگی کی کاوشیں، سب ماضی کا حصہ بن جائیں گی لیکن میں بے بس تھا۔ گگل کی خون رنگ آنکھوں سے صاف جھلکتا تھا کہ اب وہ میری ذرا سی بھی حرکت پر بےدریغ اپنا پستول مجھ پر خالی کر سکتا تھا۔

میں نے شاید ایسی بے بسی اب تک کسی موڑ پر محسوس نہ کی تھی جس نے میرے دماغ کو جھلاہٹ میں مبتلا کر ڈالا تھا۔

ادھر وہ مردود منیرا میرے دونوں ہاتھ پشت کی جانب بڑی مضبوطی سے باندھ چکا تھا۔ تب ہی اچانک شاید غیر ارادی طور پر میری وزدیدہ سی نگاہ اس طرف کو اٹھی جدھر نادو زمین پر بے سدھ پڑی تھی مگر اب وہ جگہ خالی تھی البتہ وہاں مجھے چٹکی ہوئی چاندنی میں کچھ رقیق سا مادہ پھیلا ہوا محسوس ہوا۔ شاید وہ اس کا خون تھا مگر وہ کہاں گئی تھی؟

یکلخت میرا دل دھڑک اٹھا۔ اسی لمحے گگل کے منہ سے بوکھلائی ہوئی کی بلی غراتی آواز ابھری۔

"ارے...... یہ حرام کی جنی کدھر بھاگ گئی؟"

منیرا جو میرے دونوں ہاتھ باندھ چکا تھا، وہ تیزی سے اس طرف لپکا۔ تب ہی میں نے گگل کے عقب سے ایک سائے کو نمودار ہوتے دیکھا۔ گگل کو بھی فوراً ہی اپنے عقب میں کسی سرسراہٹ کا احساس ہوا تھا۔ وہ جیسے ہی اپنے عقب میں گھوما، اس پراسرار سائے نے اس پر کوئی بھاری شے رسید کر ڈالی جو اس کی پیشانی پر پڑی۔

وہ ضرب ایک سونٹے کی تھی جسے کھاتے ہی گگل جیسے گرانڈیل شخص کے حلق سے کربناک چیخ ابھری اور وہ کٹے ہوئے شہتیر کی طرح گر گیا۔

تب ہی میری پھٹی پھٹی نظروں نے دیکھا، وہ سونٹا بردار نادو تھی۔ مدھم سی چاندنی میں مجھے اس کا نصف سے زیادہ چہرہ خون سے تربتر نظر آیا۔ میں نے منیرے کی جانب گردن موڑ کر دیکھا۔ وہ گگل کی چیخ پر اس طرف متوجہ ہوا تھا۔ تب ہی میں نے ایک خطرے کے پیش نظر نادو کو چلا کر خبردار کرنا چاہا مگر وہ پہلے ہی ہوشیار ثابت ہوئی۔ ٹھیک اسی وقت جب منیرا، گگل کی چیخ پر اس طرف متوجہ ہوا اور معاملہ سمجھتے ہی اس نے پستول نکالنے کے لیے اپنا ایک ہاتھ جلدی سے لباس میں ڈالا، تب تک نادو گگل کا گرا ہوا پستول اٹھا چکی تھی اور میرا خیال تھا کہ وہ اسے خبردار کرے گی لیکن اگلے ہی لمحے دم بخود فضا میں گولی چلنے کا دھماکا ہوا۔

میں نے پھیلی ہوئی آنکھوں سے دیکھا کہ منیرے کو اپنے حلق سے آواز نکالنے کا بھی موقع نہ مل سکا۔ اس کا بھیجا پار ہو چکا تھا اور وہ کھڑے کھڑے کسی بت کی طرح زمین پر گر پڑا۔

"ن...... نادو......!" میں نے اسے پکارا مگر اس نے اس پستول کی نال کا رخ جب قریب گرے پڑے بے سدھ سے گگل کی جانب موڑا تو میں نے چلا کر اسے روک دیا۔

"نہیں نادو......! بس اتنا ہی کافی ہے۔ ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔"

مگر نادو پر تو جیسے عجیب سی کیفیت طاری تھی۔ اس نے جیسے میری بات سنی ہی نہ تھی۔ اس نے اب اپنے دونوں ہاتھوں سے پستول کو پکڑ لیا تھا۔

"نادو... خدا کے لیے میری بات مان لے۔"

لیکن اسی وقت فائر کے دو دھماکوں نے میری آواز دبا ڈالی۔ گنگل کے زمین پر پڑے ہوئے وجود نے دو بار جھٹکے لیے۔ تب ہی میری پھٹی پھٹی نظروں نے دیکھا کہ گنگل کی ایک ٹانگ اور ایک بازو سے خون جاری ہو گیا تھا۔

"اب بس کر دے۔ میرے ہاتھ کھول۔ نکل چلیں یہاں سے۔" میں نے پھر نادو سے کہا۔

اس نے پستول دور کہیں جھاڑیوں کی طرف اچھال دیا اور اس کے بعد جیسے وہ کسی ٹرانس سے جاگی۔ میری جانب دوڑی اور پھر جلدی جلدی میرے ہاتھوں کے جکڑ بند کھولنے لگی۔

مجھے آزاد کرتے ہی وہ بے اختیار ایک روتی ہوئی سسکاری مار کے مجھ سے لپٹ گئی۔ میں نے بھی اس کے اندر کا غبار و حل جانے دیا لیکن وہ شاید بس آخری ہمت پر ہی تھی اور بے ہوش ہو کر گرنے لگی تو میں نے اسے تھام لیا۔

وہ پھر بے ہوش ہو گئی تھی۔ شاید تھوڑی ہی دیر پہلے مجھے اس نے خطرے کی زد میں پا کر مضطرب ہونے کے باوجود اپنی جرأت مجتمع کی تھی، وہ اب ختم ہو گئی تھی۔

مجھے تشویش ہوئی۔ میں نے آرام سے اسے زمین پر لٹایا اور خود بھی بیٹھ گیا۔ اس کا سر اور چہرہ میں نے اپنی گود میں رکھ کر اس کے زخم کا جائزہ لیا۔

اس کی پیشانی پر کچھ گہرا زخم تھا۔ وہاں سے خون ابھی تک بہہ رہا تھا۔ میں نے سب سے پہلے اپنی شرٹ کا دامن پھاڑ کر اس کی پٹی باندھ دی پھر اس کا چہرہ پونچھا۔ وہ خون میں لت پت ہو رہی تھی۔ نہ جانے کب سے اس بے چاری کا خون پیشانی سے بہہ بہہ کر اس کے کپڑوں کو رنگین کر چکا تھا۔

نادو کی یہ حالت دیکھ کر مجھے یکلخت تفکرات نے آن گھیرا۔ شکر تھا کہ اس کی سانسیں ہموار تھیں۔ خون بہہ جانے کی وجہ سے اس پر نقاہت ضرور طاری تھی تاہم اس نے جو تھوڑی دیر پہلے ہمت دکھائی تھی، میں وہ بھی نہیں بھلا سکتا تھا۔ تب ہی میں نے بھی اپنے حواس بحال کیے اور اس کا سر نہایت آہستگی سے اپنی گود سے ہٹا کے زمین پر رکھا پھر کچھ سوچ کر اٹھا اور موٹر سائیکل کی جانب بڑھا۔ خوش قسمتی سے وہاں سائڈ میں ایک خاکی تھیلا نصب تھا۔ اس کے اندر آئل میں لتھڑے ہوئے کچھ کپڑوں کے علاوہ پانی کی بوتل بھی رکھی ہوئی تھی۔ وہ میں لے آیا اور اس کے چھینٹے میں نے نادو کے چہرے پر مارے اور ساتھ ہی بوتل اس کے ہونٹوں سے لگا دی۔

کچھ پانی اس کے حلق میں اترا تو اس نے کھانستے ہوئے اپنی آنکھیں کھول دیں۔

"پانی پیو اور بیٹھو...." میں نے اسے دوبارہ ہوش میں آتے دیکھ کر کہا۔ اس نے کئی گھونٹ بھرے حتیٰ کہ بوتل خالی ہو گئی۔

"نادو! تم ٹھیک تو ہو نا؟" میں نے بڑے پیار سے پوچھا۔ وہ بے اختیار اس ہیئت کذائی میں مسکرا دی پھر اپنی پٹی بندھی پیشانی پر ہاتھ رکھا اور تھوڑا کراہی۔

"میں نے پٹی باندھ تو دی ہے پر مرہم لگانا ضروری ہے۔" میں نے کہا۔

وہ اٹھ بیٹھی۔ بلاشبہ وہ ایک باہمت لڑکی تھی۔ اس نے موقع کی نزاکت اور سنگینی کو دیکھتے ہوئے خود کو جلد سنبھالنے کی کوشش کی۔ اس نے ایک ذرا اپنی گردن موڑ کر زخمی حالت میں پڑے گنگل اور پھر منیرے کی سر اُدھڑی لاش کی طرف دیکھا اور بے اختیار ایک سسکاری مار کے میرے سینے میں منہ چھپا کے رو پڑی۔

نہ جانے اس نے کس جذبے اور جوش سے آکر یہ سب کر ڈالا تھا اور اب ذرا سکون پاتے ہی جیسے اسے یقین ہی نہ آیا ہو کہ یہ سب اس نے کیا تھا۔

"سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تو اٹھ سکتی ہے نا؟" میں نے پیار سے اس کے سر اور بکھرے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

اس نے اپنا چہرہ میرے سینے سے اٹھایا اور میرے سہارے سے اٹھ کھڑی ہوئی پھر بولی۔

"ہمیں فوراً آگے بڑھنا ہے، سہراب!" اس پر اب جیسے پہلے والی ہمت غالب آ گئی تھی۔ ہم دونوں کھڑے ہو گئے۔ وہ ذرا لڑکھڑائی اور پھر سنبھلی۔

ہمارا اسکوٹر ایک جانب گرا پڑا تھا۔ میں نے وہ سیدھا کیا اور اسے کک ماری۔ دو چار دفعہ کک مارنے کے بعد ہی اس کا انجن اسٹارٹ ہو سکا تھا۔

نادو میرے پیچھے بیٹھ گئی۔ میں نے اسے خود سے لپٹ کر بیٹھنے کی ہدایت کی تھی۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ میری کمر اور پیٹ کے گرد باندھ کر اور اپنا سر میری پشت پر ٹکا دیا تھا۔

میں نے اسکوٹر آگے بڑھا دیا۔

☆☆☆

پیش آمدہ حالات کی کشاکشی کے بعد میرے اعصاب کچھ شل سے ہو رہے تھے۔ دماغ بھی سُن سا ہوتا

محسوس ہوا۔ ہم بلاشبہ ایک کڑے امتحان اور سخت آزمائش سے نکل جانے میں کامیاب ہوئے تھے۔ گنگل اور اس کے ساتھی کے ہتھے چڑھ جانا سب سیدھا موت کے مترادف ہی ہوتا۔ نادو کا وہ جی برادران جو حشر کرتے سو کرتے، خود میں بھی ان ظالموں کے عتاب اور ظلم سے نہیں بچتا پھر نہ جانے فوزیہ اور راحیلہ کا کیا بنتا؟

تاہم میں نے ہمت اور حوصلے کا دامن ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ نادو تو پھر عورت ذات تھی۔ بے شک وہ دیہات کی پروردہ ایک صحت مند لڑکی تھی لیکن پھر بھی اس کی ہمت اور جوش سے میں متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس نے جلد ہی خود کو سنبھال لیا تھا۔ مجھ پر ظاہر ہی نہ ہونے دیا کہ وہ ایک کاری زخم کھائے ہوئے ہے۔ اب بھی وہ مجھ سے باتیں کرتی رہی اور راستوں کے بارے میں بتاتی رہی۔

اسی طرح سفر کرتے ہوئے ہم مین روڈ کے قریب پہنچ گئے۔ شکر تھا کہ اب تک حالات ٹھیک رہے تھے۔ دور سے ہی مین روڈ پر اِکا دُکا آتی جاتی گاڑیوں کی بتیاں نظر آ جاتیں۔

ہم یہاں تھوڑی دیر ٹھہرے تھے۔ گرد و پیش کا جائزہ اور سن گن لیتے رہے۔ اس کے بعد میں مین روڈ کے ساتھ قدرے نشیب میں بنے ناہموار راستے پر اسکوٹر دوڑاتا رہا پھر ایک مقام پر مین روڈ پر اسکوٹر لے آیا۔

دور دور تک سناٹا تھا۔ سڑک پر پہلے سے گزرتی ہوئی چند ایک گاڑیوں کی عقبی سرخ بتیاں دور سے نظر آ رہی تھیں۔ بائیں جانب سے ایک گاڑی کی ہیڈ لائٹس نظر آئیں۔ میں نے ابھی اپنا اسکوٹر سڑک پر نہیں چڑھایا تھا۔ کنارے پر ہی تھا۔ یہاں قدرے ڈھلان تھی اور اس پر خودرو گھاس اگی ہوئی تھی۔ جب تک وہ گاڑی بھی نہیں گزر گئی، ہم اسکوٹر سمیت گھاس کے عقب میں ہی رکے رہے۔

وہ کوئی ٹرک تھا۔ گھڑگھڑاتا ہوا گزرا تو میں نے پھر دائیں بائیں جائزہ لیا اور اسکوٹر سڑک پر چڑھا دیا۔

سڑک پر آتے ہی مجھے ذرا ہی دور کچھ روشنیاں دکھائی دیں۔ نادو نے بتایا کہ وہ چوراہا ہے۔ روڈ سائڈ ہوٹل اور اسی طرف چنگی تھی اور تھانہ بھی تھا۔ یعنی ہم ٹھیک جگہ پر دیہاتی جنگل سے یہاں طلوع ہوئے تھے۔ اس کے بعد میں نے فوراً ہی اسکوٹر دوسری جانب کے کچے کے علاقے میں ڈال دیا۔

ایک بار پھر ہمارا سفر اندرونِ دیہات میں شروع ہو چکا تھا۔ یہ بالکل ایسے ہی راستے تھے جیسے کہ بعض ایڈونچر پسند دنیا کے سفر پر موٹر سائیکلوں پر نکلتے ہیں اور مین روڈ کے بجائے سمندر، دریاؤں اور اندرونی دیہاتوں کا راستہ اپناتے ہیں۔ جنہیں "سائڈ وے روڈ" یا "کوسٹ روڈ" کہا جاتا ہے۔ یہ ایک طرح سے شارٹ کٹ بھی ہوتا ہے اور ویزا وغیرہ کا بھی جھنجھٹ یا ایسا کوئی مسئلہ نہیں ہوتا۔

ہم تو خیر دنیا کے سفر پر نہیں نکلے تھے۔ رات جوبن پر تھی۔ کچھ دیر پہلے آسمان پر چاند اور تارے ٹمٹماتے نظر آتے رہے تھے لیکن اب نہ جانے وہ کہاں ڈوب چکے تھے۔ جلد ہی عقدہ کھلا۔ ایک مخصوص قسم کی فضائی بارانی باس ہمارے نتھنوں سے ٹکرائی جس میں نباتات کی بو بھی شامل تھی۔ کچھ خنکی بھی ہو چلی تھی۔ معاً نادو بولی۔

"میرا خیال ہے بارش کا موسم بن رہا ہے۔" اس کی طبیعت اب کافی سنبھل چکی تھی۔ وہ سیدھی ہو کے بیٹھ گئی۔

خود مجھے بھی یہی لگ رہا تھا۔ میں نے اسکوٹر چلاتے ہوئے آسمان کی طرف دیکھا۔ اچانک ہی نہ جانے کہاں سے کالے بادل گھر آئے تھے۔ انہی نے آسمان اور ٹمٹماتے تاروں کو ڈھانپ لیا تھا۔

"یہاں سے وہ اینٹوں والی بھٹہ بستی کتنی دور ہے؟" میں نے پوچھا۔

"بس، کوئی پندرہ بیس کلو میٹر اور فاصلہ ہوگا۔" اس نے جواب میں کہا۔ "پہلے ایک نہر آئے گی۔ اس کی پلیا پار کرتے ہی بستی کی حدود شروع ہو جائے گی۔"

پندرہ بیس کلو میٹر اگر مین روڈ سے فاصلہ ہوتا تو یہ کچھ زیادہ نہیں کہلاتا۔ آرام سے اور بہ آسانی طے ہو جاتا لیکن کچے کے بل کھاتے تنگ راستوں میں اسکوٹر کی رفتار کم سے زیادہ نہیں کی جا سکتی تھی بلکہ کم ہی کرنی پڑتی۔ اسی لیے یہ پندرہ بیس کلو میٹر کا فاصلہ اس جگہ پر طے کرنا آسان نہ تھا۔

اچانک بادلوں کی گڑگڑاہٹ ابھری اور ساتھ ہی اس زور سے کڑاکے سے بجلی چمکی کہ ایک لمحے کو میں بھی دہل گیا۔ موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ ایک مقام پر میں نے اسکوٹر روک دی۔

"بیڑا غرق ہو گیا۔" نادو جھلا کر بولی۔ "کچی زمین پر کیچ (کیچڑ) بن جائے گا اور ہم کیسے آگے بڑھ سکیں گے؟"

ہم بارش میں بھیگنے لگے۔ کافی موٹے موٹے قطرے گر رہے تھے۔ یہاں کھلے جنگلی علاقے میں بجلی گرنے کا بھی خطرہ ہوتا ہے۔ مجھے بھی یہی ڈر لگا ہوا تھا۔ جب بھی آسمانی بجلی کڑکتی، میں دہل سا جاتا۔ گھٹا ٹوپ اندھیرا چاروں طرف پھیل چکا تھا۔ اس پر شراٹے دار بارش کا شور بہت ہی ہیبت ناک منظر پیش کر رہا تھا۔

فضا میں ناتانی نہ بھینچ گئی۔ اس میں بارش کے پانی کی تصویر اس بھی رچی بسی ہوئی تھی۔ میں نے دانستہ کسی درخت کے نیچے پناہ نہیں لی تھی کیونکہ درختوں پر ہی سب سے پہلے بجلی گرنے کا خطرہ ہوتا ہے۔

نادو کے زخم کی پٹی بھی بارش کے پانی میں گیلی ہوئی جا رہی تھی۔ مجھے فکر ہوئی کہیں زخم پھر نہ کھل جائے مگر نادو نے اس پر اپنی چنری باندھ دی تھی۔ شکر تھا کہ جریان خون دوبارہ نہیں ہوا۔

اسکوٹر میں نے راستے پر ہی دو درمیانی جھاڑیوں کے قریب روک دیا تھا۔ میں اور نادو اسکوٹر سے نیچے اتر آئے۔ اسکوٹر کو میں نے سائڈ اسٹینڈ پر لگا دیا تھا۔ ہم وہیں کھڑے بارش میں بھیگنے لگے۔ شکر تھا کہ سردیوں کا موسم نہیں تھا ورنہ تو اس طرح بھیگنے سے ٹھٹھر کر مر ہی جاتے۔

تاہم گرمیوں میں بھی مسلسل پانی پڑنے اور فضا مرطوب رہنے سے بھی گرمی میں سردی کا احساس ہونے لگتا ہے۔ اس وقت ہم کچھ ایسی ہی صورت حال کی زد میں تھے۔

یوں ہم دونوں دم سادھے بت کی طرح کھڑے بارش میں بھیگتے اور بارش رکنے کا انتظار کرتے رہے لیکن بارش بجائے تھمنے کے، کبھی کم ہونے لگتی تو کبھی زیادہ شروع ہو جاتی۔

جب مزید پندرہ بیس منٹ اور بیت چلے اور بارش کم زیادہ ہوتی رہی تو میں نے ہی نادو سے کہا۔

"کیا خیال ہے، ہم ابھی مین روڈ سے زیادہ دور نہیں آئے ہیں۔ چلیں سڑک سفر کے لیے ٹھیک نہیں رہے گی؟"

نادو نے فوراً جواب نہیں دیا۔ وہ کچھ سوچتی رہی۔

میں نے پھر کہا۔ "بارش میں ہر کسی نے کھوکھا اوٹ لے رکھی ہوگی۔ ہم آگے نکل جائیں گے۔"

"بات تو تیری ٹھیک ہے پر آگے جا کر ہمیں دوبارہ کچے میں اترنا ہی پڑے گا۔ باقی کا راستہ سارا کچے والا ہوگا۔"

"تو فاصلہ تو کم ہو جائے گا نا۔ پہنچ ہی جائیں گے گرتے پڑتے اپنی منزل پر۔" میں نے کہا۔ میرے لہجے میں جھلاہٹ تھی۔

نادو نے میری اس تجویز پر کوئی صاد نہیں کیا۔ میں بھی چند لمحے کے لیے خاموش رہا۔ تب ہی اچانک بارش اس بار کم ہوئی تو اس نے دوبارہ زور نہیں پکڑا۔ اب ہلکی بوندا باندی ہونے لگی تھی۔ میں نے نادو سے کہا۔

"آگے چلیں اب؟"

نادو نے میری طرح سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا۔ وہ اب صاف ہو چلا تھا۔ کہیں کہیں بادلوں کے ٹکڑے تیرتے دکھائی دیتے تاہم ان کا اجتماع ختم ہو چکا تھا اور اب تارے بھی نظر آنے لگے تھے۔ دور کہیں ٹھٹھکے ہوئے چاند کی روشنی بھی ماحول میں رچنے لگی تھی۔

دھواں دھار بارش کے شور و شغب کے بعد ایک دم طاری ہونے والا سناٹا کانوں کو کھٹکا دینے والا محسوس ہوا۔ نادو بولی۔

"چل بسم اللہ کر ..... پر ذرا دھیان رکھنا، کچی پگڈنڈی گیلی ہے۔ اسکوٹر سلپ نہ ہو جائے۔"

"اللہ مالک ہے، آؤ۔" میں نے کہا اور اسکوٹر کو کک مار کے اسٹارٹ کر دیا۔ وہ میرے پیچھے بیٹھ گئی۔ میں نے اسکوٹر آگے بڑھا دیا۔ ہیڈ لائٹ روشن کر دی۔ شکر تھا کہ بارش میں بھیگنے کے باوصف وہ جلد ہی اسٹارٹ ہو گیا تھا۔

اسکوٹر کی ہیڈ لائٹ کی مردنی سی روشنی میں مجھے کچا راستہ کیچڑ زدہ سا نظر آنے لگا۔ کافی جگہ پانی بھی کھڑا تھا۔ اس کے اندر سے بہ مشکل میں نے اسکوٹر نکالا۔ کئی بار تو گرتے گرتے بھی بچے مگر شکر رہا کہ آگے بڑھتے ہی رہے۔ ایسے میں رفتار مزید کم ہو گئی تھی اور اسکوٹر کے ہینڈل کو زور سے تھامے اور اسے سنبھالے رہنے کے سبب میرے دونوں بازوؤں میں درد بھی ہونے لگا تھا۔ گویا اب تھکن طاری ہونے لگی لیکن میں نے آہستہ ہی سہی، سفر نہیں توڑا۔ اسے جاری ہی رہنے دیا۔

ایک مقام پر راستہ گھوم رہا تھا۔ آگے کھیت تھے۔ اس کے پار دور کہیں چاند تاروں کی روشنی میں بے ترتیب گھروں کے ہیولے سے نظر آنے لگے۔

میں نے قدرے خوشی سے پوچھا۔ "کیا ہم منزل پر پہنچ چکے ہیں؟ سامنے کھیت اور گھر تو نظر آرہے ہیں۔"

"نہیں، اسے پار کر کے آگے جانا ہے۔ ابھی نہر بھی کہاں آئی ہے؟" نادو نے کہا اور میری خوشی پر جیسے اوس پڑ گئی۔ اب تو میرا دماغ بھی تھکنے لگا تھا اور اعصاب شل ہو رہے تھے۔ مجھے تھوڑا آرام کرنا چاہیے تھا مگر ایسا نہیں کیا جس کی سزا ہمیں جلد ہی بھگتنا پڑ گئی کیونکہ جیسے ہی ہم نے ایک مقام پر موڑ کاٹا، اسکوٹر کا اگلا ٹائر سلپ ہوا۔ اس بار میں گرنے سے اسکوٹر کو نہ بچا سکا۔ ہم دونوں ہی اسکوٹر سمیت کیچڑ اور پانی میں چھپاکے سے گرے۔ اسکوٹر کا انجن "گھوں، گھوں" کرتا ہوا بند ہو گیا۔ نادو کے حلق سے چیخ خارج ہو گئی۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر ہی گرے تھے۔

میں نے جلدی سے اٹھ کر نادو کو سنبھالا۔ میری طرح وہ بے چاری بھی پانی اور کیچڑ سے لت پت ہو چکی تھی۔ اس کے صحت مند جسم پر گیلے کپڑے چپکے ہوئے تھے۔ چنری بھی کہیں کہیں سے شکستہ اور پھٹ گئی تھی۔ اس پر مستزاد اب کیچڑ سے بھی بھر گئی۔ یہی حالت میری بھی تھی۔

اکناف میں گہرا سکوت طاری تھا لیکن اس میں اب جھینگروں اور برساتی مینڈکوں کی آوازیں آنے لگی تھیں۔

"چوٹ تو نہیں آئی تجھے؟" میں نے اسے سنبھالتے ہوئے پوچھا۔ مجھے اس کے پیشانی کے زخم کی فکر ہوئی۔

"چوٹ کو گولی مار۔ اسکوٹر دیکھ۔ کہیں جواب تو نہیں دے گیا۔ ابھی بہت آگے جانا ہے ہمیں۔" وہ اپنی پٹی پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔ اس پر بھی جھلاہٹ طاری تھی۔

میں اسے چھوڑ کر اسکوٹر کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ ایک طرف کو گرا پڑا تھا۔ میں نے اسے اٹھا کر سیدھا کیا۔ ٹائروں پر کرتے ہی میں نے اسے کک ماری۔ دو چار کک لگانے پڑے تب ہی وہ اسٹارٹ ہوا۔

"یہ تو اسٹارٹ ہو گیا، اب ہمارے کپڑے ..... ان کا تو خانہ خراب ہو گیا۔" میں نے نادو کی طرف دیکھ کر کہا۔

"بھاڑ میں جائیں کپڑے ..... اگے ٹر (آگے چل)۔" اس نے کہا۔ یوں بھی یہ اچھا ہی تھا۔ میرے اور نادو کے خون میں لتھڑے کپڑے اب دھل گئے تھے۔

بہرکیف، میں اسکوٹر پر سوار ہو گیا۔ وہ میرے پیچھے بیٹھ گئی۔ میں نے پھر اسکوٹر آگے بڑھا دیا۔ اسی مشقت سے اسکوٹر چلاتے ہوئے بالآخر ہم ایک نہر کے قریب آگئے۔

شکر تھا کہ اس عرصے میں محافظ یا آوارہ جنگلی کتے ہمارے دوارے نہیں آئے کیونکہ نادو کے پاس بھی اب سوٹی نہیں رہی تھی۔ وہ کہیں گر گئی تھی۔

اب میں نادو کے کہنے کے مطابق اسکوٹر نہر کے متوازی چلانے لگا۔ ریتیلے کراڑے پر تاروں کی ملگجی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ دفعتاً وہیں ہمیں چند کتوں کے سائے نظر آئے۔ یہ ایسے منظر میں مجھے بڑے ہولناک محسوس ہوئے۔ ہمیں دیکھتے ہی انہوں نے بھونکنا شروع کر دیا اور تیزی سے کراڑے کی ڈھلان سے نیچے دوڑتے ہوئے ہمارے تعاقب میں آنے لگے۔

"ستیاناس جائے ان مردودوں کا۔" پیچھے بیٹھی نادو نے حسب عادت انہیں کوسنے دیے۔

"تیرے پاس تو سوٹی بھی نہیں اور راستہ بھی ایسا نہیں کہ میں اسکوٹر دوڑا سکوں۔ یہ کمبخت ہمیں آن لیں گے۔"

میری آواز میں واضح طور پر کپکپاہٹ تھی۔ نادو کو جانے کیوں ایسے خطرناک موقع پر ہنسی آگئی۔

"یار! تو بڑا ڈرتا ہے کتوں سے۔"

"تو اور کیا۔ تو نہیں جانتی ان کے دانتوں میں کس قدر مہلک زہر ہوتا ہے۔ کاٹ لیں تو انسان بھونکنے لگتا ہے اور پانی سے ڈرتا ہے۔ بڑی کسمپرسی میں انسان دم توڑ دیتا ہے۔"

"ہاں، معلوم ہے۔ کتے کے کاٹے ہوئے ایسے انسان کو ہڑک اٹھا بولتے ہیں جس میں وہ انسان کتے کی طرح صرف بھونکتا ہی نہیں ہے بلکہ کاٹنے کو بھی دوڑتا ہے۔" نادو نے کہا۔

اس وقت اس کی معلومات پر واہ واہ کر اٹھنے کا میرا بالکل بھی موڈ نہیں ہوا۔ کتے بھونکتے ہوئے نہر کے کراڑے سے نیچے کیچڑ زدہ راستے پر آگئے۔ ایسے راستے پر میں اسکوٹر زیادہ تیز نہیں دوڑا سکتا تھا۔ گرنے کا احتمال ہوتا۔

"کیا کروں؟" میں چیخا۔

"روک دے اسکوٹر۔ میں دیکھتی ہوں ان ناس پٹوں کو۔" نادو نے بالآخر دانت پیس کر کہا۔ میں نے اس کے کہنے پر اسکوٹر روک دیا۔ کتے خوفناک انداز میں بھونکتے ہوئے ہمارے قریب ہی پہنچ چکے تھے۔

نادو جلدی سے اتری اور انہیں مخصوص انداز میں ہشکارے دینے لگی۔ میں اسکوٹر سائڈ اسٹینڈ پر کیے کھڑا تھا۔ وہ کتوں میں گھر چکی تھی۔

وہ کوئی پانچ چھ کتے تھے اور اس وقت مجھے دنیا کی بھیانک ترین اور عجیب مخلوق کی طرح ہی نظر آرہے تھے۔ ان میں دبلے اور موٹے کتے بھی تھے۔ نادو کو زخمی ہونے کے باوجود ان میں گھرا دیکھ کر میری مردانہ غیرت جوش مارنے لگی۔ تاہم میں اس لیے خاموش تھا کہ شاید نادو کو ان کتوں سے نبرد آزما ہوئے بغیر انہیں مخصوص انداز میں ہشکارے دے کر بھگانے کا کوئی طریقہ آتا ہو۔

بے شک نادو دیہات کی پروان چڑھی عورت تھی اور اسے شاید اس خطرناک صورت حال سے نمٹنے کا تجربہ بھی ہو لیکن باوصف اس کے میرا دل نہیں کیا کہ اسے ان کتوں کے رحم و کرم پر چھوڑ رکھوں۔ وہ کسی بھی وقت اسے کاٹ سکتے تھے اور اس پر چڑھ دوڑنے والے تھے کیونکہ وہ بڑے خونخوار ہو رہے تھے۔ ہشکارے انہیں مزید بھڑکا رہے تھے۔

پھر یہی وہ وقت تھا جب ایک کتے نے نادو پر جست بھری اور پہلی بار میں نے اس نڈر لڑکی کے حلق سے وحشت بھری چیخ ابھرتے محسوس کی۔ میرے اندر کا نڈر، جنگجو اور

جوش فیڈ سے بھرپور انسان جاگا۔ اب میں تماشائی نہیں رہ سکتا تھا۔ نادو کے ہتھیار سے اور "ترک" ان خونخوار اور جنگلی کتوں کے آگے کام نہ آ سکی تھی۔
میں نے وہیں سے جست لگائی اور ساتھ ہی ایک ایسی زوردار چیخ ماری کہ وہ جگر سے بدک کے پیچھے ہٹ گئے۔ نادو پر چڑھائی کرنے والے کتے نے ابھی اسے کاٹا نہیں تھا کہ میں نے قریب پہنچ کر اسے جھپٹ لیا۔ نہ جانے اس وقت میرے اندر یہ کیسا جوش جاگا تھا کہ میں خود کو بھی ایک خونخوار درندہ ہی محسوس کرنے لگا۔
یہ شاید میرے جیسے انسان کے خوف و ہراس کی وہ آخری حد ہوتی ہے جب وہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ بقا اب صرف جنگ بازی میں ہی ممکن ہے۔
یہی وجہ تھی کہ میں نے بلاخوف اس چڑھائی کرنے والے کتے کے جسم کو دبوچا تو اس کی پچھلی ٹانگیں میرے دونوں ہاتھوں میں آگئیں۔ میں نے اسے نادو پر سے کھینچا اور فضا میں دو تین بار گھمیریاں دے کر اس کے ساتھیوں پر اسے پٹخنے کے انداز میں پھینکا۔
اس کتے کے حلق سے "کوں، کوں" کی آواز برآمد ہونے لگی۔۔۔ وہ۔۔۔ میں لہراتا ہوا اپنے ساتھیوں کے جھنڈ کے درمیان جا گرا۔ اس کے ساتھی پیچھے ہٹ گئے۔ میں نے نادو کو دیکھا۔ وہ ٹھیک تھی۔ گری ہوئی تھی اور اب اٹھنے کی کوشش کر رہی تھی۔
میرے اندر آندھیاں سی چلنے لگی تھیں۔ جوش فیڈ میرے رگ و پے میں لاوے کے مانند ابلنے لگا۔
باقی کتوں نے میرے ہاتھوں اپنے ساتھی کا یہ مقدور بھر حشر دیکھا اور بس ذرا ہی دیر کے لیے پیچھے ہٹے تھے لیکن اب ان کا ٹارگٹ میں بن چکا تھا۔ وہ پھر خونخوار انداز میں بھونکتے ہوئے میری جانب لپکے۔ میں تب تک اپنی پتلون کی بیلٹ کھینچ کر نکال چکا تھا اور لوہے کے بکل والا حصہ چھوڑ کر اسے آخری حصے سے ایک ہاتھ میں پکڑ لیا اور پیچھے ہٹنے کے بجائے جس طرح یہ سب میری جانب لپکے تھے، میں بھی اسی طرح جنگجویانہ انداز میں بیلٹ فضا میں لہراتا ہوا ان کی جانب لپکا۔
میری اس جی داری نے کتوں کے اس جتھے پر خوف طاری کر دیا مگر وہ پیچھے تو نہیں ہٹے البتہ رک ضرور گئے تھے مگر میں اب "فلیش" پر آمادہ نہیں تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر سب سے آگے والے کتے کے موٹے تھوتھنے پر بیلٹ کے فولادی بکل کی ضرب رسید کر ڈالی جو میرے اس جوش فیڈ کے اس قدر زوردار ثابت ہوئی کہ مجھے کتے کے جبڑے ٹوٹنے کی آواز صاف سنائی دی۔ وہ کوں، کوں کرتا ہوا پیچھے بھاگ کھڑا ہوا اور اس کے ساتھی بھی پیچھے ہٹ گئے۔ میں پھر ان کی جانب دوڑا۔ وہ پلٹ کر بھاگے۔ میں نے تب تک ایک بھاگتا ہوا اور ایک دو کی کمر پر گھما کر بیلٹ کا بکل رسید کیا۔ وہ دم دبا کر چیختے ہوئے واپس کراڑے کی جانب دوڑ پڑے۔
وہ پسپا ہو چکے تھے۔ اب کراڑے کی بلندی پر مخلوق کی طرح کھڑے بھونکتے رہے پھر ادھر ادھر ہو گئے۔
میں ہانپتا ہوا واپس نادو کی طرف آیا تو وہ اپنی گردن اٹھا کر مجھے پھٹی پھٹی آنکھوں سے تکے جا رہی تھی۔ اس کا شاداب چہرہ اور کجراری کشادہ آنکھوں میں عجیب و غریب تاثرات لیے جذبات جیسے منجمد ہو گئے تھے۔ اس کی چنری بھی کہیں جا پڑی تھی۔ میں خاموشی سے اپنی بیلٹ کو واپس پتلون میں ڈالنے لگا۔
تب ہی وہ جانے کس جذبے تلے یک دم آگے بڑھی اور مجھ سے دیوانہ وار لپٹ گئی۔ ہم دونوں کیچڑ اور پانی میں لت پت تھے ہی جس کے سبب بدن بھی دونوں کے گیلے اور پھسلواں ہو رہے تھے۔ میرا توانا جسم اس وقت پہلے ہی جوش تلے تپ رہا تھا۔ ایسے میں نادو کے شباب پرور وجود کی شبنمی ٹھنڈک جیسے نرم پھوار بن کر مجھ میں جذب ہونے لگی۔
کیچڑ، بارش والے مخصوص بو کے پانی کی باس اور جسموں کی مہک، جس نے چند لمحوں کے لیے مجھے حیوانیت پر تو اکسایا اور لگا جیسے میں ہوش و حواس سے بیگانہ ہو جاؤں گا اور۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔ جیسے میں بھی نادو جیسی بے اختیاری میں بہہ جاؤں گا لیکن فوراً ہی مجھ پر اصل مردانگی غالب آ گئی۔
میں نے بہت دھیرے سے اسے خود سے الگ کیا اور ہولے سے بولا۔
"کیا ہو گیا ہے تجھے؟ سنبھال خود کو۔" وہ رو پڑی لیکن پھر فوراً ہی ہنس کر بولی۔
"مجھے وہی ہوا جو ابھی تھوڑی دیر پہلے تجھے ہو گیا تھا۔ مجھے ابھی تک یقین نہیں آ رہا ہے کہ تو اس قدر جوش میں آ جائے گا۔ کہاں تو، تو کتوں سے اس قدر ڈر رہا تھا۔"
"ہاں۔" میں بھی تھوڑا ہنس کر بولا۔ "لیکن جب میں نے تجھ پر ایک کتے کو چڑھائی کرتے دیکھا تو مجھ سے نہ رہا گیا۔ میری غیرت لاوے کی طرح ابل پڑی تھی۔" پھر ایک ذرا تھم کر اسے بڑی محبت سے یاد دلایا۔ "بھول گئی تو۔۔۔ ٹکل اور منیرے کا بھی تو تو نے زخمی ہونے کے باوجود ایسا ہی حشر کیا تھا۔"

"ہاں، اس وقت تو بھی تو اس مردود کے پستول کی زد پر تھا۔" نادو بھی مسکرا کر بولی۔ "سچی بات کہوں۔ یہ کتے واقعی بہت خطرناک ہوتے ہیں۔ ہم بھی ان سے ڈرتے ہی ہیں مگر جان پر بن جائے تو مقابلہ کرنا ہی پڑتا ہے۔ جب میں نے تجھے دیکھا کہ تو ان سے ڈر کے میدان چھوڑ بیٹھا ہے تو میرے اندر کی عورت کو ایک جھٹکا لگا۔ میں نے پل بھر کے لیے سوچا کہ یہ کیسا مرد ہے میرے ساتھ۔۔۔۔ اب مجھے ہی کچھ کرنا پڑے گا۔ خواہ میری جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔ اسی لیے اندر سے میں بھی ڈری ہوئی تھی مگر خود کو میں نے تن بہ تقدیر کر دیا تھا۔ پر جب ایک کتے نے مجھ پر چھلانگ لگا دی تو میں بھی خوفزدہ ہو گئی۔ میرے منہ سے چیخ نکل گئی کہ اب کون مجھے اس موذی جانور سے بچانے آئے گا۔ تب ہی تو نے شیر بن کے ان پر چڑھائی کر ڈالی۔ تیری اس بہادری نے مجھے بے اختیار کر دیا، نوجوانا۔۔۔۔ بس عورت مرد کی ایک اسی شے پر ہی تو مرتی ہے جب وہ اپنی جان کی پروا بھی نہیں کرتا اور اپنی ساتھی عورت کو بچانے کو دوڑ پڑتا ہے۔"
وہ اپنی رو میں کہے جا رہی تھی۔ میں خاموشی سے سنے جا رہا تھا۔ بارش زدہ ماحول، خنک رات، قرب و جوار میں اسرار بھرا سناٹا، اوپر نہر کے ریتیلے کراڑے پر بھیگی بھیگی چاندنی سے فضا پر عجیب طلسم سا بکھرنے لگا۔
"چلیں اب؟" میں نے ہولے سے اس سے پوچھا۔
اس نے بھی ایک گہری ہنکاری لی اور اسی لہجے میں بولی۔ "چلو۔"
میں نے اسکوٹر اسٹارٹ کیا۔ اس پر سوار ہوا۔ وہ بھی بیٹھ گئی۔ ایک بار پھر ہمارا سفر نہر کے متوازی شروع ہو گیا۔ جلد ہی وہ پلیا ہماری نظر میں آ گئی جس پر سے ہم نے نہر پار کر کے دوسری جانب جانا تھا۔
پلیا پار کرتے ہی دوسری جانب میدان سا نظر آنے لگا۔ ہلکی آسمانی روشنی میں وہ دور تک بنجر سا دکھائی دیتا تھا۔ کہیں کہیں خودرو جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں لیکن یہاں بھی بارش کے پانی کی وجہ سے زمین پھسلواں تھی۔
میں بہت احتیاط سے اسکوٹر دوڑاتا رہا۔ شکر تھا پھر کتوں سے واسطہ نہیں پڑا۔
تھوڑا آگے نکلے تو اندازہ ہوا کہ یہ ایک نیم صحرائی سا خشک علاقہ تھا جہاں کچھ کچھ فاصلے پر چمنیاں نظر آ رہی تھیں۔ یہ اینٹوں کے بھٹوں کی چمنیاں تھیں۔ چند گھر بھی دکھائی دے رہے تھے۔ ایک جانب کھیتوں کا سلسلہ بھی نظر آ رہا تھا۔ اس طرف بھی کچھ درخت بھی دکھائی دیے۔
میں نے نادو کے کہنے پر اسکوٹر ایک جگہ روک دیا۔ اس کا انجن بند کر کے میں نیچے اتر آیا۔ نادو پہلے ہی اتر کر کھڑی ہو چکی تھی اور گرد و پیش کو تکے جا رہی تھی۔
"میرا خیال ہے ہم اینٹوں والی بستی پہنچ چکے ہیں۔" میں نے کہا۔
"ہم۔۔۔۔" اس کے لبوں سے گومگو انداز میں برآمد ہوا۔ یوں جیسے وہ کچھ سوچ رہی ہو۔ میرا خیال تھا کہ یہاں بھی اس کا کوئی جاننے والا یا والی ہو گی مگر یہ ضروری بھی نہیں تھا۔ پھر بھی میں نے کسی خیال کے تحت اس سے پوچھا۔
"تو یہاں پہلے بھی آ چکی ہے؟"
"نہیں۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "نام ضرور سن رکھا ہے۔"
"شاید یہاں بھٹے زیادہ ہیں اسی لیے اس کا نام اینٹوں والی بستی پڑ گیا ہے۔" میں نے کہا۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔
"کیا سوچ رہی ہے؟" میں نے بالآخر پوچھ لیا۔
"میں سوچ رہی ہوں یہ تو مزدوروں کی بستی لگتی ہے۔" اس نے جواب میں کہا۔ "بھلا یہاں ایسے کون لوگ رہتے ہیں جس کے بتے اس موئے گورکن مرادے نے نور پر کو چڑھا دیا ہوگا؟"
"ہو سکتا ہے کوئی خطرناک گروہ یہاں رہتا ہو۔" میں نے خیال ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ "جرائم پیشہ لوگ بھلا کہاں نہیں ہوتے۔"
"اسی بات کا تو رولا ہے۔ کیسے پتا چلایا جائے؟" کہتے ہوئے وہ اپنی پیشانی مسلنے لگی۔ "کاش وہ مردودا گورکن پوری بات بتانے کے بعد ہی مرتا۔"
میں نے کہا۔ "اصل مسئلہ ہی یہی ہے۔ اب یہاں آ تو گئے ہیں، پتا کیسے کیا جائے؟" میں خود پریشان ہونے لگا تھا۔
نادو بولی۔ "بجلی کے بارے میں تو کوئی نہ کوئی جانتا ہی ہوگا۔ یہ نام مجھے بڑا خاص ہی لگتا ہے پر اس کے بارے میں پوچھنا بھی بڑی رازداری سے ہی پڑے گا۔"
"ہاں یہی ایک حل ہے ہمارے پاس۔"
"تب پھر ہمیں صبح ہونے کا انتظار کرنا پڑے گا اور رات بسر کرنا پڑے گی ادھر ہی کہیں۔" وہ کہتے ہوئے ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ "اس طرف آ ذرا۔" اس نے ایک جانب اشارہ کیا۔
میں اسکوٹر کو ہینڈل سے پکڑ کر کھینچنے لگا۔ نادو پیدل

اس کی ہیئت کذائی بظاہر قابلِ رحم نظر آتی تھی۔ یوں تو وہ کسی بھینسے کی طرح پلا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے میلا چیکٹ سا لمبا کرتا اور نیچے دھوتی باندھی ہوئی تھی۔ ایک ہاتھ اس کا غائب نظر آرہا تھا اور اس کی جگہ خالی آستین جھول رہی تھی۔ دایاں پاؤں بھی مڑا ہوا تھا۔ سر گنجا تھا، چہرہ گول اور سپاٹ سا تھا۔ بدن پورا کالا تھا۔ بڑی بڑی آنکھوں میں وحشتیں ہلکورے لے رہی تھیں۔ اس کے گلے میں رنگین منکوں کی مالائیں تھیں۔ ایک کان میں مندرا تھا۔ سر پر ملنگوں والی رنگین ٹوپی نظر آرہی تھی۔ گود میں بڑا سا کشکول دھرا پڑا تھا۔ عمر میں کوئی پچاس پچپن کا ہوگا۔

اس کی تین پہیوں والی ہاتھ گاڑی کو ایک جوان لڑکی تھامے کھڑی تھی۔ اس کی بھی حالت کسمپرسی اور غربت کی تفسیر پیش کررہی تھی۔

بوسیدہ تھیلے میں بچا کھچا کھانا ڈالنے کے بعد مولوی عبدالرحمان اپنی قمیص کی جیب سے ایک روپے کا نوٹ بھی جوان لڑکی کو تھمانے لگا تو اچانک قریب سے گزرتے ایک جوان مرد نے دور ہی سے ہانک لگائی۔ مخاطب مولوی صاحب ہی تھے۔

"ارے مولوی صاحب! یہ بدبخت تو پیشہ ور گداگر ہیں۔ یہ کب خیرات کے مستحق ہیں؟ دفع کرو انہیں۔"

ریڑھے پر بیٹھے اور اس نوجوان لڑکی پر تو اس "لعن" کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ یوں جیسے وہ ڈھیٹ ہوچکے ہوں۔ البتہ مولوی صاحب مسکرا کر اس راہ گیر سے بولے۔

"بھائی! کون مستحق ہے، کون نہیں؟ یہ تو اللہ ہی جانتا ہے مگر وہ سب کو دیتا ہے۔ کوئی مستحق ہو یا نہ ہو۔ بس، یہ سب آزمائش ہے۔"

وہ آدمی سر دھنتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ اسی وقت بگلی نامی اس بابے فقیر کی نگاہ ہم پر پڑی لیکن نہیں...... وہ بغور نادو کو تکے جارہا تھا۔ مجھے اس کی بڑی بڑی ابلی ہوئی آنکھوں کی وحشت ایک ذرا سوا ہوتی محسوس ہوئی۔

"ہے بی بی! اللہ کے نام پر تو بھی کچھ دے دے غریب بابے کو، اللہ تیرا بھلا کرے گا۔"

اس نے وہیں سے ہانک لگادی۔ نادو اندر ہوگئی اور مجھے بھی اپنی طرف کھینچ لیا۔

"کیا یہی وہ بگلی تو نہیں جس کے بارے میں اس موئے گورکن نے ہمیں بتایا تھا؟"

"پتا نہیں، یا شاید یہی ہو۔" میں الجھ سا گیا۔

"یہی ہوگا۔ میرا دل کہتا ہے وہ بدبخت یہی ہوگا جس کے قبضے میں ناہنجار گورکن نے چند ٹکوں کی خاطر نوزائیدہ کو دیا ہوگا۔"

"لل...... لیکن وہ تو کہہ رہا تھا کہ بگلی ایک عفریت ہے، ایک بلا ہے؟"

"تو بھی بھولا جیالی ہے (تو بھی سادہ لوح ہی ہے)۔ ایسے لوگ ایک بلا ایک عفریت ہی تو ہوتے ہیں۔ دیکھا نہیں اس کی صورت۔ یہ فقیر کم اور بدمعاش زیادہ نظر آرہا ہے۔ کیسے مجھے دور سے ہی تاڑنے والی نظروں سے گھور رہا تھا۔"

"وہ تو میں بھی سمجھ رہا ہوں کہ گورکن نے یہ مثال کے طور پر کہا ہوگا مگر......" میں کچھ کہتے کہتے رک گیا تو نادو مجھے جلدی سے بازو پکڑ کے اندر کھینچ لائی۔

"سن میری بات غور سے۔" وہ اندر کوٹھری میں آکر مجھ سے رازدارانہ لہجے میں بولی۔ اس کا حسین چہرہ ایک عجیب سے جوش تلے مزید سرخ اور عجیب بہار دکھانے لگا۔

"اب یہاں سے نکلنے کی کر اور خبردار مولوی صاحب کو کچھ مت بتانا۔ اس جگہ پر تو ہم مولوی صاحب سے بھی جھوٹ نہیں بول سکتے۔ ہمیں خاموشی سے اس موئے فقیر کا پیچھا کرنا پڑے گا۔ مجھے یقین ہے بگلی یہی ہے جس کا ذکر گورکن نے کیا تھا۔ یہ کوئی اتنا وڈا شہر یا دیہات نہیں ہے۔ ایک چھوٹی سی بھٹہ مزدوروں کی بستی ہے۔ اسی لیے یہی بگلی ہمارا شکار ہوگا۔"

"مجھے تیری بات سے پورا اتفاق ہے۔" میں نے بھی مضبوط لہجے اور جوش سے کہا۔

اتنے میں مولوی صاحب آگئے اور ہم ان سے اجازت لے کر مسجد سے باہر آگئے۔ ان کا ہم تہ دل سے شکریہ ادا کرنا نہیں بھولے تھے۔

ہمارا اسکوٹر مسجد کی دیوار سے لگا کھڑا تھا۔ پیٹرول اس میں تھوڑا ہی باقی بچا تھا۔ مولوی صاحب نے بتادیا تھا کہ ادھر ایک موٹر مکینک کی دکان ایسی ہے جہاں ہمیں پیٹرول تھوڑا مہنگا سہی مگر مل جائے گا لیکن ابھی ہمارے پاس وقت نہیں تھا۔ جتنا پیٹرول تھا اسکوٹر میں اسی سے کام چلا رہے تھے۔

معاشرتی ناسوروں اور درندوں کی خوں ریز سازشوں اور زخم زخم ہونے والے ایک جنگ باز کی دلدوز داستان کے مزید واقعات اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں

حضرت صالحؑ نے دیکھا کہ ان کی قوم کے لوگ ان کی باتیں بے توجہی سے سن رہے تھے۔
ان کی قوم کے ایک شخص نے پوچھا۔ "کیا تم واقعی پیغمبر ہو؟ حالانکہ تم میں پیغمبری کی کوئی علامت نظر نہیں آتی۔"
حضرت صالحؑ نے پوچھا۔ "تم کس علامت کی بات کر رہے ہو؟ مجھے بتاؤ۔"
وہ لوگ ذرا ہٹ کے آپس میں مشورہ کرنے لگے کہ ان سے کس قسم کا معجزہ طلب کیا جائے کہ یہ اسے دکھانے سے

اصحاب الرس (کنویں والے)

ضیاء تسنیم بلگرامی

دلچسپ واقعات جنہیں تلاش و جستجو کے بعد حاصل کر کے ایک جگہ جمع کردیا گیا۔ تاریخ کے عبرت اثر پہلوؤں کا ایک گوشہ جس کی آج بھی ضرورت ہے اور کل بھی ضرورت رہے گی۔ یہ سمجھنا بہت ضروری ہے کہ پچھلی قومیں کیوں تباہ و برباد کردی گئیں۔ وہ سارے عوامل اور فساد آج زیادہ شدت سے کارفرما نظر آتے ہیں جو دنیا کو بالآخر برباد کردیتے ہیں۔ اخلاقی اور مادی برائیاں، عدل و انصاف سے صرف نظر، ظلم و زیادتی کا فروغ، تباہی اور بربادی کے اسباب موجود ہیں۔ اللہ ہم سب پر رحم فرمائے۔

ناممکن ہی اور ان کا ان سے پیچھا چھوٹ جائے اور پھر یہ لوگ صلاح مشورہ کر کے حضرت صالحؑ کے پاس گئے اور کہا۔ "تم اپنے رب سے کہو کہ وہ اس پتھر کے پیچھے سے ایک اونٹنی پیدا کرے اور وہ اسی وقت ایک بچہ پیدا کرے اور یہ بچہ اونٹنی کا دودھ پینے لگے۔"

حضرت صالحؑ نے اس پتھر کی طرف دیکھا۔ یہ پتھر نہیں ایک چٹان تھی۔

وہ دل میں اپنے رب سے گڑگڑا رہے تھے۔ "اے میرے رب! میری قوم مجھ سے ایک عجیب معجزے کا مطالبہ کر رہی ہے۔ مجھ میں اتنی قدرت کہاں کہ چٹان کے پیچھے سے اونٹنی پیدا کر دوں اور یہ اونٹنی اسی وقت ایک بچہ دے اور بچہ اونٹنی کا دودھ پینے لگے۔"

اس التجا کے جواب میں حضرت جبرائیلؑ نے ان سے کہا۔ "اے صالحؑ! اللہ چھپی ہوئی باتوں سے آگاہ ہے۔ آپ کی قوم آپ سے جس معجزے کا مطالبہ کر رہی ہے، اللہ اس سے آگاہ ہے۔ ان کے اس مطالبے میں اللہ کی مشیت کام کر رہی ہے۔ اپنی قوم سے کہیں کہ یہ اس چٹان کو ہٹا دیں کیونکہ اس کے پیچھے ایک اونٹنی موجود ہے۔"

حضرت صالحؑ نے اپنی قوم سے کہا۔ "تم لوگ اس چٹان کو ہٹاؤ۔ اللہ نے چاہا تو اس کے پیچھے سے ایک اونٹنی برآمد ہوگی۔"

ابھی ان کا جملہ پورا بھی نہ ہوا تھا کہ چٹان کے پیچھے سے اونٹنی کے بلبلانے کی آواز آنے لگی۔

وہ لوگ اونٹنی کی آواز سن کر ایک دوسرے کی صورت دیکھنے لگے۔ وہ بہت حیرت زدہ تھے۔

حضرت صالحؑ کے کہنے پر ان لوگوں نے بمشکل چٹان نما پتھر کی بہت بڑی سل جو کھسکائی تو اس کے پیچھے سے ایک اونٹنی نمودار ہوئی۔ اس وقت تک اونٹنی بچے کو پیدا کر چکی تھی اور اس بچے نے دنیا میں آتے ہی دودھ پینا شروع کر دیا تھا۔

ان لوگوں نے یہ بھی دیکھا کہ اونٹنی کے سامنے تازہ تازہ ہری ہری گھاس پڑی ہوئی تھی۔

حضرت صالحؑ نے اپنی قوم کی خواہش کے مطابق معجزہ دکھا دیا تھا۔ اس لیے انہیں یہ حق پہنچتا تھا کہ وہ اپنی قوم کو خیر کی طرف بلائیں اور قوم انکار نہ کرے۔ انہوں نے اپنی قوم سے کہا۔ "اب تو تم بت پرستی چھوڑ دو اور اپنے رب کے سامنے عاجزی سے جھک جاؤ۔"

قوم کا عجیب حال تھا۔ وہ اب بھی حضرت صالحؑ کی بات ماننے کے لیے تیار نہیں تھی، کہنے لگی۔ "اے صالحؑ! تم پہلے بھی بہت ہونہار معلوم ہوتے تھے۔ ہمیں بتاؤ کہ تم ہمیں ان چیزوں کی عبادت کرنے سے کیوں منع کرتے ہو جس کی عبادت ہمارے بزرگ کرتے آئے ہیں۔ اب تم ہمیں جس دین کی دعوت دے رہے ہو، ہم تو اس کی طرف سے شبہے میں مبتلا ہیں۔"

حضرت صالحؑ نے کہا۔ "تم نے مجھ سے معجزے کا مطالبہ کیا۔ میں نے دکھا دیا۔ اب تم اپنے بزرگوں کو درمیان میں لے آئے حالانکہ وہ بھی گمراہ تھے۔ کیا تم بھی ان کی پیروی میں گمراہی اختیار کیے رکھو گے؟"

قوم نے جواب دیا۔ "صالحؑ! تم ساتوں قبیلوں میں اکیلے وہ انسان ہو جو اپنے آباؤاجداد کی پیروی نہیں کرتا۔ تو کیا ہم بھی ایک تنہا شخص کی باتوں میں آ جائیں۔ ہمیں تو تم جھوٹے معلوم ہوتے ہو۔ بڑائی مارتے ہو۔ آخر تمہارے رب نے تم پر ہی نصیحتیں کیوں اتاریں؟ ہم میں تم جیسا کوئی اور بھی ہونا چاہیے تھا۔"

لیکن پھر لوگوں نے حضرت صالحؑ کی پیغمبری کی تصدیق کی اور ان پر ایمان لے آئے۔

حضرت صالحؑ نے اونٹنی کو اللہ کے نام پر چھوڑ دیا اور اپنی قوم کو منع کیا کہ وہ اللہ کی اس نشانی کو کوئی گزند نہ پہنچائیں۔ اگر انہوں نے اس اونٹنی کو نقصان پہنچایا تو اللہ کی طرف سے ان پر عذاب نازل ہوگا۔

ساتوں قبائل ان کی پیغمبری کا انکار کرتے رہے اور بستی میں کفر و معصیت کی وجہ سے پریشانی کے اسباب نظر آنے لگے۔ چشمے خشک ہو گئے، پانی کمیاب ہو گیا۔ صرف ایک چشمہ تھا جو خشک نہیں ہوا تھا۔ سات قبائل اور ایک چشمہ۔ وہاں بڑی بھیڑ بھاڑ رہتی تھی۔ ہر شخص کی یہی کوشش ہوتی تھی کہ وہ سب سے پہلے پانی حاصل کر لے۔

اونٹنی کو بھی پانی کی ضرورت تھی۔ وہ گئی اور چشمے کا سارا پانی پی گئی۔ اب تو قوم ثمود کا برا حال ہو گیا۔ وہ فکرمند تھے کہ چشمے کے خشک ہو جانے کے بعد انہیں پانی کہاں سے ملے گا؟

حضرت صالحؑ نے اپنی قوم سے کہا۔ "تم پریشان مت ہو۔ چشمہ بظاہر خشک ہو گیا ہے اور یہی لگتا ہے کہ اونٹنی چشمے کا سارا پانی پی گئی لیکن چشمے کی تہ میں سوتے موجود ہیں۔ چشمے میں پانی پھر آ جائے گا۔"

اب جو لوگوں نے ان کے کہنے پر جا کر دیکھا تو چشمہ پانی سے لبریز تھا۔ وہ سب بہت خوش ہوئے۔

حضرت صالحؑ نے اپنی قوم کے سامنے ایک تجویز پیش کی اور کہا۔ "اب تم لوگ باریاں مقرر کرو۔ ایک دن تم سب چشمے سے پانی حاصل کرو اور دوسرے دن صرف اونٹنی کو پانی پینے دو۔"

قوم نے ان کی بات مان لی اور اس چشمے سے باری باری پانی لیا جانے لگا لیکن کچھ عرصے بعد قوم کو اونٹنی زحمت اور مصیبت محسوس ہونے لگی۔ وہ اونٹنی کی باری والے دن بھی چشمے سے پانی لینا چاہتے تھے۔ حضرت صالحؑ نے انہیں ٹوکا اور۔۔ "قول و قرار کی پابندی کرو کیونکہ اللہ عہد شکنی کو پسند نہیں کرتا۔"

حضرت صالحؑ نے بمشکل ان سب کو اونٹنی سے روکے رکھا۔ ناکامیوں کے باوجود حضرت صالحؑ اپنی قوم کو نصیحتیں کرتے رہے۔

ان کی قوم بھی عجیب تھی کہ وہ جس اونٹنی سے معاندانہ سلوک کر رہی تھی، اسی کے دودھ سے فیض یاب ہو رہی تھی۔

ایک روز حضرت صالحؑ نے ایک ٹیلے پر چڑھ کر اپنی قوم کو بتایا۔ "لوگو! مجھے بتایا گیا ہے کہ آج کے دن پیدا ہونے والا بچہ جوان ہو کر وہ کچھ کرے گا جو اس قوم نے ابھی تک نہیں کیا پھر یہ قوم اپنے کیے کی سزا پائے گی۔"

قوم ثمود کے بڑوں نے ان کا مذاق اڑایا۔ "اس شخص کی باتیں عجیب ہوتی ہیں۔ اب یہ ہمیں ڈرا رہا ہے کہ آج کے دن پیدا ہونے والا لڑکا اس قوم کی تباہی اور ہلاکت کا سبب بن جائے گا۔"

اس دن اس ٹیلے کے نیچے جن لوگوں نے ان کی ڈراوے والی پیش گوئی سنی تھی، ان میں دس ایسی عورتیں بھی تھیں جو حمل سے تھیں اور یہ بالکل اتفاقی امر تھا کہ اسی دن ان عورتوں سے دس لڑکے پیدا ہوئے۔

یہ سبھی عورتیں اپنی قوم کی تباہی اور ہلاکت کی ذمے داری اپنے بیٹے کے سر ڈالنا پسند نہیں کرتی تھیں۔ نو عورتوں نے خوف سے اپنے نومولود لڑکے اسی وقت ہلاک کر دیے۔ انہیں کئی بیٹے خدا نے پہلے ہی دے رکھے تھے۔ بس ایک عورت ایسی تھی جس کی صرف ایک اولاد تھی۔ اس نے اپنے بیٹے کو ہلاک نہیں کیا۔ اس نے اپنے بیٹے کا نام قدار رکھا۔

پھر لوگ اس پیش گوئی کو بھول گئے۔

قدار پرورش پاتا رہا اور حضرت صالحؑ مسلسل ناکامیوں اور مایوسیوں کے باوجود اپنے تبلیغی کام میں مشغول رہے۔

لڑکا جوان ہو گیا۔ وہ ہوش سنبھالنے کے بعد سے اونٹنی کو مسلسل پانی پیتے دیکھتا رہا تھا۔ اسے غصہ آتا تھا کہ ایک دن صرف اونٹنی کے لیے مخصوص کر دیا گیا تھا۔ وہ سوچتا کہ اگر یہ اونٹنی ایک دن پانی نہ پیے تو بستی والوں کو بہت آرام ہو جائے۔

اس کا ہم خیال مصدع نامی ایک دوست بھی تھا۔ ان دونوں نے آپس میں مشورہ کیا۔

قدار نے کہا۔ "میرے دوست مصدع! اپنی قوم کے لوگ تو اس اونٹنی کے خلاف کوئی قدم اٹھانے سے رہے۔ آؤ ہم دونوں ہی وہ کام کریں جو بستی کا کوئی سورما بھی نہیں کر سکا۔"

مصدع نے پوچھا۔ "یعنی وہ کون سا کام ہے جو بستی کے سورما بھی انجام نہیں دے سکے؟"

قدار نے سرگوشی میں کہا۔ "دوست! میں بھی دیکھ رہا ہوں، تو بھی دیکھ رہا ہے کہ صالحؑ کی اونٹنی ہم سب کے لیے عذاب جان بن گئی ہے۔ چشمے کا سارا پانی پی جاتی ہے اور بستی والوں میں اتنی ہمت نہیں کہ وہ اس اونٹنی کو ٹھکانے لگا دیں۔"

مصدع نے کہا۔ "اونٹنی کو مار دینا کچھ مشکل نہیں۔ ہم جب چاہیں اسے ہلاک کر دیں مگر صالحؑ کا فرمان ہے کہ اللہ کے نام پر آزاد کی ہوئی یہ اونٹنی جس دن ہلاک کی جائے گی، ہماری آبادی پر عذاب نازل ہوگا۔ ہماری ماں بھی یہی کہتی ہے۔ تم ہی بتاؤ کہ ہمیں یہ خطرناک کام انجام دینا چاہیے یا نہیں؟"

قدار نے ہنستے ہوئے کہا۔ "تو اس معمولی اونٹنی کو اللہ کی نشانی کہہ رہا ہے حالانکہ وہ محض ایک اونٹنی ہے اور اس کا پیٹ اتنا بڑا ہے کہ چشمے کا سارا پانی اس میں کہیں غائب ہو جاتا ہے۔ جب تک ہم میں یہ اونٹنی موجود رہے گی، ہم پریشانیوں کا شکار رہیں گے۔"

مصدع نے اپنے دوست کو مشورہ دیا۔ "ہم دونوں ایک خاص وقت تک خاموش رہیں اور اس سلسلے میں اپنی اپنی ماؤں سے مشورہ کریں۔ اگر ہماری مائیں بھی مان جائیں تو پھر انہیں اونٹنی کی ہلاکت سے کوئی دکھ نہیں پہنچے گا۔"

قدار نے اسی دن اپنی ماں سے اس موضوع پر بات چھیڑی اور کہا۔ "ماں! آپ نہیں جانتیں کہ یہ اونٹنی ہم سب کو کتنا پریشان کر رہی ہے۔" قدار نے اپنی ماں سے اونٹنی کے بارے میں ایسی ایسی باتیں کیں کہ وہ بھی اپنے بیٹے کی ہم خیال ہو گئی۔

قدار کے پاس اونٹنی کے خلاف یہ عذر تھا کہ وہ ایک دن میں چشمے کا سارا پانی پی جاتی ہے جس سے قوم کے لوگ پریشانی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ یہ کہاں کا انصاف ہے کہ چشمے کے پانی پر ایک دن تو اونٹنی کا حق رہے اور دوسرے دن پوری قوم کے لوگ حقدار ہو جائیں۔ اس اونٹنی نے سبھی کو پریشان کر رکھا ہے۔

ماں نے پوچھا۔ "جب پوری قوم کو اونٹنی سے شکایت ہے تو تو ہی یہ ذمے داری کیوں قبول کر رہا ہے؟"

قدار نے اپنے ساتھی کا ذکر کیا۔ "ہاں! اس معاملے میں میرا دوست مصدع میرا ہم خیال ہے۔ ہم دونوں دوستوں نے مل کر یہ منصوبہ بنایا ہے کہ اس عذاب جان اونٹنی سے پیچھا چھڑایا جائے۔"

ماں کو وہ دن اور واقعہ یاد تھا جب حضرت صالحؑ نے ایک ٹیلے پر کھڑے ہو کر اپنی قوم کو بتایا تھا کہ اس دن جس گھر میں لڑکا پیدا ہوگا وہ قوم کی ہلاکت اور تباہی کا سبب بنے گا اور اس دن دس عورتوں نے بچے جنے تھے۔ نو ماؤں نے اپنے بچے ہلاک کر دیے تھے مگر قدار کو اس کی ماں نے بچا لیا تھا اور آج وہی بچہ اپنے دوست کی مدد سے اللہ کے نام پر چھوڑی ہوئی اونٹنی کو مار دینا چاہتا تھا۔

ماں نے قدار کو سمجھایا۔ "بیٹے! حجر نامی اس علاقے میں ثمود قوم کے سات قبائل آباد ہیں اور یہ سب اونٹنی کے خلاف بھی ہیں اور صالح کی بھی مخالفت کرتے رہتے ہیں۔ ان سات قبیلے والوں کی موجودگی میں ان کو اعتماد میں لیے بغیر اگر تو اپنے ایک دوست کے ساتھ اونٹنی کے خلاف کارروائی کرتا ہے تو اس کا گناہ اور عذاب تم دونوں کی گردن پر ہوگا۔ اس لیے تجھ کو ساتوں قبائل میں سے ایک ایک آدمی کو لے کر یہ کام کرنا چاہیے۔"

دوسری طرف مصدع کی ماں نے بھی یہی مشورہ دیا۔

ان دونوں نے ساتوں قبائل کے بڑوں سے ملاقات کی اور ان کے سامنے اونٹنی کا مسئلہ رکھ دیا۔ قدار نے ان سے کہا۔ "ایک اونٹنی کی وجہ سے ہم سب ہفتے میں تین چار دن پانی سے محروم رہتے ہیں اس لیے ہم دونوں دوستوں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ اگر ہمارے قبائل اپنا ایک ایک آدمی ہمیں دے دیں تو اونٹنی کی ہلاکت کے بعد کسی ایک شخص کو مورد الزام نہیں ٹھہرایا جائے گا۔"

ساتوں قبائل کے بڑوں نے قدار کی رائے سے اتفاق کیا اور اپنا ایک ایک آدمی قدار کے حوالے کر دیا۔ اب یہ دو سے نو ہو چکے تھے۔

یہ لوگ اونٹنی کو تلاش کرتے رہے پھر یہ طے پایا کہ اونٹنی تو کہیں نہ کہیں مل ہی جائے گی، پہلے کچھ کھا پی لیا جائے۔ چنانچہ ان سب نے خوب خوب کھایا اور اوپر سے بے تحاشا شراب پی گئے۔ جب وہ شراب پی رہے تھے، اس وقت بھی اونٹنی ان کے ذہن پر سوار تھی۔ شراب نے اپنا اثر دکھایا۔ یہ سب ترنگ میں اپنے اپنے تیر کمان لے کر باہر نکلے۔ تلواریں بھی ان کے پہلو میں لٹک رہی تھیں۔ یہ لوگ اونٹنی کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

قدار نے اونٹنی پر تیر چلایا جس سے اونٹنی زخمی ہو گئی۔ اس زخمی اونٹنی نے ان سب پر حملہ کر دیا تو یہ لوگ جان بچا کر بھاگے۔ مصدع ایک جگہ چھپا ہوا تھا۔ اس نے اونٹنی کے پیچھے سے جا کے اس کی پچھلی ٹانگوں پر تلوار سے حملہ کیا۔ اونٹنی گر گئی تو سب نے مل کر اس کے ٹکڑے کر دیے۔

اونٹنی کا بچہ بھی اب پورا اونٹ بن چکا تھا۔ ان لوگوں نے اس کا بھی پیچھا کیا۔ وہ بھاگتا ہوا اس چٹان کے پیچھے گیا جہاں سے اونٹنی نمودار ہوئی تھی۔ یہ لوگ چٹان کو پلٹ کے اونٹ کو تلاش کرتے رہے مگر اس کا کہیں پتا نہ تھا۔

اونٹنی کی ہلاکت کا حضرت صالحؑ کو معلوم ہوا تو انہیں بڑا دکھ پہنچا۔ انہوں نے اپنی قوم سے کہا۔ "اے میری قوم کے لوگو! کیا میں نے تم کو یہ نہیں بتایا تھا کہ یہ اونٹنی تمہارے لیے اللہ کی ایک فیصلہ کن نشانی ہے۔ اسے اس کے حال پر چھوڑ دو تاکہ یہ اللہ کی زمین پر چرتی پھرے۔ اسے کسی طرح بھی اذیت نہ پہنچانا ورنہ عذاب تمہیں آ پکڑے گا۔"

قدار نے سب کو منع کیا۔ "صالح جو کچھ کہتے ہیں، انہیں کہنے دیں۔ اگر اس اونٹنی کی ہلاکت سے ہم پر کوئی تباہی آتی ہے تو ہماری قوم میں یہ خود موجود ہیں۔ یہ بھی ہمارے ساتھ ہلاک ہو جائیں گے۔"

بظاہر تو قدار نے اس طرح اپنی قوم کو مطمئن کر دیا تھا مگر حقیقتاً وہ حضرت صالحؑ سے تنگ آیا ہوا تھا۔ اب اس نے قبائل کے بڑے بڑے لوگوں سے کہا۔ "لوگو! صالح نے دن رات نصیحتیں کر کے ہم سب کو ہلکان کر دیا ہے۔ کیا اونٹنی کے مارے جانے کے بعد ہم پر کسی قسم کی تباہی نازل ہوئی؟"

سبھی نے اس متمرد جوان سے اتفاق کیا۔ "صالح تو بس باتیں کرتا رہتا ہے۔ سچ وزن کرو، سچ تولو، ایک اللہ کی عبادت کرو۔ حالانکہ ہمارے آباؤ اجداد بھی یہی سب کچھ کرتے تھے۔ انہیں تو کبھی کوئی نقصان نہیں پہنچا اور نہ ان پر کسی قسم کی تباہی آئی پھر یہ ہمیں کیوں ڈراتا رہتا ہے۔"

بڑوں نے کہا۔ "یہ شخص تو ہمیں باتیں بتانے والا لگتا ہے۔ ہمیں فائدے اٹھانے سے روکتا ہے۔ کہتا ہے شراب تمام برائیوں کی ماں ہے۔ ہم سب اس کی طرف سے بری الذمہ ہوتے ہیں۔ تیرا جو جی چاہے اس سے سلوک کر۔ ہم سب خاموش رہیں گے۔"

قدار نے کہا۔ "صالح تو یہ کہتا تھا کہ اونٹنی کو ہلاک کر دینے سے عذاب نازل ہوگا مگر وہ عذاب ابھی تک تو آیا نہیں تو اب کیوں نہ اونٹنی کے بعد صالح سے بھی نجات حاصل کر لیں۔"

کسی بڑے نے قدار کو مشورہ دیا۔ "دیکھ قدار! صالح ایک کمزور انسان ہے۔ نہ تو اس کے پاس مال و زر ہے اور نہ ہی ہمارے قبائل میں اس کا کوئی اثر ہے پھر بھی قبائلی دستور کے مطابق صالح کا اپنا ایک قبیلہ ہے۔ اسے جو نقصان پہنچائے گا، اس کا قبیلہ اس سے جھگڑا کرے گا اور صالح کے قبیلے میں بھی مالدار لوگ موجود ہیں۔"

قدار نے پوچھا۔ "پھر آپ لوگ مشورہ دیں کہ اگر ہم صالح کو قتل کر دیں تو اس کے قبیلے سے کس طرح نمٹیں گے؟"

بڑوں نے مشورہ دیا۔ "بہتر یہی ہے کہ تو اپنے دوست کے ساتھ صالح کے بڑے لوگوں سے مل لے۔ ان سے کہہ کہ وہ صالح کو فضول باتوں سے روکیں اور وہ ہمارے دیوتاؤں کو برا بھلا کہنا چھوڑ دے۔ دیکھو وہ کیا مشورہ دیتے ہیں۔"

قدار جب حضرت صالحؑ کے قبیلے سے بات کرنے جا رہا تھا تو راستے میں ان سے ملاقات ہو گئی۔

حضرت صالحؑ نے قدار سے کہا۔ "تو نے اونٹنی کو مار کے اچھا نہیں کیا۔ اب تجھ پر عذاب نازل ہوگا۔"

قدار نے کہا۔ "وہ عذاب کب نازل ہوگا۔ ہم تو اس عذاب کا انتظار کر رہے ہیں۔"

حضرت صالحؑ نے کہا۔ "یہ تو میرے اللہ کو معلوم ہے اور اگر اب بھی تم لوگ شرک چھوڑ دو اور دیوی دیوتاؤں کی پرستش سے اجتناب کرو، کاروبار اور تجارت میں دیانت اختیار کرو تو اللہ تمہیں عذاب سے بچالے گا۔"

قدار نے کہا۔ "کیسی عجیب بات ہے کہ ہم اپنے آباؤ اجداد کی روش ترک کر دیں اور تمہارے بتائے ہوئے طریقوں پر چلیں۔ اگر ہم سب کو تمہارے قبیلے کا خیال نہ ہوتا تو تمہیں کب کا اونٹنی کی طرح مار دیا گیا ہوتا۔"

حضرت صالحؑ نے نہایت اطمینان سے جواب دیا۔ "اے قدار! تو مجھے موت سے ڈراتا ہے حالانکہ موت سے تجھے ڈرنا چاہیے کیونکہ آخرت میں جو حساب کتاب ہوگا اس سے بچت اور رعایت کی کوئی گنجائش نہ ہوگی۔"

قدار ہنسنے لگا۔ اس نے پوچھا۔ "اے صالح! تم یہ تو بتاؤ کہ جب تمہارے بقول ہم پر عذاب نازل ہوگا تو اس کی علامات کیا ہوں گی؟"

حضرت صالحؑ نے جواب دیا۔ "یہ عذاب تین دنوں کے بعد نازل ہوگا جبکہ تین دن تک تمہارے رنگ روپ میں تبدیلیاں واقع ہوتی رہیں گی۔"

قدار نے پوچھا۔ "یہ کس قسم کی تبدیلیاں ہوں گی؟"

حضرت صالحؑ نے جواب دیا۔ "پہلے دن تو تمہارے چہرے سرخ ہو جائیں گے۔ دوسرے روز زرد پڑ جائیں گے اور تیسرے دن تم سب کا چہرہ سیاہ ہو جائے گا۔"

قدار کو ہنسی آ گئی۔ اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ "اگر ہمیں تمہارے قبیلے کا خیال نہ ہوتا تو ہم تمہیں کب کا قتل کر چکے ہوتے۔ اس وقت بھی میں تمہارے قبیلے کے بڑوں سے بات کرنے جا رہا ہوں۔ اگر انہوں نے ہماری بات مان لی تو ہمارا کام آسان ہو جائے گا ورنہ پھر کوئی دوسری راہ نکالیں گے۔"

حضرت صالحؑ نے افسوس کرتے ہوئے کہا۔ "افسوس تمہارے دلوں پر مہریں لگ چکی ہیں اور تم گمراہی سے نہیں نکل سکو گے۔ اللہ کا عذاب تم پر نازل ہو کر رہے گا۔"

قدار حضرت صالحؑ کے قبیلے کے بڑوں سے ملا اور ان سے حضرت صالحؑ کی برائی کی۔ "بزرگو! تمہاری قوم کا صالح سالوں سے ہمیں بوکھلا رہا ہے اور کہتا ہے کہ ہم سب گمراہ ہیں۔ کیا ہم سب اپنے باپ دادا کی روش پر نہیں چلتے۔ ہمارے تاجر اپنا مال جس طرح چاہیں بیچیں، ہمارے مویشی پالنے والے لوگ اپنا دودھ جس طرح چاہیں فروخت کریں، ہم جتنے

دیوی دیوتاؤں کی بجائے پرستش کریں۔ تم لوگ صالح کو منع کرو کہ وہ ہمیں نصیحتیں نہ کیا کرے۔"

حضرت صالح کی قوم کے بڑوں نے کہا۔ "اے قدار! یہ سب درست ہے جو تُو نے کہا لیکن ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم اسے منع کیسے کریں۔ وہ جو کچھ کہتا ہے اس سے کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔"

قدار نے بدمزگی سے کہا۔ "نقصان کیوں نہیں پہنچتا۔ ہمارے کئی آدمی اپنے باپ دادا کی روش ترک کر کے صالح کے ایک رب کی عبادت کرنے لگے۔ آگے چل کر اور بھی لوگ اس کی پیروی اختیار کر سکتے ہیں۔ میں اس سے پہلے ہی اس قصے کو ختم کر دینا چاہتا ہوں۔"

حضرت صالح کی قوم کے بڑوں نے کہا۔ "اگر تو نے صالح کو کوئی نقصان پہنچایا تو ہم اس کا بدلہ لیں گے۔"

اور پھر وہ دن آ گیا جس دن کی حضرت صالحؑ نے اپنی قوم کو خبر دے دی تھی۔ ایک دن ان سب کے چہرے پیلے ہو گئے تو قدار نے غصے میں حضرت صالحؑ سے کہا۔ "اے صالح! کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ تمہارا رب موسلا دھار طوفانی بارش کرے گا اور ہمارے مکانات ڈھے جائیں گے یا ہمارے گھروں میں پانی بھر جائے گا۔ ہم سب اس میں ڈوب کر ہلاک ہو جائیں گے؟ کیا تم نے یہ نہیں دیکھا کہ ہم نے اپنے گھر پہاڑیوں پر بنا رکھے ہیں۔ پتھروں کو کاٹ کاٹ کر بنائے جانے والے گھر نہ تو ٹوٹیں گے نہ ان میں پانی بھرے گا اور نہ طوفانی بارش ان کو نقصان پہنچائے گی۔"

حضرت صالحؑ نے کہا۔ "تم نہیں جانتے کہ اللہ کا یہ عذاب کس طرح نازل ہوگا۔ سب سے پہلے ایک خوفناک آواز سنائی دے گی۔ یہ آواز تمہارے کانوں کے پردے پھاڑ دے گی۔ تمہاری پتھر کی دیواروں میں دراڑیں پڑ جائیں گی اور یہ خوفناک آواز گویا اس بات کا اعلان ہوگا کہ تم پر عذابِ الٰہی کا نزول شروع ہو چکا ہے۔"

قدار نے کہا۔ "ہمارے پاس اس خوفناک آواز کا بھی علاج ہے۔"

اور قدار نے جملہ قبائل کو مشورہ دیا کہ فوراً سب لوگ بہت سی روئی فراہم کریں۔ اس روئی کے استعمال کا طریقہ وہ کل بتائے گا۔

دوسرا دن طلوع ہوا تو ان سب کے چہرے زرد پڑ چکے تھے۔ قدار پر وحشت طاری تھی مگر وہ عذابِ الٰہی سے نمٹنے کا تہیہ کر چکا تھا۔ اس نے ساتوں قبائل کو پیغام دیا۔ "تم لوگوں نے روئی کا ذخیرہ تو کر لیا ہوگا۔ جب تیسرا دن ختم ہو جائے تو تم سب اپنے اپنے کانوں میں روئی ٹھونس لینا اور اپنے اپنے سروں پر بھی بہت سی روئی رکھ لینا تاکہ کوئی خوفناک آواز تمہیں نقصان نہ پہنچائے۔"

تیسرا دن طلوع ہوا تو سب کے چہرے سیاہ پڑ چکے تھے۔ حضرت صالحؑ نے اپنے ماننے والوں کو ساتھ لیا اور بستی والوں سے کہا۔ "لوگو! جس عذاب کے دن کا ذکر کیا گیا تھا وہ آن پہنچا۔ اب دیکھنا ہے کہ تمہارے پہاڑوں پر بنے ہوئے مکانات تمہیں کس طرح پناہ دیتے ہیں۔"

رات آئی تو ہر کسی نے اپنے کانوں میں روئی ٹھونس رکھی تھی اور سروں پر بھی روئی کی تہیں جما رکھی تھیں۔ ابھی کچھ رات باقی تھی کہ صبح ہونے سے کچھ پہلے ایک کڑک دار آواز سنائی دی اور ساتھ ہی زمین ہلنے لگی۔ ایسا لگا تھا جیسے زمین اور پہاڑ کانپ رہے ہوں۔

کڑک دار آواز نے ہی ان کے شہر اور حدودِ زمین کو تباہ و برباد کر ڈالا۔ لوگ ہلاک ہو گئے۔ جو جس حال میں تھا اس کی اسی حال میں روح قبض کر لی گئی۔

حضرت صالحؑ نے اپنے ہدایت یافتہ لوگوں کے ساتھ بستی میں واپس آ کر دیکھا تو وہاں کچھ باقی نہیں رہ گیا تھا۔ ہر طرف تباہ کاریاں تھیں، بربادیاں تھیں۔ لوگ مر چکے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے پہاڑ روئی کے گالوں کی طرح اڑ گئے ہوں۔

حضرت صالحؑ کو اپنی قوم کی اس تباہی کا دکھ ہوا۔ انہوں نے وہ جگہ چھوڑ دی اور شام میں سکونت اختیار کی۔ شام میں شہرستان عوج نامی ایک جگہ ہے۔ انہوں نے وہیں سکونت اختیار کی تھی اور اسی جگہ انہوں نے انتقال فرمایا۔ ان کے ساتھیوں کا بھی اسی جگہ انتقال ہو گیا۔

شہرستان عوج کی جامع مسجد کی داہنی جانب آج بھی حضرت صالحؑ کی قبر موجود ہے۔ ان کے ساتھیوں کی قبریں بھی اسی جگہ بنی ہوئی ہیں۔

☆☆☆

اصحاب الرّس

اسی سلسلے میں حضرت شعیبؑ کا بھی ذکر ہوا ہے۔ شمالی عرب کے ایک حصے میں جو قوم آباد تھی وہ حضرت ابراہیمؑ کے فرزند مدین کی نسل سے تعلق رکھتی تھی۔

فلسطین کے جنوب مغرب اور جزیرہ نمائے سینا کے مشرق میں مدین نامی شہر اس شاہراہ پر واقع تھا جس سے شام، عرب اور مصر وغیرہ کے تجارتی قافلے گزرتے تھے۔ یہ علاقہ نہایت سرسبز و شاداب تھا۔ یہاں باغات کی کثرت تھی اور کھیتی باڑی سے انہیں غلہ بھی بکثرت حاصل ہو جاتا تھا۔ مویشی بھی پالتے تھے اور تجارت بھی ان کا عام پیشہ تھا۔ تجارت میں لوٹ کھسوٹ عام تھی۔ دولت کو جمع کرتے رہتے اور اس معاملے میں ہر کوئی مقابلے پر کمربستہ رہتا تھا۔ یہاں تک کہ اگر یہاں انہیں دولت لوٹ مار سے مل سکتی تو اس سے بھی باز نہیں آتے تھے۔ جو تجارتی قافلے ادھر سے گزرتے وہ چوروں اور راہزنوں سے محفوظ نہیں رہتے تھے۔

یہ کھلی منڈیوں میں لین دین کرتے تو دوسروں سے تول میں زیادہ وصول کرتے لیکن جب خود اپنا مال تول کر دوسروں کو دیتے تو یہ کم ہوتا۔ ان کی راہنمائی کے لیے ان میں حضرت شعیبؑ کو بھیجا گیا۔ ان کا تعلق بھی حضرت صالحؑ کی اولاد سے تھا۔ یہ بہت بڑے خطیب تھے اور رسول اللہ ﷺ نے ان کو خطیب الانبیاء کا خطاب دیا تھا۔

انہوں نے اپنی قوم میں جو بُرائیاں دیکھی تھیں ان میں بت پرستی اور کاروباری بددیانتی عام تھی لیکن ان دونوں بُرائیوں سے بڑا عیب یہ تھا کہ وہ کسی کی نصیحت سننا پسند نہ کرتے تھے چنانچہ حضرت شعیبؑ نے ان سے کہا۔ "اے لوگو! اللہ نے مجھے تمہاری راہنمائی کے لیے تم میں بھیجا ہے۔ تم ایک اللہ کی بندگی کرو کیونکہ اللہ کے سوا تمہارا کوئی اور رب نہیں اور دیکھو ناپ تول میں دیانت سے کام لو۔ یہ کیا کہ جب تم دوسروں سے کچھ لیتے ہو تو زیادہ لیتے ہو اور جب دوسروں کو دیتے ہو تو تول میں کمی کر دیتے ہو۔"

ان کی قوم نے بھی یہ طریقہ اختیار کر لیا تھا کہ ان کی باتوں پر کوئی توجہ ہی نہیں دیتی تھی حالانکہ قائل تھی کہ حضرت شعیبؑ کو خطابت آتی ہے۔ ان کی فصاحت کا ایک زمانہ معترف تھا۔ ان لوگوں کو حضرت شعیبؑ کے معاملے میں جو چیز زیادتی سے روکتی تھی وہ ان کا خاندان تھا۔ یہ لوگ جانتے تھے کہ اگر ان کے ساتھ کوئی زیادتی کی گئی تو ان کا خاندان مقابلے پر آ جائے گا۔

جس جگہ حضرت شعیبؑ تلقین کرتے تھے اور شہر کے لوگ ان کی تقریر سننے کے لیے جو راستے اختیار کرتے تھے، شہر کے سرکش لوگوں نے ان راستوں میں اپنے آدمی بٹھا دیے اور انہیں حکم دیا کہ وہ لوگوں کو حضرت شعیبؑ کے پاس نہ جانے دیں۔ چنانچہ یہ سرکش لوگ صبح سے رات تک ان راستوں کی نگرانی کرتے۔ جہاں کسی کو حضرت شعیبؑ کی طرف جاتے دیکھتے اسے پکڑ لیتے اور دھمکی دیتے کہ جہاں سے آئے ہو وہیں واپس جاؤ ورنہ ہلاک کر دیے جاؤ گے۔

کبھی کبھی ان میں جھگڑے بھی ہوتے اور ہدایت یافتہ لوگ گلی کوچوں میں ان مفسدوں سے جھگڑتے اور کہتے کہ وہ ان کا راستہ نہیں روک سکتے۔ یہ مفسد کہتے۔ "اگر تم شعیب کی باتیں سنو گے، ان پر عمل کرو گے تو ہم تمہیں اس بستی سے نکال دیں گے۔"

ہدایت یافتہ لوگ جواب دیتے۔ "تمہیں یہ حق کس نے دیا کہ تم ہمیں بستی سے نکال دو؟ ہم تو تمہارے کسی معاملے میں مداخلت نہیں کرتے پھر تم ہمارے معاملے میں دخل دینے والے کون ہوتے ہو؟"

ان سرکشوں نے دھمکی دی۔ "تم لوگ جس شخص کی باتیں سن کر ہمارے خلاف ایک محاذ کھڑا کر رہے ہو، ہم اس شخص کو بھی یہاں سے نکال باہر کریں گے۔"

اللہ کے ان بندوں نے جواب دیا۔ "ہمیں تو تم نافرمانوں میں سے لگتے ہو اور ڈر ہے کہ ماضی میں نافرمانوں پر جو عذاب نازل ہوتا آیا ہے، وہی عذاب تم پر بھی نازل نہ ہو۔"

ان سرکشوں نے سختی سے کہا۔ "عذاب جب آئے گا تو دیکھا جائے گا۔ فی الحال تو ہم تمہیں شعیب کے پاس نہیں جانے دیں گے۔"

جب حضرت شعیبؑ کو یہ معلوم ہوا کہ لوگوں کو ان کے پاس پہنچنے سے روکا جاتا ہے تو انہوں نے خود لوگوں کے پاس جانا شروع کر دیا۔

اب سرکشوں کے لیے حضرت شعیبؑ کو روکنا ایک دشوار مرحلہ تھا۔ آخر سرکش حضرت شعیبؑ سے ملے اور ان کو دھمکی دی۔ "ہمیں تمہارے قبیلے کا خیال نہ ہوتا تو یہ معاشرہ کبھی کا تم سے پاک ہو چکا ہوتا۔ اس لیے اب تمہاری اسی میں بہتری

اپنی؟ فرمان قوم کی تباہی کا غم نہ کھاؤ۔ اگر چاہو تو تمہاری بینائی تمہیں واپس مل سکتی ہے۔ اگر برباد شدہ قوم کا غم ہے تو اس کا غم نہ کرو کیونکہ اس کی جگہ ایماندار قوم نے لے لی ہے۔ اگر تمہیں دوزخ کا ڈر ہے تو اس اندیشے کو بھی دل سے نکال دو۔ اگر تمہیں دنیا درکار ہے تو دنیا بھی مل جائے گی۔ بتاؤ کہ کس چیز کی خواہش ہے؟"

حضرت شعیبؑ نے کہا۔ "میرا دل خواہشات سے خالی ہے۔ بس ایک خواہش ہے مگر وہ پوری ہوتی نظر نہیں آتی۔"

حضرت جبرئیلؑ نے کہا۔ "تم اپنی خواہش بتاؤ، میں اللہ تک پہنچادوں گا۔"

حضرت شعیبؑ نے کہا۔ "وہ خواہش ہے دیدارِ خداوندی کی۔"

حضرت جبرئیلؑ نے ان کی یہ خواہش اللہ تک پہنچادی۔ جواب ملا۔ "جاؤ ان سے کہہ دو کہ ان کی یہ خواہش قیامت کے دن پوری کردی جائے گی۔"

حضرت شعیبؑ نابینا ہونے کے بعد بھی بارہ سال زندہ رہے اور حضرت موسیٰؑ کے آنے کے بعد بھی چار سال چار ماہ زندہ رہے۔ اس کے بعد وصال ہوگیا۔

حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ کو خدا نے حکم دیا تھا کہ اس قوم کے پاس جاؤ جسے تکذیبِ انبیاء کے باعث ہلاک کردیا گیا تھا۔

یہ دونوں حضرات مصر سے نکل کر دشتِ سینا میں آئے اور دشتِ سینا سے گزرتے ہوئے رتمہ نامی ایک جگہ پر پہنچے۔ کہتے ہیں کہ یہی رتمہ نامی جگہ قرآن پاک کا الرس ہے کیونکہ عبرانی زبان میں رتمہ ایسی زمین کو کہتے ہیں جو زلزلے کے سبب تہ و بالا ہوگئی ہو۔

یہاں کی پہلی جگہ کا نام قبرات الہتاوہ ہے اور اس کے معنی ہیں آرزوؤں کا مسکن۔ کہتے ہیں کہ یہ نام لوگوں نے اس علاقے کے ہولناک منظر کو دیکھ کر رکھا تھا۔

یہ دونوں صاحبان آگے بڑھے تو حصیرات نامی مقام ملا۔ عبرانی زبان میں حصیرات کا مطلب ہے مستحکم قلعہ۔ اور آگے بڑھے تو رتمہ نامی جگہ دیکھی۔ یہاں کھیتی باڑی ہوتی تھی کیونکہ رتمہ کا مطلب ہی قابلِ زراعت ہے۔ اور آگے بڑھے تو رمون فارس جگہ پر قیام کیا۔ رمون فارس کا مطلب ہے درختوں کا مجموعہ جہاں باغات ہوا کرتے تھے۔ اسی کے قریب لبنہ نامی جگہ تھی جس کا مطلب ہے دودھیا زمین اور اس کے بعد رسہ نامی جگہ پر پہنچ گئے یعنی زلزلے کے بعد پھٹی ہوئی زمین پر۔

اگر ان تمام مقامات کے بارے میں ترتیب قائم کی جائے تو اس طرح تشریح کی جائے گی۔ "اس علاقے پر نظر ڈالو تو خواہشوں کا ایک قبرستان نظر آئے گا۔ یہاں کبھی نہایت زرخیز قابلِ زراعت زمین ہوا کرتی تھی۔ پہاڑیوں پر مستحکم قلعوں جیسے مکانات ہوا کرتے تھے، شاداب باغات تھے پھر زبردست زلزلہ آیا۔ زمین پھٹی تو اندر کا مادہ اوپر آگیا اور قابلِ زراعت زمین دودھیا مٹی بن گئی۔ باغات تہ و بالا ہوگئے اور اتنی زبردست تباہی آئی کہ صرف اس علاقے کو دیکھ لینے سے ہی تمام امنگیں مرجاتی ہیں۔"

☆☆☆

غزوۂ تبوک کے موقع پر رسول اللہ ﷺ کا گزر حجر پر ہوا۔ صحابہؓ نے ثمود کے کنوؤں سے پانی بھرا اور آٹا گوندھ کر روٹیاں پکانے لگے۔ پھر جیسے ہی رسول اللہ ﷺ کو معلوم ہوا کہ یہی وہ جگہ ہے جہاں قوم ثمود رہتی تھی اور برباد کردی گئی تھی تو آپ ﷺ نے حکم دیا۔ "پانی گرادیا جائے، ہانڈیاں الٹ دی جائیں اور آٹا اونٹوں کو کھلا دیا جائے۔"

صحابہ کرامؓ نے پوچھا۔ "یا رسول اللہ ﷺ! یہ کیوں؟"

آپ ﷺ نے جواب دیا۔ "یہاں مت ٹھہرو اور نہ یہاں کی کسی چیز سے فائدہ اٹھاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ تم بھی کسی مصیبت میں گرفتار ہو جاؤ اس لیے کہ اس بستی پر خدا کا عذاب نازل ہوا تھا۔"

ماخذات

قصص الانبیاء، مولوی عبدالمنان۔ قصص القرآن، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی۔ کتاب الہدیٰ، مولانا یعقوب حسن۔ انبیائے قرآن، جمیل احمد۔ ترجمان القرآن، مولانا ابوالکلام آزاد

کامیابی کی کلید

محمد عباس ثاقب

مسئلہ کوئی بھی ہو اسے حل کرنے کے لیے ذہانت کی ضرورت ہوتی ہے جو ہر ایک کو نصیب نہیں ہوتی... ایک اس کی بیوی کا مسئلہ تھا جسے اس نے اپنے طریقے سے حل کیا اور ایک مسئلہ اس پولیس آفیسر کا تھا جسے ہر حال میں اپنا فرض نبھانا تھا... یہ اور بات کہ دونوں کے مقاصد میں تضاد نے ایک کو مجرم اور ایک کو فرض شناس ثابت کردیا۔

ایک ذرا سی غلطی سے قاتل حسینہ کا راز فاش

سلویا کوزنر نے اپنے شوہر کی لاش کا جائزہ لیا۔ اس نے جرم و سزا کی کہانیوں میں جو کچھ پڑھا تھا اس کے برعکس قتل کرنے کا عمل اس کے لیے کافی آسان ثابت ہوا تھا۔ جان سے اس کی گرما گرم بحث جاری تھی۔ رفتہ رفتہ بات بڑھتی چلی گئی اور پھر جان کا طیش قابو سے باہر ہوگیا اور اس نے اپنی نشست پر بیٹھے بیٹھے سلویا کو زوردار تھپڑ رسید کردیا۔

سلویا پہلے ہی غیظ و غضب کی آخری حدیں چھو رہی تھی۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، اٹھ کر آتش دان کے پاس دہکتے کوئلے کریدنے والا بھاری بھرکم دھاتی آنکس اٹھایا اور جان کی کھوپڑی پر دے مارا۔ نشانہ کچھ زیادہ ہی ٹھیک بیٹھا۔ جان چکرا کر صوفے سے گرا اور کچھ دیر تڑپنے کے بعد ساکت ہوگیا۔ اس کی کھوپڑی سے خون مسلسل رس رہا تھا۔ سلویا چند لمحوں تک پھٹی پھٹی نظروں سے جان کی لاش کو دیکھتی رہی۔ اسے اپنی ضرب کی طاقت اور اثر انگیزی پر کچھ اچنبھا ضرور ہوا مگر اسے

اپنے کیے پر کوئی افسوس نہیں تھا۔ جان اس کے ساتھ اب تک جو کچھ کرتا آیا تھا اور اس نے سلویا پر ہاتھ اٹھا کر جو سرخ لکیر عبور کی تھی، اس کے بعد اسے مارنا فطری ردعمل تھا۔

ہاں، جان کو جان سے مارنا تو واقعی آسان تھا لیکن سلویا جانتی تھی کہ اب اسے لاش کو ٹھکانے لگانا ہے اور ایسا کرنا بہت زیادہ مشکل ہوگا۔

صوفے پر بیٹھتے ہوئے اس نے خود سے کہا۔ ”پُرسکون رہو۔ ہنگامی حالت میں مکمل پُرسکون رہنا اور یک سوئی سے معاملات پر غور و فکر ہی کامیابی کی کلید ہے۔ مجھے بالکل گھبرانا نہیں ہے۔“

سلویا نے قتل کے موضوع پر بہت سے تجسس سے بھرپور ناول پڑھ رکھے تھے، اس لیے وہ اس بات سے واقف تھی کہ ان ناولوں کے ولن اپنے شکار کی لاش سے کس کس طرح چھٹکارا حاصل کیا کرتے تھے۔

’میں اسے گھر کے پچھواڑے والے ویران میدان میں دفن کر سکتی ہوں۔‘ اس نے سوچا لیکن پھر اس نے فیصلہ کیا۔ ’ہرگز نہیں..... ناممکن۔ جان کی لاش چھپانے کے لیے اتنا بڑا اور گہرا گڑھا کھودنا اور لاش دبانے کے لیے دوبارہ بھرنا، یہ میں کبھی نہیں کر سکتی۔ اس کے علاوہ، جان کے اچانک غائب ہو جانے اور اسی دوران میں گھر کے پچھواڑے کو کھودے جانے پر بلانچے جیسی عیار و مکار عورت کو فوراً شک ہو جائے گا۔‘

بلانچے وہسٹران کی پڑوسی اور علاقے کی شرلاک ہومز تھی۔ یوں سمجھیں کہ لوگوں کی کن سوئیاں لینا اور ان کی زندگی میں تاک جھانک کرنا ہی اس کی زندگی کا مقصد تھا۔ وہ فخر سے دعویٰ کیا کرتی تھی کہ وہ اس رہائشی بلاک میں موجود ہر شخص کے بارے میں سب کچھ جانتی ہے..... اور اس کا یہ دعویٰ کچھ اتنا غلط یا مبالغہ انگیز بھی نہیں تھا۔ سلویا کو بخوبی احساس تھا کہ بلانچے کی عقابی نظروں سے بچ کر گزرنا ایک مشکل کام ہوگا۔

’بلانچے نے جان کو آج رات گاڑی میں جاتے دیکھا تھا۔‘ سلویا نے سوچا۔ ’میں نے اسے بلانچے کی طرف ہاتھ لہراتے ہوئے دیکھا تھا لیکن وہ جس وقت واپس آیا، بلانچے کہیں گئی ہوئی تھی۔ شاید میں یہ بات اپنے فائدے کے لیے استعمال کر سکوں۔‘

سلویا اٹھی اور دھیرے دھیرے چہل قدمی کرنے لگی۔ تب ہی اس کی نظر شام کے اخبار پر پڑی جس پر سینما میں نمائش پذیر فلموں کے اشتہاروں والا صفحہ کھلا ہوا تھا۔

”یقیناً، کام بن سکتا ہے۔“ اس نے لگ بھگ ہانپتے ہوئے خود کلامی کی۔ ”میں جان کی لاش گاڑی میں ڈال کر گندی فلموں کی نمائش کرنے والے ان سینما گھروں میں سے کسی ایک تک لے جا سکتی ہوں۔ میں جان کی لاش کسی گلی میں پھینک دوں گی اور کار وہیں آس پاس کہیں چھوڑ کر واپس آ جاؤں گی۔ اس طرح یوں لگے گا کہ اس پر شہر کے اس غلیظ حصے میں لوٹ مار کرنے کے لیے حملہ ہوا تھا۔“ سلویا اپنی ہوشیاری پر مسکرا دی۔ ”پھر مجھے صرف یہ کرنا ہے کہ کسی کی نظروں میں آئے بغیر گھر پہنچ جاؤں..... مگر یہ کیسے ہوگا؟“

اس سوال کا اسے فوراً ہی جواب سوجھ گیا۔ میں جسم فروش عورت کا روپ دھار سکتی ہوں۔ اسے یاد آیا کہ ہالووین کے پچھلے تہوار پر اس نے ایک کاسٹیوم پارٹی کے لیے ایک بازاری عورت کا لباس پہنا تھا اور اس کے پاس اب بھی بلاؤز، اسکرٹ، فش نیٹ جرابیں اور وگ اس کی الماری میں کہیں پڑے ہوئے تھے۔ مزید تھوڑا سا میک اپ اور بھیس مکمل ہو جائے گا۔

”اچھا، اب سوچ بچار ختم کرو اور کمر کس لو۔ کام پر لگنا ہے۔“ اس نے خود سے خوش دلی سے کہا۔

سب سے پہلے، اس نے جان کے سر پر پلاسٹک کا تھیلا چڑھا دیا تاکہ اسے منتقل کرتے وقت کسی بھی چیز پر خون نہ لگے۔ پھر اس نے اس کا پرس خالی کیا اور اس کی انگوٹھی اتار دی۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ پرس میں موجود رقم وہ اپنے پاس رکھے گی اور وہ انگوٹھی گھر سے نکلنے کے بعد راستے میں کسی مناسب جگہ پر پھینک دے گی۔

جان کی لاش سلویا کی توقع سے کہیں زیادہ بھاری ثابت ہوئی۔ تاہم اس نے کسی نہ کسی طرح لاش برف پر پھسلنے والی گاڑی پر لاد لی۔ اس ترکیب نے نہ صرف جان کو گھر سے باہر لے جانا سہل بنا دیا، بلکہ سلویا کو اسے سیڑھیوں سے نیچے اور گیراج میں لے جانے کا ایک آسان طریقہ بھی فراہم کر دیا۔

کافی جدوجہد کے بعد سلویا، جان کو اپنی کار کی اگلی سیٹ پر رکھنے میں کامیاب ہو گئی۔ اس نے اس کی لاش کو پہلو کے بل لٹایا اور اسے برساتی کوٹ سے ڈھانپ دیا جسے وہ خود پہننے کا ارادہ رکھتی تھی۔

آہستہ آہستہ اور ہیڈ لائٹس کو آن کیے بغیر..... تاکہ تجسس پسند بلانچے کو کچھ نظر نہ آئے، سلویا نے گاڑی گیراج سے باہر نکالی اور ڈرائیو وے میں آنے کے بعد بالآخر سڑک پر پہنچ گئی۔ اگلے پندرہ منٹ تک سلویا نے حد سے زیادہ احتیاط سے گاڑی چلائی۔ وہ ایسا کچھ نہیں کرنا چاہتی تھی جس کے نتیجے میں پولیس والے اسے پوچھ گچھ کے لیے روک لیتے۔

آخرکار سلویا قصبے کے ایک پرانے حصے میں پہنچ گئی جہاں فحش کتابوں کی دکانوں، سیکس شاپس اور عریاں فلموں کے سینما گھروں کی بھرمار تھی۔ سلویا کی خوش قسمتی کہ ایسے ہی ایک سینما گھر

اور کتابوں کی دکان کے درمیان اسے ایک تنگ گلی مل گئی۔

سلویا نے گاڑی فٹ پاتھ کے کنارے لگا کر کھڑی کر دی۔ کافی وقت انتظار کرنے کے بعد جب اسے یقین ہو گیا کہ آس پاس کوئی نہیں ہے تو وہ کار سے باہر نکلی اور دروازہ کھول کر جان کی لاش کو نکالا اور جتنا جلدی ممکن تھا، اسے گلی کے نصف تک گھسیٹتی چلی گئی۔ اس کے بعد اس نے جان کی جیبیں باہر کی طرف نکالیں اور اس کا خالی پرس زمین پر ایسی جگہ پھینک دیا جہاں اس کا نظر آنا یقینی تھا۔

جان کے سر پر سے پلاسٹک کا تھیلا ہٹانے کے بعد، وہ گاڑی کی طرف واپس آئی، دروازے بند کر دیے اور تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی اس علاقے سے دور نکل گئی۔ اسے یقین تھا کہ اس دوران میں وہ کسی کی توجہ کا مرکز نہیں بنی ہے۔ جان کی لاش والی گلی سے تین بلاکس کا فاصلہ طے کرنے کے بعد اس نے ہاتھ دے کر ایک ٹیکسی روکی اور ڈرائیور کو شہر کے سب سے بڑے مال لے جانے کی ہدایت کی۔

سلویا نے ٹیکسی کی پچھلی نشست پر بیٹھ کر اطمینان کا سانس لیا اور بے اختیار مسکرا دی۔ اس نے اتنی عمدگی سے ہمت اور یک سوئی برقرار رکھنے پر اپنے آپ کو شاباش اور مبارک باد دی۔ اور یہ کہ اس نے خود کو ایک بار پھر یاد دلایا۔ مکمل پُرسکون رہنا اور یک سوئی سے معاملات پر غور و فکر ہی کامیابی کی کلید ہے۔

مال پہنچنے پر سلویا نے ٹیکسی والے کو ادائیگی کی اور اس کے جانے کا انتظار کیا۔ حتیٰ کہ وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا پھر وہ مال کے عقب میں چلی گئی جہاں ملازمین کی گاڑیاں پارک کی جاتی تھیں۔ اس ویران علاقے میں، اس نے تیزی سے اپنی وگ، شوخ رنگ کا بلاؤز، گھٹنوں سے اوپر ہی ختم ہو جانے والا اسکرٹ اور اونچی ایڑیوں والے سینڈل اتار دیے۔ اس نے جلدی سے ایک سویٹر، جینز، جوتے اور رین کوٹ زیب تن کیا اور طوائفوں والا لباس اس بیگ میں بھر دیا جس میں وہ اپنے کپڑے لائی تھی۔

مال کے سامنے واپس آنے کے بعد، سلویا نے ایک بس پکڑی اور اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گئی۔ وہ اپنے معمول کے اسٹاپ سے کئی بلاکس پہلے اتری اور باقی راستہ پیدل طے کیا۔ خاموشی سے اپنے گھر کے قریب پہنچ کر سلویا چوری چھپے اپنے گیراج میں گھس کر گھر میں پہنچ گئی۔ کپڑے بدل کر وہ کوئی لائٹ روشن کیے بغیر بستر میں گھس گئی۔ تب اسے اطمینان ہوا کہ اس نے بلانچے کو متوجہ نہیں ہونے دیا۔

مگر صبح ہوتے ہی بلانچے اس کے پاس آن دھمکی۔ سلویا نے خندہ پیشانی سے اس کا خیر مقدم کیا اور کافی اور بسکٹ سے اس کی خاطر تواضع کرتے ہوئے خفگی بھرے لہجے میں کہا۔

”آج تو جان نے حد کر دی۔ ساری رات گھر سے باہر گزار دی۔ اب آئے گا تو اس کی خوب خبر لوں گی۔ آوارگی کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ مجھ سے کہہ کر گیا تھا کہ دفتر میں ایک اہم میٹنگ ہے مگر ابھی تک گھر واپس نہیں لوٹا۔“

”تم نے اسے جاتے دیکھا تھا۔“ بلانچے نے کہا۔ ”تقریباً چھ بجے تھے نا؟“

سلویا نے کہا۔ ”مجھے لگتا ہے دفتر میں میٹنگ کا تو صرف بہانہ تھا۔ غالباً کسی دوست کے گھر میں نشے میں دھت ہو گیا ہوگا۔ رات بھر پوکر کھیلا ہوگا، میں شرط لگا سکتی ہوں۔“

تب ہی دروازے پر ہونے والی دستک ان کی گفتگو میں خلل انداز ہوئی۔

سلویا نے دروازہ کھولا تو اسے ایک وردی پوش پولیس والا نظر آیا۔

”آپ مسز جان کونرز ہیں؟“ پولیس افسر نے پوچھا، پھر جواب کا انتظار کیے بغیر بولا۔ ”میں نہیں جانتا کہ آپ کو یہ کیسے بتاؤں، لیکن آج صبح ایک گلی سے آپ کے شوہر کی لاش ملی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ ڈکیتی کا شکار ہوا ہے۔“

سلویا نے حیرت اور صدمے کے اظہار کے لیے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا۔ وہ اپنی کرسی پر گر گئی اور کانپنے لگی۔

”تاہم ایک عجیب و غریب بات میرے مشاہدے میں آئی ہے۔“ پولیس افسر نے باورچی خانے میں اِدھر اُدھر نظریں دوڑاتے ہوئے کہا پھر وہ گیراج کی طرف جانے والی راہداری میں دیوار پر موجود لکڑی کی دھاتی کھونٹیوں والے بورڈ کی طرف بڑھا۔ ساتھ ہی اس نے گفتگو جاری رکھی۔ ”ہمیں آپ کا شوہر، اس کا پرس اور اس کی کار مل گئی، لیکن ڈھونڈنے کے باوجود گاڑی کی چابی نہیں مل سکی۔“

یہ کہتے ہوئے اس نے بورڈ پر ایک کھونٹی میں لگی چابی اتار کر اپنے ہاتھ میں لے لی۔ اس کی انگلی میں لٹکی چابی کے چھلے سے منسلک گھونگے کے بیضوی خول پر کندہ جان کونرز کے نام کے ابتدائی حروف ”جے سی“ دور سے ہی واضح دکھائی دے رہے تھے۔ پولیس افسر نے گہرے طنز کے ساتھ بات آگے بڑھائی۔ ”میں سخت حیران تھا کہ جان کونرز نے چابی کے بغیر گاڑی چلانے کا انتظام کیسے کیا ہوگا۔ شکر ہے، یہاں پہنچتے ہی مجھے اپنے سوال کا جواب مل گیا۔“

سلویا کو لگا کہ اس کا سکون رخصت ہو چلا ہے اور گھبراہٹ اس پر غالب آتی جا رہی ہے۔

xxx

کچھ لوگوں کی زبان میں اللہ ایسی تاثیر دیتا ہے کہ جو بات نکلے
وہ پوری ہو جاتی... اور یہ مقام ہر ایک کے حصے میں نہیں آتا
مگر جسے مل جاتی ہے وہی جان سکتا ہے کہ اس کی قدر کیسے
کی جاتی ہے... اسے بھی ایک ایسی ہی شخصیت کا سامنا تھا
جس کی حقیقت نا سمجھی میں وہ سمجھ ہی نہ سکا اور عقل
کل کا مظاہرہ کرتے ہوئے انتہا کی حماقت کر ڈالی... پھر کیا تھا
اس کی زبان سے نکلے لفظوں نے اس کے گرد ایسا حصار کھینچا
کہ نکلنا محال ہو گیا... اس بھید کو سمجھنا مشکل ترین تھا
مگر اس کے کاروباری باپ نے بالآخر اس اسرار کو کھول ہی
لیا... پھر تو اس بیوپاری نے ایسی چالیں چل دیں جو سب کے
کی لیے الٹی تھیں مگر وہ جانتا تھا کہ وہ کس قدر سیدھی اور
سچی چال چل رہا ہے... البتہ محبت کے حصول کے لیے اسے
کسی چال کی بیرمعافی کی ضرورت تھی... لہٰذا ان بھولے
بسرے لفظوں کے تعاقب نے اسے واپس انہی رستوں کی تلاش
میں بے چین کر ڈالا۔

بددعا کے حصار میں قید ایک منچلے نوجوان کی آزمائشوں کی دلچسپ اور انوکھی داستان

کاروباری چال

طاہر جاوید مغل

شہزاد کروڑ پتی باپ وراب وحید کا بیٹا تھا۔ قبول صورت اور نوجوان تھا اسے لڑکیوں کی بھلا کیا کمی ہو سکتی تھی مگر ورمن کچھ ایسی اس کے دل میں اتری تھی کہ باقی سب کچھ اس کے لیے غیر ہو گیا۔ ورمن ایک متوسط گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ وہ بھائی بہنوں میں سب سے بڑی تھی۔ اس کے والد فاروقی صاحب کو اس سے اضافی پیار تھا وہ اسے اعلیٰ مقام پہ دیکھنا چاہتے تھے۔ ورمن بی ایس سی کر رہی تھی۔

بھیگے بھیگے سے اس سرد موسم میں شہزاد اپنے کمرے کی کھڑکی سے لگا بیٹھا تھا اور وحید ہاؤس کے وسیع و عریض لان میں پھول پتیوں کو بارش میں بھیگتے دیکھ رہا تھا۔ معصوم ورمن کا چہرہ بار بار اس کے پردۂ تصور میں ابھرتا اور دل کو درد سے بھر جاتا۔ جانے کیوں کسی وقت اسے لگتا تھا کہ شاید وہ ورمن کو کھو دے گا۔ اللہ رب العزت نے شہزاد کو ایک ایسا اوٹ پٹانگ والد فراہم کیا تھا جس کی شاید کوئی کل سیدھی نہیں تھی۔ وہ بہت چاہتے ہوئے بھی اپنے سیماب صفت والد کا احترام نہیں کر پاتا تھا۔

آج صبح سویرے والد نے، جنہیں وہ باداجی کہتا تھا، شہزاد سے ایک ایسی بات کہی تھی جو اس کی کھوپڑی میں نہیں آئی بلکہ وہ ایسی بات تھی جو شاید کسی کی کھوپڑی میں بھی نہیں آسکتی تھی۔ اس بات کا کوئی سر پیر نہ تھا اور شہزاد صبح سے بیٹھا اپنا سر دھن رہا تھا۔ اب چونکہ وہ سر دھن دھن کر تھک گیا تھا لہٰذا اس نے اپنے لنگوٹیے یار "مارکو" کو بلایا تھا تاکہ اس کے ساتھ اپنی شدید حیرانی و پریشانی شیئر کر سکے اور پھر دونوں اپنے سر دھن سکیں۔

مارکو بھی ایک امیر فیملی سے تعلق رکھتا تھا اور کالج کے زمانے سے اس کا دوست تھا۔ جب مارکو پہنچا تو وہ بھی حیران تھا کیونکہ شہزاد نے فون پر اسے تھوڑی بہت بات بتا بھی دی تھی۔ وہ اپنی گول گول آنکھوں میں تعجب لیے صوفے پر ڈھیر ہو گیا اور صوفہ اس کے اضافی وزن سے چرچرا کر رہ گیا۔

"یار! انکل نے نشہ وغیرہ تو نہیں شروع کر دیا؟" ارسلان عرف مارکو نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

"اس کا تو پتا نہیں لیکن مجھے ضرور لگ رہا ہے کہ میں نے صبح سے بڑی مقدار میں چرس پی رکھی ہے اور میرا دماغ گھومتا چلا جا رہا ہے۔ یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ باداجی نے یہ سب کچھ کہا ہے۔"

"دوسری وجہ ان کی دماغی صحت ہو سکتی ہے۔" مارکو نے خیال ظاہر کیا۔

"یار! دماغی صحت ان کی ٹھیک کب تھی۔ مجھے تو آج تک پتا ساتک بھی نہیں ہوا کہ وہ جاگی ہوئی روحیں ہیں لیکن آج صبح انہوں نے جو چھکا مارا ہے وہ تو سمجھ سے بالکل ہی بالاتر ہے۔"

"تو پھر انکار کر دو۔ کہہ دو ان سے کہ میں دنیا کے سامنے اپنا تماشا نہیں لگا سکتا۔ لوگ مجھے کھوتا کہنا شروع کر دیں گے۔ بلکہ ممکن ہے کھوتے کا پتر۔ میری عزت کا جنازہ نکل جائے گا۔"

"یہ سب کچھ کہا تھا میں نے۔ بولے تھے کہ جب تمہیں عاق کروں گا اور کوڑی کوڑی کو محتاج ہو جاؤ گے تو عزت کا جنازہ نہیں نکلے گا؟"

"یعنی انکل نے تمہاری غیرت کو جگانے کی کوشش کی حالانکہ جگایا اس چیز کو جاتا ہے جو موجود ہو کر سو رہی ہو۔"

"تو بھی انسان کا بچہ بن۔ چٹکیاں نہ کاٹ۔ میں واقعی پریشان ہوں۔ تجھے پتا ہے میں روپے پیسے کا بھوکا نہیں ہوں۔ مجھے اپنے لیے تو کچھ نہیں چاہیے مگر ورمن کے لیے سب کچھ چاہیے۔ میں اسے بیاہ کر نہیں بلکہ حقیقتاً سونے میں تول کر اپنے گھر لانا چاہتا ہوں۔ دنیا جہان کی خوشیاں اس کے قدموں میں ڈھیر کرنا چاہتا ہوں۔ وہ سب کچھ اسے دینا چاہتا ہوں جو اب تک کسی نے کسی کو نہ دیا ہو۔"

"تو پھر مان لو انکل کی بات۔ اپنا وارث بنانے کے لیے ایسی آسان شرط تو شاید آج تک دنیا میں کسی باپ نے کسی بیٹے کے سامنے نہیں رکھی ہوگی۔"

شہزاد نے امپورٹڈ سگریٹ سلگا کر بیڈ کے کراؤن سے ٹیک لگائی اور جسم کو جیسے ڈھیلا چھوڑ دیا۔ دھیمے لہجے میں بولا۔ "اب تو میں بھی ایسے ہی سوچ رہا ہوں۔ جب وہ خود کہہ رہے ہیں کہ آ بیل مجھے مار۔۔۔ اور مسلسل کہہ رہے ہیں تو پھر بیل کو کچھ نہ کچھ تو کرنا پڑے گا۔"

شہزاد کے والد صاحب اپنی طرز کے انوکھے بندے تھے۔ انہیں بڑھاپے کی تقریباً ساری بیماریاں لاحق تھیں اور ستم یہ تھا کہ جوانی اور نوجوانی کی بیماریوں نے بھی ابھی پیچھا نہیں چھوڑا تھا۔ پرہیزی کھانا کھاتے تھے اور پرہیز صرف ان ہی چیزوں سے ہوتا تھا جو ڈاکٹر صاحبان نے انہیں کھانے کے لیے کہی ہوتی تھیں۔ نتیجہ یہ تھا کہ ان کا دستر خوان کوٹھی کے سبزہ زار لان سے بس تھوڑا ہی چھوٹا ہوتا تھا۔ ڈائٹنگ سے مراد وہ یہ لیتے تھے کہ "ڈٹ کر ڈائٹ لی جائے" لہٰذا جب خوش ہوتے تھے تو بہت زیادہ ڈائٹنگ کرتے تھے اور پھول کر کپا ہو جاتے تھے۔

اپنی انوکھی شرط جو انہوں نے آج صبح شہزاد کے

سامنے رکھی تھی اس کی داغ بیل تو وہ پچھلے تقریباً ایک ماہ سے ڈال رہے تھے مگر آج صبح انہوں نے سب کچھ کہہ دیا تھا۔ انہوں نے بات اس طرح شروع کی تھی۔ "دیکھو شہزادے! اب بوڑھا ہو رہا ہوں۔ کبھی سوچتا ہوں کہ سب کچھ تمہیں سونپ کر زیارتوں کے لیے چلا جاؤں اور پھر ادھر ہی رہ جاؤں (شہزاد کو شک تھا کہ وہ امریکا، یورپ وغیرہ جانے کی بات کر رہے ہیں)۔ باپ جب سب کچھ اپنی اولاد کو دیتا ہے تو اس سے پہلے اس کا کچھ امتحان بھی لیا چاہتا ہے۔ دیکھنا چاہتا ہے کہ اولاد یہ سب کچھ سنبھالنے کے قابل ہے بھی یا نہیں (ان لمحوں میں شہزاد کو باداجی اورنگ زیب عالمگیر نظر آئے حالانکہ اپنی رنگین مزاجی کے حوالے سے وہ جہانگیر اور اکبر وغیرہ کے قریب تھے)۔

ایک طویل سانس بھر کر انہوں نے کہا۔ "میں نے جو فیصلہ کیا ہے حتمی ہے۔ اس میں چوں چرا کی بلکہ صرف چرا... کی گنجائش بھی نہیں ہے۔ میں نے منیجر اکاؤنٹس سے کہہ دیا ہے۔ وہ کل دس کروڑ روپیہ تمہارے پرسنل اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کر دے گا۔ تم نے اس دس کروڑ کو کاروبار میں لگانا ہے اور آٹھ نو ماہ کے اندر اندر مجھے رزلٹ دینا ہے۔"

شہزاد باپ کے ساتھ کاروبار میں شریک تھا۔ لاہور کی دو بسکٹ فیکٹریاں اور ایک ادویہ ساز کمپنی کا کام اس اکیلے نے سنبھال رکھا تھا۔ اسے اب خاصا تجربہ تھا۔ بے شک پچھلے کچھ عرصے سے اس کی کاروباری منصوبہ بندیاں کچھ زیادہ کامیاب نہیں ہو رہی تھیں پھر بھی باداجی کی شرط اسے کچھ زیادہ کٹھن محسوس نہیں ہوئی۔ وہ آٹھ نو ماہ میں اس دس کروڑ کو چودہ پندرہ کروڑ میں تو بدل ہی سکتا تھا لیکن باداجی نے اپنا اصل اور بے ہودہ ترین بم ابھی شہزاد کے سر پر نہیں پھوڑا تھا۔ انہوں نے اپنی توند کھجاتے ہوئے فرمایا۔ "آٹھ ماہ میں تم نے اس دس کروڑ کو کاروبار کے ذریعے دو کروڑ کر کے دکھانا ہے۔۔۔ ہاں دو کروڑ۔ یعنی اسے بڑھانا نہیں، گھٹانا ہے۔ مہلت پوری ہونے پر تمہارے پاس زیادہ سے زیادہ دو کروڑ ہونا چاہیے۔" اس کے ساتھ ہی انہوں نے بڑے غور سے شہزاد کا چہرہ دیکھا اور بولے۔ "اگر تمہارے چھوٹے سے دماغ میں کوئی الٹی سیدھی بات آ رہی ہے تو اسے ابھی اسی وقت دماغ سے نکال دو۔ اس دس کروڑ میں سے آٹھ کروڑ ویسے ہی کہیں پھینک نہیں دینا۔ اسے کاروبار کے ذریعے کم کرنا ہے۔۔۔ کاروبار کے ذریعے۔" انہوں نے ایک ایک لفظ پر زور دیا۔

☆☆☆

ورمن بہت پیاری تھی اور ہنستے ہوئے کچھ اور بھی پیاری لگتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ شہزاد اسے ہر وقت ہنستے ہوئے ہی دیکھنا چاہتا تھا مگر فی الوقت وہ بھی کچھ حیران پریشان تھی۔ دونوں ایک ریسٹورنٹ کے فیملی کیبن میں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ بالوں کی ایک لٹ بیل کی طرح ورمن کے چہرے پر جھول رہی تھی اور اس کی ناک کو چھونے کی کوشش کر رہی تھی جیسے اس ننھے سے تل کو بوسہ دینا چاہتی ہو جو اس کی ناک کی چوٹی پر واضح تھا۔ شہزاد کو یہ تل اپنی علیحدہ حیثیت میں ورمن ہی کی طرح پیارا تھا۔

ورمن کے والد کالج میں پولیٹیکل سائنس کے پروفیسر تھے۔ اس کے علاوہ وہ ایک سلجھے ہوئے سیاست دان بھی تھے۔ ان کے سلجھے ہوئے ہونے کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا تھا کہ وہ بڑی واضح اکثریت سے تین بار صوبائی اسمبلی کا الیکشن ہار چکے تھے۔

ورمن نے گہرے سانس لیتے ہوئے کہا۔ "شہزاد! میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا۔ یہ تو سراسر تماشا بننے والی بات ہے۔ تم۔۔۔ تم اس دس کروڑ میں سے آٹھ کروڑ کہیں ویسے ہی دائیں بائیں کر دو۔ بعد میں بے شک کاروبار میں ڈال دینا۔"

"یہی تو مسئلہ ہے ڈارلنگ! باداجی نے باقاعدہ قسم لی ہے مجھ سے کہ میں نے اس پیسے کو بذریعہ کاروبار ہی برباد کرنا ہے اور قسم بھی پتا ہے کس کی لی ہے؟ جو مجھے دنیا میں سب سے زیادہ پیارا ہے۔"

"اور وہ کون ہے؟"

"قیامت کی نشانی ہے کہ یہ بھی تم پوچھ رہی ہو۔ بھئی، میں نے تمہارے سر کی قسم کھائی ہے۔"

ورمن نے حیرت سے کہا۔ "یعنی تم نے انکل سے کہا کہ میں ورمن کے سر کی قسم کھاتا ہوں؟"

شہزاد نے اثبات میں سر ہلایا۔ ورمن گہری سانس لے کر بولی۔ "چلو انکل نے یہ تو تسلیم کر لیا کہ تم مجھے اپنی مرحومہ امی کے بعد دنیا میں سب سے زیادہ پیار کرتے ہو۔"

"ہاں تو وہ لیں گے لیکن سوئی ان کی وہیں پر اٹکی رہے گی۔ میری شادی اپنے پارٹنر وارث شیخ کی بیٹی سے کرنا چاہیں گے۔"

اسی دوران فون پر کال کے سگنل آئے۔ شہزاد نے کال ریسیو کی۔ دوسری طرف اس کا لنگوٹیا ارسلان عرف مارکو تھا۔ چھوٹتے ہی بولا۔ "شہزاد! ایک سنہری سوچ کا پتا چلا ہے۔ سات آٹھ کروڑ کی انویسٹمنٹ ہے۔ ان شاء اللہ مارچ اپریل تک ساڑھے چھ کروڑ کا نقصان تو یقینی ہے۔"

"اچھا، فون پر کروڑوں کی باتیں نہ کیا کرو۔ یہاں آ جاؤ ریستوران میں۔ ورمن بھی یہیں پر ہے۔" مارکو نے کہا۔

"چلو ٹھیک ہے۔ میں آ رہا ہوں۔" گفتگو سن رہی تھی۔ اپنا خوش اخلاق آن تھا۔ ورمن نے

"اچھا بھئی، میں تو پھر چلتی ہوں۔" بیگ سنبھالتے ہوئے بولی۔ گفتگو بیان فرمانے سے قبل وہ دانش مندانہ تم دونوں جس طرح کی دانش مندانہ گفتگو فرمانے والے ہو اس سے میرے دماغ کی چولیں ہل جائیں گی۔"

"رک جاؤ یار! تمہارے اچانک جانے سے میرے دل کی چولیں بھی تو ہل جاتی ہیں۔"

"چولیں دل کی نہیں، دماغ کی ہوتی ہیں۔ سارے مزاحیہ ڈراموں اور فلموں میں ایسے ہی کہا جاتا ہے۔" وہ مسکرائی۔

"اچھا چلو تو دیتی جاؤ۔" وہ معنی خیز انداز میں بولا۔

"کوئی بل نہیں۔" اس نے شوخی سے جواب دیا۔

"اچھا بائے ہی سہی۔" اس نے کہا اور تین چار سیکنڈ کے لیے ورمن کو بیٹا بانہوں میں بھرا۔

وہ سرخ چہرے کے ساتھ دروازے کی طرف گھومی تو وہ بولا۔ "ایسا سادہ لوح ویٹر کہیں پر دیکھا ہے۔ بل چھوڑ دیتا ہے، صرف ٹپ سے کام چل جاتا ہے۔"

پتا نہیں کیوں شہزاد کو ایسے لگا تھا کہ ورمن اس سے بے پناہ پیار رکھنے کے باوجود اس حوالے سے کچھ ابھی ہوئی سی رہتی ہے۔ کبھی کبھی لگتا تھا کہ وہ چاہتے ہوئے بھی اس سے فاصلے پر رہ رہی ہے اور یہ سب کچھ کوئی دو سال پہلے شروع ہوا تھا اور بات صرف ورمن ہی کی نہیں تھی اور بھی کئی حوالوں سے پچھلے دو برس اس کے لیے مثبت نہیں رہے تھے۔ بزنس کے کئی معاملات بھی اس میں شامل تھے۔

ورمن کے جانے کے پانچ دس منٹ بعد ہی مارکو آ دھمکا۔ اس کے گول چہرے پر دبا دبا جوش تھا۔ اپنے قیمتی موبائل کی اسکرین شہزاد کے سامنے رکھتے ہوئے بولا۔ "یہ دیکھو جیسے ایک نقشہ دیکھو۔ یہ گوجرانوالہ سے کوئی چودہ میل آگے قریباً 180 ایکڑ زمین ہے۔ دو گندے نالے اس کے بیچوں بیچ سے گزرتے ہیں۔ ساتھ والا کوئی سو ایکڑ رقبہ ایک نہایت بدمعاش اور کمینی قسم کی پارٹی کے پاس ہے۔ اکثر جھگڑے بھی ہوتے ہیں۔ یہ 180 ایکڑ رقبہ مالک 10 لاکھ روپے فی ایکڑ کے حساب سے دے رہا ہے۔ بھاؤ تاؤ میں امید ہے کہ چالیس پچاس ہزار فی ایکڑ سے زیادہ رعایت نہیں کرے گا۔ مطلب یہ کہ قریباً ساڑھے سات کروڑ کی سرمایہ کاری تو یہ ہوگی۔"

"نفع کا رسک کیا ہے؟" شہزاد نے متانت سے پوچھا۔

"ون پر سنٹ یا شاید اس سے بھی کم۔ گھما پھرا کر اطلاع پھر دی ہے۔ یہ زمین بک کر نہیں دے گی۔ کوئی بیتا گھوڑا ہو کر ہم پلے سے بھی جا سکتے ہیں۔" مارکو خوش ہو کر بولا۔

"تو تم کتنا کماؤ گے؟"

"زیادہ نہیں یار! ابھی میں پراپرٹی کا ریٹ سستا ہو کر گرتا جا رہا ہے۔ اوپر سے یہ جو نئی ڈیل وغیرہ کے چکر چل گئے ہیں۔"

"پونے ڈھائی کروڑ کہاں کھپائیں گے؟" شہزاد نے گہری سانس لیتے ہوئے پوچھا۔

"پہلے! اس کا بھی کچھ نہ کچھ ہو جائے گا ان شاء اللہ! پہلے بڑی رقم سے تو نمٹیں۔"

شہزاد اور مارکو کے اگلے دو تین ہفتے کافی مصروف گزرے۔ والد بادشاہ جی کا تقاضا یہ تھا کہ زمین کے سودے کے وقت کسی اچھے وکیل کو بھی شامل کیا جائے۔ بہرحال کاغذات کی جانچ پڑتال کے بعد وہ 180 ایکڑ زرعی زمین خرید لی گئی۔ کافی سارا رقبہ سیم تھور کے اثر میں تھا۔ امریکن سنڈی بھی پائی جاتی تھی۔ شہزاد کا خیال تھا کہ یہاں کوئی فصل وغیرہ لگا لیتے ہیں جو یقیناً خاطر خواہ نقصان پہنچائے گی۔ تاہم مارکو نے اختلاف کیا۔ اس کا کہنا تھا کہ سیم اور تھور تو ٹھیک ہے مگر امریکن سنڈی کا کوئی بھروسا نہیں کہ مدد کے لیے وقت پر آئے نہ آئے۔

☆☆☆

شہزاد اور مارکو کو زمین خریدے بہ مشکل چھ ہفتے ہی ہوئے تھے کہ ان پر ایک خبر بجلی بن کر گری۔ یہ خبر ورمن نے ہی ان تک پہنچائی تھی۔ اس وقت شہزاد اور مارکو شہزاد ہی کے گھر میں عالیشان بیڈ روم کے اندر چائے پی رہے تھے۔ پچھلے دو گھنٹے سے مسلسل 1200 روپے پاؤ والے چلغوزے ٹھونگ رہے تھے۔ ساتھ ساتھ کسی ایسے نہایت رنگین اور رذیل قسم کے کاروبار کا سوچ رہے تھے جس میں اڑھائی کروڑ لگا کر یقینی نقصان حاصل کیا جا سکے۔ فون کی بیل ہوئی۔ یہ ویڈیو کال تھی۔ دوسری طرف ورمن مرجھائی ہوئی سی مسکراہٹ کے ساتھ نظر آ رہی تھی۔

"خیریت ہے؟" شہزاد نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

"اتنی زیادہ بھی نہیں۔" وہ بولی۔ "ابھی پاپا کسی سیاسی میٹنگ میں گئے ہوئے تھے۔ واپس آ کر انہوں نے ایک خبر دی ہے جو تم دونوں کے لیے یقیناً دلخراش ہوگی۔"

"اب بتا بھی چکو۔" شہزاد نے سینے پر ہاتھ رکھ کر ہارٹ اٹیک کا خدشہ ظاہر کیا۔

"وہ جو زمین تم نے پچھلے دنوں خریدی ہے، وہاں سے سڑک نکل رہی ہے۔ یہ سڑک رائے ونڈ روڈ سے جا ملے گی۔ سمجھو، اردگرد کی پراپرٹی کو چار چاند لگنے والے ہیں، بلکہ لگ چکے ہیں۔"

شہزاد اور مارکو نے ہراساں نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ انہیں یقین نہیں آ رہا تھا مگر جب ورمن نے تفصیل بتائی تو یقین کرنا پڑا۔

"اب کیا ہوگا؟" شہزاد نے پُرتشویش لہجے میں پوچھا۔

"پاپا کہہ رہے تھے کہ سڑک کی خبر نکلتے ہی اردگرد کے علاقے میں قیمتیں بڑھ گئی ہیں مگر ابھی یہ اور بڑھیں گی۔ بہتر تو یہی ہے کہ بڑے نقصان... میرا مطلب ہے بڑے نفع سے بچنے کے لیے اس جگہ سے جان چھڑا لو۔"

جونہی ورمن سے بات ختم ہوئی، شہزاد نے زمین دلانے والے ڈیلر کو فون کیا۔ وہ بغیر کسی تمہید کے بولا۔ "دیکھا شہزاد ولد صاحب! میں نے کہا تھا کہ یہ جگہ فائدہ دے گی۔ اب تو آپ کی طرف مٹھائی پکی ہو گئی ہے۔"

"کیا صورت حال ہے؟" شہزاد نے لہجے کو ہشاش بشاش رکھنے کی پوری کوشش کی۔

"آپ نے ساڑھے نو لاکھ فی ایکڑ دیا تھا۔ تیرہ چودہ لاکھ تو آپ کو ابھی مل جائے گا۔ اللہ کے کرم سے۔"

"تیرہ چودہ لاکھ۔" شہزاد نے حیرت سے آنکھیں پھاڑیں۔

"جی ولد جی! اور اگر تین چار مہینے انتظار کریں تو سترہ اٹھارہ لاکھ فی ایکڑ تو کہیں نہیں گیا۔ بس مٹھائی کھلا دیں آپ۔"

"میں زہر نہ کھلا دوں کہیں۔" شہزاد زیر لب بڑبڑایا۔

"جی، کیا کہا ولد صاحب؟"

"کچھ نہیں، اپنے ملازم سے بات کر رہا تھا۔"

بات ختم ہوئی تو شہزاد اور مارکو دونوں کا رنگ پھیکا پڑا ہوا تھا۔ شہزاد نے جلدی سے موبائل کے کیلکولیٹر پر حساب جوڑ۔ آنکھیں پھاڑتے ہوئے بولا۔ "چودہ لاکھ... یعنی چودہ لاکھ ضرب 80۔ مطلب گیارہ کروڑ بیس لاکھ۔ اس میں باقی والا ڈھائی ملایا تو قریباً چودہ کروڑ کے لگ بھگ۔ او خدایا... یہ کیا کر دکھایا؟"

☆☆☆

چند روز بعد کی بات ہے۔ شام کا وقت تھا۔ شہزاد اپنے کمرے میں اداس بیٹھا سگریٹ پھونک رہا تھا۔ شیو بڑھی ہوئی تھی۔ اس نے کھڑکی میں سے نیچے جھانکا۔ اپنی گاڑی سے نکل کر اس کے والد حضور گھر کے اندر آ رہے تھے۔ عقب میں دو چوکس گارڈز تھے۔ پہلو میں آفت کی پرکالہ خوبرو شائستہ مون تھی۔ یہ بادشاہ جی کی سیکریٹری تھی تاہم اکثر "دفتری امور" نمٹانے کے لیے بادشاہ جی اسے گھر بھی لے آتے تھے۔ ایسے ہی "دفتری امور" پہلے بھی کئی خواتین نمٹاتی رہی تھیں مگر یہ شائستہ مون تو بادشاہ جی سے چپک کر رہ گئی تھی۔

قریباً پانچ منٹ بعد باوردی ملازم نے آ کر شہزاد کو اطلاع دی کہ بادشاہ جی اس سے ملنے آ رہے ہیں۔ اس نے سگریٹ ایش ٹرے میں مسلا اور الجھے بالوں کو انگلیوں سے سنوارا۔ بادشاہ جی جب کسی کمرے میں نمودار ہوتے تھے تو پہلے ان کی توند نمودار ہوتی تھی۔ آج بھی وہ توند کے پیچھے پیچھے تشریف لے آئے۔ بادشاہ جی کی حرکات دیکھ دیکھ کر شہزاد کسی وقت بولنے پر مجبور ہو جاتا تھا۔ آج بھی اس سے رہا نہیں گیا، بولا۔ "بادشاہ جی! یہ دو ٹکے کی سیکریٹری کیوں ہر وقت آپ سے چپکی رہتی ہے؟"

"تمہیں اس کے سیکریٹری ہونے پر اعتراض ہے یا دبلی پتلی ہونے پر۔ اگر دبلی پتلی ہونے پر اعتراض ہے تو یہ بالکل غلط ہے۔ سب جانتے ہیں کہ میرے قریب کوئی بھی کھڑا ہو جائے، دبلا پتلا ہی لگے گا۔"

"مجھے اعتراض اس بات پر ہے کہ وہ گھر آتی ہے بلکہ اعتراض بھی نہیں، یہ ایک خوف ہے۔"

"کس بات کا خوف؟"

"اپنے سے تین چار سال چھوٹی لڑکی کو "والدہ" کہنے کا خوف۔"

"تم مجھے کون سا بابا کہتے ہو جو اسے ممی کہو گے۔ بہرحال فی الوقت ان ادھر ادھر کے مسائل کو چھوڑو۔ موجودہ مسئلے کی بات کرو۔"

"یعنی آپ کو پتا چل گیا ہے کہ گوجرانوالہ والی وہ زمین گھاٹے میں جانے کے بجائے اچانک مہنگی ہو گئی ہے۔"

"ابھی تو اور مہنگی ہونی تھی بیٹا جی! یہ تو تم نے دانش مندی سے کام لیا کہ اس سے پیچھا چھڑا لیا۔ مجھے لگ رہا ہے کہ زمین کی قیمت کے ساتھ ساتھ تمہاری پریشانی بھی بڑھی ہے۔" وہ خاموشی سے اپنی گدی سہلاتا رہا۔ ایک لمبے توقف کے بعد ارباب ولد نے کہا۔ "اچھا، چلو تمہیں ایک اور پیشکش بھی کرتا ہوں... بلکہ دو پیشکشیں۔ پہلی تو یہ کہ تمہاری مہلت تین مہینے اور بڑھا دیتا ہوں۔ دوسری یہ کہ اگر تم اس رقم کو دو کروڑ تک لانے میں کامیاب ہو گئے تو میں تمہاری نامعقول گرل فرینڈ ورمن کے معاملے پر نظرثانی کا سوچوں گا۔"

وہ بھی بڑی لگتی ہیں۔ اگر تم میں ذرا سی بھی انسانیت ہے تو تمہیں میری امانت کی داد دینا چاہیے تھی۔"

"تم تو کچھ ختم کرتے ہو یا میں اٹھاؤں جوتی؟"

وہ مسکراتے انداز میں بولا۔ "یارا ایک بہت بڑا ریسٹورنٹ کھولتے ہیں، بلکہ ہوٹل۔"

"بکواس بند کر۔ آج کل ہوٹل بہت چلتے ہیں۔ گوجرانوالہ پاس ہی ہے۔ اس قربت کی وجہ سے لاہوریوں میں بھی بسیار خوری کی تمام علامات نمودار ہو چکی ہیں۔ یہ لوگ بڑے سے بڑے ہوٹل کو کامیاب کر سکتے ہیں۔"

ورمن نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔ "مارکو بھائی! ویسے آئیڈیا اتنا برا بھی نہیں ہے۔ اچھے سے اچھے کھانے کی حد تو ہو سکتی ہے مگر برے سے برے کی نہیں۔ کوئی بھی نالائق ہیڈ خانساماں بڑے سے بڑے ہوٹل کو ایک دو ماہ میں تباہ کر سکتا ہے۔"

"باواجی اتنے بھی بے وقوف نہیں جتنا تم سمجھ رہے ہو۔" شہزاد نے برا سا منہ بنایا۔ "میں نے چند روز پہلے ان سے اس آئیڈیا پر بات کی تھی۔ انہوں نے پہلا فقرہ یہ بولا..... "شہزادے! ضرور بنا ہوٹل لیکن اب تجربے کے نام پر کسی لانڈی تجھے نہیں مارنے دوں گا۔ جتنا بڑا مرضی ہوٹل کھول اور جہاں تیری مرضی کھول مگر اس کا مینیجر اور سروس وغیرہ بالکل ٹھیک ہونی چاہیے۔ اگر ایسا نہیں ہوگا تو یہ فائل بند ہوگا اور پھر....."

"ایک منٹ..... ایک منٹ۔" مارکو نے تیزی سے اس کی بات کاٹی۔ "انہوں نے کہا کہ جتنا بڑا مرضی ہوٹل کھول اور جہاں تیری مرضی کھول؟"

"ہاں..... کہا انہوں نے۔"

"بس..... بس، یہی تو پوائنٹ ہے۔ اصل نکتہ تو یہی ہوٹل کی لوکیشن ہے بیٹے! ایسی سپر لوکیشن ڈھونڈی ہے کہ... ان شاء اللہ یہ پروجیکٹ دن رات چوگنا نقصان اٹھائے گا۔"

شہزاد کے چہرے پر چمک نمودار ہوئی۔ ورمن کے چہرے پر بھی دلچسپی کے آثار نظر آئے۔ مارکو نے بات جاری رکھتے ہوئے موبائل پر ایک نقشہ دکھایا۔ یہ لاہور سے تیس چالیس کلومیٹر آگے کا ایک علاقہ تھا۔ تقریباً سنسان ہی تھا۔ ایک ٹوٹی پھوٹی تنگ سڑک وہاں سے گزر رہی تھی۔ مارکو نے ایک جگہ انگلی رکھی۔ "یہ دیکھو جی۔ یہ ہے وہ بلڈنگ..... بلکہ اسے حویلی کہنا چاہیے۔ ارد گرد باغ ہے۔ ٹوٹل کوئی تین ایکڑ رقبہ ہے۔ کسی زمانے میں کوئی دیسی انگریز یہاں رہتا تھا۔ اب یہ برائے فروخت ہو رہا ہے۔"

"تو ہم یہاں ہوٹل بنائیں گے؟" شہزاد نے تیوری چڑھائی۔

"بالکل بنائیں گے اور آج کل یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔ لوگ پرانی عمارتوں کو خریدتے ہیں۔ انہیں پرانی طرز پر ہی "رینوویٹ" کرتے ہیں۔ حویلیوں کے انداز میں ہی سجاتے ہیں اور ہوٹل کی شکل دے دیتے ہیں۔ یہاں لاہور میں بھی کئی لوگوں نے اس طرح کے کامیاب ہوٹل بنائے ہوئے ہیں۔"

"لیکن اس ویران ہوٹل میں پہنچے گا کون؟" ورمن نے بے ساختہ کہا۔

"میری پیاری بہن! ابھی تو خوبصورتی ہے اس پلاننگ کی۔ اس ہوٹل میں پہنچے گا کون؟ پھر ایک اور بات اہم ہے جس کا شاید کسی اور کو پتا نہ ہو مگر مجھے پتا ہے۔"

شہزاد اور ورمن سوالیہ نظروں سے مارکو کا گول مٹول چہرہ دیکھنے لگے۔

مارکو نے دیدے گھماتے ہوئے کہا۔ "علاقے میں دو تین خطرناک برادریاں بھی موجود ہیں۔ آپس میں تو لڑتی ہی ہیں، علاقے میں آنے جانے والے اجنبیوں کو بھی آڑے ہاتھوں لیتی ہیں۔" پھر اس نے دبی دبی پرجوش سرگوشی کی۔ "راہزنی کی وارداتیں ہوتی ہیں اور گاہے بگاہے اکا دکا ڈاکا بھی پڑ جاتا ہے۔"

بات اب کچھ کچھ سمجھ میں آ رہی تھی۔ شہزاد نے پرسوچ انداز میں کہا۔ "کتنے میں مل جائے گی عمارت؟"

"یارا عمارت تو بس ملبا ہی ہوتا ہے۔ اصل قیمت جگہ کی ہے۔ مالک دس کروڑ کہہ رہے ہیں۔ پوری امید ہے کہ وہ بس چالیس پچاس لاکھ ہی کم کریں گے۔ عمارت کو رینوویٹ کرنے اور سجانے سنوارنے میں بھی پانچ چھ کروڑ تو لگ ہی جاتا ہے۔ تھوڑا سا ہاتھ ڈھیلا چھوڑیں گے تو ایک دو کروڑ کا اضافہ ہو سکتا ہے۔ باقی رقم سروس شروع کرنے میں استعمال ہو جائے گی۔"

شہزاد سگریٹ سلگا کر بولا۔ "ٹھیک ہے۔ اللہ کرم کرتا ہے اور کام "نہیں" چلتا تو پھر کیا ہوگا؟ زیادہ سے زیادہ دو تین کروڑ کا نقصان ہو جائے گا۔"

"او نہیں میرے بیٹے! یہ جگہ چار سال سے ویب سائٹس پر لگی ہوئی ہے۔ ابھی تک نہیں بکی۔ آگے بھی نہیں بکے گی۔ ان شاء اللہ کوڑیوں کے بھاؤ نکالنا پڑے گا اسے بلکہ ہم انکل سے کہیں گے کہ وہ خود اسے بیچ لیں۔"

اس موضوع پر تینوں میں تقریباً دو گھنٹے مشورہ ہوا اور آخر فیصلہ اس پروجیکٹ کے حق میں ہو گیا۔

چائے وغیرہ پینے کے بعد ورمن تو چلی گئی مگر شہزاد اور

مارکو وہیں بیٹھے اس پروجیکٹ کے حوالے سے "دانش مندانہ" گفتگو فرماتے رہے۔ باتیں کرتے کرتے اچانک شہزاد کو یاد آیا۔ اس نے کہا۔ "شروع میں تم نے کہا تھا کہ اس تجویز میں سے ایک اور تجویز بھی نکلتی ہے؟"

"ہاں..... نکلتی تو ہے لیکن میں نے ورمن کے سامنے جان بوجھ کر نہیں بتائی۔ وہ ایویں پریشان ہوتی۔ اوکھی بوکھی سی تجویز ہے۔ مذاق مت اڑانا۔ بس ایک آئیڈیا سا ہے۔ ایسے ہی آئیڈیاز میں سے آئیڈیے نکلتے ہیں۔ لمبی لمبی کہانیاں بن جاتی ہیں..... دیوتا، شکاری، داستان جیسی..... اور شیطان کی آنت جیسے ٹی وی سوپ بن جاتے ہیں....."

"میں تمہیں جھانپڑ ماردوں گا مارکو! ہمیں شیطان کی آنت نہیں ناپنی۔ باواجی کی مہلت ختم ہونے سے پہلے کام مکمل کرنا ہے..... فاسٹ۔"

"یارا فاسٹ والی بات ہی تو کر رہا ہوں۔ سمجھو یہ ایک شارٹ کٹ ہے۔ کیا پتا کامیاب ہو ہی جائے۔ ہمیں ہوٹل والا پاپڑ ہی نہ بیلنا پڑے۔" وہ مسکرایا۔

"کیا مطلب؟"

جواب میں جو کچھ مارکو نے کہا، اس کا خلاصہ کچھ یوں تھا۔ مارکو کا خیال تھا کہ وہ زیادہ اچھا علاقہ نہیں ہے۔ رات کے وقت وہاں سائیکل سوار تک لٹ جاتے ہیں۔ اگر وہ دونوں بغیر کسی گارڈ وغیرہ کے، لوکیشن کی جانچ پرکھ کے لیے اپنی مرسیڈیز گاڑی میں وہاں گھومیں پھریں تو عین ممکن ہے کہ انہیں "اغوا" وغیرہ کر لیا جائے اور پھر اغواکار ان کی حیثیت کے مطابق بھاری بھرکم تاوان مانگیں۔ چونکہ یہ حادثہ لوکیشن کی تلاش اور چھان پھٹک کے سلسلے میں ہی پیش آئے گا لہٰذا کاروبار ہی کے کھاتے میں جائے گا..... اور کوئی بڑی بات نہیں کہ پندرہ بیس کروڑ آسانی سے ٹھکانے لگ جائیں۔

شہزاد نے مارکو کی ساری بات بڑے اطمینان و سکون سے سنی اور پھر سر جھکا کر خاموش ہو گیا۔ مارکو نے یہی جانا کہ تجویز اسے پسند آ رہی ہے مگر یہ طوفان سے پہلے کی خاموشی تھی۔ اچانک شہزاد نے جمپ لگایا اور اڑتا ہوا سا مارکو پر جا پڑا۔ اس اچانک افتاد سے گھبرا کر مارکو چاروں شانے چت ہو گیا۔ شہزاد نے تین چار کرارے گھونسے اس کی پسلیوں میں رسید کیے۔ مارکو نے پلٹ کر خود کو شہزاد کے نیچے سے نکالنا چاہا مگر وہ اس کی کمر پر سوار ہو گیا اور اس کی گردن کو آرم لاک لگا کر پھنکارا۔ "کسی بندر کی اولاد..... کبھی کبھی تو مجھے لگتا ہے کہ تو یار نہیں..... بار ہے۔"

مارکو نیچے سے پھنسی پھنسی آواز میں پکارا۔ "یارا میں صرف تجویز ہی تو دے رہا ہوں۔ کون سا اس پر عمل کر دیا ہے۔"

شہزاد نے دانت پیسے۔ "میں بھی گردن کو ذرا دبا ہی رہا ہوں نا..... کون سی توڑ دی ہے۔ کسی اندھی چڑیل کے لے پالک بچے! اب ہم اغوا ہی ہو گئے تو پھر یہ اغواکاروں کی مرضی ہوگی کہ وہ کتنا تاوان مانگتے ہیں۔ اگر انہوں نے بیس کی جگہ پچاس مانگ لیا تو میں تو گیا کام سے۔"

"تیرا باپ تو دے دے گا جتنے مانگے جائیں گے۔ میرا باپ تو پھوٹی کوڑی نہیں دے گا اپنے پلے سے۔ مارا جاؤں گا میں تو۔"

آفس کے دروازے پر مدھم دستک ہوئی پھر ایک فائل بدست ملازمہ نے اندر جھانکا۔ شہزاد کو مارکو کی کمر پر سوار دیکھ کر اس کا رنگ فق ہوا اور وہ جلدی سے واپس چلی گئی۔

شہزاد نے اپنے غصے پر قابو پایا اور کپڑے جھاڑتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ مارکو بھی ٹائی درست کرتا اور کھانستا ہوا کھڑا ہو گیا۔

کچھ دیر بعد وہ دونوں پھر آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ مارکو نے کہا۔ "واقعی یارا یہ بات تو میری سمجھ میں ہی نہیں آئی۔ ورلڈ بینک اور آئی ایم ایف کی طرح اغواکاروں کے مطالبات بھی تو غیر متوقع ہو سکتے ہیں۔"

تھوڑی دیر بعد کولڈ کافی کے دو دو کپ پینے کے بعد وہ دونوں نارمل ہو چکے تھے اور ایک بار پھر ہوٹل والے پروجیکٹ پر غور کر رہے تھے۔

☆☆☆

بہار کا موسم شروع ہو چکا تھا۔ ایک خوب صورت ناک اور اس کے تل سے شہزاد کی محبت بڑھتی جا رہی تھی مگر فی الحال ملاپ کی منزل دور تھی۔ کسی وقت شہزاد کو پروفیسر فاروقی صاحب سے ڈر بھی لگتا تھا۔ باواجی کی طرح وہ بھی جذباتی شخص تھے اور کسی بھی وقت اپنی بیٹی ورمن کو کسی رشتے کے بندھن میں باندھ سکتے تھے۔

انسان سوچتا کچھ ہے اور ہوتا کچھ ہے۔ شہزاد اور مارکو کے بنائے ہوئے ہوٹل کے ساتھ بھی یہی کچھ ہونے والا تھا لیکن کیسے ہونے والا تھا؟ یہ وہ دونوں نہیں جانتے تھے۔ فی الوقت تو سب کچھ ٹھیک ہی جا رہا تھا۔ لق و دق عمارت کو مکمل ہوٹل کی شکل دی جا چکی تھی اور دو ہفتے پہلے اس کا باقاعدہ افتتاح بھی ہو چکا تھا۔ افتتاح کے لیے شہزاد نے ملتان سے خصوصی طور پر ایک منحوس پرسنالٹی کو بلایا تھا۔ یہ ایک خاتون وزیر تھیں اور جب سے وزیر بنی تھیں، ان کی حکومت نے ہچکیاں لینا شروع کر دی تھیں۔ پچھلے دنوں وزیر صاحبہ نے

ایک چھ منزلہ کمرشل پلازے کا افتتاح کیا گیا تھا۔ فیتہ کاٹنے کے کچھ ہی دیر بعد پوری عمارت زمین بوس ہوگئی۔ تمام مہمانانِ گرامی مع موصوف مالکان لقمۂ اجل بنے تھے۔ صرف موصوف اوران کا ایک گارڈ زندہ بچ پائے تھے۔

شہزاد اور مارکو نے اس بے رونق ہوٹل کا نام "ڈوب" رکھا تھا۔ یہ کسی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ صرف شہزاد اور مارکو جانتے تھے کہ اس کا پورا نام "زقم ڈوب" ہے۔ یعنی "زقم ڈوب ہوٹل۔" فی الحال تو یہ اسم بامسمیٰ ہی تھا۔ پچھلے پندرہ بیس روز میں یہاں صرف الو بولتے تھے یا چالیس پچاس افراد پر مشتمل عملہ بولتا تھا۔

شروع میں باداجی نے ہوٹل کی لوکیشن کے سلسلے میں سخت اعتراض کیا تھا تاہم شہزاد نے باداجی کو باداجی کے ہی "فرمودات" یاد دلا کر خاموش کردیا تھا۔ ان میں اہم فرمودہ یہی تھا کہ ہوٹل کہیں بھی ہو مگر اس کی سروس اور کھانے وغیرہ ہوٹل کے لیول کے مطابق ہونے چاہئیں۔ سب کچھ لیول کے مطابق تھا مگر لوگ ہوٹل کا رخ نہیں کررہے تھے۔ قریبی علاقے کے کوئی اکا دکا چودھری ٹائپ لوگ آتے بھی تھے تو سخت مایوس ہوکر واپس جاتے تھے۔

جانے کیوں کسی وقت شہزاد گہری سوچ میں کھو جاتا تھا۔ باداجی بہت سے عجیب وغریب فیصلے کیا کرتے تھے مگر یہ دس کروڑ کو دو کروڑ بنانے والا فیصلہ ابھی تک شہزاد کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ وہ ایسا کیوں کررہے تھے جس میں ان کے اکلوتے بیٹے کی جگ ہنسائی اور نقصان کے سوا اور کچھ نہیں تھا؟ کسی وقت وہ یہ سوچنے پر مجبور ہوجاتا کہ کہیں یہ والد صاحب کی کوئی ایسی چال تو نہیں جو اسے ان کی جائز وراثت سے محروم کردے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ اسے نااہل اور ناکارہ ثابت کرنا چاہتے ہوں اور اس کے پیچھے اس خوبرو سیکریٹری ثناکہ کی خواہشات ہوں جو ہر وقت چھپکلی کی طرح ان سے چمٹی رہتی تھی؟ وہ جتنا سوچتا تھا، اتنا ہی الجھتا جاتا تھا۔ اب بھی وہ "ڈوب" ہوٹل کے دفتر میں بیٹھا یہی سوچ بچار کررہا تھا جب ایک باوردی ملازم نے آکر اطلاع دی کہ کوئی محترمہ اس سے ملنے آئی ہیں۔ اس سے پہلے کہ وہ محترمہ کو اندر بلانے یا نہ بلانے کا کوئی فیصلہ کرتا، وہ چھپاک سے خود ہی اندر داخل ہوگئیں۔ محترمہ کو دیکھ کر شہزاد کے چودہ طبق روشن ہوگئے۔ وہ کوئی اور نہیں، زرنا تھی..... زرنا وارث..... باداجی کے پارٹنر وارث شیخ کی بیٹی جس کے ساتھ باداجی شہزاد کی قسمت خراب کرنا چاہتے تھے۔ شہزاد نے بمشکل اپنی اندرونی تکلیف کو چھپایا اور چہرے پر

مسکراہٹ سجاتے ہوئے کہا۔ "اوہ..... واٹ اے سرپرائز..... تم کب آگئیں؟"

وہ شوخی سے بولی۔ "دنیا میں آئے ہوئے تو تقریباً 24 سال ہوگئے ہیں۔ پاکستان میں کل ہی آئی ہوں اور دیکھو آج ہی لاہور سے چل کر تمہارے اس عجیب وغریب یونیک ہوٹل میں آن پہنچی ہوں۔"

وہ بے حد ٹائٹ جینز میں تھی۔ بال پونی ٹیل کی شکل میں بندھے ہوئے تھے اور گلے میں ہمیشہ کی طرح کیمرا جھول رہا تھا۔

"زہے نصیب!" شہزاد نے پھر چہرے پر مسکراہٹ سجائی۔ "مجھے پہلے پتا ہوتا تو..... آپ کے استقبال کا خصوصی انتظام کرتا۔" (درحقیقت وہ کہنا یہ چاہتا تھا کہ مجھے پہلے پتا ہوتا تو تمہارے راستے میں کتے چھوڑ دیتا)۔

وہ بڑی دلچسپی اور توجہ سے ہوٹل کے در و دیوار اور اس کی قدیمی طرز کی آرائش کو دیکھ رہی تھی۔ بولی۔ "واؤ..... کیا زبردست آئیڈیا ہے۔ جنگل میں منگل۔ میرا تو دل چاہ رہا ہے کہ اپنی پہلی ڈاکیومینٹری تمہارے اس ہوٹل پر بنا ڈالوں۔"

"گڈ آئیڈیا..... گڈ آئیڈیا..... ویسے آپ اکیلی ہی آئی ہیں؟"

وہ ہنسی۔ "دنیا میں تو اکیلی ہی آئی تھی کیونکہ میرا کوئی جڑواں بھائی بہن نہیں تھا۔ ویسے تم ادھورا سوال پوچھتے ہو شہزاد..... تمہیں پوچھنا چاہیے تھا کہ کیا میں کینیڈا سے اکیلی آئی ہوں؟"

"چلیں ٹھیک ہے۔ آپ کینیڈا سے اکیلی آئی ہیں؟"

وہ شہزاد کو سرتاپا دیکھتے ہوئے ذرا اٹھلائی اور بولی۔ "ہاں، آئی تو اکیلی ہوں مگر جی چاہتا ہے کہ جاؤں اکیلی نہ۔"

زرنا کا معنی خیز انداز محسوس کرتے ہوئے شہزاد نے دل میں "لاحول" پڑھا اور ادھر اُدھر کی باتوں میں مصروف ہوگیا۔ وہ گفتگو کے دوران میں اینگل بدل بدل کر تصویریں کھینچتی رہی اور شہزاد کو یہ بتانے کی کوشش کرتی رہی کہ وہ ہر زاویے سے قابلِ غور ہے اور یہ بھی کہ آئندہ دنوں میں شہزاد کی خیر نہیں۔

زرنا سے شہزاد کی یہ ملاقات شہزاد کے لیے خاصی پُراندیشہ رہی اور اسے ہر گھڑی یہ دھڑکا لگا رہا کہ سوشل میڈیا کے اس تیز تر دور میں کہیں درمن کو اس طول طویل ملاقات کی بھنک نہ پڑ جائے۔ بہرحال شہزاد اس ملاقات کے اصل مضمرات سے آگاہ نہیں تھا۔ یہ مضمرات اگلے آٹھ دس روز میں سامنے آئے اور اتنی شدت سے آئے کہ شہزاد، مارکو اور

درمن حواس باختہ ہوگئے۔ دراصل زرنا نے "ڈوب ہوٹل" کی ایک تفصیلی ویڈیو بنا کر سوشل میڈیا پر ڈال دی تھی۔ ویڈیو کا عنوان ہی اس نے جنگل میں منگل رکھا تھا۔ ویڈیو میں ڈوب ہوٹل کے منفرد محل وقوع اور ویرانی کا زبردست نقشہ کھینچا گیا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ ویڈیو وائرل ہوگئی۔ پہلے اکا دکا کسٹمرز نے ڈوب ہوٹل کا رخ کیا۔ پہلے دو ایک ہفتے بے تحاشا زیادہ ہوئی..... اور پھر تو جیسے لائن ہی لگ گئی۔ لاہور، شیخوپورہ اور گوجرانوالہ تک سے منچلے ہوٹل کا رخ کرنے لگے۔ جب گوجرانوالہ کے خوش خوراک لوگ بھی پہنچنا شروع ہوگئے تو شہزاد اور مارکو کی سمجھ میں آگیا کہ اب خیر کی توقع رکھنا بے کار ہے۔ دو تین ہفتے کے اندر اندر ایسی بھیڑ چال شروع ہوئی کہ شہزاد اور مارکو کو دن میں تارے نظر آگئے۔

حواس باختہ ہوکر شہزاد اور مارکو نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ جو ذیلی سڑک ویران علاقے سے گزرتی ہوئی ڈوب ہوٹل تک پہنچتی تھی، اس پر مختلف بورڈز لگوا دیے۔ بورڈز کچھ اس طرح کے تھے۔ "بلاوجہ گاڑی نہ روکیں..... رات کو سفر کرتے ہوئے احتیاط برتیں..... راہزنوں سے ہوشیار رہیں..... بلا لائسنس اسلحے کے ساتھ سفر کرنا سخت ممنوع ہے..... "وغیرہ وغیرہ۔

نتیجہ تو نکلا مگر خاطر خواہ نہیں نکلا۔ مارکو کا خیال تھا کہ لوگ تھرل اور ایڈونچر کے اتنے شوقین ہوچکے ہیں کہ اب ہر اوکھلی میں سر دینے کے لیے تیار ہوجاتے ہیں۔ جو رہی سہی کسر تھی وہ مقامی انتظامیہ نے پوری کردی۔ ایک روز ایک ڈپٹی کمشنر صاحب "ڈوب" میں مع فیملی کھانے کے لیے تشریف لائے۔ انہوں نے اس دلیرانہ کوشش پر شہزاد کا شانہ تھپکا اور نہایت شفقت کا مظاہرہ کرتے ہوئے مقامی پولیس کو سیکیورٹی نہایت سخت کرنے اور تمام بورڈز ہٹانے کی ہدایت کردی۔ شہزاد اور مارکو شکریہ ادا کرنے کے سوا اور کچھ بھی نہ کرسکے۔

..... ہر تدبیر الٹی پڑ رہی تھی۔ "ڈوب" کا کام بڑھتا چلا جارہا تھا۔ تجویز مارکو کی ہی تھی۔ ایک دن شہزاد اور مارکو میں خوب لڑائی ہوئی۔ ہاتھا پائی تک نوبت پہنچ گئی۔ انہیں چھڑانے والی درمن ہی تھی۔ وہ دونوں کے درمیان آگئی۔ لڑائی رکنے والی نہیں تھی مگر شہزاد کو رکنا پڑی کیونکہ شہزاد کے ہاتھ بیچ بچاؤ کرانے والی درمن کے جسم کے مختلف حصوں سے مسلسل ٹچ ہورہے تھے۔ خیر یہ بھی کوئی ایسی قباحت کی بات نہیں تھی لیکن مسئلہ یہ تھا کہ مارکو کے ہاتھ بھی ٹچ ہورہے تھے۔ لڑائی ختم ہونے کے بعد دونوں دیر تک ہانپتے رہے

اور زلزلے کے آفٹر شاکس کی طرح تھوڑا تھوڑا لڑتے بھی رہے۔ مارکو کا موقف تھا کہ اصل قصور وار وہ کینیڈا پلٹ، مٹکنی پرورتر ماوارث ہے جس نے وہ منحوس ڈاکیومینٹری بنائی اور ہوٹل کو وائرل کردیا۔

کہتے ہیں کہ ہر غم کے بعد خوشی اور خوشی کے بعد غم ہوتا ہے۔ یہاں بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ جس دن مارکو اور شہزاد کے درمیان اَٹ کھڑکا ہوا، اسی دن صورتِ حال میں ایک اچھا ٹوئسٹ بھی آیا۔ درمن ہوٹل کے عالیشان دفتر میں شہزاد کے قریب ہی موجود تھی اور اس کے چہرے کی چوٹوں پر کبھی گرم ٹکور اور کبھی ہونٹوں سے ٹکور کررہی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ پھر ہیڈ بیرے نے آکر بتایا کہ کل جس پارٹی نے ٹائم لیا تھا، وہ ملنے آئی ہے۔ بیرا اطلاع دے کر چلا گیا۔ درمن نے اپنے جسم کا سب سے خوبصورت حصہ یعنی اپنی ناک، شہزاد کے شانے سے رگڑتے ہوئے پوچھا۔ "کون پارٹی ہے یہ؟"

"کوئی ملک شیر افگن ہے۔ کاروباری میٹنگ کرنا چاہتا ہے۔"

درمن چونکی۔ "ارے اس کا نام تو میں نے سنا ہوا ہے۔ کسی سیاست دان کے قتل کے جرم میں جیل بھی کاٹ چکا ہے۔ اس علاقے کا بہت خطرناک بندہ شمار ہوتا ہے۔"

شہزاد نے ٹھنڈی سانس لی۔ "اللہ کرے وہ خطرناک ہی ثابت ہو۔ کوئی ایسی بات کہے کہ پھڈا پڑ جائے اور..... اس ہوٹل کا کام تمام ہو۔ کل اکاؤنٹس دیکھے ہیں میں نے..... رقم تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ اس منافع کو روکا نہ گیا تو بالآخر میں کوڑی کوڑی کو محتاج ہوجاؤں گا۔ باداجی میری "تعریف" پر ایسی لات ماریں گے کہ تم سے دو ہزار میل دور جا گروں گا۔"

درمن نے بے چین ہوکر اس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔

کچھ ہی دیر بعد شہزاد اور مارکو میٹنگ ہال میں پارٹی سے بات کررہے تھے۔ شیر افگن ایسا آدمی تھا کہ اس کا کوئی بھی نام ہوتا، وہ ملک شیر، شیر محمد یا شیر وغیرہ ہی نظر آتا۔ عمر اٹھاون کے لگ بھگ، قد چھ فٹ سے نکلتا، جثہ مضبوط، سیاہ مونچھیں آدھے رخساروں تک تنی ہوئیں۔ دھیمی آواز میں بولتا تھا تو لگتا تھا کہ اپنے آپ سے جھوٹ بول رہا ہے۔ اسے ملک شیر کہا جاتا تھا مگر انداز سارے ملک الموت جیسے تھے۔ بہرحال فی الوقت وہ اپنے والد ملک فراست علی کے مشورے سے کچھ کہنے آیا تھا۔ دو تین مشیر بھی ملک شیر کے ہمراہ تھے۔ ملک شیر بتانے آیا تھا کہ ڈوب ہوٹل کے بعد وہ بھی ساتھ ہی

جناب! ادارے محلے لے بہت بڑے ہو دیکھا ہے۔ دو فٹوں کی دائیں جانب پیلے رنگ کے تین بلڈوزر کھڑے ہیں۔ پیچھے شاید ایک دو کرینیں بھی ہیں۔ یہ بہت بڑا بیانا پانے والا ہے جی۔ آپ فوراً پہنچیں یہاں۔ بلکہ پولیس کو اطلاع بھی کر دیں۔"

"نہیں نہیں ... کسی کو اطلاع کرنے کی ضرورت نہیں۔ بس دیکھو اور انتظار کرو۔" شہزاد نے کہا۔

مارکو نے شہزاد کے ہاتھ سے فون جھپٹتے ہوئے منیجر سلطان سے کہا۔" ... بلکہ صرف انتظار ہی نہ کرو۔ منیجر کے جن لوگوں کو گولیاں پڑی ہیں، انہیں ہوٹل کی چھت پر چڑھا دو اور ان سے کہو کرینوں کے خلاف نعرے لگائیں۔"

شہزاد نے مارکو کے ہاتھ سے فون چھینا۔" اور صرف منیجر ہی نہیں، ہوٹل کے عملے کو بھی چھت پر پہنچا دو۔ خوب رولا ڈالو۔"

"ہم ... میں کچھ سمجھا نہیں پارہا جناب!" منیجر سلطان جو پہلے ہی ان دونوں کی دماغی صحت پر شک کرتا تھا، اب مزید مایوس نظر آنے لگا۔

"بس جو کہا جارہا ہے، ویسا ہی کرو۔" شہزاد نے کہا اور فون بند کر دیا۔ شہزاد اور مارکو نے ایک دوسرے کے ہاتھوں پر ہاتھ مارے اور کسی "بریکنگ نیوز" کے لیے بے چین نظر آنے لگے۔

بڑی مشکل سے دس منٹ انتظار کر کے شہزاد نے دوبارہ منیجر کو فون کیا۔ اس نے بتایا۔" صورت حال بدستور کشیدہ ہے۔ ملک پارٹی نے کافی سارے لوگ جمع کیے ہوئے ہیں۔ دوسری طرف ہوٹل کی چھت پر بھی ہمارے ساتھ کے قریب مزدور اور ویٹر وغیرہ موجود ہیں۔ نعرہ زنی کر رہے ہیں۔"

شہزاد نے پوچھا۔" اصل بات بتاؤ۔ بلڈوزر اپنی جگہ سے حرکت میں آئے یا وہیں پر کھڑے ہیں؟"

"بس ... بلڈوزر تو وہیں پر کھڑے ہیں ابھی۔"

"ایسا کرو کہ ... مزدوروں وغیرہ سے کہو غصہ دلانے والے نعرے لگائیں ... بہت زیادہ گندے ... بلکہ ہو سکے تو کچھ لوگ ننگا ہو کر بھی دکھا دیں ملک شیر کی پارٹی کو۔"

"نن ... ننگا ہو کر؟ آپ ... یہ ... آپ کیا ..."

"شٹ اپ سلطان! میں نے تمہارا بوتھا توڑ دینا ہے۔ جتنا کہا جارہا ہے، اتنا ہی کرو ..." شہزاد نے تیزی سے بات کاٹی۔" کچھ بھی میرے حکم کے بغیر نہیں ہونا چاہیے۔"

اس نے فون بند کر دیا۔ اچانک کمرے کا دروازہ کھلا اور نرما لپک کر اندر آ گئی۔ لگتا تھا کہ اس نے ساری باتیں سن لی تھیں۔ "واہ ... واہ ... واٹ اے ہیرو یو آر۔ سچ کہتی ہوں شہزاد ... اگر تم جیسا ایک بندہ بھی پہلی جنگ عظیم میں یورپ کے ساتھ ہوتا تو اسے کبھی شکست نہ ہوتی۔ میرا تو دل چاہتا ہے تم پر ایک شارٹ فلم بنا ڈالوں۔" اس نے مارکو کی پروا کیے بغیر جھٹ سے شہزاد کے گال کا بوسہ لیا۔

یہ بڑے سنسنی خیز لمحات تھے۔ ملک شیر افگن تھوڑی سی ہمت کرتا تو بہت کچھ ہو سکتا تھا۔ شہزاد اور مارکو نے یہ بازاری والوں کو عمارتیں گراتے دیکھا تھا۔ وہ اگر پانچ فٹ تک عمارت توڑتے تھے تو دراڑوں کی وجہ سے پچاس فٹ تک مالکان خود توڑ دیتے تھے اور یہ جو کچھ بھی ہونے جارہا تھا، فاؤل پلے بھی ہرگز نہیں تھا۔ باواجی کوئی اعتراض نہیں کر سکتے تھے۔

پانچ منٹ بعد شہزاد نے پھر بڑے اشتیاق سے فون اٹھایا مگر اس سے پہلے کہ وہ منیجر کا نمبر پریس کرتا، کال خود آ گئی۔" کرم مانگتا ہوں، عطا مانگتا ہوں۔" دوسری طرف سلطان کے بجائے ایک اور بھاری بھرکم آواز تھی۔

"کون؟" شہزاد نے رعب دار آواز میں پوچھا۔

"ملک بول رہا ہوں۔" دوسری طرف سے کہا گیا۔

"ملک ... کون ملک؟" شہزاد نے گلے پر پورا بوجھ ڈال کر گرجنے کی کوشش کی۔

"ملک فراست علی ... ملک شیر میرا بیٹا ہے۔"

"اچھا ملک فراست علی ... لیکن ... لیکن اب بات چیت کا وقت گزر گیا ہے بزرگوار تم نے جو کرنا ہے اب کر گزرو۔"

ملک فراست نے نرم لہجے میں کہا۔" جوان خون جوشیلا ہوتا ہے۔ تم دونوں بھی جوان ہو۔ میں مانتا ہوں کہ میرے بیٹے نے اس معاملے کو اپنے جوشیلے پن سے بگاڑا ہے ... میں نے اسے سمجھایا ہے۔ اس لڑائی میں دونوں پارٹیوں کا بہت زیادہ نقصان ہے۔ ہمیں مل بیٹھ کر کوئی حل نکالنا چاہیے۔"

شہزاد نے پھر گلے پر بوجھ ڈالا اور گرجا۔" اسی طرح بولو جاجا ... جس طرح تمہارا پتر بولتا تھا۔ اگر بلڈوزر لے آئے ہو اور کرایہ بھی دے دیا ہے تو پھر انہیں چلاؤ بھی ... چلاؤ ناں۔" (زور لگا کر بولنے سے شہزاد کو کھانسی ہونے لگی تھی)۔

نرما عقب سے شہزاد کے ساتھ لپٹ گئی اور اس کے سر پر بوسہ دیا۔ فون پر ملک فراست نے کہا۔" جوشیلی بات کر رہے ہو۔ اگر تم خود نہیں آ سکتے تو میں آ جاتا ہوں۔ آرام سے مل بیٹھ کر حل نکالتے ہیں ... بس میں آ رہا ہوں۔"

ملک فراست نے شہزاد کی اگلی گرج سننے سے پہلے

فوراً فون بند کر دیا۔

شہزاد اور مارکو تعجب سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ انہیں یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ ملک فراست اور ملک شیر جیسے دبنگ و خطرناک لوگ بھی اس طرح بھیگی بلی بن سکتے ہیں۔ شاید ٹھیک ہی کہتے ہیں کہ ڈرایا اسی کو جاتا ہے جو ڈرتے ہیں۔

نرما شہزاد کی ان اداؤں پر ریشہ خطمی ہو رہی تھی۔ مارکو کی موجودگی میں اس کا بس نہیں چل رہا تھا ورنہ وہ اس سے لپٹ ہی جاتی۔ بولی۔" تم جیسے نڈر اور باہمت لوگ ہی بازی پلٹتے ہیں، جنگیں جیتتے ہیں، نئی زمینیں دریافت کرتے ہیں۔ کولمبس کی ٹیم میں تم جیسا بندہ ہوتا تو کولمبس یقیناً اپنے پہلے سفر میں ہی امریکا دریافت کر لیتا۔"

شہزاد نے برا منہ بنایا۔" میں کولمبس کے ساتھ ہوتا تو اسے یہ "مصیبت" دریافت ہی نہ کرنے دیتا۔"

شہزاد کے مزاحیہ جواب پر نرما نے کھل کر قہقہہ لگایا۔

... اگلے تین گھنٹے میں جو کچھ ہوا، وہ شہزاد اور مارکو کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ ملک فراست علی نہ صرف خود لاہور پہنچا بلکہ اپنے بیٹے ملک شیر اور تین چار معتمد" معاون ہدایت کاروں" کو بھی ساتھ لایا۔ ان میں ملکوں کا مختار خاص سجاول شاہ بھی تھا۔ وہ لوگ بسکٹ فیکٹری کے عالیشان آفس میں پہنچے تو شہزاد اور مارکو آفس میں موجود تھے۔

ملک فراست ستر سال کا بڑی بڑی سفید مونچھوں اور لٹکی ہوئی ٹھوڑی والا ایک بڈھا شیر تھا۔ کسی وقت یقیناً اس نے بھی بڑی چیر پھاڑ کی ہوگی مگر اس وقت اپنے نام کی نسبت سے اس کی آنکھوں میں کافی" فراست" موجود تھی۔

چائے اور لسی وغیرہ پر ان دونوں پارٹیوں کے درمیان قریباً ایک گھنٹا گفتگو ہوئی اور حالات کافی حد تک کول ڈاؤن ہوئے۔ ملک فراست علی نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔" پتر شہزادا! ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ ہم اپنا ہوٹل بنانے کے بجائے کیوں نہ تمہارے مشورے پر عمل کریں۔"

"میرا مشورہ؟"

"ہاں شہزادا! تم نے اپنا ہوٹل بیچنے کی آفر کی تھی۔ اگر تمہاری آفر برقرار ہے تو ہم یہ ہوٹل خریدنے کو تیار ہیں۔"

ملک شیر نے بھی اپنا کھڑا سا سر ہلا کر باپ کی بات کی تائید کی۔

یہ بات سن کر شہزاد کو اچھا لگا۔ یقیناً مارکو کی کیفیت بھی یہی تھی۔ تاہم کھاگ کاروباری لوگوں کی طرح دونوں نے اپنے تاثرات چھپائے۔ کچھ ہی دیر بعد وہ دونوں علیحدہ کمرے میں چلے گئے تاکہ مشورہ کر سکیں۔

ان کا مشورہ کچھ اس طرح تھا۔ مارکو نے کہا۔" اس ٹھیٹ بڈھے نے پچیس چھبیس کروڑ کی آفر کر دی ہے۔"

شہزاد بولا۔" ان سے پہلے ہم خود دیا ناٹ کر دیتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ چودہ پندرہ کروڑ مانگ لیتے ہیں۔"

"نہیں چیتے ... ! وہ مذاق سمجھیں گے ... اور تمہارے باواجی کو پتا چلا تو وہ اسے فاؤل پلے قرار دے دیں گے ... میں تو کہتا ہوں اکیس بائیس کروڑ مانگو اور جان چھڑاؤ اس کتے ہوٹل سے۔"

"نہیں یار! اکیس بائیس بہت زیادہ ہو جائے گا۔ چلو تم کہتے ہو تو میں اٹھارہ مانگتا ہوں۔"

"تھوڑا سا اور بڑھا لو پیارے۔"

"نہیں ... اب ایک پیسا بھی اور نہیں ..." "واہ" ہی نہیں کھاتا ... اور فاؤل پلے کیسے ہوگا۔ جھگڑے والی جگہ بن چکی ہے۔ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔"

فیصلہ کرنے کے بعد جب وہ دونوں واپس آفس میں آئے تو سب سے پہلے ان کی نظر ایک بڑی توند پر ہی پڑی۔ ملک پارٹی کے ساتھ شہزاد کے باواجی کو بیٹھے دیکھ کر دونوں کے غبارے سے ہوا نکل گئی۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا، انہیں مختار خاص سجاول شاہ نے ڈیل میں مدد دینے کے لیے بلایا تھا۔ ان کی موجودگی میں ایسی شاندار ڈیل ہوئی کہ شہزاد کو دن میں تارے نظر آ گئے اور اس میں قصور باواجی کا بھی نہیں تھا۔ حسب اندیشہ ملک پارٹی نے ملک سے پچیس کروڑ کی آفر کر دی تھی۔ باواجی کی موجودگی میں انکار کیسے کیا جا سکتا تھا۔ رسمی سی بارگیننگ میں پچاس لاکھ کا اضافہ مزید ہوا اور مبلغ ساڑھے پچیس کروڑ شہزاد کی قسمت میں لکھ دیے گئے۔

☆☆☆

آراستہ بیڈروم میں سیکریٹری شائلہ مون کمرے کے وسط میں کھڑی تھی اور ارباب واہلہ نے اسے خود سے لپٹا رکھا تھا۔ جب بھی وہ یہ حرکت فرماتے تھے تو ان کی توند کی وجہ سے شائلہ کی کمر خم کھا جاتی تھی اور وہ سوالیہ نشان نظر آنے لگتی تھی۔ وہ سوالیہ نشان نظر آ رہی تھی لہٰذا آج اس نے وہ سوال بھی پوچھ ہی لیا جو کافی دنوں سے اس کے ہونٹوں پر مچل رہا تھا۔ اس نے کوشش کر کے اپنا سر ارباب کے چکنے ہوئے سینے سے لگایا اور بولی۔" جانو! آپ نے مجھے الجھا کر رکھ دیا ہے۔ آخر بتا کیوں نہیں دیتے جو پچھلے چار ماہ سے پوچھ رہی ہوں؟"

"کیا پوچھ رہی ہو؟" ارباب نے مشروب کی چسکی

آج کل تو رتو میں سوچ سیا کر رہا ہے۔" پھر اس نے اپنے سر کا روپٹا سہلایا اور ذرا تنک کر کہا۔ "اور یہ جو چیلی تمہاری دم چھلی بنی ہوئی ہے، اسے اتنا سر پر کیوں چڑھا رکھا ہے۔ سچ کہتی ہوں، یہ تمہاری دوست کم اور اماں زیادہ لگ رہی تھی۔ اسے سمجھاؤ اپنی حد میں رہے۔"

شہزاد کا بیزار سا چہرہ اتر رہا تھا۔ وہ سٹپٹا سا گیا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ دو دن بعد اس نے نہ چاہتے ہوئے بھی اوپر تلے چار بھرے ہوئے سگریٹ پیے۔ اپنے کپڑوں پر تھوڑی سی شراب لگائی اور بالکل مخمور ہو کر زما کے ساتھ "ڈیٹ" پر چلا گیا۔ اس ڈیٹ پر اس نے جان بوجھ کر اخلاقی باتیں چھیڑیں اور پھر ایک موقعے پر بے ہوش ہو کر زما کے لیے نہایت ناقابل اشاعت الفاظ استعمال کیے۔ وہ ذرا بھی احتجاج کرتی تو وہ اسے تھپڑ تک جڑ دیتا مگر اس نے کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا۔ وہ شہزاد کی اس کیفیت کو "اوور ڈرنکنگ" سے جوڑتی رہی—— بلکہ بعد میں شہزاد کی تعریف بھی کی اور کہا۔ "ایسا ہی رنگیلا اور "ڈونٹ کیئرنگ" شوہر درکار ہے۔"

کچھ دیر بعد ایک پارک کی پارکنگ میں گاڑی کھڑی کرتے ہوئے شہزاد نے پینترا بدلا۔ ذرا تلخی سے لہجے میں بولا۔ "ویسے کالج کے زمانے میں کتنے عاشق تھے تمہارے؟ جھوٹ نہ بولنا۔"

وہ ایک دم چپ ہو گئی۔ چند سیکنڈ بعد شہزاد نے پوچھا۔ "کیا سوچ رہی ہو؟"

"یار گن تو لوں۔" اس نے کہا اور پھر بلند آواز میں ہنسنے لگی۔

—— اب تو بس ایک ہی راستہ رہ جاتا تھا کہ وہ خود کو مزید رنگیلا اور "ڈونٹ کیئرنگ" ثابت کرنے کے لیے اسی ڈیٹ میں کار کے اندر زما کے ساتھ باقاعدہ زیادتی وغیرہ کروا لے—— جو وہ نہیں کر سکتا تھا لہٰذا وہ جیسے سٹپٹایا ہوا گیا تھا، ویسے ہی واپس روانہ ہو گیا۔ راستے میں وہ اس کے تھوڑے سے لبوترے چہرے اور تھوڑی سی براؤن آنکھوں کو نہایت ناپسندیدگی کی نظروں سے دیکھتا رہا۔

☆☆☆

وہ جاتی سردیوں والی ایک ابرآلود رات تھی۔ رم جھم ہو رہی تھی۔ شہزاد اپنے کمرے میں جیسے کانٹوں کے بستر پر تھا۔ ورمن اس سے روٹھی ہوئی تھی اور جس کو وہ "روشنا" جانتا تھا وہ ریت کی طرح اس کے سامنے سے پھسلتی اور نکلتی چلی جا رہی تھی۔ دوسری طرف تقریباً ساڑھے پچیس کروڑ کا مدعا تھا جس کی وجہ سے شہزاد پائی پائی کو محتاج ہونے والا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ سارا روپیہ باواجی کا ہی تھا۔ وہ شرط ہار جاتا تو یہ روپیہ ان کے پاس ہی جاتا تھا۔ مزید یہ ہوتا کہ وراثت اس کے ہاتھ سے نکل جاتی۔

اس نے چوتھی بار ورمن کا نمبر ملایا تو آخر اس نے کال ریسیو کر لی۔ اگلا تقریباً ایک گھنٹا اس نے ورمن کو یہ باور کرانے میں لگایا کہ اسٹیو کے ساتھ اس کی تنہائی دراصل زما کو خود سے دفع دور کرنے کا ایک ڈراما تھی۔ جیسے مچھر کو دفع دور کرنے کے لیے موسپل وغیرہ لگایا جاتا ہے۔

سب کچھ جاننے اور سمجھنے کے باوجود ورمن ابھی تک ناراض تھی۔ صرف اتنا ہوا تھا کہ اس نے زما کے سر پر "روبڑا" ڈالنے کے ضمن میں چھوٹا سا "سوری" کہہ دیا تھا۔ شہزاد اسے مسلسل منانے میں لگا رہا۔ آخر ورمن نے صاف الفاظ میں کہا کہ اب وہ اسے مزید وقت نہیں دے سکتی۔ وجہ یہ ہے کہ اب اس کے پاپا اور ماما اسے مزید وقت نہیں دے رہے۔ وہ چٹ منگنی، پٹ بیاہ اور کھٹ رخصتی چاہتے ہیں۔ ایک بڑا مناسب سا رشتہ پاپا کے حواس پر چھایا ہوا ہے۔ وہ اوویز مرکا "لوکا" کوئی نائب ناظم قسم کی شے ہے۔ لہٰذا اگر شہزاد کچھ کرنا چاہتا ہے تو دو چار دن میں کر لے۔

شہزاد مزید رسک نہیں لے سکتا تھا۔ وہ اگلے ہی روز اپنے متوقع سسر پروفیسر فاروقی صاحب کے پاس جا دھمکا۔ وہ قدرے اچھے موڈ میں تھے لہٰذا ان کے ساتھ بات آگے بڑھتی ہوئی نظر آئی۔ کسی حد تک وہ بھی بیٹی کی مرضی جانتے تھے مگر فاروقی صاحب کو سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ شہزاد کو پولیٹیکل سائنس یعنی سیاست کی الف ب کا بھی پتا نہیں تھا۔ وہ صرف کاروباری تھا۔ صرف کاروباری کو فاروقی صاحب بہت زیادہ ابلے ہوئے پھیکے آلو سے تشبیہ دیتے تھے۔

حرفِ آخر کے طور پر انھوں نے شہزاد کے سامنے دو شرطیں رکھیں بلکہ یہ ایک ہی شرط کے دو حصے تھے۔ وہ عینک درست کرتے ہوئے بولے۔ "تمہارے پاس دو آپشنز ہیں۔ پہلا آپشن یہ کہ پولیٹیکل سائنس میں تمہیں پی ایچ ڈی کرنا ہوگی—— دوسرا آپشن......"

"بس بس...... بس۔" شہزاد جلدی سے بولا۔ "مجھے دوسرا آپشن قبول ہے۔" (لاک ڈاؤن کے دنوں میں ایک لطیفے سے اس نے یہ پھرتی مستعار لی تھی)۔ ظاہر ہے اس نے بی اے ہی تقریباً منہ زبانی کر رکھا تھا۔ پی ایچ ڈی تک کہاں پہنچ سکتا تھا۔

پروفیسر فاروقی نے کہا۔ "اور دوسرا آپشن یہ ہے کہ کم از کم ایم پی اے کا الیکشن جیت کر دکھا دو...... اس

سے کم کچھ نہیں۔"

☆☆☆

پیسے کے زور پر کیا نہیں ہو سکتا اور الیکشن تو ہوتا ہی پیسے کے زور پر ہے۔ مقامی ایم پی اے صاحب (جو فاروقی صاحب کو ہرا چکے تھے) اپنی کرپشن کا حساب کتاب دینے کے لیے پہلے اسلام آباد اور پھر وہیں سے بذریعہ "ہارٹ اٹیک" عدم آباد روانہ ہو گئے تھے۔ لہٰذا یہاں ڈیڑھ دو ماہ بعد ضمنی الیکشن ہونے والا تھا۔ ورمن کا رشتہ رکوانے کے لیے شہزاد کا عشق بے خوف اس آتشِ "مردود" میں کود پڑا۔ مارکو بھی ہمیشہ کی طرح ساتھ تھا۔ ساڑھے پچیس کروڑ میں سے تو کچھ بھی الیکشن پر خرچ نہیں کیا جا سکتا تھا کیونکہ اس ساڑھے پچیس پچیس کروڑ کو صرف کاروبار کے ذریعے دو کروڑ کرنے کا طے تھا۔ کوشش کے طور پر شہزاد نے باواجی کو بہت سمجھایا کہ الیکشن بھی تو کاروبار ہی ہے لیکن وہ مان کر نہیں دیے۔ نتیجے کے طور پر شہزاد کو مارکو سے کوئی ڈیڑھ کروڑ روپیہ ادھار لینا پڑا۔

الیکشن میں کودنے کا طریقہ تو بچے بچے کو پتا ہے۔ بس پیسا پھینک، تماشا دیکھ۔ ایک ایڈوائزر کی ہدایات کے مطابق شہزاد اور مارکو نے جوش و خروش سے عمل شروع کر دیا۔ وہی مروجہ طریقے تھے۔ پانچ چھ لاکھ کی سلائی مشینیں بیواؤں میں بانٹی گئیں۔ کوئی ایک ہزار من آٹے کے تھیلے سیلاب زدگان میں تقسیم کیے گئے (ویسے کوئی ایسا بڑا سیلاب ابھی آیا بھی نہیں تھا)۔ علاقے کی تین چار اچھی بھلی سڑکوں کو اکھاڑ کر دوبارہ بنایا گیا اور تختیاں لگائی گئیں۔ حلقے کی آٹھ دس گلیوں میں سوئی گیس اور سرکاری پانی فراہم کیا گیا۔ سائیکلیں تقسیم ہوئیں۔ شادیوں اور جنازوں میں شرکت کی گئی، جمعے کی نمازیں باجماعت پڑھی گئیں اور اس طرح کے سارے دوسرے کام۔

یہ سب کچھ ہو رہا تھا مگر پتا نہیں کیوں شہزاد کو ایک دھڑکا سا لگا ہوا تھا۔ اس کی ہر تدبیر الٹ ہو رہی تھی اور یہی خطرہ اسے الیکشن کے حوالے سے بھی تھا۔ چونکہ اس سے پہلے اس نے کبھی ایرے غیرے لوگوں کو منہ نہیں لگایا تھا لہٰذا حلقے کے اکثر لوگ اسے بڑا اکھڑا ہوا اور مغرور قرار دے رہے تھے۔ بہت سے لوگ اسے معیشت اور کاروبار کی سوجھ بوجھ سے عاری قرار دیتے تھے۔ شاید یہ اس کی اسی "حماقت" کی طرف اشارہ تھا جب اس نے عین بیماری کے دنوں میں کئی کروڑ کے کسٹن جوڑے خرید لیے تھے۔

ایک رات شہزاد اپنے گھر میں موجود تھا۔ شب بڑی ہوئی تھی۔ دل پژمردہ تھا۔ اب تو واقعی اس کا دل چاہنے لگا تھا کہ بھرے ہوئے سگریٹ پیے۔ رات کے بارہ بجے تھے جب اسے کسی کمرے سے باواجی کی سیکرٹری شائکہ سون کے شوخ مترنم قہقہے کی مدھم آواز آئی۔ خانہ خراب اب تک "دفتری امور" نمٹانے کے لیے رات گئے تک یہاں رہنے لگی تھی۔ اس کا سینہ طیش کی آگ سے سلگنے لگا۔ کمرے سے ننگے پاؤں نکلا اور شوخ مترنم قہقہے کی وجوہات جاننے کے لیے باواجی کے کمرے کی طرف گیا۔ بند دروازے سے کان لگائے تو اندر کی آوازیں صاف سنائی دینے لگیں۔

شائکہ سون اٹھلا کر بولی۔ "اچھا چھوڑیں ان باتوں کو...... مجھے وہ بتائیں جو اس دن بتاتے بتاتے جناب سو گئے تھے۔ کسی بددعا کی بات کی تھی، پھر ہڑپہ کے کھنڈر کا ذکر کیا تھا اور خراٹے لینے لگے تھے۔"

اندر باواجی نے ایک طویل ڈکار لی اور ان کے استعمال شدہ کڑاہی گوشت کی خوشبو شہزاد کے نتھنوں تک پہنچی۔ وہ ادھر ادھر کی باتیں کر رہے تھے جیسے ٹالنے کی کوشش کر رہے ہوں مگر وہ ٹلنے والی کہاں تھی۔ وہ بالآخر ارباب وابلہ کو اپنے ڈھب پر لے ہی آئی۔ ارباب وابلہ یعنی شہزاد کے باواجی کو بددعا اور ہڑپہ کے کھنڈرات والی ساری کتھا ازسرِنو شائکہ کو بتانا پڑی۔ یہ ایسی کتھا تھی جس نے شہزاد کو سرتاپا ہلا دیا۔ وہ جوں جوں سنتا گیا، اس کی حیرانی کا دریا چڑھتا گیا۔

باواجی نے بات کچھ اس طرح سے شروع کی۔ "روحانی کرشموں اور دعاؤں بددعاؤں وغیرہ پر میں نے کبھی یقین نہیں کیا تھا۔ شاید آئندہ بھی کبھی نہ کرتا اگر مجھے اور شہزاد کو ایک کاروباری ٹور پر کوئی ڈھائی سال پہلے ساہیوال اور اس سے آگے ہڑپہ نہ جانا پڑتا۔ ہم فیکٹری کے لیے ایک کم قیمت زمین خریدنا چاہ رہے تھے۔ میرے دو منیجرز بھی میرے ساتھ تھے۔ ہم لینڈ کروزر پر سوار ایک تنگ سے راستے سے گزر رہے تھے۔ جولائی کی ایک گرم ترین دوپہر تھی...... اچانک ایک کھنڈر سے نکل کر ایک کالا بھجنگ، ننگ دھڑنگ شخص ہمارے سامنے آ گیا۔ عجیب بات یہ تھی کہ وہ پاؤں کے بجائے ہاتھوں پر چل رہا تھا۔ اس کے سیاہ جسم پر فقط ایک لنگوٹی تھی۔ ہمارے ڈرائیور نے بہت دفعہ ہارن بجایا مگر اس عجیب الخلقت شخص نے راستہ دینے سے انکار کر دیا۔ دو دیہاتی ہمارے قریب آئے۔ انھوں نے ہمیں بتایا کہ یہ "بھجنا پیر" یعنی الٹا ولی ہے۔ اب یہ آگے سے نہیں ہٹے گا۔ ہمارے لیے بہتر یہی ہے کہ ہم جیپ ریورس کریں

اور چکر کاٹ کر دوسرے راستے سے چلے جائیں۔ جب کئی منٹ اسی طرح گزر گئے تو مجھے تاؤ آ گیا۔ پہلے برداشت کرنے کی کوشش کی مگر نہیں ہوا۔ میں نے شہزاد سے کہا کہ وہ گاڑی سے اترے اور اس پاکھنڈی کو سیدھا کرے...... میرے کہنے پر شہزاد نیچے اترا۔ اس نے الٹے پیر کو سیدھا کیا پھر گود میں بھر کر ایک طرف بھربھری مٹی میں پھینک دیا۔ الٹے پیر نے وار چلا کیا۔ نہ صرف وہ خود کالا سیاہ تھا بلکہ منہ کے اندر اس کی زبان تک کالی تھی۔ اس نے شہزاد سے کہا۔ ''جا پتر! تیرا کوئی کام سیدھا نہیں ہوگا۔ جو چاہے گا اس کے الٹ پائے گا۔ ساری حیاتی روتا ہی رہے گا۔''

''باتیں کو تو شاید یہ بددعا بھول گئی لیکن پتا نہیں کیوں میرے دماغ سے چپٹ کر رہ گئی۔ الٹے پیر کے الفاظ اکثر میرے کانوں میں گونجتے رہتے تھے۔ میرا یقین جب اور پختہ ہو گیا جب ایک دو ماہ بعد میں نے محسوس کیا کہ شہزاد کی ہڈیوں میں ونگے چڑنے شروع ہو گئے ہیں۔ اس کی وجہ سے کھانے پر کھانا ہونے لگا تھا......''

باواجی بولتے رہے اور شہزاد پتھر کا بت بنا سنتا رہا۔ باواجی نے جس بددعا کا ذکر کیا تھا، وہ واقعی اسے بھول چکی تھی مگر اب بہت کچھ یاد آ گیا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ اس پر حیرت انگیز انکشافات بھی ہو رہے تھے۔ ان میں سب سے تہلکہ والا انکشاف وہی باواجی کی انوکھی شرط والا تھا یعنی انہوں نے ایک ہوشیار کاروباری ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے شہزاد کے الٹے نصیب کو الٹے کام سونپ دیے تھے اور چین کی بانسری بجا رہے تھے۔

جوں جوں یہ گفتگو آگے بڑھتی رہی، شہزاد کی کھوپڑی میں روشنی کے جھماکے بھی بڑھتے رہے۔ اسے یہ بھی پتا چل گیا کہ باواجی اس کی شادی کے سلسلے میں بھی پوری طرح مطمئن اور شاد باد ہیں۔ انہیں بڑھے کے ہر قر توت کی بددعا پر پورا یقین ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ شہزاد ورمن کو حاصل کرنے کی جتنی بھی کوشش کرے گا، اتنا ہی اس سے دور ہو جائے گا...... اور نرما وارث سے جتنا بھاگے گا، اتنی ہی گاڑھی سیاہی کے ساتھ وہ اس کی قسمت میں لکھی جائے گی۔ وہ سنتا رہا اور انکشافات کے بحر اکاہل میں غوطے کھاتا رہا۔ کھوپڑی میں آتش بازی جاری تھی۔

☆☆☆

اگلے روز شہزاد نے سب کچھ مارکو کے گوش گزار کر دیا۔ شروع میں یہ سب کچھ مارکو کو بھی ناقابل یقین لگا...... مگر جوں جوں وہ غور کرتا گیا، اس کی کھوپڑی میں بھی آگاہی اور یقین کے جھماکے ہونا شروع ہو گئے۔ اس بددعا کا دائرہ کار بہت وسیع محسوس ہو رہا تھا اور اس کے سگنل کہیں بھی کمزور پڑتے نظر نہیں آتے تھے۔ تازہ ترین ثبوت یہ الیکشن والی مہم ہی تھی جس کی کامیابی کی صورت میں ورمن کے رشتے کی بات چیت رک سکتی تھی۔ شہزاد، مارکو اور ان کے ساتھی اس مہم کو جتنا اٹھانا چاہ رہے تھے، وہ اتنی ہی بیٹھتی جا رہی تھی اور اب تو قربانی کے اڑیل اونٹ کی طرح اپنی جگہ سے ہل کر نہیں دے رہی تھی۔ جلسوں میں بھی زیادہ رونق نظر نہیں آتی تھی۔

اس روز بند کمرے میں شہزاد اور مارکو کے درمیان ایک طویل مذاکرہ ہوا۔ انہوں نے چند نہایت اہم اور کایا پلٹ قسم کے فیصلے کیے اور باواجی کی چال ان پر ہی الٹنے کا فیصلہ کر لیا۔ تازہ ترین انکشافات کی روشنی میں انہوں نے سب سے پہلے الیکشن والا گیم الٹنے کا عزم کیا۔ سمجھ میں یہی آ رہا تھا کہ وہ الیکشن جیتنے کی جتنی زیادہ کوشش کریں گے، اتنی ہی ذلت کے ساتھ ہاریں گے۔ اگلے روز سے انہوں نے الیکشن کے سلسلے میں اپنی ساری کوششوں کو الٹ دیا...... یعنی دھوبی پٹکا مار دیا۔ اس صورت حال پر الیکشن کا ایڈوائزر خوب حیران پریشان ہوا۔ یقیناً اسے یہی لگا تھا کہ کسی وجہ سے شہزاد اپنے ہوش و حواس کھو چکا ہے اور اس نے مارکو کو بھی تقریباً فاتر العقل کر دیا ہے۔ بہرحال ہوا وہی جو وہ دونوں چاہتے تھے۔ ان کے حکم پر ان کے کارکن گھر گھر گئے اور بیواؤں کو دی گئی ساری کی ساری سلائی مشینیں زبردستی واپس لے لیں۔ حلقے کے بے شمار گھروں میں بہت دہائی مچی مگر شہزاد اور مارکو کی طرف سے کارکنوں کو سخت ترین ہدایات تھیں۔ مزاحمت کرنے والی بیواؤں کو گھسیٹا گیا، ان کے دل کھینچے گئے۔ یہی سنگین قسم کا الف ٹائم ان محتاجوں اور ضرورت مندوں کو دیا گیا جن کو آٹے کے تھیلے اور راشن وغیرہ تقسیم کیا گیا تھا۔ جو ''بے خبر'' راشن وغیرہ استعمال کر چکے تھے، ان کی ماں بہن ایک کی گئی۔ سلائی مشینوں کی طرح سائیکلیں، لحاف اور اسی طرح کا دیگر امدادی سامان بھی ڈھونڈ ڈھونڈ کر برآمد کیا گیا۔ کارکنوں کے جوش و خروش کا یہ عالم تھا کہ چھینی گئی سلائی مشینیں اور سائیکلیں اس تعداد سے بھی زیادہ نکلیں جو تقسیم کی گئی تھیں۔ پورے حلقے میں ہاہاکار مچی تو شہزاد کو یقین ہونے لگا کہ کامیابی کی طرف پہلا قدم اٹھ گیا ہے۔

ابھی حلقے کے لوگ پہلے دھچکوں سے سنبھل بھی نہ پائے تھے کہ ان کو ایک اور آفت کا سامنا کرنا پڑا۔ بہت

سے لوگ جب اگلی صبح ''واش روم'' میں گئے تو انہیں طہارت وغیرہ کے لیے پانی کے بجائے سوئی گیس ملی۔ دوسری طرف خواتین خانہ نے دہائی مچائی کہ اکثر چولہوں میں سے ٹھنڈا ٹھار پانی نکل رہا تھا۔ یہ کارستانی بھی شہزاد کی زیر ہدایت اس کے جوشیلے کارکنوں کی تھی اور یہ کارستانی بھی انہوں نے چھپائی ہرگز نہیں۔

اسی روز سہ پہر کو شہزاد نے حلقے کے عیدگاہ گراؤنڈ میں ایک نہایت پر مغز اور منفرد خطاب کیا۔ اس نے مٹھی لہراتے ہوئے کہا۔ ''کوئی یہ نہ سمجھے کہ سوئی گیس اور پانی والی گڑبڑ غلطی سے ہوئی ہے۔ یہ ہم نے جان بوجھ کر کروائی ہے...... اور یہ سب کچھ ہم آئندہ بھی کرتے رہیں گے۔ یہ ہماری لاسٹ وارننگ ہے۔ 16 اپریل کو آپ ہمیں ووٹ دیں اور کیے پر مہر لگائیں...... ورنہ یاد رکھیں یہ مکا آپ کے منہ پر بھی پڑ سکتا ہے۔ آپ کا جینا حرام کر سکتا ہے...... میرا منشور مکمل کتاب کی طرح ہے۔ میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ ہماری کامیابی کی صورت میں ان شاء اللہ گلی گلی میں چرس، ہیروئن اور آئس وغیرہ دستیاب ہوگی۔ ہر اسکول، کالج کے سامنے منشیات فروشوں کو سہولتیں فراہم کی جائیں گی۔ اسلحے کے خریداروں کو نہایت ہی آسان بلکہ برائے نام قسطوں پر اسلحہ فراہم کیا جائے گا۔ پبلک مقامات پر شراب پینے اور سرعام اسلحہ لہرانے کی حوصلہ افزائی کی جائے گی۔ ون ویلنگ کے باقاعدہ مقابلے کرائے جائیں گے اور جاں بحق ہونے والوں کو سول ایوارڈز دیے جائیں گے۔ پتنگ بازی کو پھر سے رواج دیا جائے گا اور کیمیکل ڈور کے تحفظ کا قانون بھی ہم نے منشور میں شامل کر لیا ہے۔''

لوگ جلسے سے نکل کر جانے لگے تو شہزاد اور مارکو نے انہیں ماں بہن کی گالیاں دیں اور جھنڈا بردار کارکنوں نے جھنڈوں کو ڈنڈے بنا کر لوگوں کی ٹھکائی کی۔

...... جوں جوں شہزاد کی عجیب و غریب الیکشن کمپین آگے بڑھتی رہی، شہزاد اور مارکو کو یقین ہوتا گیا کہ وہ صوبائی اسمبلی کا الیکشن جیت کر رہیں گے۔ دوسری طرف ورمن اور اس کے والد صاحب، شہزاد کو فاتر العقل سمجھنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ نرما وارث اور اس کے اہل خانہ بھی ہکا بکا تھے۔ ان سب کو کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی مگر شہزاد کو آ رہی تھی۔ الٹے پیر کی بددعا کی برکت سے شہزاد یہ الیکشن جیتنے جا رہا تھا۔ اس نے لوتی جھگڑتی اور روتی بسورتی ورمن کو یقین دلایا تھا کہ ایک کرشمہ ہونے جا رہا ہے۔ بظاہر جو کچھ نظر آ رہا ہے، محض وہ نظر کا دھوکا ہے اور بات صرف اس الیکشن ہی کی نہیں...... ایک

اتفاقاً

کلاس ٹیچر بچوں کو سمجھا رہی تھیں کہ کن باتوں کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ وہ اتفاقاً ہوئیں پھر انہوں نے ایک بچے کو ہدایت کی کہ وہ اس کی کوئی مثال بیان کرے۔

بچہ سوچ کر بولا۔ ''میرے ابو اور امی کی شادی اتفاقاً ایک ہی دن ہوئی تھی۔''

(مرسلہ: مسکان خان، کوئٹہ)

ثبوت

پہلوان جی چھٹی منزل سے گرنے کے بعد اسپتال میں تھے۔ ان کا ایک پڑوسی عیادت کے لیے پہنچا۔ انہیں سر سے پاؤں تک پٹیوں میں لپٹا اور بے حس و حرکت لیٹا دیکھ کر پڑوسی نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔ ''پہلوان جی! کیا آپ مر چکے ہیں؟''

''ہاں۔'' پٹیوں میں سے آواز آئی۔

پڑوسی گہرا سانس لے کر بولا۔ ''پہلوان جی! آپ تو بڑے جھوٹے آدمی ہیں۔ بول رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ میں مر چکا ہوں۔''

''میرے مرنے کا اس سے بڑا ثبوت کیا ہوگا کہ تم مجھے جھوٹا کہہ رہے ہو۔ اگر میں زندہ ہوتا تو تم میرے منہ پر مجھے جھوٹا کہہ سکتے تھے؟'' پہلوان جی کی تکلیف زدہ آواز سنائی دی۔

(مرسلہ: حرا اطہر، کراچی)

''اسم اعظم'' کے طفیل ان کے باقی سارے کام بھی سیدھے ہونے جا رہے ہیں۔''

اور پھر واقعی کرشمہ ہو گیا۔ شہزاد کی ضمانت تو ضبط ہونا ہی تھی۔ اس نے کسی بھی الیکشن میں کم سے کم ووٹ لینے کا 70 سالہ ریکارڈ توڑ دیا۔ وہ شہزاد کے لیے بہت بڑا دن تھا۔ اس نے چرس سے بھرے ہوئے کئی سگریٹ پیے اور نڈھال سا ہو کر بسکٹ فیکٹری کے آفس میں میز پر اوندھا گر گیا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ بددعا میں کوئی تکنیکی خرابی پیدا ہو گئی تھی یا وہ خود کہیں کوئی غلطی کر گیا تھا...... شومئی قسمت اس نہایت ابتر موڈ میں مارکو اس کی اشک شوئی کے لیے آن پہنچا۔ ابھی مارکو نے اتنا ہی کہا تھا۔ ''یار حوصلہ کر......'' کہ شہزاد جمپ لگا کر اس پر جا پڑا۔ وہ اسے گھونسے مارتا جاتا تھا اور پکارتا جاتا تھا۔ ''اب تو بھی حوصلہ کر...... تو بھی حوصلہ

کر۔۔۔ یہ سب تیرا ہی کیا دھرا ہے۔۔۔ کسی اندھی چڑیل کے لے پالک بچے۔"

اس نے مارکو کی پسلیاں چٹخا کر رکھ دیں پھر وہ اس کے تھوبڑے پر اپنا انتقامی نشان آزمانے لگا تو مارکو نے۔۔۔ بہ مشکل اپنی ناک کی ہڈی بچائی۔ اسے پتا تھا پچھلی رحیمہ مشق میں شہزاد نے اسے ادھیڑ کر رکھ دیا تھا۔ اس کے علاوہ اس کا ڈھائی لاکھ کا سوٹ اور کوئی سات لاکھ کی گھڑی بھی برباد ہو کر رہ گئی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ڈھیلا نہیں پڑا اور جوں ہی بپھرے ہوئے شہزاد نے اس کے ایک پرائیویٹ پارٹ پر گھٹنا رسید کرنا چاہا وہ تڑپ کر اس کے نیچے سے نکل گیا۔ ساتھ ساتھ وہ دبی آواز میں بول رہا تھا۔ "کچھ خدا کا خوف کر چیتے۔۔۔ اپنا گھر نہیں دفتر ہے۔ کوئی آسکتا ہے۔"

لیکن چیتا تو واقعی چیتا بنا ہوا تھا۔ اپنے پاؤں پر کھڑا ہوتے ہی اس نے پھر اچھل کر مارکو پر سوار ہونا چاہا۔ اس بار مارکو جھکائی دے گیا۔ شہزاد اوندھے منہ قالین پر گرا۔ یہ سب فرسٹریشن اور افراط چربی کا نتیجہ تھا۔ اب مارکو بھی بھنا گیا۔ وہ اس کی پشت پر سوار ہو گیا اور گردن کے گرد بازو لپیٹ دیا۔ آفس کے دروازے پر بڑی شائستہ سی دستک ہوئی جب فائل بردار ملازمہ نے اندر جھانکا۔ اس کا رنگ اڑ گیا۔ منظر پچھلی مرتبہ جیسا ہی تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اب شہزاد نیچے اور مارکو اوپر تھا۔ وہ جلدی سے دروازہ بند کر کے واپس چلی گئی۔

وہ دن ہی شاید بہت برا تھا۔ اس دن نہ صرف شہزاد اور مارکو کے درمیان سنجیدہ قسم کی لڑائی ہوئی اور مارکو سرخ چہرے کے ساتھ اس کے دفتر سے نکل گیا بلکہ رات کو گھر میں بھی شہزاد اور باواجی کے درمیان پانی پت والا سین ہو گیا۔ اس روز خلاف معمول باواجی ایک کڑھائی دار شیروانی میں نظر آرہے تھے۔ غالباً وہ دنیا کی مظلوم ترین شیروانی تھی جس کو اتنی بڑی توند ڈھانپنا پڑ رہی تھی۔ شہزاد ان پر پھٹ پڑا۔ وہ ہاتھ لہرا لہرا کر چلایا۔ "آپ نے کبھی بزرگوں، فقیروں کی عزت نہیں کی۔ ہر ایک کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکا۔ ڈھائی سال پہلے ہڑپہ میں جو کچھ ہوا وہ صرف اور صرف آپ کی وجہ سے ہوا۔۔۔۔ اور اس کا سارا وبال مجھ پر آیا۔ بجائے اس کے کہ آپ اپنے اکلوتے بیٹے کو اس وبال سے نکالنے کی کوشش کرتے، آپ نے اس وبال سے فائدہ اٹھایا۔ میرا تماشا بنایا۔۔۔۔ میری محبت دُرِ ثمن کو مجھ سے دور کرنے اور اس حرافہ ثریا کو میرے گوڈوں گٹوں میں بٹھانے کی کوشش کی۔ میں سب کچھ جان چکا ہوں جو آپ نے کیا۔۔۔۔"

"بکواس بند کرو۔" باواجی گرجے۔ "مرکیوں نہیں جاتے۔۔۔ تیجے پر جاؤ۔ کیا تم نے دولت نہیں کمائی؟"

"میں لعنت بھیجتا ہوں اس دولت پر۔۔۔ یہ آپ کی ہے اور آپ کی رہے گی۔ مجھے دُرِ ثمن چاہیے تھی جو۔۔۔ ستم ہے کہ مجھ سے چھن گئی ہے۔"

"دولت پر صرف لعنت بھیجنے سے کچھ نہیں ہوگا۔ اسے واپس کرو۔" وہ پھر دہاڑے۔

شہزاد پے آرڈر بنوا کر لایا تھا۔ اس نے 2.6 بلین کا پے آرڈر باواجی کے سامنے پھینک دیا۔

اس کے انداز نے باواجی کو مزید تاؤ چڑھایا۔ "اوئے، انسان کا بچہ بن۔ بدتمیزیاں نہ دکھا۔ کوئی احسان کر رہا ہے مجھ پر؟" وہ اتنے زور سے بولے کہ جوانی والی کالی کھانسی کا دورہ پڑ گیا۔ شیروانی کے دو تین بٹن ٹوٹ گئے۔ اندر سے شائکہ مون بھاگی ہوئی آئی۔

"اوہ گاڈ۔۔۔۔ کیا ہوا آپ کو؟" وہ جلدی جلدی باواجی کا سینہ مسلنے لگی۔ یہ دیکھ کر شہزاد کی حیرت اور بڑھی۔ صرف باواجی ہی "کامدار شیروانی" میں نہیں تھے، شائکہ بھی زرق برق لباس میں تھی۔ اس کے جسم میں آتشیں لہر دوڑ گئی۔ دو تین منٹ بعد ہلکی ہلکی کھانسی کے دوران میں باواجی شہزاد کو خوشخبری سنا رہے تھے کہ انہوں نے اس کے اندیشے کو حقیقت کا روپ دے دیا ہے۔ وہ شائکہ مون سے رشتہ ازدواج میں منسلک ہو چکے ہیں۔ اس رشتے سے شائکہ اس کی ممی ہے۔ انہوں نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کڑے لہجے میں کہا۔ "اپنی نئی ماں کو سلام کرو۔"

وہ سلام کا کہہ رہے تھے اور شہزاد کا دل چاہ رہا تھا کہ انہیں اکیس توپوں کی سلامی دے اور ساری توپوں کا رخ اصلی گولوں کے ساتھ اپنی اس نئی "امی جان" کی طرف ہی رکھے۔ شہزاد سکتہ زدہ سا کھڑا تھا۔ اپنے سے تین چار سال چھوٹی اس چھپکلی نما لڑکی کو والدہ محترمہ کا درجہ دینا اس کے لیے تقریباً ناممکن تھا۔ باواجی نے چیخ کر کہا۔ "سنا نہیں میں کیا کہہ رہا ہوں۔ سلام کرو اپنی اس نئی امی کو۔ آگے بڑھ کر پیار لو اس سے۔"

وہ پیار لینے کا کہہ رہے تھے اور شہزاد کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اپنے پورے وزن کے ساتھ اس سنگل پسلی امی کی گود میں ہی جا بیٹھے۔۔۔۔ اور اس کے جسم کی کسی ہڈی کا فریکچر کر دے۔ وہ صوفے پر بیٹھی اپنی چمکیلی آنکھوں سے اسے دیکھتی چلی جا رہی تھی۔

شہزاد ٹس سے مس نہ ہوا تو باواجی اس زور سے

دہاڑے کہ شیروانی کے باقی کے بٹن بھی ٹوٹ گئے۔ "دفع ہو جاؤ یہاں سے۔ اگر تمہارا یہ رویہ ہے تو پھر اس گھر میں کوئی جگہ نہیں ہے تمہارے لیے۔ نکل جاؤ میرے گھر سے۔"

اور وہ نکل گیا۔

☆☆☆

یہ شہزاد کے لیے سخت پریشانی اور ابتلا کے دن تھے۔ وہ اپنے ایک پرانے منیجر اشفاق رحمانی صاحب کے چھوٹے سے گھر میں منتقل ہو چکا تھا۔ باپ کے گھر سے وہ اپنے چند کپڑوں اور ذاتی استعمال کی اشیا کے سوا اور کچھ نہیں لایا تھا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ بددعا والی بات کو وہ شروع میں تو مذاق ہی سمجھا تھا مگر اب اسے بڑی حد تک یقین آچکا تھا۔ اس کے باوجود ایک تازہ الجھن بھی تھی۔ اگر اس کلیے پر یقین کر لیا جاتا کہ شہزاد جو کچھ بھی چاہے گا، اس کے الٹ ہوگا تو پھر ایم پی اے کے الیکشن میں یہ کلیہ کیوں فیل ہو گیا تھا۔ تب تو شہزاد نے بڑی رنجیدگی سے کوشش کی تھی اور نہایت سوچ سمجھ کر ایسے غلط اقدام کیے تھے جو الیکشن جتوانے کے لیے ناکافی تھے پھر کیوں "کلیے" کی ایسی تیسی ہو گئی اور وہ ہار گیا؟ ایک روز وہ ایک نفسیات دان جاں ماہر روحانیات کے پاس پہنچا اور اپنی ساری روداد "الف تا ے" بیان کر دی۔

ماہر نے اس بات کی تائید کی کہ پرانے کھنڈروں میں چالاتی دوپہروں میں کچھ ایسے لوگ گھومتے پائے گئے ہیں جو کالے سیاہ ہوتے ہیں اور اتنے کالے ہوتے ہیں کہ ان کے منہ کا اندرونی حصہ اور زبان تک کالی ہوتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ پاؤں کے بجائے ہاتھوں کے بل چلتے ہیں۔ ان کا تعلق غالباً کسی قدیم قبیلے سے ہے۔ ان کی بددعا بہت "ہائی وولٹیج" کی ہوتی ہے۔۔۔۔ اور ایک بار لگ جائے تو عرصہ دراز تک Valid رہتی ہے۔ جنوبی پنجاب اور سندھ میں نظر آنے والے ایسے لوگوں کے دو چار واقعات بھی انہوں نے سنائے۔

شہزاد اب اس معاملے کو پوری سنجیدگی سے لے رہا تھا۔ اس نے کہا۔ "آپ نے میری پوری بات سن لی۔ اب مجھے بس ایک سوال کا جواب دے دیں۔ یہ بددعا الیکشن والے معاملے میں کیوں کامیاب نہ ہوئی؟"

ماہر نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "یہ بہت گہری اور باریک بات ہے شہزاد صاحب۔ دراصل اس بددعا کا تعلق تمہارے افعال سے نہیں، تمہارے دلی ارادے سے ہے۔ بے شک تم نے الیکشن ہارنے کے لیے ظاہری طور پر نہایت بھونڈی کوششیں کیں لیکن دلی طور پر تو تم الیکشن اور اپنی محبوبہ کو جیتنا ہی چاہتے تھے نا۔" ایکسپرٹ کے جواب نے شہزاد کو لاجواب سا کر دیا۔

وہ بے حد مایوسی اور دکھ کے شب و روز تھے۔ یوں لگتا تھا کہ کوئی بھی اس سے خوش نہیں ہے۔ والد گرامی اس کی تشریف پر لات مار چکے تھے۔ تھکے ہارے بھی اب پورے کپڑے پہن لیے تھے اور روٹھا بیٹھا تھا۔ پچھلے دو تین ہفتوں میں وہ دُرِ ثمن کو سیکڑوں کالیں کر چکا تھا مگر اس نے بات نہیں کی۔ اب وہ اس کی بارھویں سم بھی بلاک کر چکی تھی۔ اس کی خوبصورت ناک اور ناک کا تل دن بدن شہزاد کی نگاہوں میں دھندلاتے چلے جا رہے تھے۔

ہولے ہولے ساڈے کولوں دور ٹر گئی
ایسا اوہدی زندگی چہ کون آ گیا

اور پھر ایک روز ثریا کی زبانی ہی اسے پتا چلا کہ واقعی دُرِ ثمن کی زندگی میں کوئی آنے والا ہے یا شاید آچکا ہے۔ ثریا کو کہیں سے یہ اڑتی اڑتی خبر ملی تھی کہ دُرِ ثمن اپنے پروفیسر والد اور فیملی کے دیگر افراد کے ساتھ ایک اور اہم فیملی سمیت تاران، کاغان وغیرہ کی طرف گئی ہوئی ہے۔ شہزاد کو خیال گزرا کہ شاید یہ وہی بالکل ناکب ناظم ہوگا جسے وہ اور مارکو "او میٹر ٹر لوکے" کا خطاب دیا کرتے تھے مگر پھر پتا چلا کہ وہ رشتہ تو پروفیسر کے ہاتھ سے نکل گیا ہے۔ اب یہ کوئی اور فیملی ہے۔ کافی کھاتے پیتے لوگ ہیں۔

ایک دن تنہائی میں شہزاد آٹھ آٹھ آنسو رویا۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ دُرِ ثمن ایسے بدل جائے گی۔ شاید اس کی قسمت ہی خراب تھی۔ عرش سے فرش پر آ گیا تھا۔ کہاں مہنگی گاڑیوں کے قافلے میں گارڈز کے ساتھ سفر اور کہاں اپنے سابقہ منیجر کی عمر رسیدہ سوزوکی۔ ثریا ہر وقت اس کا حوصلہ بڑھانے کی کوشش کرتی رہتی تھی لیکن یہ حق تو وہ چیز ہے جو موجود ہو۔ ثریا اسے مالی تعاون کی پیشکش بھی کرتی تھی مگر یہ اسے قبول نہیں تھا۔ ثریا کو شہزاد کے دیوداس سوا کا پتا تھا لہٰذا وہ آج کل اٹھتے بیٹھتے اپنے جسم کے مختلف اینگل بھی شہزاد پر واضح نہیں کرتی تھی۔

ایک دن بولی۔ "شہزادا مارکو نے تمہیں زورجوں تجربے دیں اور سب ناکام ہو گئے۔ آج ایک تجربہ میری بھی مان لو۔ ہڑپہ جا کر اس کالی زبان والے فقیر کو تلاش کیا جائے۔"

"میں نے تمہیں بتایا تھا کہ پچھلے مہینے ایسی کوشش میں کر چکا ہوں۔ کچھ نہیں ملا۔" شہزاد نے مری مری آواز میں کہا۔ "لیکن تم نے صرف دو تین بندے بھیجے تھے۔ میں

چاہتی ہوں کہ میں تمہیں بتا دوں کہ مجھے جو ایسے کاموں کے ماہر بھی ہوں۔ فرح کی کوئی فکر نہیں۔ میں ارینج کر لوں گی۔ تم بعد میں دے دینا۔"

پہلے تو شہزاد نہیں مانا، پھر راضی ہو گیا۔

وہ اپنے طور پر کھوج لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ کون سی امیر کبیر فیملی ہے جس کے لڑکے کے ساتھ پروفیسر فاروق صاحب ورمن کا ناتا جوڑنا چاہ رہے ہیں لیکن ابھی تک معلوم نہیں ہو سکا تھا۔ وہ لوگ ہنوز کاغان، ناران کی حسین وادیوں میں تھے۔ ایک روز اپنے موبائل کی اسکرین پر ورمن کا میسج دیکھ کر وہ اچھل پڑا۔ ورمن نے لکھا تھا۔

"شہزاد! میں چاہتی ہوں تم حقیقت کو تسلیم کرنا سیکھ لو۔ جو کام نہیں ہو سکتا، وہ نہیں ہو سکتا۔ سچ کڑوا ہوتا ہے شہزاد! لیکن سچ یہی ہے کہ میں نے اپنا شریک حیات ڈھونڈ لیا ہے۔ میں بہت خوش ہوں۔ پاپا بھی میری خوشی میں خوش ہیں۔ تم سے اتنا ہی کہنا ہے کہ مجھے بھول جاؤ۔ ہم ایک دوسرے کو ہمیشہ دعاؤں میں یاد رکھیں گے۔ خدا حافظ۔"

یہ مرے کو مارے شاہ مدار والی بات تھی۔ شہزاد کے سینے سے "دل" تو عرصہ پہلے وہ "ناک کے تل والی" نکال کر لے جا چکی تھی ورنہ آج ضرور اسے "دل" کا دورہ پڑ جاتا۔ ورمن کے اس میسج سے واضح ہوتا تھا کہ اس نے خود کسی سے دل لگایا ہے اور اب دل کی اس لگی کو وہ دونوں لیملیو رشتے میں بدلنے کے لیے تیار ہیں۔

☆☆☆

شہزاد ایک بے آسرا پناہ گزین کی طرح اپنے سابق نیجر اشفاق رحمانی صاحب کے عام سے گھر کے ایک کمرے میں موجود تھا۔ کروڑوں کے مالک شہزاد وہلہ کو اس کے لالچی باپ نے فٹ پاتھ پر کھڑا کر دیا تھا۔ دروازے پر دھیمی دستک ہوئی تو وہ چونک گیا۔ ثریا وارث آج کل ہڑپہ اور ساہیوال کے علاقے میں کالی زبان والے اس فقیر کو تلاش کروا رہی تھی۔ دروازے پر وہی تھی۔ شاید وہ کوئی اچھی خبر لائی تھی مگر جب شہزاد نے دروازہ کھولا تو ثریا کے چہرے پر خوشخبری کے بجائے "ناگہانی اطلاع" جیسا کوئی لفظ لکھا ہوا تھا۔ وہ چند لمحے تک شہزاد کو سنسنی خیز انداز میں دیکھتی رہی پھر بولی۔ "ورمن اور اس کا "متوقع" شوہر واپس لاہور آ چکے ہیں بلکہ آج کل ایک ہائی فائی ریسٹورنٹ میں مل بھی رہے ہیں۔"

"تم نے خود دیکھا ہے یا نہیں؟"

"ہاں، اپنی ان گناہ گار آنکھوں سے...... بلکہ مجھے پتا چلا ہے کہ وہ آج بھی ڈنر اسی ریسٹورنٹ میں فرمائیں گے۔"

"کیسا ہے وہ لڑکا؟" شہزاد نے اپنے اندر کی شدید جلن چھپاتے ہوئے کہا۔

"تم خود دیکھ لینا...... بلکہ چاہو تو ابھی چلتے ہیں۔" ثریا نے اپنی رسٹ واچ دیکھتے ہوئے کہا۔

قریباً بیس منٹ بعد وہ دونوں اس ریسٹورنٹ کی پارکنگ میں موجود تھے۔ ثریا کی جیگوار گاڑی سے نکل کر وہ بذریعہ لفٹ عمارت کی چھت پر پہنچے جہاں ریسٹورنٹ واقع تھا۔ ایک کھڑکی میں سے ثریا نے شہزاد کو ریسٹورنٹ کے ہال کا ایک نیم تاریک گوشہ دکھایا۔ شہزاد کو لگا وہ جیسے زمین آسمان کے درمیان معلق ہو گیا ہے۔ اسے اپنی نگاہوں پر بھروسا نہیں ہو رہا تھا۔ نیم تاریک گوشے میں ورمن جس کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے چہک رہی تھی، وہ کوئی اور نہیں اس کا جگری یار مارکو تھا۔ ورمن سے اس کی نفرت تو پہلے ہی "بے بہا" ہو چکی تھی۔ اب وہ ساتویں آسمان کو چھو گئی۔ اسے پتا ہی نہیں چلا کب وہ ثریا سے ہاتھ چھڑا کر ہال میں پہنچا، کب وہ مارکو پر جھپٹا، کب اس کی عین ناک پر مکا رسید کیا اور کب اس پر پل پڑا۔ مارکو اسے چیتا کہتا تھا اور آج وہ چیتا ہی لگ رہا تھا۔ پورے ہال میں کہرام مچ گیا۔ کئی بلوری میزیں ٹوٹ گئیں۔ شہزاد نے اسے دھنک کر رکھ دیا۔ ساتھ ساتھ وہ چلا رہا تھا۔ "تو یار نہیں...... یار مار ہے، مکار اور دغا باز ہے۔ میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

چار پانچ افراد ان کو چھڑانے کی کوشش کر رہے تھے۔ ان میں ورمن بھی شامل تھی۔ وہ مارکو کے سامنے ڈھال سی بنی ہوئی تھی۔ شہزاد کی آنکھوں میں شعلے لپک گئے۔ اس نے کھینچ کر ورمن کو دور پھینکا۔ لوگوں نے شہزاد کو دونوں طرف سے پکڑ رکھا تھا۔ شہزاد نے دور ہی سے ورمن کی طرف تھوک دیا۔ "لعنت ہے تیرے عورت ہونے پر...... تیرے جیسی عورتیں پیسے کی یار ہوتی ہیں جو کبھی بھی کوٹھوں پر جا بیٹھتی ہیں......"

موقع ملتے ہی مارکو، ورمن کو وہاں سے نکال لے گیا۔ ریسٹورنٹ کی انتظامیہ شہزاد کو پولیس کے حوالے کرنا چاہ رہی تھی مگر ثریا درمیان میں آ گئی۔ اس نے مذاکرات کے بعد ایک بڑی رقم کا چیک کاٹا اور کہہ سن کر یہ سارا معاملہ رفع دفع کرایا۔

دھینگا مشتی میں شہزاد کے پاؤں پر خاصی چوٹ آئی تھی۔ اس رات پچھلے پہر تک وہ اپنے کمرے میں چیتے بلکہ لنگڑے چیتے کی طرح ٹہلتا رہا اور تصور ہی تصور میں مارکو اور اس بدباطن ورمن کو مختلف طریقوں سے قتل کرتا رہا۔ کبھی

چھریوں کے پے در پے وار کر کے، کبھی فائرنگ سے چھلنی کر کے اور کبھی سیوریج کے پانی میں ڈبو ڈبو کر...... لیکن اگر وہ سمجھتا تھا کہ اس طرح کی خود لذتی سے اسے کا غیظ و غضب کم ہو جائے گا تو یہ اس کی بھول تھی۔ کچھ دیر پہلے ہی اسے ثریا کی زبانی پتا چل چکا تھا کہ ان دونوں کی باقاعدہ منگنی ہو چکی ہے اور اگلے سے اگلے ویک اینڈ پہ ان دونوں کی شادی بڑی دھوم دھام سے لاہور کے فائیو اسٹار ہوٹل میں ہو رہی ہے۔

دن کب رکتے ہیں۔ وہ گزرتے چلے جاتے ہیں۔ جوں جوں شادی کا دن نزدیک آ رہا تھا، شہزاد کی بے کلی بڑھتی جا رہی تھی۔ شادی سے پہلے وہ کہیں دور چلے جانا چاہتا تھا۔ کسی ایسی جگہ جہاں ورمن کی منحوس صورت تو کیا، اس کا تصور بھی اس کے ذہن میں نہ آ سکے مگر کہیں دور جانے کے لیے کرایہ درکار ہوتا ہے اور وہلہ انڈسٹریز کے روح رواں شہزاد وہلہ کے پاس فی الوقت شیخوپورہ تک کا کرایہ بھی نہیں تھا۔

ورمن کی "شادی" کو اب صرف ایک ہفتہ رہ گیا تھا۔ شہزاد کا دل چاہتا تھا کہ جلد سے جلد یہ مرحلہ گزر جائے...... اسے ڈر تھا کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ اپنے غیظ و غضب کو سنبھال نہ سکے اور ورمن نام کی اس حرافہ کو اپنے کمینے، کم ظرف دوست سمیت واقعی گولیوں سے چھلنی کروا لے۔ وہ جب مارکو کے بارے میں سوچتا تھا تو اس کی آنکھوں سے بے اختیار آتشیں آنسو رسنا شروع ہو جاتے تھے۔ آستین کے سانپ والا محاورہ شاید مارکو کی بدباطنی کو کامل طور پر بیان نہیں کر سکتا تھا۔

ثریا تقریباً روز ہی آ جاتی تھی۔ شہزاد کی اذیت اور بے کلی کو کم کرنے کے لیے وہ اسے اپنے ساتھ اپنی جیگوار گاڑی میں بٹھاتی تھی اور لاہور و گردونواح میں گھماتی پھراتی رہتی تھی۔ اس نے شہزاد کو بتا رکھا تھا کہ وہ ایک شارٹ فلم بنا رہی ہے۔ اس کا نام اس نے "کچھ نہ کچھ ہو جاتا ہے" بتایا تھا۔ فلم کا نام ہی اس کا تھیم سونگ بھی تھا جسے وہ کبھی کبھی گنگناتی تھی...... کچھ نہ کچھ ہو جاتا ہے۔ تاہم شہزاد کی حالت زار دیکھتے ہوئے اس نے آج کل فلم پر کام بھی روک رکھا تھا۔

آج بھی اس نے شہزاد کو اپنے ساتھ لیا اور اسے گھمانے پھرانے نکل گئی۔ لاہور سے نکل کر وہ دونوں شیخوپورہ روڈ کی طرف چلے گئے پھر تاریخی ہرن مینار کے پاس سے گزرتے ہوئے وہ گھنے درختوں کے درمیان نیم پختہ سڑک پر جا رہے تھے جب ایک جگہ بڑا مجمع دیکھ کر رک گئے۔ یہ انگریزوں کے دور کا ایک کھنڈر سا ریسٹ ہاؤس تھا۔ کافی بڑے رقبے پر پھیلا ہوا تھا۔ اس کھنڈر کے سامنے درجنوں بچے، بوڑھے اور جوان جمع تھے...... وہ واویلا کر رہے تھے۔ ان لوگوں کے سامنے زرد رنگ کے دو عدد دیوہیکل بلڈوزر کھڑے تھے۔ قریب ہی تین چار لگژری جیپیں بھی نظر آ رہی تھیں۔ ایک جیپ دیکھ کر ثریا اور شہزاد ایک ساتھ چونک گئے۔ یہ اسی شیر افگن کی جیپ تھی جس کے ساتھ اوپ ہوٹل والا جھگڑا ایمن آباد کے علاقے میں ہوا تھا۔ شہزاد اور ثریا جلدی سے گاڑی سے نکل آئے۔ یہاں منظر بے حد ڈرامائی تھا۔ پولیس بھی موجود تھی۔ بلڈوزر غالباً ریسٹ ہاؤس کے کھنڈر پر چڑھائی کرنا چاہ رہے تھے مگر بلڈوزروں کے سامنے دس پندرہ افراد لیٹ گئے تھے۔ ان میں مردوں کے علاوہ تین چار عورتیں بھی تھیں۔ خستہ حال لوگوں کا باقی ہجوم چلا رہا تھا اور احتجاجی نعرے لگا رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے دونوں بلڈوزر جھٹکوں کے ساتھ اپنی جگہ سے حرکت میں آئے اور کھنڈر کی طرف بڑھے۔ لیٹنے والے لیٹے رہے...... مگر جب بلڈوزر بالکل سر پر پہنچ گئے تو ان کی ہمت جواب دے گئی اور وہ چلاتے ہوئے اٹھ کر بھاگے۔ بلڈوزر کھنڈر ریسٹ ہاؤس کی بیرونی دیوار سے ٹکرائے اور اس کا کچھ حصہ مسمار کر دیا۔ تب وہ پھر پیچھے کی طرف گئے۔ ان کی اگلی ٹکر سے پہلے شہزاد لپکتا ہوا ان کے سامنے پہنچ گیا۔ "رک جاؤ۔" وہ ہاتھ اٹھا کر دہاڑا۔

اس کے ساتھ ہی اس نے شیر افگن کی طرف دیکھا جو اب حیران پریشان سا اپنی جہازی سائز جیپ کے پاس کھڑا تھا۔ اس نے بھی شہزاد کو دیکھ لیا تھا۔ شہزاد اندر سے تو پھول رہا تھا مگر اتنی بات وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اتنا تو ہی سہی مگر شیر افگن اور ملک پارٹی پر اس کی دھاک بڑی اچھی طرح بیٹھ چکی ہے۔ اس "دھاک" کا ثبوت بھی شہزاد کو جلد ہی نظر آ گیا۔ اس نے دور سے ہی دیکھ لیا تھا کہ ملک شیر کی اوپر کو اٹھی ہوئی مونچھیں تھوڑی تھوڑی ڈھیلی پڑ گئی ہیں اور رنگ زرد نظر آنے لگا ہے۔ موقع پر موجود پولیس پارٹی بھی اس کایا پلٹ پر حیران تھی۔

شہزاد نے اپنے گلے پر پورا زور ڈال کر آواز کو گرج دار بنایا اور وہیں کھڑے کھڑے پکارا۔ "یہ کیا ہو رہا ہے ملک شیر؟"

ملک شیر لڑکھڑاتا ہوا سا شہزاد کی طرف بڑھ آیا۔

اگلے آدھ پون گھنٹے میں ساری صورت حال واضح ہو گئی۔ "اوپ ہوٹل" حاصل کرنے کے بعد ملک پارٹی یہاں بھی ویسا ہی "جنگل منگل" ہوٹل بنانا چاہتی تھی۔ ریسٹ ہاؤس کے اس وسیع کھنڈر میں مقامی غریب لوگوں نے

چھوٹے چھوٹے پارٹیشن کر کے رہائش کے لیے کمرے وغیرہ بنا لیے گئے تھے..... اب ملک پارٹی انہیں اس کھنڈر سے بے گھر کرنے آ گئی تھی۔

شہزاد نے وہی کیا جو اسے کرنا چاہیے تھا۔ اس نے ملک شیر کو اب..... ایسا نہیں کرنے دے گا اور اگر کوئی ہرجانے وغیرہ کی بات ہے تو وہ ملک پارٹی کو ادا کر دیا جائے گا۔ ملک شیر کے پاس ماننے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ وہ شہزاد کا "جگرا" دیکھ چکا تھا۔

جب بلڈوزر واپس جا رہے تھے اور لوگ خوشی سے نعرے لگا رہے تھے تو ایک اور کرشمہ ہوا۔ شہزاد کے پاس کھڑی زرما وارث نے کھنڈر کی طرف دیکھا اور خوشی آمیز لہجے میں پکاری۔ "شہزاد..... اوہ دیکھو..... شہزاد دیکھو۔"

شہزاد نے گھوم کر دیکھا اور اس کی حسیات بھی سمٹ کر آنکھوں میں آ گئیں۔ اس نے گہرے سیاہ رنگ کے ایک نیم دھڑنگ شخص کو دیکھا۔ وہ پاؤں کے بجائے ہاتھوں سے چلتا ہوا کھنڈر میں سے باہر نکل رہا تھا۔ اس کا سر نیچے اور ٹانگیں اوپر تھیں۔ شہزاد نے ایک لمحے میں پہچان لیا..... یہ وہی تھا..... یہ وہی تھا۔ ڈھائی تین برس پہلے باوا جی کی ہدایت پر شہزاد نے اسی درویش صفت کے ساتھ بُرا برتاؤ کیا تھا اور اس سے بددعا لی تھی۔ یہی وہ شخص تھا جسے ہڑپہ میں "پٹھا پیر" کہا جاتا تھا۔ یہاں بھی لوگ اس کے ساتھ نہایت عقیدت کا مظاہرہ کر رہے تھے۔

زرما فرطِ جذبات سے اچھل کر خوشی سے چلائی۔ "مجھے پتا تھا کہ اب کچھ نہ کچھ ہو جاتا ہے..... کچھ نہ کچھ ہو جاتا ہے۔ دیکھو شہزاد! ہم نے اسے پا لیا۔"

پھر وہ اس کی طرف لپکی اور اس کے پاؤں چھو لیے۔

کچھ ہی دیر بعد پٹھا یعنی الٹا پیر ایک بہت بڑی چارپائی پر جا بیٹھا اور ایک درخت سے ٹیک لگا لی۔ وہ درمیانی عمر کا تھا۔ واقعی لگتا تھا کہ ڈھائی تین ہزار سال پہلے کے کسی سخت جان قبیلے سے اس کا شجرۂ نسب جا ملتا ہوگا۔ وہ سیاہ ترین حبشی سے بھی زیادہ سیاہ تھا اور انوکھی بات یہ تھی کہ وہ بولتا تھا تو پتا چلتا تھا کہ اس کا منہ اور زبان وغیرہ بھی اندر سے کالے ہیں۔ اس نے بھی شہزاد کو دیکھ لیا تھا اور اب جیسے اسے پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔

زرما ایک بار پھر مسرت بھرے لہجے میں پکاری۔ "مجھے پتا تھا، اب کچھ نہ کچھ ہو جاتا ہے..... مجھے پتا تھا....."

پھر اس نے اپنا سیل فون نکالا اور لوگوں سے تھوڑا سا دور جا کر ایک نمبر ملایا اور جوشیلے انداز میں بولی۔ "درمن..... میں نے کہا تھا نا کہ اب کچھ ہو جائے گا..... دیکھو ہو گیا۔ وہ بندہ جسے ہم پتا نہیں کہاں کہاں ڈھونڈ رہے تھے، یہاں شیخوپورہ کے قریب ایک کھنڈر میں مل گیا ہے۔ ہاں وہی ہے..... ہاں، ہاں..... شہزاد بھی یہیں ہے..... میں تو کہتی ہوں تم بھی آ جاؤ۔"

شہزاد کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ زرما کیا کہہ رہی ہے اور اس نے درمن سے رابطہ کیوں کیا ہے؟

اردگرد موجود لوگ شہزاد کی تعریفوں کے پل باندھ رہے تھے جس نے بروقت مداخلت کر کے ملک شیر افگن جیسے طاقتور بندے کا پتا پانی کیا اور اس کا منہ پھیرا۔ شہزاد کو اندازہ ہو رہا تھا کہ سیاہ فام شخص نے بھی کھنڈر کے اندر سے یہ ساری صورت حال دیکھی ہے۔ وہ شہزاد کو پہچان تو چکا تھا مگر وہ ابھی تک اپنے مخصوص جلالی موڈ میں نہیں آیا تھا۔ تب شہزاد کو حیرت کا ایک اور دھچکا لگا۔ سیاہ فام نے شہزاد کو اشارے سے اپنے پاس بلایا۔ وہ اس کے قریب جا کر بیٹھا تو سیاہ فام نے عجیب گمبھیر آواز میں قدرے نرمی سے کہا۔ "تو وہی ہے نا جس کے باپ کے پیٹ میں ہاتھی کا بچہ پرورش پاتا ہے؟" شہزاد اثبات میں سر ہلانے کے سوا کچھ نہ کہہ سکا۔ "مجھے یاد آ گئی ہے تیرے ساتھ اپنی پچھلی ملاقات۔" سیاہ فام بولا۔

شہزاد کی آنکھوں میں آنسو لرزنے لگے۔ اچانک اس نے اپنا سر سیاہ فام کے اوپر کو اٹھے ہوئے کمزور گھٹنوں پر رکھ دیا اور سسکیوں سے رونے لگا۔ "باباجی! بہت بھگت لیا میں نے..... اب مجھے معاف کر دیں۔"

سیاہ فام نے اپنے گھٹنے سکیڑے اور ہلکے پھلکے لہجے میں کہا۔ "اوئے، پیچھے کر اپنا منہ۔ کیوں کت کتاریاں کر رہا ہے مجھے۔"

شہزاد نے اپنا منہ پیچھے ہٹایا تو رونے کی وجہ سے ناک میں سے جو رقیق مادہ نکلا تھا، اس کی لمبی سی تار گھٹنے سے ناک تک کھنچ گئی۔ سیاہ فام بولا۔ "اوئے گندے باندر..... تجھے کسی نے بتایا نہیں کہ آنکھوں سے روتے ہیں، ناک سے نہیں۔"

شہزاد جھینپ کر رہ گیا۔ اس کی حالت دیکھ کر سیاہ فام نے پُرلطف قہقہہ لگایا پھر شہزاد کے کان میں سرگوشی کے انداز میں بولا۔ "ویسے رونا میں بھی ناک سے ہی ہوں اور صرف یہی نہیں اور بھی بہت سے پٹھے (الٹے) کام ہیں میرے۔"

"بے شک..... بے شک۔" شہزاد نے عقیدت بھرے انداز میں شد و مد سے سر ہلایا۔

ہاتھوں کے بل چل چل کر سیاہ فام کے پاؤں بہت سوکھے سڑے ہو چکے تھے۔ اس نے سیاہ فام کے پاؤں پر ہاتھ رکھے۔ "میں آپ کے پاؤں چھوتا ہوں۔ میری غلطی پر مجھے معافی دے دیں۔"

"اوئے، گندے باندر! تیری غلطی نہیں غلطا تھا۔ لہٰذا تجھے معافی نہیں معافا مانگنا چاہیے۔"

"چلیں جی..... مجھے معافا دے دیں۔"

"چل کیا یاد کرے گا بن مانس کے بچے! تیری آج کی کارکردگی کی وجہ سے دیا تجھے معافا۔" شہزاد نے ایک بار پھر اس کے گھٹنوں پر سر رکھنا چاہا۔ وہ بدک کر پیچھے ہٹ گیا۔ "اوئے، پھر مجھے گندا کرے گا۔"

شہزاد کھسیانا سا ہو گیا۔ زرما نے آگے بڑھ کر شہزاد کی مدد کی۔ "پیر سائیں جی اور اصل اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کس طرح آپ کا شکریہ ادا کرے۔"

"اگر اسے بہت زور کا "شکریہ" آ رہا ہے تو یہیں بیٹھے بیٹھے کر لے اور یہ کر بھی سکتا ہے۔ تم مالدار ہو۔ وقتی طور پر اس کی مدد کرو۔ کچھ ایسا کرو کہ کوئی یہاں کے رہنے والے مسکینوں کو یہاں سے نکال نہ سکے۔"

"ٹھیک ہے جی۔ ایسا ہی ہوگا بلکہ سمجھیں ہو گیا۔" شہزاد نے فوراً کہا۔ "اس کے علاوہ کوئی حکم؟"

"اس خوشی کے موقعے پر پانچ چھ دیگیں پکواؤ۔ ان لوگوں کو کھلاؤ اور خود بھی کھاؤ۔"

"ٹھیک ہے جی۔ ایسا ہی کرتے ہیں۔" اس بار زرما نے جواب دیا۔

"چلو پھر کرواؤ انتظام فٹافٹ۔" سیاہ فام پیر سائیں نے کہا پھر شہزاد سے مخاطب ہو کر بولا۔ "چلو، اگر تمہارا تھوڑا بہت "شکریہ" نکلا ہوا ہے تو یہاں بیٹھ کر میرے پاؤں دبا لو۔"

شہزاد خوش دلی سے پاؤں دبانے لگا۔ سیاہ فام سائیں نے شہزاد کی گردن پر ہلکا سا چپت لگایا۔ "میں تجھے باندر سمجھتا تھا پر تو، تو لکڑی کا باندر ہے۔ تیری سمجھ میں اتنی خواری کے بعد بھی یہ بات نہیں آئی کہ یہ میرے پاؤں نہیں، یہ سر ہے میرا۔ میرے پاؤں یہ ہیں۔" اس نے اپنے موٹے موٹے سخت ہاتھ دکھائے۔

شہزاد [illegible] سمجھ کر جلدی جلدی اس کے ہاتھ اور بازو دبانے لگا۔ زرما کھانے کا انتظام کروانے لگی۔

قریباً آدھ گھنٹے بعد ہی دو کاریں تیز رفتاری سے موقع پر پہنچ گئیں۔ ان میں سے درمن کے علاوہ درمن کے والد اور مارکو وغیرہ کو اترتے دیکھ کر شہزاد دنگ رہ گیا۔ درمن کے چہرے پر چمک تھی۔ وہ عجیب طرح کی لگاوٹ کے ساتھ شہزاد کو دیکھ رہی تھی۔ مارکو کی آنکھوں میں ایک مسکراتا ہوا سا بھید جھلکتا تھا۔

کچھ ہی دیر بعد وہ سب کھنڈر کے ہی ایک مختصر کمرے میں بیٹھے تھے۔ ایک طرح سے یہ اس سیاہ فام سائیں کا حجرہ تھا۔ زرما نے شہزاد سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ "تم سے کہا تھا نا کہ کچھ نہ کچھ ہو جاتا ہے۔"

"کیا مطلب؟" شہزاد نے منہ پھاڑا۔

"تمہیں بتایا تھا نا شہزاد! میں جو شارٹ فلم بنا رہی ہوں، اس کا نام ہے "کچھ نہ کچھ ہو جاتا ہے۔" یہ دراصل تمہاری ہی فلم ہے۔ اس فلم کے ہیرو ہیروئن تم اور درمن ہو۔"

"ہم..... میں اب بھی کچھ نہیں سمجھا۔"

زرما نے آنکھوں آنکھوں میں مارکو کو اشارہ کیا کہ وہ آگے کی بات بتائے۔ مارکو نے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور بولا۔ "چیتے یار.....! اصل میں بات یہ ہے کہ....."

"تم تو اپنی زبان بند ہی رکھو مارکو..... ورنہ یہاں دنگا ہو جائے گا..... اور خبردار آئندہ مجھے چیتا نہ کہنا۔ چیتے تم ہو بلکہ چیتے سے بھی آگے کی چیز ہو۔ بے رحم جانور۔ تم نے میرے دل میں پنجے گاڑ کر میرا گوشت نوچا ہے۔"

صورت حال دیکھ کر پروفیسر فاروق نے مارکو کو چپ ہونے کا اشارہ کیا اور شہزاد کو لے کر ساتھ والے کمرے میں چلے گئے۔ زرما بھی پیچھے پیچھے آ گئی۔ جب سے الیکشن میں شہزاد کی ضمانت ضبط ہوئی تھی، اس نے فاروق صاحب سے آنکھ نہیں ملائی تھی۔ آج بھی نہیں ملا رہا تھا۔ پروفیسر فاروق نے پانچ دس منٹ شہزاد کو کول ڈاؤن کرنے میں لگائے پھر انہوں نے جو کچھ بتایا اس کا خلاصہ کچھ یوں تھا۔

کینیڈا پلٹ زرما وارث جو بھی تھی مگر ایک حقیقت پسند لڑکی تھی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ شہزاد درمن سے گہری محبت کرتا ہے اور کبھی اس کا نہیں ہو سکے گا۔ یہ جو بھی ڈراما ہوا تھا، اس کا "اسکرپٹ" واقعی زرما نے لکھا تھا اور بڑی گہرائی میں جا کر لکھا تھا..... یہی نہیں، اس کو عملی شکل بھی دی تھی۔ دراصل اسے مارکو کی زبانی "بددعا" والے سارے معاملے کا علم ہو چکا تھا۔ ماڈرن ہونے کے باوجود مارکو کی طرح زرما کو بھی اس انوکھی حقیقت پر یقین کرنا پڑا تھا۔ بعد میں ان دونوں نے یہ سب کچھ درمن سے بھی شیئر کر دیا۔ زرما کے ذہن میں ایک تجویز آ چکی تھی اور اس نے اس تجویز پر مارکو اور درمن کو قائل کیا۔ زرما بڑی اچھی طرح سمجھ گئی تھی کہ شہزاد واقعی ایک بددعا کے اثر میں ہے اور یہ بددعا اظہر من الشمس ہے۔ اس

بددعا کے کلیے کے تحت ہر کام شہزاد کے ارادے کے الٹ ہو رہا تھا۔ وہ جب تک درمن کو چاہتا رہتا، وہ اس کی ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ اس کو حاصل کرنے کے لیے شہزاد کے لیے ازحد ضروری تھا کہ وہ اس کو نہ چاہے بلکہ اس سے نفرت کرے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے نرما نے پروفیسر فاروق کی موجودگی میں پلان تیار کیا کہ مارکو اور درمن کے رشتے کی بات چلائی جائے گی اور نوبت شادی تک پہنچا دی جائے گی۔

یہ سب کچھ طے شدہ تھا..... حقیقت میں مارکو درمن کو بھائی کا درجہ دے رہا تھا بلکہ بھائی سے بڑھ کر بہن کا۔ اس رول کے لیے تیار ہوتے ہوئے وہ شدید ذہنی کرب سے بھی گزرا لیکن اپنے دوست کی بھلائی کے لیے اس نے یہ کردار قبول کیا اور پوری طرح نبھایا بھی۔ وہ سب کوشش کر رہے تھے مگر یقین کسی کو بھی نہیں تھا کہ یہ کھیل واقعی شہزاد اور درمن کے لیے کوئی راہ کھول سکے گا۔ صرف نرما کو پختہ یقین تھا اور وہ اکثر یہ کہتی بھی تھی..... دیکھنا..... کچھ نہ کچھ ہو جاتا ہے۔

اور پھر کچھ نہ کچھ ہوا..... الٹے سائیں یعنی سیاہ فام ملنگ سے ان کی ملاقات بالکل اچانک ہوئی..... اور وہ بددعا بھی پلٹ گئی جس نے شہزاد کا جینا حرام کر رکھا تھا۔

اب سب کچھ شہزاد کی سمجھ میں آ گیا تھا۔ وہ جس دوست کو تصور ہی تصور میں درجنوں بار موت کے گھاٹ اتار چکا تھا اور لاش گلیوں میں گھسیٹ چکا تھا، وہ بے گناہ تھا۔ وہ اس کے سامنے آنکھوں میں آنسو لیے کھڑا تھا..... اور کچھ یہی کیفیت درمن کی بھی تھی۔ شہزاد نے جذباتی ہو کر پہلے درمن سے لپٹنا چاہا مگر پھر پروفیسر فاروق کی موجودگی محسوس کر کے مارکو سے لپٹ گیا۔ اسے اپنے ساتھ بھینچ لیا۔ ”مجھ سے معافی مانگتا ہوں یار..... بلکہ معافی مانگتا ہوں..... بہت شرمندہ ہوں تجھ سے۔“

”اور درمن سے؟“ پروفیسر فاروق نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”بہت شرمندگی محسوس ہو رہی ہے درمن سے اپنے رویے پر۔“ وہ بولا۔

”بلکہ شرمندگا ہے۔“ نرما نے لقمہ دیا۔ سب مسکرانے پر مجبور ہو گئے۔

پروفیسر فاروق نے وہیں کھڑے کھڑے درمن اور شہزاد کے ہاتھ پکڑے اور دونوں کے ہاتھ آپس میں ملاتے ہوئے بولے۔ ”مجھے یقین ہے شہزاد..... دعاؤں اور بددعاؤں میں اثر ہوتا ہے اور یہ جو خاص بددعا تھی، یہ تم سے اٹھ گئی ہے۔ اب تمہارے لیے جو ہوگا اچھا ہی ہوگا..... میں آنے والے دنوں میں تم دونوں کو ایک دیکھنا چاہتا ہوں۔“

درمن نے شرما کر سر جھکایا۔ اس کی ناک اور ناک کا تل مزید دلکش نظر آنے لگے۔ کوئی مناسب موقع ہوتا تو شہزاد اس ناک کی چونچ کو اپنے ہونٹوں سے ضرور چھوتا بلکہ ممکن تھا کہ پیار سے ہلکی سی دندی کاٹ کر بھاگ بھی جاتا مگر اب وہ صرف خوش ہو کر رہ گیا۔

☆☆☆

پروفیسر فاروق صاحب نے کہا تھا کہ آئندہ ان شاء اللہ... شہزاد کے لیے جو ہوگا اچھا ہی ہوگا..... اور ان کی زبان مبارک رہی۔ اچھا ہی ہوا۔ شہزاد کے باداجی کی بادی شامل ہوں حسب اندیشہ انہیں ٹھیک ٹھاک چونا لگا گئی۔ یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ اس نے اپنے ”جانِ من“ کو ٹکوں سے ہلکا کر دیا۔ اپنے کسی وکیل دوست کے ساتھ مل کر اس نے جعلسازی کی اور باداجی کی دو کمپنیوں کے بے شمار حصص اپنے نام کرا کے اٹلی فرار ہو گئی۔ ایسے موقعوں پر لوگوں کو اکثر ہارٹ اٹیک ہوتا ہے مگر بہت بڑی توند کی وجہ سے باداجی کا اپنڈے کیس پھٹ گیا۔ اس حادثے نے انہیں ہارٹ اٹیک سے بڑھ کر ترتھلیاں ڈالیں۔ کسی ستم ظریف نے سوشل میڈیا پر اس طرح کا چٹکلا بھی چھوڑا کہ انہیں ”توند اٹیک“ ہوا ہے۔ وہ ٹلیل بھی ہوئے اور اپنی نظروں میں ذلیل بھی۔ نیم بے ہوشی میں خود ہی کو کوستے رہے..... اور اپنے اکلوتے بیٹے شہزاد کو پکارتے رہے۔

پندرہ بیس روز بعد بحال ہوئے تو شہزاد کو بلا کر اسے اپنی توند سے لگایا۔ اس کا ماتھا چوما۔ درمن کے سر پر بھی پیار دیا اور ارادہ ظاہر کیا کہ اب وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر یادِ الٰہی میں مصروف ہوں گے اور اپنے گناہ بخشوائیں گے۔ شہزاد کا خیال تھا کہ شاید وہ حج عمرے پر جانے کی بات کریں گے مگر جب پوچھا تو وہ بولے۔ ”فی الحال تو امریکا جاؤں گا..... کہ بخشوانے کے لیے کچھ گناہوں کا ہونا بھی تو ضروری ہوگا۔“

شہزاد ذرا جھجک کر بولا۔ ”گویا آپ کا خیال ہے کہ فی الحال آپ گناہ گار نہیں ہیں؟“

”ابھی میں کبیرہ گناہوں کی بات کر رہا ہوں۔“ انہوں نے کہا۔

شہزاد اس جواب پر ٹھنڈی آہ بھرنے کے سوا اور کیا کر سکتا تھا..... سوچنے لگا اگر وہ اب تک صغیرہ گناہ کرتے رہے ہیں تو کبیرہ پتا نہیں کیا ہوں گے؟

✖✖✖

ختم نبوت ﷺ زندہ باد　　　　　　　　　　　　　عظمت صحابہ زندہ باد

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ:

معزز ممبران: آپ کا وٹس ایپ گروپ ایڈمن **"اردو بکس"** آپ سے مخاطب ہے۔

آپ تمام ممبران سے گزارش ہے کہ:

- گروپ میں صرف PDF کتب پوسٹ کی جاتی ہیں لہذا کتب کے متعلق اپنے کمنٹس / ریویوز ضرور دیں۔ گروپ میں بغیر ایڈمن کی اجازت کے کسی بھی قسم کی (اسلامی وغیر اسلامی، اخلاقی، تحریری) پوسٹ کرنا سختی سے منع ہے۔
- گروپ میں معزز، پڑھے لکھے، سلجھے ہوئے ممبرز موجود ہیں اخلاقیات کی پابندی کریں اور گروپ رولز کو فالو کریں بصورت دیگر معزز ممبرز کی بہتری کی خاطر ریموو کر دیا جائے گا۔
- کوئی بھی ممبر کسی بھی ممبر کو انباکس میں میسج، مس کال، کال نہیں کرے گا۔ رپورٹ پر فوری ریموو کر کے کاروائی عمل میں لائے جائے گی۔
- ہمارے کسی بھی گروپ میں سیاسی و فرقہ واریت کی بحث کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں ہے۔
- اگر کسی کو بھی گروپ کے متعلق کسی قسم کی شکایت یا تجویز کی صورت میں ایڈمن سے رابطہ کیجئے۔
- سب سے اہم بات:

گروپ میں کسی بھی قادیانی، مرزائی، احمدی، گستاخِ رسول، گستاخِ امہات المؤمنین، گستاخِ صحابہ و خلفائے راشدین حضرت ابو بکر صدیق، حضرت عمر فاروق، حضرت عثمان غنی، حضرت علی المرتضیٰ، حضرت حسنین کریمین رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین، گستاخ اہلبیت یا ایسے غیر مسلم جو اسلام اور پاکستان کے خلاف پراپیگنڈا میں مصروف ہیں یا ان کے روحانی و ذہنی سپورٹرز کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے لہذا ایسے اشخاص بالکل بھی گروپ جوائن کرنے کی زحمت نہ کریں۔ معلوم ہونے پر فوراً ریموو کر دیا جائے گا۔

- تمام کتب انٹرنیٹ سے تلاش / ڈاؤنلوڈ کر کے **فری آف کاسٹ** وٹس ایپ گروپ میں شیئر کی جاتی ہیں۔ جو کتاب نہیں ملتی اس کے لئے معذرت کر لی جاتی ہے۔ جس میں محنت بھی صَرف ہوتی ہے لیکن ہمیں آپ سے صرف دعاؤں کی درخواست ہے۔
- عمران سیریز کے شوقین کیلئے علیحدہ سے عمران سیریز گروپ موجود ہے۔
- **لیڈیز کے لئے الگ گروپ کی سہولت موجود ہے جس کے لئے ویریفکیشن ضروری ہے۔**
- اردو کتب / عمران سیریز یا سٹڈی گروپ میں ایڈ ہونے کے لئے ایڈمن سے وٹس ایپ پر بذریعہ میسج رابطہ کریں اور جواب کا انتظار فرمائیں۔ برائے مہربانی اخلاقیات کا خیال رکھتے ہوئے موبائل پر کال یا ایم ایس کرنے کی کوشش ہر گز نہ کریں۔ ورنہ گروپس سے تو ریموو کیا ہی جائے گا بلاک بھی کیا جائے گا۔

نوٹ: ہمارے کسی گروپ کی کوئی فیس نہیں ہے۔ سب فی سبیل اللہ ہے

0306-7163117	0343-7008883	0333-8033313
محمد سلمان سلیم	پاکستان زندہ باد	راؤ ایاز

پاکستان زندہ باد　　　　　　　　　　　　　پاکستان پائندہ باد

اللہ تبارک تعالیٰ ہم سب کا حامی وناصر ہو